خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اکتوبر 2012
نگران اعلیٰ
معراج رسول
قیمت 60 روپے

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ عذرا رسول

جلد 41 • شمارہ 10 اکتوبر 2012 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

حکمتِ عملی

جون ایلیا

شام ہے اور ایک حالتِ استفہام ہے۔ میں اور میرا ہمزاد بیٹھے ہوئے سوچ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ بول رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ یہ عمل وقفے وقفے سے جاری ہے۔ جو لفظ ہماری زبان پر بار بار آ رہا ہے وہ ''سیاست'' ہے۔ ہے یوں کہ جہاں سماج ہے وہاں سیاست اور جہاں سیاست ہے وہاں سماج۔

دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک ایسے سماج کے خواب دیکھتا ہے جہاں کوئی سیاسی نظام یعنی حکومت یا ریاست نہ پائی جاتی ہو۔ اس گروہ کو اردو میں نراجی اور عربی میں فوضوی (ANARCHIST) کہتے ہیں۔ ایسا ہی سماج میرا اور میرے ہمزاد کا خواب رہا ہے اور ہے۔ یہ خواب کب پورا ہوگا؟ کتنی نسلیں گزرنے کے بعد پورا ہوگا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن گمان یہ ہے کہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جسے ہمیشہ مضحکہ خیز سمجھا گیا ہے۔ اس پر انیسویں صدی میں بھی بری طرح ہنسا گیا اور اس صدی میں بھی اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی ذہن کے سب سے خوب صورت خوابوں کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے؟ جو خیالات انسانی ذہن کا سرمایہ ہیں، بیش قیمت ترین سرمایہ انہیں دیوانگی کی پیداوار کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جو خیالات دیوانگی کی پیداوار سمجھے گئے انہی نے تاریخ میں انقلابی کردار ادا کیا۔ وہ فکر و خیال کے دیوانے ہی تھے جنہوں نے فرزانگی کی پرورش اور پرداخت کی۔ تہذیب کی تاریخ دراصل دیوانوں ہی کی کارگزاری کی سرگزشت ہے۔

ذکر تھا، سیاست کا۔ سیاست کو ایک ایسا عمل سمجھا جاتا ہے جو چالاکی، عیاری، سازش، فریب دہی اور دروغ گوئی سے تعلق رکھتا ہو۔ ایسا سمجھنا ''سیاست'' کے ساتھ بے حد افسوس ناک ناانصافی ہے۔ یہاں میں جس امر کو واضح کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست یا ملک داری (حکومت) حکمت سے تعلق رکھتی ہے اور حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور دوسری حکمت عملی۔ حکمت نظری، منطق، ریاضیات، طب، علم ہیئت (ASTRONOMY)، طبیعات اور دوسرے علوم سے تعلق رکھتی ہے۔

اب رہی حکمت عملی، حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں اور وہ ہیں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل یعنی امور خانہ داری کی تنظیم اور سیاست (یعنی حکومت یا ملک داری) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست حکمت عملی کی سب سے برتر قسم ہے۔

اگر میری یہ بات صحیح ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح ہے اس لیے کہ یہ بات میرے ذہن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مہذب معاشروں کی تسلیم شدہ بات ہے تو مجھے بتایا جائے کہ سیاست دانوں یا حکمرانوں کی اکثریت جس طرز سیاست پر عمل پیرا ہے کیا اس کا حکمت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہے......؟

میری اس بات کے پیش نظر سیاست یا ملک داری کا کام چلانے والے لوگوں کا معاشرے کے حکیم ترین یا دانش مند ترین لوگوں کے حلقے سے تعلق ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے یا نہیں...... اگر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ہونا چاہیے تو کیا ہم بہت رعایت دینے کے بعد بھی سیاست دانوں یا حکمرانوں کو حکیم ترین اور دانشمند ترین نہ سہی، بہت ادنیٰ مفہوم کے اعتبار سے حکیم یا دانش مند قرار دے سکتے ہیں؟ یہاں چند لمحوں کے لیے رک کر ذرا ہنس لیجیے...... سیاست داں یا حکمراں اور حکیم...... سیاست داں یا حکمراں اور دانش مند! توبہ توبہ...... یہ تو نیم حکیم بھی نہیں ہیں...... ہاں خطرۂ جاں ضرور ہیں۔

میں دنیا کے سیاست دانوں یا ملک داروں کی ایک بڑی تعداد سے سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے عوام نے قومی معاملوں میں کبھی قوم کو مایوس کیا......؟ ان میں سے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مایوس کیا۔ ہرگز مایوس نہیں کیا۔ پھر تم کیسی بدبلا ہو جو اپنی قوم کو لگاتار مایوس کرتے چلے آ رہے ہو، تمہارے عوام نے ہمیشہ تم پر اعتبار کیا' پر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمہارے پیش رو اور تم ہمیشہ ناقابلِ اعتبار ٹھہرے۔ انہوں نے ہمیشہ تم سے اپنی عزیز ترین امیدیں وابستہ کیں پر تم نے انہیں بڑے برے اور بینڈے انداز کے ساتھ ناامید کیا۔ تمہارا ٹولا تو بس بڑبولے پن کا ہنرمند اور آنکھوں میں دھول جھونکنے پر کاربند رہا ہے۔

آخر تم لوگ کس غرے میں ہو۔ کیا تم رنگ و خوشبو کے بیٹے ہو، کیا تم روشنی کے جنے ہو۔ کیا تم سلیقے اور شائستگی کے لے پالک ہو......؟ نہیں جانا جاتا کہ آخر تم کون ہو؟ جنہوں نے تم سے شروع شروع میں آس لگائی، ان کی بھویں بھی سفید ہو چکی ہیں اور جوان کے بعد آئے وہ...... اور جو ان کے بعد آئے وہ اس عذاب میں مبتلا ہیں جسے ہونے کے احساس کی جان کنی کہتے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسانوں کے حقیقی مسئلوں کو نہ تو سائنس دان حل کر سکتے ہیں۔ نہ فلسفی، نہ شاعر اور نہ ادیب۔ یہ فرض تو صرف سیاست داں اور حکمراں ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے کہ عوام ان ہی کی بات سنتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کی طاقت صرف سیاست دانوں یا حکمرانوں ہی کو حاصل ہے۔ آج انسانوں کے مسئلے پہلے سے کہیں زیادہ الجھے ہوئے ہیں اور یہ الجھے ہوئے مسئلے کسی ایک ملک یا ایک علاقے کے عوام کو متاثر نہیں کر رہے ہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ کیا دنیا کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کا گروہ اس صورتِ حال کو حکمت پسندی، دانش مندی اور انسان دوستی کے ساتھ پیش نظر رکھے گا یا نہیں؟

کزن بھی...... ماہا ایمان عقل سے پیدل ہے تو کیا آپ کی کزن بھی...... رمضان پاشا بھائی خیریت تو ہے ناں۔ کہیں بھابی نے کچھ کہہ تو نہیں دیا، تبصرہ بڑا مختصر سا لکھا ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ اگر آہی گئی ہیں تو بی بی خط لکھیں طنز نہ کریں۔ ویسے قدرت اللہ صاحب ایک بات تو بتائیں، سرورق کو واقعی روزے کی وجہ سے نظر انداز کیا تھا یا بھابی نے...... چاہتوں کے سفر میں آخر کار ہمارے پیارے اور فیملی ممبر سسپنس کے حوالے سے دو دل آپس میں مل رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہمارا پیارا سسپنس یقیناً مبارک باد کا مستحق ہے۔ ادریس بھائی آپ کے ایکسی ڈینٹ کا پڑھ کر افسوس ہوا اس سے بھی زیادہ افسوس یہ پڑھ کر ہوا کہ آپ سات سال سے صاحب فراش ہیں خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ تفسیر عباس بابر خوشبو کی ایک ایسی لڑی کی پروتا ہے جس کی مہک الفاظ کے ذریعے یاران محفل میں چار سو پھیل جاتی ہے۔ بشیر احمد بھٹی فوجی صاحب آپ واقعی فوجی لگتے ہیں کیا تو دی پوائنٹ بات کی ہے، مختصر سے خط میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔ محمد زبیر ساگر صاحب ہما گر کنارے دل یہ پکارے ہم پر رحم کریں اپنی کوئی تحریر سسپنس میں نہ بھیجیں۔ عمران حیدر بلوچ بیٹا تمہارے ناکردہ جرم کی تفصیل پڑھ کر بڑا افسوس ہوا۔ خدا تمہیں جلد از جلد اس کال کوٹھری سے نجات دلائے، آمین۔ روشنی رشید صاحبہ کافی عرصے بعد دھمیال کیمپ سے دھمال ڈالنے آئی ہیں۔ ویلکم ٹو محفل روشنی صاحبہ۔ مجھے تو روشنی رشید اور عبدالرؤف عدم ایک ہی تصویر کے دو رخ لگتے ہیں۔ راشد حبیب تابش اور سید محی الدین اشفاق کے مختصر سے تبصرے بڑے بونگے لگے اسی لیے ان دونوں حضرات نے مابدولت کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ لیں کومل رباب جی ہم رک گئے، بولیں کیا بات ہے اچھا اچھا آپ اپنے اس اوٹ پٹانگ خط کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہیں، ارے ارے آپ نے رونا کیوں شروع کر دیا۔ بہت شکریہ حسنین عباس بلوچ بیٹا تم نے مجھے محفل کی جان سمجھا حالانکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ محفل کی جان تو وہ تمام قیدی ہیں جو اتنے پیار سے اتنی محبت سے محفل میں شامل ہوتے ہیں۔ اب کی بار بھی سب سے پہلے انوار صدیقی صاحب کی تخلیق کشکول پڑھی۔ کہانی ابھی تک جرائم پیشہ افراد کے گرد گھوم رہی ہے حالانکہ شروع میں کہا گیا تھا کہ کہانی کا عنوان پراسراریت ہے مگر اسی پراسراریت کو صحیح طرح ہائی لائٹ نہیں کیا جا رہا۔ سسپنس کی دوسری قسط وار کہانی ناصر ملک صاحب کے ذہن کی پیداوار مسافر اپنے تخلیق کار کو آہستہ آہستہ بلندیوں پر لے کر جا رہی ہے۔ آخری صفحات پر عائشہ فاطمہ کی تحریر کردہ قرض مسافت وہی پرانی اور گھسی پٹی کہانی مجھے تو پسند آئی۔ محبت جیسے لازوال موضوع پر طاہر بھائی نے جب بھی لکھا زبردست لکھا۔ حسام بٹ صاحب اس بار مرزا امجد بیگ صاحب کی ڈائری سے پس منظر لے کر آئے اور حسب معمول بیگ صاحب نے یہ کیس بھی جیت لیا۔ اس دفعہ پہلے صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد صاحب تاریخ کے جھروکوں سے چچ نامہ لے کر آئے۔ مغرب سے درآمد شدہ کاشف زبیر بھائی کی تحریر مستحق درمیانی سی کہانی تھی۔ دوسری کہانیاں بھی اچھی اور سسپنس کے معیار کے مطابق تھیں۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ محفل میں صرف تین عدد چڑیلیں ہی تھیں جو کہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اگر ہمت ہے تو میدان میں میرا مطلب ہے محفل میں تشریف لائیں۔ دل چاہتا ہے اور بہت سی باتیں کروں مگر خط لمبا ہو جائے گا۔'' (شائع تو ہو گیا آپ کا مختصر سا خط مزید مختصر کرنے کے بعد...... اگر ہم اسے پورا شائع کرتے تو شاید دوسروں کو جگہ نہ ملتی۔ لیکن ہمیں آپ کے خط سے مکمل آگاہی ہوئی جو آپ بھی چاہتے تھے)

✠ ڈاکٹر وسیم خالق گھمیاں، گجرات سے تبصرہ کر رہے ہیں ''سرورق پر عید کی مناسبت سے بنی سنوری حسینہ ہماری کچھ ماہ سے غیر موجودگی کی وجہ سے پریشان اور بجھی بجھی پائی گئی۔ جون ایلیا کے انشائیہ بے دولتی پر پہنچے جس پر تبصرہ کرنے سے بندۂ ناچیز قاصر ہے۔ محفل یاراں میں کرسی صدارت پر ساحر ناز لدھیانوی جلوہ افروز تھے۔ ہماری پیاری پیاری بہن روشنی رشید جو بھولی بسری یاد بن کے رہ گئی تھی، آئی اور اپنے تبصرے سے محفل میں جان ڈالی۔ میری پیاری بہنا روشنی جی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ کی یادداشت کی روشنی ٹمٹمانے لگی ہے۔ تبھی تو آپ اپنی محفل سے غیر موجودگی کی مدت 2 سال بتا رہی ہیں جبکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کا آخری تبصرہ اگست 2011ء میں سسپنس کے اوراق کی زینت بنا۔ طاہرہ گلزار جی آپ کا نام مجھے کسی عہد شکن دوست کی یاد دلاتا ہے۔ ہمایوں سعید راج صاحب کیا موبائل نمبرز بھی سگے اور سوتیلے ہوتے ہیں؟ راجا ثاقب اور تصویر العین کو کافی مس کیا۔ سب سے پہلے آخری صفحات کی زینت بنی عائشہ فاطمہ کی اسٹوری قرض مسافت پڑھی جو کچھ سرفراز کے ساتھ ہوا اس پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے ناں اس طرح کے کاموں میں۔ اس کے بعد انوار صدیقی کی کشکول پڑھی جو کسی ایکشن موڈی سے کم نہیں۔ ناصر ملک کی مسافر ایک زبردست اسٹوری ہے مگر جس طرح شاہ صاحب کے کردار کو نظر انداز کیا گیا ہے وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر میں ایک بات محفل یاراں کے تمام ساتھیوں سے کہ ہو سکتا ہے کہ میں اس مہینے دبئی میں چلا جاؤں اور یہ میرا آخری خط ہو (اللہ آپ کو خیریت سے لے جائے لیکن آخری خط کیوں، دبئی سے خط بھیجنا مشکل نہیں پھر انٹرنیٹ بھی تو ہے۔ رسالہ آپ کو دبئی میں بہ آسانی دستیاب ہو گا) اگر محفل کے کسی ساتھی کا میری وجہ سے دل دکھا ہو تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' (محفل میں آتے رہیے گا)

✠ سنسان دل، شور وغل کے ساتھ جودھپور، کبیر والہ سے حاضر ہیں ''ستمبر کا سسپنس چاند رات کو ملا، بس جی ہماری عید تو اسی وقت شروع ہو گئی (یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے......) میں گزشتہ 8 سالوں سے سسپنس کا قاری ہوں۔ اس بار قلم کشائی کا ارادہ کیا ہے۔ امید ہے کہ اس بندۂ ناداں کو محفل کے قیمتی اوراق میں تھوڑی جگہ دے دی جائے گی۔ (خوش آمدید) گھر آ کر ہم نے سرورق کا جائزہ لیا تو ایک پیاری سی لڑکی ایک ہاتھ میں چھ چوڑیاں پہنے اور ایک کان میں جھمکا پہنے کسی کی راہ تک رہی ہے۔ ہم نے محترمہ کو ان کے حال پر چھوڑا اور محفل میں قدم رکھا جہاں ساحر ناز صاحب اپنی باتوں کے سحر میں سب کو جکڑے نظر آئے۔ بہت زبردست تبصرہ تھا جناب کا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کا تبصرہ پڑھا۔ محترمہ سب پر طنز فرماتی نظر آئیں۔ محترمہ کچھ ہاتھ ہلکا رکھیے۔ سب لوگ ماہا ایمان کی عمر کا اندازہ لگا رہے ہیں یہ چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جناب وہ اگر 60 یا 80 سال کی ہیں تو آپ کیوں فکر کرتے ہیں......! بابر عباس صاحب 21 جولائی کو آپ کی سالگرہ تھی۔ آپ کو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو......! چلو اب کیک بھجوا دینا لازمی۔ روشنی رشید صاحب اپنے یاد نہ کرنے کا گلہ کرتی نظر آئیں۔ محترمہ یہ دنیا کا اصول ہے جو پاس ہے وہ یاد ہے۔ کومل رباب......! محترمہ ہم مانتے ہیں کہ آپ زیادہ نہیں بس مشہور زمانہ گلوکارہ عابدہ پروین کے ہم پلہ ہیں، لہٰذا آپ فکر نہ کریں آپ کو جگہ مل گئی ہے۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی کہانی بہت زبردست جا رہی ہے۔ شہریار اپنی مہم میں ناکام لوٹا۔ پروین اسے نہیں ملی۔ کشکول بہت زبردست تحریر ہے۔ لیاقت حسین بال بال بچا۔ اورنگ زیب بگ باس کے مقابلے میں مصلحت سے کام لے رہا ہے، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ قرض مسافت میں تاریخ نے خود کو دہرایا۔ سرفراز علی دنیا و آخرت سب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مریم کے خان کی تحریر ''بھائی'' نے ثابت کر دیا کہ عورت بھائی کو بھائی

کا دشمن بنا دیتی ہے۔ روزن دل بہت اچھی تحریر تھی۔ کہانی کے اختتام نے افسردہ کر دیا۔ خود غرض نثار کی حقیقت جاننے کے بعد پر ملال کیفیت دیکھ کر افسوس ہوا۔ ہیلمٹ کی چوری نک کے اوپر لکھی گئی تھی مگر اس نے اتنا متاثر نہیں کیا۔ فریب کار میں شکاری آخر کار خود شکار ہو گیا اور قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ بھی اپنی سگی بہن کے ہاتھوں۔''

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''اس دفعہ سرورق پر ایک کہانی کے کردار کی شبیہ بنی دیکھ کر خوشی ہوئی، میرا اشارہ قرض مسافت کی ستارہ بیگم کی طرف ہے۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح تلخ اور ترش تھا۔ آپ کے خط میں اس حقیر فقیر کا خط چھپا دیکھ کر اور آپ کی چھ لفظی تعریف پڑھ کر ڈھیروں خون بڑھ گیا، مارے خوشی کے دل باغ باغ ہو گیا (خوش رہیے) سندھ کی تاریخ پر چچ نامہ چھپنے سے میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ مستحق بڑی اچھی کہانی تھی، مدتوں یاد رہے گی۔ جدائی پسند نہیں آئی۔ کشکول میں سسپنس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ دور جدید کا طلسم ہوشربا پڑھ رہا ہوں۔ بھائی، کہانی تو اچھی تھی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جیمز مر چکا تھا تو مائیکل کی باتیں سننے کون آیا تھا، کیا اس کی روح؟ (جی ہاں) تعاقب نام سے تو لگا تھا کہ کوئی سراغرسانی پر کہانی ہو مگر اختتام پر تائمیں فش...... پس منظر حسب معمول بیگ صاحب کیس جیت گئے، عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ ہلمٹ کی چوری اس بار نک ویلوٹ قانون کے شکنجے میں پھنستے پھنستے بچ گیا۔ اس چوری روداد میں مزہ آیا۔ دولت کا رشتہ یہ کہانی بھی یاد رہ جانے والی ہے۔ کہانی تعاقب سے تو یہ بہت اچھی ہے۔ مسافر واہ کیا دبنگ کہانی ہے۔ اس کی میڈم کے رنگ ڈھنگ، بود و باش اور کارنامے پڑھ کر ماضی کی سرسر صبا رفتار کی یاد تازہ ہو گئی۔ فریب کار بھی اچھی کہانی تھی۔ شامت اعمال کافی دلچسپ کہانی تھی، جیسا میں نے چاہا اختتام ایسے ہی ہوا۔ ہم شکل مختصر کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی تھی۔ قرض مسافت، یہ ایک پرانی کہانی کو جدید انداز میں تحریر کیا گیا ہے، کرداروں کے نام اور واقعات میں تھوڑا سا رد و بدل اور عنوان بھی نیا، نئے زمانے کا ماحول ظاہر کرنے کے لیے ٹارگٹ کلنگ اور بھتہ مافیا کا تڑکا لگا دیا، کیا خوب، کہانی اچھی تھی۔ اشعار کی محفل میں سید محی الدین اشفاق کا انتخاب پسند آیا۔ بلقیس خان کا چناؤ بھی قابل داد تھا۔ مہناز قریشی کا شعر بھی اچھا تھا۔ کترنیں بہت عمدہ تھیں، خوب ہنسی آئی۔'' (ہمیشہ مسکراتے رہیے)

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''ستمبر 2012ء خوب صورت سرورق کے ساتھ موصول ہوا اور بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی تبصرے کے ساتھ ساحر ناز لدھیانوی اپنی دس سالہ سسپنس سے شناسائی کا ذکر کرتے ہوئے اگر ماہا ایمان پر اپنے زریں خیالات کا اظہار نہ کرتے تو تبصرہ بہت شاندار تھا مگر کہیں کہیں آپ کا قلم آپ کے قابو میں نہیں رہا، آئندہ توجہ فرمائیے گا اور ذاتیات سے الجھنے سے پرہیز کیجیے گا۔ رمضان مبارک میں مجبوروں کا ریڑھا لگا کر حلال رزق کمانا عین عبادت ہے اور ویسے بھی مجبور سے روزہ افطار بہت ہی ثواب اور سب سے بڑی بات سنت ہے۔ سعدیہ بخاری کا تبصرہ بھی بہت شاندار رہا۔ روشنی رشید صاحبہ کافی عرصہ بعد تشریف لائیں ویسے بھی روشنی آج کل ہمارے ملک کا بڑا ہی گھمبیر مسئلہ ہے۔ آپ کو سب نے یاد رکھا جس طرح دلنشین بلوچ صاحبہ کو یاد کیا جاتا ہے۔ آئندہ تبصرے کا انتظار رہے گا۔ کومل رباب کو جگہ مل گئی اب آئندہ ذرا بڑے اور زوردار تبصرے کے ساتھ حاضری دیجیے گا۔ بیگ صاحب کے کارناموں میں اب یکسانیت کی خوشبو آنے لگی ہے۔ بیگ ذرا زبردست کارنامہ سسپنس کی نذر ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب چچ نامہ لے کر آئے چچ اور رانی کا کردار تو روایتی مگر چچ کا کردار تاریخ کا ایک زبردست کردار رہا معلوم یہ ہوا کہ بلند کردار کے انسان ہر دور میں تھے اور رہیں گے مگر ڈاکٹر صاحب انجام میں تشنگی رہی۔ محمد بن قاسم کے ہاتھوں ہندو سلطنت کا خاتمہ۔ اب محمد بن قاسم پر اگر کچھ ہو جائے تو کیا بات ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب جدائی اپنے طرز کی خوب صورت کہانی تھی شہلا، عدنان اور وینس سینما اور پھر کہانی کا انجام بہت ہی حیرت انگیز رہا۔ زبیر صاحب کی مستحق۔ اب اس کہانی کے لیے کیا کہوں زبردست! سسپنس سے بھرپور کہانی جسے زبیر صاحب نے بہت ہی خوب صورت انداز میں تحریر کیا۔ کشکول بڑی برق رفتاری سے پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے آگے ہی آگے بڑھ رہی ہے۔ دفتر کی تباہی اور نگ زیب کے ہاتھوں لوچن کی گرفتاری اور پھر درمیان میں مہاراج اور مدھو کا کردار کہانی کس رنگ میں آتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح مسافر بھی برق رفتاری سے رواں دواں ہے۔ بہن کی تلاش کہاں ختم ہو گی مگر یہ کیا...... ڈاکٹر صاحب کا کردار ایکدم غائب ہو گیا جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی اب مسافر کون ہے یہ کس کو معلوم ہو۔ مریم کے خان کا بھائی اور سلیم انور کا تعاقب بہت عرصہ تک یاد رکھنے والی کہانیاں ہیں۔ قرض مسافت، عائشہ فاطمہ نے طوائف کے پس منظر میں خوب صورت کہانی لکھی اور اسے آہستہ آہستہ اپنے انجام تک لے کر آئیں۔''

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں آدھمکے ہیں ''ٹائٹل گرل حنائی ہاتھوں اور سولہ سنگار کے ہتھیاروں سے لیس کسی کے لیے سراپا انتظار ہے۔ انشائیہ میں دانش و حکمت سے مستفید ہوئے۔ اداریے کے بعد اپنی محفل میں وارد ہوئے، سب سے اوپر ساحر ناز لدھیانوی کا نام تھا جو اپنے پہلے ہی خط میں صدر محفل ہو گئے، مبارکباد۔ انداز بھی اچھا ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلے مسافر سے ابتدا کی، نئے نئے انکشافات اور دلچسپی کے ساتھ مسافر کا سفر جاری ہے۔ دوسری کہانی کشکول بھی کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا چچ نامہ تاریخی واقعات پر مشتمل تھا۔ خصوصاً راجا داہر کے متعلق حقیقت سے آشنا ہوئے۔ مستحق بھی اچھا اثر لیے ہوئے تھی۔ ایک پروفیسر نے بہترین ذہانت کا مظاہرہ پیش کیا اور اپنی بیٹی کے قاتل سے انتقام لے لیا۔ مریم کے خان کی بھائی نے بھی اچھا تاثر دیا۔ تعاقب بھی بہتر تھی جہاں چھوٹے سے احساس نے ناگ کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے پہلے حقیقت کھل گئی۔ پس منظر بھی تسلسل کے لحاظ سے ٹھیک تھی۔ روزن دل، دولت کا رشتہ، ہلمٹ کی چوری بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ اشعار نے بھی مزہ دیا مگر اپنا شعر نظر نہیں آیا۔ فریب کار بہت اچھی لگی جسٹن گڈ جیسے شاطر بفریبی دھوکے باز کولنڈا نے بدترین سزا دی اور اپنی دوست کا انتقام لے لیا۔ دلوں کو روشنی کی کرنوں اور ایمان کو جلا بخشنے والی تحریر میں حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعات اور حالات پُراثر تحریر تھی۔ شامت اعمال میں قتل جیسا بھیانک جرم بھی سرزد ہوا جو کہ جلد بازی اور بدحواسی کا شاخسانہ ہے۔ ہم شکل اور خود گواہی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ مجرم خواہ کتنا بھی چالاک اور سیانا ہو مگر قانون کی دسترس سے بچنا محال ہے۔ قرض مسافت آخری صفحات کی بہترین کہانی تھی۔''

✠ حافظ شاہد عمران چدھڑ، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے ''سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شریک ہوا ہوں (خوش آمدید) یار آپ لوگوں نے تو

خطوط پر خطوط لکھ کر کافی رونق لگائی ہوئی ہے۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ماہ میں دو مرتبہ سسپنس شائع ہو (کمال ہے بھئی) لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ ہمیں جیل کی کال کوٹھریوں میں ہر ماہ مل تو جاتا ہے۔ عمران حیدر بلوچ، حسنین عباس، ریاض شاہد بھائی سب اسیروں کے لیے دعا ہے اللہ ہم سب کو رہائی عطا فرمائیں (آمین) زبیر ساگر صاحب آپ کو بھی مبارک ہو کہ آپ کا خط بھی شامل ہو گیا ہے۔ ماہا ایمان کا فرار بھی باعث تشویش ہے۔ اس ماہ کا شمارہ 21 تاریخ کو ملا تو جان میں جان آئی اس دفعہ سرورق اچھا لگا۔ سب سے پہلے مسافر پڑھی۔ کہانی بہت ہی اچھی جارہی ہے۔ میڈم شکیلہ اور شہریار کی آنکھ مچولی اچھی جارہی ہے۔ کشکول اچھے انداز میں رواں دواں ہے۔ شیخ حامد کو ناکامی پر ناکامی ہو رہی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعات ایمان افروز تھے۔ داستان بہت ہی اچھی لگی۔ محفل شعر وسخن میں حاجی زاہد اقبال صاحب کے شعر نے تو تمام جسم کی توانائیوں کو سمیٹ کر رکھ دیا۔ رائے نعیم احمد بھٹی صاحب آپ کا شعر بھی بہت اچھا لگا۔ محفل شعر وسخن کی کرسی صدارت تو ہم حافظوں نے سنبھال رکھی ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام شعر بہت ہی اچھے تھے۔ سسپنس ڈائجسٹ اپنی محنت اور لگن سے ہمیشہ فرسٹ پوزیشن پر ہی رہے گا، یہ تمام اسٹاف کی محنت شاقہ کا ثبوت ہے۔'' (پسندیدگی کا بہت شکریہ)

✠ تصویر العین، اوکاڑہ سٹی سے چلی آرہی ہیں ''سب سے پہلے تمام اسٹاف وقارئین کو عید کی گزری ہوئی ساعتیں مبارک ہوں۔ امید ہے اچھی عید گزری ہوگی۔ دفاع پاکستان کے حوالے سے میں اپنے بہادر اور نڈر، جرأت مند فوجی بھائیوں کو نذرانہ عقیدت اور سلام پیش کروں گی جو اپنے سکھ، چین کی قربانی دیتے ہیں۔ اس دفعہ سسپنس کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ دوشیزہ کی کلائیوں کی چوڑیاں اور کانوں کے جھمکے بھی زبردست تھی۔ اس بار فہرست میں نمبرون ساحر ناز لدھیانوی رہے۔ مبارکاں، بہت طویل عرصے کے بعد آپ کو آخر خط لکھنے کا خیال آیا تو آپ نے اتنا ہی طویل تبصرہ لکھ دیا۔ رمضان پاشا کم سے کم لفظوں کا بہترین انتخاب یقیناً آپ سے سیکھنا چاہیے۔ سعدیہ بخاری خط کا آغاز ہی لفظوں کے تیروں سے کیا ہے ہاتھ ہولا رکھو یار! میں آپ کی بات سے ایگری کرتی ہوں کہ ہم نے جسمانی آزادی تو حاصل کرلی لیکن ذہنی طور پر ابھی تک ہم آزاد نہ ہوسکے۔ محمد قدرت اللہ خان نیازی اپنے تبصرے میں سب دوستوں کی ٹانگ کھینچتے نظر آئے۔ ادریس احمد خان آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا، خدا آپ کو اور ہمت حوصلہ اور جرأت عنایت فرمائے۔ تفسیر بھائی، آپ کی تو کیا ہی بات ہے، آپ کے خط کے آگے مجھے کسی اور کا خط کیسے اچھا لگ سکتا ہے۔ تفسیر بھائی، آپ اوکاڑہ کا آواز 105.4FM سنتے ہیں کیا؟ پلیز ضرور بتایئے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔ عمران حیدر بلوچ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے۔ روشنی رشید دو سال کا عرصہ کافی لمبا عرصہ ہے اس دوران آپ کیا کرتی رہیں۔ راشد حبیب تابش، واقعی محبت انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ کترنیں میں محمد قدرت اللہ نیازی، طالب حسین طلحہ، محمد جاوید بلوچ اور تفسیر عباس بابر کی چوائس اچھی لگی۔ محفل شعر وسخن میں احمد حسین عرضی اور محمد شہیر اسامہ سیال کی پسند اچھی لگی۔ کہانیوں میں تعاقب، سلیم انور کی۔ تنویر ریاض کی ہم شکل۔ عائشہ فاطمہ کی قرض مسافت اور نظارت نصر کی فریب کار اچھی کہانیاں تھیں۔ میں معذرت کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ اب ناصر ملک کی مسافر کہانی فی الحال مجھے متاثر نہیں کررہی جیسے اس کی اسٹارٹ میں دو یا تین اقساط تھیں۔ انوار صدیقی کی کشکول میں شیخ حامد کا انجام اب بہت قریب ہے۔ شکر ہے لیاقت حسین اس پنڈت کے جال میں آنے سے بچ گیا۔ عید کا دن ہے۔ مصروفیات زیادہ ہیں۔ جلدی میں بس گندا گندا ہی لکھا گیا ہے۔'' (یہ گندا گندا بھی ہمیں بہت خوب صورت لگا)

✠ ماریہ فاروق، چمن سے محفل میں تشریف لائی ہیں ''اپنا خط نہ پا کر نا امید نہیں ہوئی اسی لیے دوبارہ خط لکھنے کی جسارت کر ڈالی (اور آپ کی کوشش بار آور ثابت ہوئی، خوش آمدید اور آپ کا منفرد انداز بھی ہمیں اچھا لگا کہ آپ نا صرف خط لکھتی ہیں بلکہ اسے ترتیب دینے میں بھی بہت محنت کرتی ہیں) سرگزشت اور سسپنس میرے پسندیدہ رسالے ہیں۔ مرزا امجد بیگ، کاشف زبیر، نجمہ مودی، ڈاکٹر ساجد امجد، ناصر ملک اور انوار صدیقی ہی سسپنس کے شہنشاہ ہیں۔ عمران حیدر بلوچ، ریاض شاہد، حسنین عباس بلوچ، رائے قیصر عباس کھرل ان کے لیے بہت دعا گو ہوں اور رہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور انہیں جیل جیسی زندگی سے نجات دلوائے (آمین) ان سبھوں کے لیے میرا پیغام ہے کہ انہیں بھی اپنی غلطیوں پر سزا ملی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے نئی زندگی کی امنگ پیدا کیجیے۔ میں رمضان کے مبارک مہینے میں آپ سب کے لیے دعا گو ہوں اور دعا گو رہوں گی۔ تمام اہل محفل کو بھی میرا اسلام پہنچے۔ معراج انکل! میری ایک WISH تو پوری کردیں، پلیز کہ سسپنس میں انوار علیگی کا مسکن نامی ناول شائع کروادیں۔ مجھ سے ماہ مئی کا سسپنس مس ہوگیا۔ تاخیر کی وجہ سے میں ماہ مئی کا رسالہ نہیں پاسکی۔ مسافر کہانی کی پوری ایک قسط جو ضائع ہوگئی تو میں نے بھی کہانی آگے نہیں پڑھی۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ ماہ مئی والی قسط شائع کروادیں پوری۔ (اس طرح وہ ہزاروں قارئین جو یہ قسط پڑھ چکے ہیں وہ کیا کریں گے) یا مجھے کوئی ایسا طریقہ بتادیں کہ میں ماہ مئی کا سسپنس پاسکوں (اپنے قریبی بک اسٹال سے رابطہ کریں یا رسالے میں دیے گئے فون نمبر پر بات کریں، آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا) سسپنس میں اگر ملک صفدر حیات، ڈاکٹر ساجد امجد، کاشف زبیر، نجمہ مودی، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی کہانیاں نہ ہوں تو ہر رسالہ کوئی معنی نہیں رکھے گا۔ جس ماہ کے بھی رسالے میں ان حضرات کی کاوشیں ہوں، وہ بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ آخری صفحات کی کہانی پڑھی جو ایک اچھی کہانی ہے۔ کہانیاں اس وجہ سے پوری نہیں پڑھ سکی ہوں کیونکہ پھر خط کے شائع نہ ہونے کا خطرہ ہوگا۔ (یہ بہانہ قابل قبول نہیں ہے) ماہنامہ سرگزشت کا عشق ناکام نمبر آپ لوگوں کی اچھی کوشش تھی۔'' (عشق ناکام نمبر آپ کی طرح ہزاروں قارئین نے بے حد پسند کیا جس پر ہم آپ سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

✠ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل کوٹ لکھپت، لاہور سے تبصرہ کررہے ہیں ''16 اگست کو جب سپیدۂ سحر نمودار ہوتو تب سے ہم انتظار کی کوفت میں جل بھن کر کباب بن رہے تھے۔ ہم جس کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کر چکے ہیں مانا کہ ہمارے اور اس کے سوشل اسٹیٹس میں فرق ہے پھر بھی ہم خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم تو دوست کے ساتھ وابستہ اعلانیہ طور پر ہیں پھر بھی ذاکر انکل اور مدیرہ آنٹی کی مخاصمانہ نظروں کی پروا کیے بغیر اخبار والے کی طرف گئے آخر لمبے انتظار کے بعد دوپہر 2 بجے کے قریب طرح دار حسینہ کی طرح اپنے فل فیشن کے ساتھ نمودار ہوا تو فوراً سے پہلے ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق پر خوب صورت حسینہ۔ نیلی آنکھیں، کانوں میں جھمکے، گلابی ہونٹ، آنکھوں میں ویرانی۔ دائیں پاؤں میں لنگڑاہٹ لیے ہوئے اپنے خوب صورت حسن کے ساتھ جلوہ گر ہورہی تھی۔ ہم آگے بڑھے اور محفل میں آن وارد ہوئے۔ کیوں بھئی حیران کیوں ہیں کیا میں نہیں آسکتا۔ سب سے پہلے پہلی نشست پر ساحر ناز

لدھیانوی اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ بہت نازاں تھے۔ ساحر صاحب اپنی کزن کو بھی اگر ساتھ لے آئے تو...... خیر مبارک ہو آپ کو عینک کی طرح سر آنکھوں پر بٹھالیا ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ آپ کے ذہن کو داد دینی پڑے گی ایسے خیالات سبحان اللہ...... محمد قدرت اللہ نیازی صاحب خانیوال سے، بھئی کیسے ہیں آپ جلدی لکھنے کی کوشش کیا کریں۔ ہمیں کوئی خوشی نہیں ہوتی کسی بھی دن کی، نہ ہی 14 اگست کی اور نہ ہی کسی عید کی کیونکہ جیلوں میں قید دن سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ہم تو ایک بارش کا لطف نہیں اٹھاسکتے باقی باتیں تو بعد کی ہیں (مایوس نہیں ہوتے، اللہ سب بہتر کرے گا) سسپنس ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف اور قارئین کو گزارش کی جاتی ہے کہ وہ دلی طور پر ہماری دوست اجالا کی سالگرہ پر ضرور وش کریں۔ 14 ستمبر کو اجالا کی سالگرہ ہے (بہت مبارک) ان کے بارے میں تھوڑا بہت بتادوں کہ بہت خاموش قاری سسپنس ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصنفہ بھی ہیں۔ ہمایوں سعید راج اپنے راج پر بہت مغرور بیٹھے ہوئے تھے۔ روشنی رشید راولپنڈی سے محفل میں جلوہ گر تھیں۔ روشنی صاحبہ اس دفعہ تعریف نہیں بلکہ دلی طور پر آپ ہمارے دلوں پر چھاگئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب فرمائے۔ رائے قیصر عباس کھرل، جویریہ یاض بٹ، حکیم سید محمد رضا، محمد ہمایوں کے نام محفل میں آنے سے قاصر رہے، چلو آئندہ سہی۔ ابھی کہانیوں میں صرف سلسلہ وار کہانیاں کشکول اور مسافر ہی پڑھی ہیں۔ جو میری فیورٹ کہانیاں ہیں بہت اچھی جارہی ہیں۔ کشکول نارمل طور پر اور مسافر جو ہے وہ ذرا بکھری ہوئی ہے۔ ہم شکل اور قرض مسافت بھی انعامی کہانیاں تھیں۔ آنشہ فاطمہ بہت اچھی قلم کار ہیں۔ باقی سسپنس ہمیں وقت کی پابندی کے ساتھ بیدار کرتا ہے۔ سسپنس سورج کی طرح اپنی کرنیں بکھیرتا ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ اہل کراچی آلودگی کی جو رقم تاریخ کرر ہے ہیں وہ آنے والی نسل کے لیے کسی بھیانک زندگی سے کم نہیں۔ مدیرہ آنٹی میرا ہر دفعہ موڈ چوپٹ کردیتی ہیں اور میرے خط کو کالی لسٹ میں ٹھونس کر ردی کی ٹوکری بھر رہی ہیں۔'' (ارے بھئی کبھی کبھی مجبوری بھی ہوجاتی ہے، ناراض نہ ہوا کریں)

✠ ہمایوں سعید راج، بنوں سے شامل محفل ہیں ''سرورق پہ بجی عید والی لڑکی غیر متاثر کن ہرگز نہیں تھی۔ بس ہاتھوں پر لگی مہندی نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ اداریے میں ستمبر کو ناپسندیدہ قرار دیے جانے کے حق میں موثر دلائل دیے گئے۔ گزشتہ نصف صدی میں ایسا پہلی بار ہوا کہ مجھے صدارتی خط بے حد پسند آیا ہو۔ سعدیہ جی! کیا اس بار بھی عید پر فاسٹ فوڈز کا اسٹال لگانے کا ارادہ ہے جو خط نہیں لکھ پاؤ گی۔ قدرت برادر! ماہا صاحبہ کتنے کروڑ سال کی ہیں جو تمہارے سال خوردہ کیلکولیٹر نے اس کا حساب لگانے سے معذرت کرلی۔ بابر عباس صاحب آپ کے تعریفی ریمارکس ہم نے فریم کروا کے ٹانک دیے دیوار پر۔ طاہر جی آپ نے بن دیکھے اتنا بڑا رسک لے تو لیا ہے لیکن خدانخواستہ اگر بھابی جی ماہا ایمان کی ہم عمر، ہم وزن، ہم قد اور ہم عادات و اطوار نکلیں تو میرا کندھا حاضر ہے۔ ادریس صاحب ہم تمہاری صحت کے لیے مختلف وظائف اور چلے کاٹ رہے ہیں۔ عمران برادر ہماری شدید ترین خواہش ہے کہ آپ آزاد فضاؤں میں سانس لے کر سسپنس کے لیے خط لکھیں۔ روشنی رشید صاحبہ ویلکم بیک...... باوجود اس کے کہ آپ نے صرف بلیک اینڈ وائٹ زمانے کے لوگوں کو یاد کیا۔ عبدالرؤف کی ایک بات مجھے بے تحاشا حیرت میں ڈبوئے رکھتی ہے کہ وہ جب عدم ہیں تو ہمیشہ دستیاب کیسے رہتے ہیں؟ کومل رباب صاحبہ ہماری محفل معراج انکل کے دل کی طرح بہت کشادہ ہے۔ یہاں آنے اور بیٹھنے کے لیے اتنا واویلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی جدائی پڑھی اور حد سے زیادہ پسند آئی۔ مغل جی نے ایک ایک سطر سے دل والوں کے دل کی دھڑکنوں کو زیروزبر کرنے کی کوشش کی۔ کاشف زبیر کی کہانی ایسے شروع ہوئی جیسے بندہ سوتے میں سے اٹھ کر دوڑ لگادے۔ بہرحال اس نے قصوروار کو نہایت شاندار سزا دی۔ مریم کے خان کی کہانی مشرقی انداز لیے ہوئے تھی۔ کسی بھی رشتے کے حوالے سے ایسی شدت مشرق میں ہی پائی جاتی ہے۔ کہانی خوب رہی۔ بیگ صاحب اس دفعہ ایک بے حد غیر دلچسپ کیس لیے حاضر ہوئے۔ دولت کا رشتہ جیسی کرنی ویسی بھرنی کی عملی تفسیر ثابت ہوئی۔ ثمر عباس کی خود گواہی بھی پورے مارکس لے جانے میں کامیاب رہی۔ سارجنٹ مارٹینز کی ذہانت پہ صدقے واری ہونے کو دل چاہا۔ سلیم انور کی تعاقب میں ہمیں دماغ نے فوراً ہی سگنل دے دیا تھا کہ تعاقب کرنے والا جسٹس یا اس کا بھیجا ہوا بندہ ہوگا۔ عائشہ فاطمہ کی قرض مسافت مکافاتِ عمل کی سفاک حقیقت کو اجاگر کرتی یادگار کہانی ثابت ہوئی۔ ستارہ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا کہ طوائف اپنے محبوب کا پیچھا قبر تک نہیں چھوڑتی۔ مسافر میں شہریار بہ دستور اپنی بہن سے دور ہے۔ دوسری طرف میڈیم کی گستاخیاں اور شہرے کی لاچاریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ مختار آزاد کی شامت اعمال سب سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوئی۔ محفل شعر وسخن میں عمران حیدر اور حسنین کے اشعار بے تحاشا وزنی تھے۔''

✠ محمد جاوید بلوچ، علی پور سے ''چچ نامہ چچ چچ چچ سمجھ کر آغاز کیا مگر یہ تو ہمارے وہم وگمان میں نہ تھا چچ کسی راجا کا اسم گرامی ہوگا راجا داہر کی ہمشیرہ سے شادی کے شرمناک فعل کو پڑھ کے چچ چچ یعنی افسوس کرتے رہ گئے۔ گلستان محبت باپ چاہے مشرق کا ہو یا مغرب کا بیٹی پر جب بھی کوئی افتاد پڑی سینہ سپر ہوگیا۔ محترم طاہر جاوید مغل یہ جدائی آتی کیوں ہے؟ آئے تو آئے مگر جدائی میں ہیشگی نہ ہو۔ آہ...... راجا ثاقب دیکھنا ذرا ہماری آہ کی گرما گرم گری سے چیخ کر کلیاں پھول تو نہیں بن گئیں؟ لذت کشید کرنے والے نہنگ، شیخ حامد کی پسپائی اور ناکامیوں کا تسلسل یہی رہا تو کشکول کا مستقبل کیا ہوگا؟ محترم سلیم انور کی کھوج تعاقب میں لہولہو، مخملی ہاتھوں میں سرخ گلاب محبوب کے قدموں میں نچھاور کرنا...... اف کتنی محبت مخفی ہے اس جملے میں۔ مثالی محبتوں، مخالفتوں کا نادر تماشا مریم کے خان کا ترجمہ بھائی پر اثر تحریر ثابت ہوئی۔ اختتام سے قبل دل کو کچو کے دے جانے والی اسٹوری روزن دل میں زاہد نقوی نے صفحہ نمبر 144 پر زبردست موڑ دے کر روزن ذہن پر مسلسل دستک دیتے ہوئے چند کلبلاتے سوالات کا جواب از خود ہی مل گیا۔ روزن دل مختصر کہانیوں میں درجہ اول کی مستحق کاوش ہے۔ دولت کا رشتہ کیا یہ وہی قلم کے دھنی ابوالمنصور ہیں جن کی مارچ 1986ء سسپنس ڈائجسٹ کے آخری صفحات پر زر کا بندہ شائع ہوئی تھی؟ پلوشہ فرام پشاور اگر آپ کو رات کو نیند نہیں آتی تو دن کو سولیا کریں ناں۔ مسافر میں سب کچھ ہے ایکشن، بربریت، بے خود کردینے والا رومانس، مزاح۔ میڈیم شکیلہ کی خود سپردگی، بہادری، شہریار بلوچ کی مظلومیت ومعصومیت، میری سرائیکی زبان کا تڑکا قریشی موڑ اور بصرہ قلندرانی بلوچ جہاں متعدد بار جا بھی چکا ہوں۔ فریب کار کا نہایت مہارت سے تیار کیا گیا قابل دید وتحسین اسکیچ تھا۔ سانپوں کے گھر سے آغاز وانجام پانے والی کہانی مترجم نظارت نصر کی بہترین تلاش تھی۔ قرض مسافت کا خوبصورت اسکیچ دیکھتے ہی عائشہ فاطمہ کی گلے کو خشک کردینے والی کاوش کا موضوع سمجھ گئے۔ بہترین نصیحت وہ ہے جو دوسروں کے حالات سے لی جائے خردمند ... ہمیشہ قرض مسافت جیسی تحریروں اور دوسروں کے حالات سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ بابر عباس آپ دمہ کا نہیں دمہ کی کرتے ہیں۔ دمہ کا تو ہم کرنے

والے ہیں خوبصورت انداز الفاظ کی کشیدہ کاری بوڑھے تخلص کے ساتھ سطح ارتقا پر جلوہ گر کوئی اور نہیں عمار آف کوٹلہ ہیں۔ ساحر ناز یعنی عماد کا ذہن ہے کہ کیسٹریوں کی کھنڈ الفاظ تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ رمضان پاشا آپ نے تو دریا کو لوٹے میں بند کر دیا بہت اچھے بھئی سعدیہ بخارے سے بخاری ہمارے غیاب کی وجہ دراصل وٹامن شی کی شدید کمی تھی۔ اب کافی افاقہ محسوس ہو رہا ہے۔ وٹامن ہی کی شدید کمی کا شکار ہمایوں سعید صاحب، تقاضائے ادب یہ ہے کہ بے ادبی سے احتراز برتا جائے۔ عمران حیدر حسنین بلوچ اور ہمایوں کے گون کے بتائے گئے اسپلینگ چار حرفی جوک سے کم نہیں تھے۔ ایبہ انصاری یہ لڑکیاں سالوں کی مسافت طے کر لینے کے باوجود خود کو بچی کیوں کہلوانا پسند کرتی ہیں؟ نوز ائدہ کومل رباب آپ اتنی موٹی نہیں تو کتنی موٹی ہیں؟ اگر بے حس ادارہ ہمیں پاور آف اٹارنی دے تو سب سے پہلے قارئین کی دیرینہ تمنا کہ لکھاریوں کے انٹرویو شائع کروں۔ روشنی رشید بزم دوستاں میں جب اندھیرا ہو آپ کی یاد آتی ہے۔

✠ **عبدالمالک کیف**، صادق آباد سے ”سب دوستوں اور بہنوں کی خدمت میں زبردستی آداب اور زبردستی محفل میں گھس آنے پہ اور زبردستی سلام عرض کرنے پہ میں شرمندہ۔۔۔ بالکل ہی نہیں۔ کسی کو آگ بگولا ہونے کی ضرورت بھی بالکل نہیں۔ آپ سب کو بتا دوں میں بڑا ڈھیٹ بندہ ہوں جس سے ناتا جوڑ لیا اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور آپ لوگوں کو اگر میرا یوں آنا گوار گزر رہا ہے اور آئندہ بلیک لسٹ کرنے کا ارادہ ہے تو کان کھول کے سن لیں میں پھر آ جاؤں گا اور تب تک آتا رہوں گا جب تک آپ سب کے دل میں اپنی محبتوں کی شمع روشن نہ کر لوں، زبردستی اس لیے کہا کہ محفل میں نیا بھرتی ہوا ہوں تو کسی نے لفٹ ہی نہ کروائی۔ خیر یہ نوک جھوک، تو تو، میں میں، پھر کر لوں گا۔ اب ذرا اپنے آنے کا مقصد بیان کر دوں یہ نہ ہو کہ واقعی کوئی گھاس ہی نہ ڈالے اور ایسا نہ ہو کہ ایسا بھاگوں کہ اپنے شہر سے بھی آگے نکل جاؤں۔ اس لیے بڑے پیار سے، مان سے، ہاتھ باندھ کے ادب کے ساتھ، جنس کے پروانوں، پروانیوں کو سلام عرض۔ سسپنس اور جاسوسی سے پڑھنے کی حد تک لگن رہی تھی جونہی صفحات پلٹنا شروع کیے تو اپنے محبوب مصنف طاہر جاوید مغل کی جدائی پر نظر پڑی۔ محترم طاہر جاوید مغل کی کہانیوں سے، بہت لگاؤ رہا ہے۔ جون ایلیا بے دولتی نے دکھی سا کر دیا، یونہی آپ کے خط میں پہنچے۔ پہلا خط ساحر ناز لدھیانوی کوٹلہ سے، جناب بھی لگتا ہے ہماری طرح نئے ہیں۔ تبصرہ شاندار تھا۔ رمضان پاشا گلشن اقبال کراچی کا چھوٹا سا مگر تبصرہ لکھنے کا انداز بھا گیا۔ تیسرا خط محترمہ سعدیہ بخاری اٹک سے محو گفتگو ہیں۔ بابر عباس، حسنین عباس کمیل عباس کھاریاں سے آئے بہت خوب بھئی، ہمارا سلام بھی قبول کر لیں۔ محمد اسماعیل اجاگر کے خط کے بعد ہمایوں سعید راج بنوں کا تبصرہ پڑھا۔ انداز بیاں اچھا لگا۔ آپ کا نمبر ہم نے بھی نوٹ کر لیا ہے۔ ادریس احمد خان ناظم آباد کراچی بھئی ہم تو آپ کی صحت و تندرستی کے لیے دعا گو ہیں۔ تفسیر عباس بابر اوکاڑہ بہت خوب لکھا۔ روشنی رشید راولپنڈی سے قیدی بھائیوں کے لیے آپ کے جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عمر علی گجرات، بڑی خوش فہمی ہے بھئی اپنے حسن پر۔ راشد حبیب تابش اٹک، آپ کے سٹی میں سسپنس نہیں آتا حیرت ہے ورنہ میرے اپنے قلم کو سسپنس کی طرف موڑنے میں اک وجہ یہ بھی ہے کہ سسپنس دنیا کے ہر کونے میں پڑھا جاتا ہے اور ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے، کومل رباب لاہور، ارے بھئی لائن میں کس طرف ہو نظر تو نہیں آ رہی ہو۔ حسنین عباس بلوچ میرے لیے شناسا چہرہ ہے۔ کہانیوں میں پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی چچ نامہ پڑھی، مزہ آ گیا کہ کس طرح ایک پجاری سچے دل سے ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ لے کر نکلا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اہل سندھ کا راجا بنا دیا۔ اس کے بعد اپنے محبوب مصنف طاہر جاوید مغل کی جدائی میں کھو گئے۔ پاکستان کے سینما گھر اجڑ گئے ہیں جاوید مغل نے ایسا نقشہ کھینچا سینما کے ماحول کا کہ ہمیں بھی وہ زمانہ یاد آ گیا جب ہمارے شہر کے سینما میں بھی رونق ہوا کرتی تھی۔ کاشف زبیر کی مستحق لاجواب کہانی تھی جس نے آخری پیرے تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ عائشہ فاطمہ کی قرض مسافت، واجبی سی لگی۔ رضوانہ ساجد کی حضرت شعیب علیہ السلام کی اسلامی تاریخ کی سچی کہانی خوب رہی، ایسی کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ باقی سلسلے وار کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ رکیے رکیے دومنٹ۔۔۔ اجی ہم اپنی کوئی کہانی بھیجیں تو لگ سکتی ہے؟“ (اگر قابل اشاعت ہو تو۔۔۔)

✠ **محمد حسن نظامی**، قبولہ شریف سے ”تبصروں میں ساحر ناز لدھیانوی رمضان پاشا، سعدیہ بخاری، قدرت اللہ خاں نیازی، حسنین برادرز، محمد اسماعیل اجاگر، ادریس احمد خان، بشیر احمد بھٹی، روشنی رشید وغیرہ بھی اپنے اپنے خوب صورت رنگوں کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ چچ نامہ پہلی تحریر میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب تاریخی اور اسلامی تہذیب کے رنگوں سے مزین اپنی تحریر کے ساتھ منفرد انداز بیاں کی طرف گامزن تھے۔ اس تحریر میں ماضی کا رنگ نمایاں تھا۔ جدائی طاہر جاوید مغل، اپنی تحریر میں جدائیوں، ہجرتوں اور چاہتوں کے بھی رنگ سمیٹے تھے جو ایک ناقابل فراموش تحریر تھی۔ کاشف زبیر، نے مستحق کو سزا خود دے کر اپنا رنگ اجاگر کر دیا اور صحیح معنوں میں یہی تحریر کا اینڈ تھا جس سے پوری کہانی میں جان پڑ گئی۔ کشکول اور مسافر دونوں سلسلے سابقہ کی طرح اپنی روایات اچھے اور خوب صورت رنگوں سے سمیٹے ہوئے تھے۔ مریم کے خاں، بھائی کا انمول اور منفرد رشتہ لیے اپنے بے پایاں رنگ میں جلوہ گر تھیں۔ یہ رشتہ ایسا منفرد اور پکا ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے قطعی نہیں توڑ سکتی۔ پس منظر میں مرزا صاحب، اپنے روایتی انداز میں قانون کے ہتھیاروں سے آراستہ سبھی رنگ سمیٹے رونما تھے اگر وہ اپنے دلائل کی روشنی میں اچھا برا اور جھوٹ سچ ثابت نہ کرتے تو شاید ان کے موکل کی ڈھتھ ہی ہو جاتی۔ زاہد نقوی اپنے انداز تحریر میں محبتوں کے سبھی رنگ سمیٹے جلوہ گر تھے جو اپنے عنوان کے منفرد اور خوب صورت لفظوں پر مبنی تحریر تھی۔ فریب کار! نظارت نصر، بہت باریک بینی سے دوستی جیسے لازوال اور بے مثال رنگوں سے پردہ اٹھا رہی تھیں مگر لنڈا گڈ نے آخر میں جسٹس کو سزا دی اور سبھی سانپوں کو دور کرتے ہوئے جارڈن کا ہاتھ تھام لیا۔ رضوانہ ساجد اپنی سبھی روایتوں کو برقرار رکھے ہوئے ایمان افروز مضمون حضرت شعیبؑ کے سنگ جلوہ گر تھیں جو اپنی نوعیت کا اچھا، معیاری اور منفرد سلسلہ ہے۔ بقیہ سسپنس کے تراشے، لطیفے اور معلومات پرچے کی جان تھے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ریاض بٹ، حسن ابدال۔ احمد حسن رضی، قبولہ شریف۔ این ایس آر مدثر کراچی۔ احتشام احسان، صفدر آباد۔ محمد افتخار جوئیہ، گورکھ سنگھ۔ محمد طارق کامرہ، عامر اقبال کاکی، نور پور تھل۔ محمد رمضان، حسرت الحسنی، نور پور تھل۔ محمد حسن نظامی، قبولہ شریف۔ عمران حیدر بلوچ، سرگودھا جیل۔ قیصر عباس کھرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ احسان سحر، زاوے خیلانوالہ، میانوالی۔ ساجد راجا، ہندواں سرگودھا۔

فاتح

ڈاکٹر ساجد امجد

بے رحم وقت نے ہمیشہ اپنی بساط پر بہت عجیب چالیں چلی ہیں... یہ اور بات کہ اس کے چال چلن کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ جیسے زیرِ نظر اس تحریر میں... جس لختِ جگر کی پیدائش کو باپ نے اپنے لیے منحوس قرار دیا، بالآخر وہی صلیبی جنگوں کا ہیرو بن کر تاریخ کے اوراق پر آج بھی زندہ ہے... بہ ظاہر صلیبی جنگوں کی بنیاد عیسائی عقیدے کو قرار دیا جاتا ہے مگر درحقیقت اس نظریے کی آگ پر مال و دولت کے لالچ نے ایسا تیل چھڑکا کہ عیسایت کی تعلیمات مفلسی کے ہاتھوں پسِ پشت چلی گئیں کیونکہ مشرق کی خوش حالی مغرب کی افلاس زدہ قوم کو منظور نہ تھی۔ ان جنگوں میں تاریخ کے مطابق چالیس ہزار مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کرکے یروشلم پر قبضہ کرلیا گیا... وقت کے قدموں نے پھر جنبش کی اور وہی منحوس بچہ جب سلطان صلاح الدین ایوبی کے پیراہن میں سامنے آیا تو اس کی دانش نے جنگی بساط کو ہر مقام پر پلٹ کر رکھ دیا... اور پھر خاموشی کی چادر نے زبان پر چپ کی مہر لگا دی۔ وقت نے اپنا چولا بدلا اور صلاح الدین ایوبی کے پیروں تلے فتح و کامیابی کی راہ بن کر بچھ گیا... سلطان نے بھی مقصد برآری کے لیے عقل و شعور کی منازل طے کرتے ہوئے ایسا چلن اختیار کیا کہ دشمن کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں کیونکہ اس بار مقدر مسلمانوں پر مہربان تھا... اور تاریخ مسلمانوں کے کارناموں کو رقم کرنے کے لیے بے چین...

قلعہ کرتب (عراق) کا حاکم نجم الدین ایوب اپنے محل کے ایک کمرے میں پریشانی کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ملازموں نے شمع دان روشن کر دیے تھے لیکن اندھیرا پھر بھی دور نہیں ہوا تھا۔ نجم الدین نے کمرے میں رکھی قیمتی اشیا کی طرف دیکھا۔ چند ہی روز میں وہ ان چیزوں سے دور جانے والا تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر چھت کی طرف گھورنے لگا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک کنیز تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس عجلت میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ مالک کے سامنے ادب سے حاضر ہوتے ہیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی پھولی ہوئی سانس پر قابو پایا اور بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔

''امیر محترم! آپ کو زنان خانے میں طلب کیا جا رہا ہے۔ چھوٹے امیر کے کان میں اذان دیجیے۔''

وہ تو یہ سمجھ کر بھاگی چلی آئی تھی کہ حاکم کی جانب سے انعام کی حق دار ٹھہرے گی لیکن جواب یہ ملے گا، اس کی توقع بھی نہیں کرسکتی تھی۔

''ہماری بیگم سے کہو، یہ بچہ منحوس ہے۔ ہمیں اس کی شکل دیکھنے کی جلدی نہیں۔''

کنیز ایسا بے تکا جواب سن کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھر حاکم کی ذہنی حالت پر شک کرتے ہوئے الٹے قدموں لوٹ گئی۔

نجم الدین کی بیوی زبیدہ کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ اس کا شوہر ابھی کمرے میں داخل ہوگا اور اس کی خیریت دریافت کرے گا، بچے کو گود میں اٹھائے گا، اس کے کان میں اذان دے گا اور اس کا کوئی اچھا سا نام تجویز کرے گا۔ ان خیالات نے اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بکھیر دیا تھا۔

اس نے دیکھا کنیز اندر داخل ہوئی۔ اگر نجم الدین آئے ہوتے تو کنیز ان کے پیچھے ہوتی۔ دروازے پر پہلے داخل ہونے کی جرأت کیسے کرسکتی تھی۔

''کیا بات ہے، تو اکیلی چلی آرہی ہے۔ تیرے چہرے پر وہ خوشی بھی نہیں جو یہاں سے جاتے وقت تھی؟''

''آقا اپنے بیٹے کی پیدائش سے خوش نہیں ہیں۔''

''خوش نہیں ہیں؟''

''ہاں۔ جب میں نے یہ خوش خبری سنائی تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔''

''تو نے غلط سنا ہوگا یا پھر وہ کچھ اور سمجھے ہوں گے۔ جا پھر جا کر بتا اور یہ بھی کہہ کہ میں انہیں یاد کر رہی ہوں۔''

کنیز کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اسے تو تعمیل حکم کرنی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر گئی۔ نجم الدین بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ کنیز نے دو مرتبہ اسے مخاطب کیا لیکن وہ جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ کنیز اس طرح پیچھے ہٹی کہ قدموں کی آواز تک نہ ہوا اور دوسرے کمرے میں زبیدہ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

''کیا کہتے ہیں تیرے آقا؟''

''اس مرتبہ تو انہوں نے میری بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔''

''کیا ماجرا ہے۔ وہ کس پریشانی میں ہیں۔'' زبیدہ نے اپنے آپ سے کہا اور پھر کنیز سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے سہارا دے کر ذرا اٹھا تو سہی۔ میں خود جا کر دیکھتی ہوں۔''

کنیز اسے سہارا دے کر اٹھا ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''شاید وہ آگئے۔'' زبیدہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

زبیدہ کی امید نے اس وقت ساتھ چھوڑ دیا جب نجم الدین نہیں، اس کا چھوٹا بھائی اسدالدین شیرکوہ مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''بھابی جان، بیٹے کی پیدائش مبارک ہو۔'' یہ کلمات تحسین اس نے دروازے میں داخل ہوتے ہی ادا کیے تھے لیکن جب وہ زبیدہ کے بستر کے قریب آیا تو اس نے زبیدہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو دیکھے۔

''بھابی جان، اس خوشی کے موقعے پر آپ کی آنکھوں میں آنسو! میں انہیں کیا نام دوں۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں یا کوئی اور بات ہوئی ہے؟''

''آپ کے بھائی کو بیٹے کی پیدائش سے خوشی نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے پیغام بھجوایا ہے کہ وہ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کی شکل دیکھنا انہیں گوارا نہیں۔''

''یہ منحوس خبر کس ذریعے سے آپ تک پہنچی ہے؟''

''میں نے کچھ دیر قبل اپنی کنیز کو ان کے پاس بھیجا تھا۔'' زبیدہ نے نقاہت بھری آواز میں کہا اور دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی۔

اسدالدین شیرکوہ، زبیدہ کے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کی طرف جھک گیا۔ پھر اسے گود میں اٹھالیا۔

''یہ تو ہمارے گھر میں یوسف پیدا ہوا ہے۔''

''تمہارے بھائی تو اسے منحوس کہہ رہے ہیں۔''

''اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے، میں جا کر دیکھتا ہوں۔'' اسدالدین شیرکوہ نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

وہ نجم الدین کے کمرے میں پہنچا تو نجم الدین کو واقعی پریشان دیکھا۔

''آؤ شیرکوہ، میں تمہیں بلانے ہی والا تھا۔ شاید تم میری پریشانی کا علاج بن جاؤ۔''

''میں تو ایک خبر کی تصدیق کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ خیر آپ سنایے کیا پریشانی ہے شاید میرے پاس اس کا کوئی حل ہو۔''

''مجھے حاکم اعلیٰ مجاہد الدین کا حکم نامہ موصول ہوا ہے۔ اس کے مطابق مجھے قلعہ داری کے منصب سے معزول کردیا گیا ہے۔ یہ حکم بھی ملا ہے کہ چھ دن کے اندر اندر اپنے اہل خانہ کو لے کر صوبۂ تکریت کی حدود سے باہر نکل جاؤں۔ میری خدمات کا یہ صلہ ملا ہے مجھے۔''

''برادر محترم! گستاخی معاف، اتنی سی بات پر اتنے پریشان ہوگئے کہ اپنی اولاد کو منحوس کہہ بیٹھے۔''

''تو اور کیا کہوں۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی میرا اعزاز مجھ سے چھن گیا۔ اب مجھے محل چھوڑ کر خانہ بدوشی کی زندگی گزارنی ہوگی اور یاد رکھو، تم بھی میرے اہل خانہ میں شامل ہو۔''

''مجھے معلوم ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی بچہ منحوس نہیں ہوتا۔ اس پریشانی کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ ہم کہیں بھی چلے جائیں گے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ فی الوقت تو بھابی جان کی خیریت دریافت کیجیے اور اپنے بچے کے کان میں اذان دیجیے۔''

''میں اپنی معزولی کا سبب اسی بچے کو سمجھتا ہوں۔ مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں اسے اپنی اولاد کہوں گا۔''

شیرکوہ اپنے بھائی کا ادب بھی کرتا تھا اور اس سے ڈرتا بھی تھا۔ اس نے اس وقت بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اٹھ کر بھاوج کے کمرے میں آگیا۔ بچے کو اٹھایا اور اس کے کانوں میں اذان دی۔

''اسے یوسف کہہ کر پکارنا۔ یہ نام اس پر خوب سجے گا۔''

زبیدہ نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ نجم الدین بچے کو دیکھنے کیوں نہیں آئے لیکن شیرکوہ کسی جواب کے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔

یہی بچہ ''یوسف'' صلاح الدین ایوبی تھا جو صلیبی

جنگوں کا ہیرو بن کر تاریخ میں اب بھی زندہ ہے۔

☙☙☙

پانچ دن گزر گئے تھے۔ حاکم اعلیٰ کی طرف سے دی گئی مدت میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا اور ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا تھا کہ جنت بے نظیر سے نکل کر کس ویرانے کا رخ کیا جائے۔ کس کی پناہ لی جائے۔ اندازہ یہی تھا کہ حاکم اعلیٰ کے معزول کردہ منصب دار کو پناہ دے کر کوئی بھی حاکم اعلیٰ کی دشمنی مول نہیں لے گا۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا جارہا تھا۔ نجم الدین ایوب جس بدحواسی میں مبتلا تھا، اب اسدالدین شیرکوہ بھی اسی گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

دونوں بھائی اپنے اپنے خیالوں میں گم اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے۔ یہ تقریباً طے ہوچکا تھا کہ منزل کے تعین کے بغیر سفر کا آغاز کردیا جائے، جو ویرانہ پاؤں پکڑ لے گا وہیں بیٹھ جائیں گے۔ اچانک شیرکوہ کے دل میں کوئی خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا۔ نجم الدین اس کی اس بے چینی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''برادر معظم! خدا نے شاید ہماری سن لی۔''

''ایسا کیا ہوگیا شیرکوہ؟''

''آپ کو زنگی حکومت کا بانی عمادالدین زنگی یاد ہے؟''

''صلیبیوں سے اس کی جنگیں آج بچے بچے کی زبان پر ہیں۔''

''آپ ذرا وہ واقعہ بھی یاد کیجیے جب آج سے چھ سال پہلے وہ مجاہد عراق میں شکست کھا کر فرار ہوا تھا۔ اس کا تعاقب کیا جارہا تھا اور اس کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ اس مشکل وقت میں آپ نے قلعۂ تکریت کے دروازے اس پر کھول دیے تھے۔ اسے پناہ دی تھی۔''

''میرے بھائی، مجھے سب کچھ یاد آگیا۔''

''عمادالدین نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو......؟''

''آج عمادالدین کی جگہ آپ کھڑے ہیں۔ آپ کو پناہ کی تلاش ہے۔ عمادالدین زنگی ایک بہادر سردار ہے۔ احسان یاد رکھنا بہادروں کا شیوہ ہوتا ہے۔ کیوں نا ہم ''موصل'' پہنچ کر اس سے ملاقات کریں۔''

''حکمرانی کے غرور نے اس کا حافظہ کمزور نہ کر دیا ہو۔''

"اس کے ظرف کو آزمایا تو جائے۔ اللہ کوئی اور سبیل نکالے گا۔"

اب اتنا وقت نہیں تھا کہ مزید سوچا جاتا یا نامہ و پیام کے ذریعے عماد الدین زنگی سے اس کی رائے طلب کی جاتی۔

☆☆☆

صلیبی جنگوں کے بارے میں اکثر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ جنگیں عیسائی عقیدے کی بنیاد پر لڑی گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کی آگ پر مال و دولت کے لالچ نے مزید تیل چھڑکا۔ اس وقت کے مغرب میں آج کے برعکس غربت، افلاس کا دور دورہ تھا جبکہ مشرق میں خوش حالی کا دور تھا۔ بالخصوص مسلم معاشرہ اپنے بہترین دور سے گزر رہا تھا۔ اس ممتاز فرق نے یورپ اور خاص طور پر چرچ سے وابستہ افراد کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ دولت کے اس لالچ نے عیسائیت کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا اور مذہب کو بنیاد بنا کر دنیاوی جنگوں کا آغاز کر دیا گیا۔

مذہبی جماعت کے تین سو ممبر "پوپ" کی قیادت میں جمع ہوئے۔ عیسائیت کے جنگ مخالف نظریات کا طوق اتار پھینکا گیا۔

یروشلم چونکہ مسلمانوں کے قبضے میں تھا اس لیے ان جنگوں کی بنیاد انہی علاقوں کو بنایا گیا۔ عیسائیوں کو ترک مسلمانوں اور عربوں کے خلاف ابھارا گیا۔ عیسائیوں سے کہا گیا کہ مسلمان مقدس سفر پر جانے والوں پر حملے کر رہے ہیں اور عیسائیوں کی مقدس جگہوں کی تذلیل کر رہے ہیں حالانکہ یہ جھوٹ تھا۔ بیت المقدس مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی محترم تھا جتنا عیسائیوں کے لیے۔ مسلمان اس کی تذلیل کیسے کر سکتے تھے۔

اس پروپیگنڈے کا جلد ہی شدید ردعمل ہوا۔ قلیل مدت میں ایک بہت بڑی صلیبی فوج تیار ہو گئی۔ 1096ء کے موسم گرما میں صلیبیوں کا یہ ہجوم تین مختلف ٹولیوں میں روانہ ہوا۔ ان میں سے ہر ٹولی کو قسطنطنیہ پہنچ کر آپس میں مل جانا تھا۔

جب تمام ڈیوک، بشپ، شہزادے، امرا اور عام لوگ اس مقدس جنگ کے لیے جمع ہو کر آگے بڑھے تو بربریت کا ایک طوفان تھا جو برپا ہوا۔ بستیوں کو روندتے، آگ لگاتے اور لاتعداد مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے یہ صلیبی آخرکار 1099ء میں یروشلم پہنچ گئے اور تقریباً پانچ ہفتوں کے محاصرے کے بعد شہر فتح ہو گیا۔

جب صلیبی فاتح کی حیثیت سے یروشلم میں داخل ہوئے تو عورت اور مرد کا امتیاز کیے بغیر مسلمانوں کو تلوار کی نوک پر لٹکا دیا۔ ہر وہ چیز لوٹ لی جو ان کے ہاتھ آ سکتی تھی۔ مسجدوں کے صحن خون سے بھر گئے۔ سارا شہر آگ کے شعلوں میں نہا گیا۔ جو لوگ عمارتوں میں تھے، زندہ جل گئے۔ ایک تاریخی ماخذ کے مطابق چالیس ہزار مسلمان بے رحمی سے قتل کر دیے گئے۔ ایک مورخ نے ستر ہزار بھی لکھا ہے۔

یہ شہر حضرت عمر فاروق ؓ کے عہد میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا اور اب یہاں صلیبیوں نے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جس بیت المقدس کو 16ھ میں انسانی خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر فتح کیا تھا اسی متاع عزیز کو تقریباً پانچ سو سال بعد گنوا دیا گیا۔

مسلمانوں نے یہ ذلت گوارا کر لی تھی لیکن القدس کے چھن جانے پر نوحہ کناں تھے۔ وہ منتظر تھے کہ کب قسمت یاوری کرے اور وہ یروشلم پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرائیں۔

صلیبیوں کی چیرہ دستیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں۔ اب مسلمانوں کو ایک ایسے مرد مجاہد کی ضرورت تھی جو اتحاد و قیادت کے عناصر فراہم کر کے عالم اسلام کا دفاع کر سکے۔ بہت جلد مسلمانوں کو ایسا مرد مجاہد عماد الدین زنگی کی ذات میں مل گیا۔

نجم الدین ایوب اپنے اہل خاندان کو لے کر، جس میں صلاح الدین ایوبی بھی تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف سات دن تھی، اسی عماد الدین زنگی کی خدمت میں جا رہا تھا۔ قدرت عجیب انتظام کرنے والی تھی۔ صلاح الدین ایوبی کو عماد الدین زنگی کے دربار میں پہنچا رہی تھی کیونکہ آئندہ چل کر عماد الدین کے مشن کو اسی صلاح الدین ایوبی کو مکمل کرنا تھا۔ کھویا ہوا یروشلم اسی کے ہاتھوں ملنا تھا۔

☆☆☆

لیمو اور سفیدے کے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس لٹے پٹے، تھکے ہارے قافلے کو لوگوں نے غور سے دیکھا۔ اس قافلے کے ساتھ گھوڑے تو نہایت اعلیٰ نسل کے تھے لیکن ان گھوڑوں پر بیٹھنے والوں کے چہروں پر وہ شادابی نہیں تھی جو عموماً سیر و سیاحت کے لیے نکلنے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ موصل کے رہنے والے حیران تھے کہ یہ کون بدنصیب ہیں جو شہر میں وارد ہوئے ہیں۔

یہ لوگ جب عماد الدین زنگی کے محل کی طرف بڑھنے لگے تو اس قافلے کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوا۔ پھر یہ بات کسی نہ کسی طرح پھیلنے لگی کہ آنے والا صوبہ تکریت کا قلعہ دار نجم

الدین ایوب ہے۔ وہ اس حال میں یہاں کیوں پہنچا ہے، یہ بات البتہ ابھی راز میں تھی۔

عماد الدین زنگی کا دربار سجا ہوا تھا۔ زنگی تخت پر متمکن تھا۔ مقربین اور وزرا صف بہ صف اپنے اپنے عہدے اور مراتب کے مطابق بیٹھے ہوئے تھے کہ حاجب نے نجم الدین کی آمد کی اطلاع دی۔ سات سال پہلے کی بات تھی، یہ نام اس کے ذہن سے نکل بھی چکا تھا لیکن قلعہ تکریت کا نام آتے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ دونوں بھائیوں کو نہایت احترام کے ساتھ اندر لایا جائے۔ دل میں سوچ بھی رہا تھا کہ ایسی کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ میرے محل پر دستک دینے پر مجبور ہوا ہے۔

نجم الدین اور شیرکوہ جیسے ہی داخل دربار ہوئے، زنگی حکمراں نے ان کے استقبال کے لیے تخت سے نیچے قدم رکھ دیا۔ اس کے دونوں بازو معانقے کے لیے کشادہ تھے۔

"خوش آمدید، خوش آمدید۔ ہم دونوں بھائی کتنے سال بعد مل رہے ہیں۔"

نجم الدین کو قطعی امید نہیں تھی کہ اس کی پذیرائی اس انداز سے ہو گی۔ جتنی دیر میں وہ اپنے جذبات پر قابو پاتا، عماد الدین اسے وزرا کی صف میں کرسی پر بٹھا چکا تھا۔ اس کے ساتھ آئی ہوئی خواتین پہلے ہی مہمان خانے میں پہنچائی جا چکی تھیں۔

"میرے بھائی نجم الدین، آپ کا چہرہ مجھے جو کچھ بتا رہا ہے، میں چاہتا ہوں آپ کی زبانی سنوں۔ اگر آپ سر دربار نہ بتانا چاہیں تو ہم خلوت میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔"

"میں چاہوں گا کہ جو مجھ پر گزری وہ نہ صرف آپ کے گوش گزار ہو بلکہ آپ کے وزرا بھی سن لیں تاکہ انہیں بھی معلوم ہو کہ ہم مسلمان کس نااتفاقی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ عیسائی ہماری جڑیں اکھاڑ پھینکنے کے درپے ہیں اور ہم مسلمان آپس ہی میں ایک دوسرے کے گلا کاٹنے پر بضد ہیں۔

میں ایک دن تیر اندازی کر رہا تھا۔ میں نے کمان سے تیر چھوڑا تھا کہ ایک عیسائی سامنے آ گیا اور تیر اس کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مرنے والا عیسائی تکریت کے حاکم اعلیٰ مجاہد الدین بہروز کا غلام تھا۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب بہروز نے مجھے طلب کیا اور مجھ پر اپنے عیسائی غلام کے قتل کا الزام عائد کیا حالانکہ یہ محض اتفاق تھا۔ میری معذرت، میری صفائی سب بے کار گئی اور مجھے حکم دے دیا گیا کہ میں چھ دن کے اندر اندر تکریت سے کہیں دور چلا جاؤں۔

امیر محترم! عیسائی بے قصور مسلمانوں کے گلے کاٹ رہے ہیں اور ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ حاکم اعلیٰ نے مسلمان ہوتے ہوئے میری خدمات کو نظرانداز کیا اور میری دربدری کے احکام صادر کر دیے۔ اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔ آپ کے جواب کا منتظر ہوں ورنہ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔"

نجم الدین کی اس تقریر نے سب کو اداس کر دیا۔ خود عماد الدین زنگی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نجم الدین ایوب کو مخاطب کیا۔

"میرے بھائی! میں اس احسان کو نہیں بھولا ہوں جو کبھی آپ نے مجھ پر کیا تھا۔ اگر آپ نے اس وقت مجھے پناہ نہ دی ہوتی تو دریائے دجلہ مجھے نگل چکا ہوتا۔ آپ نے مجھے زندگی دی تھی تو کیا میں آپ کو پناہ نہیں دے سکتا؟

میرے بھائی! آج میرے پاس اتنی طاقت ہے کہ میں تکریت کے حاکم پر چڑھائی کر کے آپ کی تذلیل کا بدلہ لے سکتا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کی تلوار مسلمانوں کے خلاف اٹھے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ جب تک چاہیں اطمینان و فراغت کے ساتھ موصل میں رہیں۔ عیسائیوں کے خلاف جہاد میں میرا سہارا بنیں۔"

تمام اہل دربار نے اپنے امیر کی تائید کی۔

دوسرے دن سلطان نے نجم الدین ایوب اور شیرکوہ کو اپنے مقربین میں شامل کیا۔ رہنے کے لیے عالی شان محل دیا۔ خاندان ایوبی کی بدبختی رخصت ہو گئی۔ وہی بچہ جسے نجم الدین منحوس کہتا رہا تھا، اس کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

اب مستقبل کا صلاح الدین ایوبی موصل کے عالی شان محل میں پرورش پا رہا تھا۔

☆☆☆

یروشلم پر قابض ہوتے ہی عیسائیوں نے کئی ریاستیں قائم کر لی تھیں جو مسلمانوں کے لیے ہر وقت خطرے کا باعث بنی رہتی تھیں۔ یروشلم کی دوبارہ فتح مسلمانوں کا خواب تھا لیکن اس فتح سے پہلے ان ریاستوں سے نمٹنا ضروری تھا جو اب نہایت طاقتور ہو گئی تھیں۔ ان ریاستوں میں ایک "ایڈیسہ" بھی تھی جس پر جوسلن ثانی حکومت کر رہا تھا جو مذہبی عصبیت میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا۔ مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

اس ریاست کو مذہبی تقدس کے اعتبار سے عیسائی دنیا میں پانچواں درجہ حاصل تھا۔ صلیبیوں نے یہاں زبردست

طاقت جمع کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اسے شاہ یروشلم کی حمایت بھی حاصل تھی۔

یہ ریاست چونکہ موصل، بغداد، دیار بکر اور دوسرے نواحی مسلم علاقوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی اسی لیے مسلم حکمران اس پر بار بار حملے کرتے رہے تھے لیکن فتح مقدر میں نہیں تھی۔

عمادالدین موصل اور دمشق میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد ایڈیسہ کی طرف متوجہ ہوا۔

جوسلن کا خوف ایسا طاری تھا کہ عمادالدین کے مشیر اسے اس جنگ سے باز رہنے کے مشورے دے رہے تھے۔ جنگ سے پہلے ہی ان کے چہروں سے شکست کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

''جو خبریں ہم تک پہنچی ہیں وہ تو یہ بتاتی ہیں کہ جوسلن کے پاس بے پناہ طاقت جمع ہو گئی ہے۔ شاہ یروشلم بھی اس کی پشت پر ہے۔ ہم اس وقت اس سے مقابلہ کر کے دانش مندی نہیں کریں گے۔ ہمیں تو اپنے دفاع کی فکر کرنی چاہیے۔''

عمادالدین نے ان مشوروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اپنے وزیروں کو سمجھا بجھا کر اس جنگ کے لیے آمادہ کرلیا۔

نجم الدین ایوب اور اسدالدین شیرکوہ تو موقعے کی تلاش میں تھے کہ کب وقت آئے اور وہ سلطان کے احسانات کا بدلہ چکانے کے قابل ہوں۔ انہوں نے عمادالدین کا ساتھ دینے کی ہامی بھری اور اس جہاد میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

اس وقت مستقبل کے سلطان صلاح الدین کی عمر سات سال تھی۔ وہ اس وقت جہاد کا مطلب بھی نہیں سمجھتا ہوگا۔ وہ تو صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے باپ اور چچا جنگ پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

عمادالدین آندھی طوفان کی طرح ایڈیسہ کی صلیبی ریاست کے سرحدی قلعوں کو روندتا ہوا ایڈیسہ کی دیواروں کے نیچے جا پہنچا۔

جوسلن کو اس کی آمد کی خبر اتنی دیر میں ہوئی کہ باہر نکل کر مقابلے کا وقت نکل چکا تھا۔ جوسلن نے اسی میں عافیت سمجھی کہ قلعہ بند ہو جائے اور عمادالدین کے ضبط کا امتحان لے۔ اسے معلوم تھا کہ قلعے کی سنگی دیواریں اتنی مضبوط ہیں کہ مسلمان سر ٹکرا کر واپس ہو جائیں گے۔ سامان رسد بھی اتنا موجود تھا کہ محاصرے کی طوالت کا بہ آسانی مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

قلعے کی مضبوطی کا احوال عمادالدین سے بھی پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دن تک صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے آخری حجت پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا طریقۂ جنگ بھی یہی تھا کہ وہ دشمن کو ہتھیار پھینکنے کا موقع دیا کرتا تھا اور اس وقت تو نہایت مضبوط قلعہ اس کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

اس نے نجم الدین ایوب کو خلوت میں طلب کیا۔

''میں چاہتا ہوں جوسلن کے پاس ایک خط روانہ کروں جس میں اسے ہتھیار ڈالنے کی ترغیب دوں۔''

''سلطان کا خیال بالکل درست ہے، کسی خونریزی کے بغیر اگر مطلب نکل آئے تو کیا برائی ہے۔''

''میرے بھائی، میں چاہتا ہوں یہ خط لے کر آپ اس کے پاس جائیں۔''

''یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا۔''

''میرے بھائی، مجھے عیسائیوں سے ایفائے عہد کی امید نہیں۔ وہ بہت جلد اخلاق سے گر جاتے ہیں۔ ان کے درباروں میں قاصدوں سے تحقیر آمیز سلوک بھی دیکھا گیا ہے۔ بس یہ سوچ کر تذبذب میں ہوں۔''

''امیر محترم! آپ نے مجھے اتنی عزت دی ہے کہ کوئی ذلت اس کا اثر زائل نہیں کر سکتی۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کر کے سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ وہ خط مجھے دیجیے تاکہ میں جوسلن تک اسے پہنچاؤں۔''

نجم الدین نے وہ خط لے کر اپنی پگڑی کی تہوں میں چھپایا۔ سیاہ کوتل گھوڑے پر سوار ہوا اور سفید پرچم لہراتا ہوا لشکر سے نکل گیا۔ قلعے کے دروازے اس پر کھل گئے۔

''مجھے جوسلن کے پاس لے چلو۔''

''تم کوئی ہتھیار لے کر نہیں جاؤ گے۔''

''مجھے معلوم تھا کہ میں ایک بزدل قوم کے لوگوں کے پاس جا رہا ہوں اس لیے کوئی ہتھیار ساتھ نہیں لایا ہوں۔''

''عجیب بے وقوف آدمی ہو۔ نہتے چلے آئے، اگر ہم تمہیں قتل کر دیں؟''

''اس فائدے سے محروم رہو گے جو تمہارے بادشاہ سے میری ملاقات کے بعد تمہیں پہنچ سکتا ہے۔''

''کیا صلح کا پیغام لے آئے؟'' ان میں سے کئی نے قہقہے بلند کیے۔

''یہی سمجھ لو۔''

''ہمیں پہلے ہی معلوم تھا۔ یہ قلعہ ایسا نہیں جسے تم فتح

کر سکو۔'' قہقہے پھر بلند ہوئے۔

یہ پہرے دار اتنے بے وقوف تھے کہ یہ بھی نہ سمجھے کہ جنگ ہی نہیں ہوئی تو صلح کیسی۔ شاید یہ ان کی خواہش تھی کہ جنگ نہ ہو۔ بہرحال انہوں نے نجم الدین کو جوسلن کے دربار میں پہنچا دیا۔

جوسلن ثانی قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ایک بڑے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے معتمد وزرا اس کے اردگرد بیٹھے تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔

نجم الدین ایوب، جوسلن ثانی کے تخت کے قریب پہنچے اور اپنی پگڑی کی تہوں سے سلطان زنگی کا خط نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''میرے امیر کا خط آپ کے نام۔''

''وہ خط ہی بھیج سکتا ہے، خود تو یہاں آنے سے رہا۔'' جوسلن نے کہا اور خط اپنے وزیر فریڈرک کی طرف بڑھا دیا۔

فریڈرک نے اس خط کو پڑھنا شروع کیا۔

''تم نے قلعے کی دیواروں سے دیکھ لیا ہوگا۔ ہم تمہارے سرحدی قلعوں کو مسمار کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں۔ اگر اپنے شہریوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی پروا ہے تو ہتھیار پھینک کر قلعہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم ضمانت دیتے ہیں کہ عیسائیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اگر تم نہ مانے تو پھر فیصلہ تلوار سے ہوگا۔''

خط کا متن سنتے ہی جوسلن آگ بگولہ ہو گیا۔ اس موقعے پر اس نے عجیب حرکت کی۔ فریڈرک کے ہاتھ سے خط چھینا اور پرزے پرزے کر دیا۔

''اپنے سلطان کو بتا دینا کہ میں نے اس کے خط کا جواب دے دیا ہے۔''

جوسلن کی یہ حرکت دیکھ کر نجم الدین ایوب کو اسلامی تاریخ کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب پیغمبر اسلام ﷺ کا خط مبارک لے کر اسلامی سفیر (حضرت عبداللہ بن قدافہ) ایرانی بادشاہ خسرو کے دربار میں گیا تھا۔ ایرانی شہنشاہ نے صحابی رسول ﷺ کو نظر حقارت سے دیکھا تھا۔ پھر اسی حقارت سے خسرو پرویز نے نامہ رسول ﷺ کو چاک کر دیا تھا۔

اس ناکام سفارت کے بعد سرور کونین ﷺ نے فرمایا تھا۔

''خسرو نے میرا خط چاک نہیں کیا، اپنی حکومت کے ٹکڑے کر دیے۔''

نجم الدین نے بے بسی سے اپنے سلطان کے خط کو پرزے پرزے ہوتے ہوئے دیکھا اور جوسلن کے دربار سے نکل آیا۔ سلطان زنگی کے قدموں میں پہنچا اور تمام روداد سنائی۔

''میرا رب گواہ ہے کہ میں نے اپنی سی کوشش کر لی۔ اب اگر جنگ ہے تو جنگ سہی۔''

عمادالدین صرف اتنا کہہ سکا اور نجم الدین کو جانے کی اجازت دے دی۔

دوسرے دن نماز فجر کے بعد عمادالدین نے اپنے سپاہیوں کو قلعے کی فصیل پر مختلف اطراف سے حملہ کرنے کے احکام صادر کر دیے۔

فصیل میں شگاف ڈالنا مقصود تھا۔ اس لیے منجنیقوں سے سنگ باری کی جانے لگی۔ دیوار اتنی مضبوط تھی کہ بڑے بڑے پتھر ٹکرا کر واپس آ جاتے تھے۔ پورے دن پتھر برستے رہے، ایک دراڑ بھی نہ پڑ سکی۔

دن پر دن گزرتے جا رہے تھے۔ سپاہیوں کے حوصلے جواب دینے لگے تھے۔ عمادالدین کی تقریریں تھیں جو ان کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں ورنہ وہ ناامید ہو چلے تھے۔

اٹھائیس دن کی مسلسل سنگ باری کے بعد فصیل میں شگاف پڑ گئے۔ بپھرے ہوئے سپاہی ان شگافوں کے ذریعے شہر میں داخل ہو گئے۔ جوسلن کی فوج آگے بڑھی لیکن بے سود، مسلمانوں کے سینے آتش انتقام سے دہک رہے تھے۔ انہوں نے اس شدت سے حملہ کیا کہ صلیبی فوج گاجر مولی کی طرح کٹ کٹ کر گرنے لگی۔

مسلمانوں کی نظر اچانک عمادالدین زنگی پر پڑی۔ وہ اپنے محافظوں کو چھوڑ کر اکیلا دشمن کی صفوں میں گھس گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی جانبازوں پر ایسا جوش طاری ہوا کہ دشمن کو چیونٹیوں کی طرح مسل کر رکھ دیا۔

ایک خونریز جنگ کے بعد نوبت یہ آئی کہ جو صلیبی قتل ہونے سے بچ گئے تھے، انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اس افراتفری کا فائدہ اٹھا کر جوسلن نے راہ فرار اختیار کی۔

فتح ملتے ہی مسلمانوں کو وہ تمام مظالم یاد آ گئے جو عیسائیوں نے مسلمانوں پر روا رکھے تھے خصوصاً یروشلم کی فتح کے وقت جو مظالم مسلمانوں پر ڈھائے گئے تھے۔ انہوں نے شہر کو لوٹنے اور عیسائیوں کے قتل عام کے لیے تلواریں سونت لیں۔ عمادالدین کو جیسے ہی اس ارادے کی خبر ہوئی، اس نے حکم جاری کیا۔ ''کوئی سپاہی کسی عام شہری پر تلوار نہیں اٹھائے گا۔ جتنا مال لوٹا جا چکا ہے وہ بھی

واپس کر دیا جائے۔ ہم صرف ان سے جنگ کرتے ہیں جو ہم سے جنگ کرتا ہے۔''

تاریخ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ عمادالدین زنگی نے اپنے بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا ہے۔ اتنی بڑی فتح کے بعد بھی کسی عام شہری پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔

ایڈیسہ کی فتح سے تمام عیسائی دنیا میں ماتم برپا ہو گیا۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ مسلمان صلیبی قصرِ اقتدار کو منہدم کرنے میں اس قدر جلد کامیاب ہو جائیں گے۔ عیسائی مورخ فلپ کے حتی نے لکھا ہے ''یہ ریاست سب سے پہلے قائم ہوئی اور سب سے پہلے ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی واضح ہو گیا کہ صورتِ حال مسلمانوں کے حق میں پلٹ رہی ہے۔''

یروشلم میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ پادری شمعون اپنے بال نوچ رہا تھا جبکہ عالمِ اسلام میں جشن کا عالم تھا۔ بڑے بڑے شعرا نے عمادالدین کی شان میں تہنیتی قصائد لکھے۔ علما و مشائخ نے عمادالدین کو محافظِ اسلام اور مجاہدِ کبیر کے خطابات دیے یہاں تک کہ خلیفۂ بغداد نے اس کا نام خطبوں میں داخل کرنے کا حکم دیا۔

عمادالدین نے اپنی فوج کا ایک مضبوط دستہ ایڈیسہ میں متعین کیا اور خود باقی ماندہ لشکر لے کر فتح و نصرت کے پرچم اڑاتا ہوا دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف بڑھا اور کئی قلعے اور شہر فتح کر ڈالے۔ ان میں سیروج کا مشہور قلعہ بھی شامل تھا۔

ان فتوحات کے دوران وہ قلعۂ جعبر کے سامنے پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

وہ رات عجیب تھی۔ محاصرہ جاری تھا۔ سلطان اپنے خیمے میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ خیمے کے باہر اس کا ایک مسلح غلام چوکس کھڑا تھا لیکن کچھ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ بار بار خیمے کے اندر جھانک لیتا تھا۔ پھر چوکس کھڑا ہو جاتا تھا۔

ہر طرف اندھیرا تھا، خیمے کے اندر شمع کی مدھم روشنی تھی جو اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ غلام فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کا آقا جاگ رہا ہے یا سو گیا۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے قدم اندر رکھ دیا۔ خیمے کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا سلطان کو سرہانے پہنچ گیا۔ شمع کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کا آقا آنکھیں بند کیے گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ سلطان سو رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سلطان کی ہیبت اس پر طاری تھی۔ اس نے ہمت کر کے تلوار ننگی کی اور پے در پے کئی وار کر ڈالے۔ وار اتنے شدید تھے کہ سلطان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ عمادالدین زنگی کی موت واقع ہو گئی۔

کوئی شور بلند نہیں ہوا تھا لہٰذا اس غلام کو تاریکی میں فرار کا موقع مل گیا۔

لوگوں نے بعد میں یہ خیال کیا کہ قلعہ جعبر کے حاکم نے سلطان کے اس غلام کو خرید لیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غلام اپنے عقیدے کے اعتبار سے باطنی تھا جو کسی ایسے کو زندہ نہیں دیکھ سکتا تھا جو اسلام کی حفاظت پر مامور ہو۔

باطنی وہ لوگ کہلاتے تھے جو ایک شخص حسن بن صباح کے پیروکار تھے۔ حسن بن صباح مر چکا تھا لیکن اس کے عقیدے کو ماننے والے اب بھی اپنی کارروائیوں میں مشغول تھے۔

حسن بن صباح کے ان چیلوں کا سامنا بعد میں صلاح الدین ایوبی کو بھی کرنا پڑا اور بالآخر اس نے اس فتنے کا خاتمہ کیا۔

حسن بن صباح نہایت آزاد خیال اور الوالعزم تھا۔ وہ محض آزاد خیالی کی تبلیغ ہی پر قانع نہ تھا بلکہ اسے طاقت و عظمت کے خواب کی عملی تعبیر کے لیے آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر مجھے نصف درجن جاں نثاروں کی خدمات حاصل ہو جائیں تو میں ساری دنیا کو زیرِ نگیں کر لوں اور پھر وہ اپنے اس ارادے پر کمربستہ ہو گیا۔ اس نے اپنی جرأت اور خود اعتمادی سے نصف درجن حلیف پیدا کر لیے اور اپنے عقیدے کی تبلیغ شروع کر دی جو یہ تھا ''حق کچھ بھی نہیں، سب کچھ جائز ہے۔'' اور عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لیے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے رسم و رواج کا نہایت بے دردی سے مضحکہ اڑایا۔

اس نے اپنے مریدوں کی ایک خفیہ جماعت منظم کی جس کے ارکان میں داعی، رفقا اور فدائی شامل تھے۔ جماعت کی اصل کامیابی کا راز فدائی تھے۔ ان کی سفید عباؤں کے اوپر سرخ رنگ کا کمربند نمایاں نظر آتا تھا جن میں دو لمبے خنجر آویزاں ہوتے تھے۔ یہ تمام فدائی نوجوان ہوتے تھے جنہیں وہ شراب اور افیون کے مرکب کا اس طرح عادی بنا دیتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جاتے تھے۔

ان گمراہوں کے نزدیک حسن بن صباح ایسا صاحبِ قدرت پیغمبر تھا جس کے مقابلے میں اسلام کی ساری

شخصیات ہیچ تھیں۔ اس نے ان فدائیوں کے ذریعے دنیائے اسلام کی اہم شخصیات کو قتل کرانا شروع کیا تاکہ ہر طرف خوف و ہراس پھیل جائے اور وہ مروجہ نظام کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کر لے۔ اس کا پہلا نشانہ معاصر اسلامی دنیا کا دانا ترین شخص نظام الملک تھا جو سلجوق سلاطین کا وزیرِ باتدبیر تھا۔ اس کی موت کے بعد سلطنتِ سلجوقیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس ابتری سے فائدہ اٹھا کر حسن بن صباح نے اپنے اقتدار کی بنیادیں استوار کر لیں۔

فدائیوں کے حملوں سے ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ علمائے اسلام نے حسن بن صباح کے خلاف بولنا ہی چھوڑ دیا اور وہ آرام سے نوجوانوں کو بہکاتا رہا۔ کئی سلاطین و امرا اس کے خلاف برسرپیکار رہے لیکن اسے پناہ دینے والے بھی بے پناہ تھے۔ وہ ہمیشہ بچ نکلتا۔ بہت سے کمزور عقیدہ لوگوں کو یقین ہونے لگا کہ وہ واقعی کوئی روحانی شخصیت ہے۔

رفتہ رفتہ اس کی طاقت بڑھنے لگی۔ اس نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر قلعے تعمیر لیے۔ ان قلعوں کی وجہ سے اس کا نام ''حسن شیخ الجبل'' پڑ گیا تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں حسن اپنی بادشاہت کی بنیادیں استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی سلطنت کی حدود میں سمرقند سے لے کر قاہرہ تک کے کوہستانی علاقے شامل تھے۔ اپنے اخراجات کے لیے برسرِ اقتدار لوگوں سے خراج وصول کرتا تھا۔

اس کے مرنے کے بعد دوسرا شیخ سلسلے کا سربراہ بنا۔ اسی دوران ''جنت'' کی تعمیر ہوئی۔ یہ فریب کاروں کا نہایت پراثر اور حسین وسیلہ تھا۔ ایک دشوار گزار عمودی پہاڑ کی چوٹی پر مہیب اور سنگین دیواروں کے عقب میں ایک وسیع باغ سجایا گیا تھا۔ اس باغ میں عجیب و غریب درخت زمردیں دوب پر سایہ ریز تھے۔ مرمر کے فواروں سے اچھلتی ہوئی ارغوانی شراب کی ہلکی پھوار سورج کی کرنوں میں طلائی موتیوں کی طرح جگمگاتی تھی۔ مرصع ایوانوں اور آراستہ کوشکوں میں دیبا و حریر کے فرش بچھے ہوئے تھے۔ فضا ان دیکھے موسیقاروں کے نغمات سے کیف بار رہتی تھی۔ نوجوانوں کو افیون کے نشے سے سرشار کر کے اس جنت میں لایا جاتا اور سیر کرائی جاتی۔ حسین و جمیل دوشیزائیں ان نوجوانوں کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتیں۔ پھر ان مدہوش لڑکوں کو اس جنت سے نکال لیا جاتا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد پھر وہاں جانے کی طلب کرتے تو ان سے کہا جاتا، شیخ کے لیے کام کرتے رہو۔ اگر تمہیں موت آ گئی تو یہی جنت تمہاری منتظر ہو گی۔ یہ فدائی بے خوف ہو کر قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے رہتے۔

حسن بن صباح کو مرے زمانہ ہو گیا تھا لیکن اس کے بنائے ہوئے فدائی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر اسلام کو شدید نقصان پہنچا رہے تھے۔

سلطان عمادالدین زنگی کا قاتل بھی ایسا ہی ایک فدائی تھا۔

عمادالدین کے قتل کی خبر سنتے ہی اسدالدین شیرکوہ شہزادہ نورالدین زنگی کے خیمے میں پہنچا اور اسے مشورہ دیا کہ آپ کو اپنے جاں نثاروں کے ساتھ فوراً ''حلب'' (شام) چلے جانا چاہیے۔ مرکزِ حکومت، موصل کی فوج اور عوام وزیرِ اعظم جمال الدین الجواد کے زیرِ اثر ہیں اور وہ سیف الدین غازی (نورالدین زنگی کا بھائی) کا زبردست ساتھی ہے۔ اس لیے موصل میں آپ کا جانا خلافِ مصلحت ہو گا۔

نورالدین نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حلب کی طرف کوچ کر گیا۔

عمادالدین کی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ موصل پر سیف الدین قابض ہو گیا اور شام میں نورالدین زنگی نے حکومت قائم کی۔

☆☆☆

عمادالدین کے شہید ہونے کی خبر موصل پہنچی تو پورا شہر آہ و زاری کرتا ہوا سڑکوں پر امڈ آیا۔ ہر طرف، ہر زبان پر سلطان کی دریادلی اور رعایا پروری کا ذکر تھا، لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔

صرف موصل ہی میں نہیں پوری اسلامی دنیا میں عمادالدین کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ بغداد میں عباسی خلیفہ نے بھی اس کا سوگ منایا۔ مساجد اور مدارس میں اجتماعی دعائیں کی گئیں۔

موصل میں ایک گھر وہ بھی تھا جہاں کی فضا سب سے زیادہ سوگوار تھی۔ یہ گھر نجم الدین ایوب کا تھا۔ اس کی بیوی زبیدہ اپنے محسن کے احسانات کو یاد کر کر کے آنسو بہا رہی تھی۔ صلاح الدین یوسف ابھی ابھی مدرسے سے آیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ وہ مدرسے سے گھر تک آہیں اور سسکیاں سنتا ہوا آیا تھا۔ گھر میں آیا تو ماں کو بھی روتے ہوئے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا، اس نے استفسار کیا۔

''اماں جان، آپ رو کیوں رہی ہیں بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوا آرہا ہوں کہ پورا شہر رو رہا ہے۔''

''ہاں بیٹا، جب کسی کا باپ مرجاتا ہے تو رونے کے سوا اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔''

''تو کیا سب کے باپ ایک ساتھ مر گئے ہیں جو سب رو رہے ہیں؟''

''سلطان عماد الدین سب کے باپ تھے۔ انہیں شہید کردیا گیا ہے۔''

''وہ تو بڑے اچھے سلطان تھے۔ انہیں کس نے شہید کردیا؟''

''ان کے ایک غلام نے۔''

''یہ خبر ہی غلط ہے۔ کوئی غلام اپنے آقا کو کیسے قتل کرسکتا ہے۔ مسلمانوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

''وہ غلام بہ ظاہر مسلمان تھا لیکن عقیدے کے اعتبار سے باطنی تھا مگر تم نہیں سمجھو گے باطنی کون ہوتے ہیں۔''

''کیوں نہیں سمجھوں گا۔ مجھے مولوی صاحب نے باطنیوں کے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ باطنی اپنے آقا کو بھی قتل کرسکتے ہیں۔''

''سلطان کی موت سے اسلامی دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔''

''مجھے بڑا ہونے دیں۔ میں اس نقصان کی تلافی کروں گا۔ اس فتنے کا سر ہمیشہ کے لیے کچل دوں گا اور اس غلام کے تو ایسے ٹکڑے کروں گا کہ آپ دیکھیے گا۔''

ماں نے بیٹے کو آغوش میں چھپالیا۔ ''اللہ تجھے نظر بد سے بچائے۔''

''ابا جان اور چچا جان محاذ جنگ سے گھر آئیں گے تو ان سے کہوں گا، مجھے تلوار چلانا سکھائیں۔ ابھی تو میں صرف مدرسے جاتا ہوں۔ میں نے سوچا بھی یہی تھا کہ مدرسے جاتا رہوں گا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ مجھے سلطان کے قاتلوں سے بدلہ لینا ہے۔''

صلاح الدین نے باپ اور چچا کا ذکر چھیڑا تو زبیدہ کو ان کی یاد آگئی۔ وہ سلطان کے غم میں اپنے شوہر کو بھول ہی گئی تھی۔ ''خدا ان کی حفاظت کرے۔ وہ خیریت سے گھر پہنچیں۔''

کچھ دن بعد نجم الدین اور شیر کوہ گھر پہنچے تو ایک بار پھر گھر کی فضا اداس ہوگئی۔ سلطان کا ذکر پھر زبانوں پر آگیا۔ نجم الدین کی زبان پر سلطان کے احسانات تھے جنہیں وہ رو رو کر بیان کررہا تھا۔ شیر کوہ مسلسل چپ تھا جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔ اسے دکھ تھا تو یہ کہ وہ آخری وقت میں اپنے آقا کی کوئی مدد نہ کرسکا۔

وقت کے قدموں نے پھر جنبش کی۔ موصل میں سیف الدین کی حکومت تھی اور شام میں نورالدین زنگی کی حکمرانی تھی۔

نجم الدین کو دونوں بھائی عزیز تھے کہ دونوں اس کے محسن کی اولاد تھے لیکن نور الدین زنگی سے اسے خاص عقیدت تھی کیونکہ وہ نہایت پاکباز نوجوان تھا۔ شیر کوہ کے مشورے ہی سے نورالدین زنگی شام گیا تھا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ اس لیے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بیوی بچوں کو لے کر نورالدین کے پاس شام چلا جائے۔

ایک مرتبہ پھر دونوں بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ شیر کوہ کی رائے بھی یہی تھی کہ موصل چھوڑ کر شام کے لیے رخت سفر باندھا جائے۔

''میں نورالدین میں وہ تمام اوصاف دیکھ رہا ہوں جو سلطان مرحوم کی ذات کا حصہ تھے۔ وہی بہادری، وہی پارسائی، وہی فیاضی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سلطان کا نعم البدل ثابت ہوگا۔ ہمیں چاہیے ہم اس کا سہارا بنیں۔ اس کے دربار میں ہماری ترقی کے امکانات بہت روشن ہیں۔''

یہ نجم الدین کی دوسری ہجرت تھی۔ ایک وقت وہ تھا جب وہ تکریت سے موصل آیا تھا۔ اب وہ موصل سے شام جارہا تھا لیکن اب میں اور جب میں بہت فرق تھا۔ جب اس نے پہلی ہجرت کی تھی تو اس کا قافلہ لٹے پٹے مہاجر کا قافلہ تھا لیکن اب وہ بیش قیمت سامان کے ساتھ شام کی سرحدوں میں داخل ہوا۔

سلطان نور الدین زنگی نے استقبال کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔ نجم الدین ایوب کی شاندار پذیرائی کی اور اسے اپنی افواج کا سالار بنادیا۔

نورالدین زنگی کو علوم دینی سے خاص شغف تھا۔ اس نے علم قرآن وتفسیر، علم حدیث کے علاوہ اصول فقہ اور صرف ونحو، ادب وتاریخ وغیرہ میں مکمل طور پر ید طولیٰ حاصل کیا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی بھی اس قدر سادہ تھی کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی تھی۔ دین کا یہی جذبہ وہ دوسروں میں بھی کارفرما دیکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اس وقت کے مشہور عالم ابن عرمون کو قاضی کے عہدے پر فائز کیا اور انہیں یہ ذمے داری سونپی کہ شام کے بڑے بڑے شہروں میں درس گاہیں قائم کریں اور مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کریں۔

موصل سے آنے کے بعد صلاح الدین کو ابن عرسون کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ کتابوں میں اس کا دل ایسا لگا کہ اسے یہ وعدہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ بڑا ہو کر سپاہی بنے گا اور سلطان عمادالدین زنگی کے قاتلوں سے بدلہ لے گا۔ اب وہ ابن عرسون کی طرح عالم دین بننا چاہتا تھا۔

اس کا چھریرا بدن، گفتگو کی نرمی، چہرے پر پھیلی ہوئی نرمی، بڑی بڑی شربتی آنکھیں دلالت کرتی تھیں کہ وہ خونخوار سپاہی بننے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔

اس کا باپ ایک سپاہی تھا اور بیٹے کے لیے بھی یہی خواب دیکھتا تھا لیکن صلاح الدین کی طرف دیکھ کر اسے افسوس ہوتا تھا۔ اس کی بے پناہ ضد کے بعد صلاح الدین نے گھڑسواری اور شمشیر زنی وغیرہ کی مشق شروع تو کردی تھی لیکن اس کا دل کتابوں ہی میں اٹکا رہتا تھا۔ ابن عرسون کی تقریروں میں اسے جو لذت ملتی تھی تیر اندازی کے جلسوں میں نہیں ملتی تھی۔

نجم الدین اور شیر کوہ دونوں اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے۔ اکیلے میں اسے سمجھاتے بھی تھے لیکن وہ یہی کہتا تھا کہ اس کا دل کتابوں میں لگتا ہے۔ نجم الدین نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ اسے ابن عرسون کے پاس نہ جانے دیں لیکن پھر اس ڈر سے چپ ہوگئے کہ یہ خبر یقیناً سلطان تک پہنچے گی اور وہ ان سے باز پرس کرے گا کیونکہ سلطان علم کا بڑا شائق تھا۔ وہ کبھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ صلاح الدین کو تعلیم حاصل کرنے سے روکا جائے۔ مجبور ہو کر اس نے اس کے حال پر چھوڑ دیا، وہ اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر فنون حرب سیکھتا ضرور رہا لیکن کتابوں سے اس کا شغف بڑھتا رہا۔ اس کے اس شوق وعلم نے ابن عرسون کو بھی اس کا عاشق بنادیا تھا۔ وہ بھی اس پر بھرپور توجہ دے رہے تھے۔

⁂

سلطان عمادالدین کے قتل نے عیسائی دنیا میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ مہینوں تک عیسائی ریاستوں میں جشن منائے جاتے رہے تھے۔ سلطان کی شہادت سے زیادہ انہیں خوشی اس بات کی تھی کہ اب اس کے وارثوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوجائے گی لیکن انہیں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ عمادالدین کی صالح اولاد نے آپس میں لڑ کر خون کی ندیاں نہیں بہائیں۔ ان کے نزدیک ایک خوش آئند بات ضرور تھی کہ سلطنت زنگی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ انہیں یہ بھی اطمینان تھا کہ سلطان کے بیٹوں میں سے کوئی سلطان کی طرح جری اور دلیر نہیں ہوگا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے مفرور جوسلن ثانی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ایڈیسہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ خود دریائے فرات کے مغرب میں واقع تل باشر کے شہر میں مقیم ہوگیا تھا جو انطاکیہ کا ایک شہر تھا۔

وہ سلطان عمادالدین سے شکست کھا کر بھاگا تھا اور اب سلطان اس دنیا میں نہیں تھا۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایڈیسہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔

وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہایت رازداری سے حاکم انطاکیہ کے پاس گیا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''عظیم ڈیمورا! عمادالدین زنگی مارا جاچکا ہے۔ اس کے بیٹے اس کی طرح مردمیدان نہیں۔ دونوں میں اختلافات بھی ہیں۔ ایک کی مدد کو دوسرا نہیں آئے گا۔ مقدس باپ نے یہ سنہری موقع ہمیں دیا ہے کہ ہم عیسائیوں کی بربادی کا انتقام لیں اور ایڈیسہ کی متبرک زمین مسلمانوں سے چھین لیں۔''

''جوسلن، تمہارے ارادوں کو سلام ہو۔ اہل صلیب پر یہ تمہارا بڑا احسان ہوگا۔''

''اس میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔''

''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''میرے پاس جو فوج ہے وہ بہت کم ہے۔ اگر آپ مجھے اپنی فوج کا کچھ حصہ دے دیں تو ایڈیسہ اہل صلیب کا ہوجائے گا۔ میرا کیا ہے، میں اگر صلیب کے نام پر قتل بھی ہوجاؤں تو کم ہے۔''

انطاکیہ کا حاکم اس کی پراثر تقریر سے اس قدر مرعوب ہوا کہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ ڈیمورا کی فوج آجانے کے بعد جوسلن کو ایک بڑے لشکر کی خوش خبری مل گئی۔

زور شور سے لیکن نہایت رازداری کے ساتھ ایڈیسہ پر حملے کی منصوبہ سازی ہونے لگی۔

⁂

سلطان زنگی ابھی کسی بڑے معرکے میں نہیں الجھا تھا۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر وہ سلطنت کے استحکام میں مشغول تھا، دور دور تک ایسے حالات بھی نظر نہیں آتے تھے کہ اسے جنگ کے لیے نکلنا پڑے گا۔

اس دور کے رواج کے مطابق نورالدین نے بھی اپنی سرحدوں پر جاسوسوں کا جال بچھا رکھا تھا تا کہ ملک کے

چھوٹے بڑے واقعے سے باخبر رہیں اور دوسری طرف دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رہے۔

ایک روز محکمۂ جاسوسی کے نگراں نے اسے نہایت پریشان کن اطلاع دی۔ یہ اطلاع جوسلن کی ایڈیسہ کی جانب پیش قدمی سے متعلق تھی۔

''اطلاع ملی ہے کہ جوسلن ثانی انطاکیہ کے حکمران ڈیمورا کی پشت پناہی میں ایڈیسہ پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔''

تفصیلات معلوم نہیں ہوسکی تھیں لیکن یہ اطلاع پریشان کن ضرور تھی کیونکہ ایڈیسہ میں اسلامی فوج کی تعداد بہت کم تھی اور اندازے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ جوسلن کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہوگا۔ اگر ان کی مدد کو نہیں پہنچا گیا تو تمام مسلمان تہ تیغ ہوجائیں گے۔

سلطان زنگی نے فوراً اپنے سالار نجم الدین ایوب اور شیرکوہ کو طلب کیا۔ ان دونوں کے فاضل مشوروں سے وہ ہمیشہ فیض یاب ہوتا رہتا تھا۔

نجم الدین تو دھیمی طبیعت کا مالک تھا لیکن شیرکوہ اپنے نام کی طرح ہمیشہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ جوسلن ثانی کا نام سنتے ہی منہ سے جھاگ اگلنے لگا۔

''اس اپاہج کی یہ ہمت کہ وہ اپنے زخم چاٹنے کے بجائے ہمارے مقابلے کو نکلے۔ کہیں یہ اطلاع غلط تو نہیں؟''

''شیرکوہ! فیصلے جذبات سے نہیں ہوتے۔ دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا کرنا ہے۔'' سلطان نے نہایت نرمی اور بردباری سے کہا۔

نجم الدین کو اب بولنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر ایڈیسہ چھن گیا تو ہم سلطان مرحوم کی روح سے شرمندہ ہوں گے، ہمیں ہر قیمت پر ایڈیسہ کا دفاع کرنا ہے۔ ہمیں فوری پیش قدمی کرنا ہوگی تاکہ جوسلن سے پہلے ہم وہاں پہنچ جائیں۔''

''آپ کی بھی یہی رائے ہے تو پھر تیاری کی جائے۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہے۔''

''تیاری میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ کل کا سورج طلوع ہوتے ہی ہم روانہ ہوجائیں گے۔''

نورالدین نے ان کے جذبے کی تعریف کی اور اجلاس ختم ہوگیا۔

نورالدین دس ہزار سواروں کو لے کر ایڈیسہ کی طرف بڑھا لیکن جوسلن اس سے پہلے ایڈیسہ پہنچ گیا، اس نے ایڈیسہ پر شب خون مارا اور مسلمان محافظوں کو روندتا ہوا شہر میں داخل ہوگیا۔ بپھرا ہوا جوسلن شہر میں داخل ہو اور مسلمانوں کی عزت وآبرو محفوظ رہ سکے! لیکن وہ یہ بھول گیا کہ جب سلطان عمادالدین کی فوجیں ایڈیسہ میں داخل ہوئی تھیں تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا تھا کہ شہریوں کا قتل عام نہ کیا جائے۔ متعصب جوسلن نے حکم دیا کہ جو مسلمان ملے اس کی گردن اتار کر زمین پر پھینک دو۔ شیطان کا رقص شروع ہوگیا، مسلمانوں کا خون بہنے لگا۔ بکھری ہوئی لاشوں کو جوسلن کے سپاہی اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتے پھر رہے تھے۔ معصوم دوشیزاؤں کی آبروریزی کی جارہی تھی۔ جو مسلمان بچ گئے تھے وہ قلعے کی طرف دوڑ رہے تھے، قلعے کے مسلمانوں نے ان کے لیے دروازے کھول دیے۔ جب یہ مسلمان قلعے میں پہنچ گئے تو قلعے کے دروازے بند کرلیے گئے اور جوسلن ثانی کی فوج پر تیر برسانے لگے۔ عیسائیوں نے بھی جواب دیا اور سخت مقابلہ ہونے لگا۔ مقابلہ ہو رہا تھا لیکن مسلمان سخت خوفزدہ تھے ان کے پاس اتنا اسلحہ نہیں تھا کہ زیادہ دیر تک مقابلہ کرسکتے۔ اب کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ سلطان نورالدین کو خبر پہنچائی جاسکتی۔

جوسلن فتح کے نشے سے ایسا سرشار تھا کہ دل میں یہ خیال تک نہ آیا کہ کوئی مسلمانوں کی مدد کو آبھی سکتا ہے۔ وہ بے خبر تھا اور سلطان نورالدین آندھی طوفان کی طرح بڑھا چلا آرہا تھا۔

''امیر محترم! ہمیں تو راستے میں جوسلن کا لشکر کہیں دکھائی نہیں دیا۔'' سلطان کے ایک امیر نے کہا۔

''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ہم سے پہلے ایڈیسہ پہنچ چکا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو بہت برا ہوا ہے۔ ایڈیسہ میں اتنی فوج نہیں کہ وہ جوسلن کا مقابلہ کرسکے۔''

اس نے حکم دیا کہ گھوڑے اور تیز دوڑائے جائیں اور اس تیاری سے جایا جائے کہ جاتے ہی مقابلہ کرنا ہے۔ اس نے ایک حکمت عملی یہ اختیار کی کہ فوج کا ایک حصہ، شیرکوہ کی نگرانی میں پیچھے چھوڑ دیا۔ شیرکوہ کو حکم دیا کہ وہ ایڈیسہ کی طرف میانہ روی سے چلے تاکہ اس کے گھوڑے تھکے بغیر ایڈیسہ تک پہنچیں۔

جوسلن قلعہ ایڈیسہ کے مسلمانوں سے مصروف جنگ تھا کہ نورالدین زنگی بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گیا اور ایڈیسہ کو چاروں طرف سے گھیرلیا۔ یہ صورت حال جوسلن کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ اچانک دونوں طرف سے

گھر گیا۔ قلعے کے اندر سے محصور مسلمان تیروں کی بارش کر رہے تھے اور باہر نورالدین کی فوج قیامت ڈھارہی تھی۔ دوپہر کے بعد پیچھے رہ جانے والا شیرکوہ بھی تازہ دم فوج کے ساتھ آگیا۔ اب عیسائی فوجیوں میں تاب مدافعت نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لشکری مارے گئے۔

جوسلن کے تمام اہم سردار مارے جاچکے تھے، اب اس کے سامنے بھی فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بھیس بدل کر فرار ہوگیا۔ مسلمان جوش میں بھرے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ غدار عیسائیوں کے گھروں کو جی کھول کر لوٹا۔

اب وہ سلطان عمادالدین کی روح کے سامنے شرمندہ نہیں تھے۔

ﷺﷺﷺ

صلاح الدین یوسف سولہ سترہ برس کا ہوچکا تھا۔ اس کی جسمانی حالت قابل رشک نہیں تھی۔ اس کا بدن اب تک اتنا چھریرا تھا کہ اسے لاغر اندام اور کمزور کہا جاسکتا تھا۔ اسے لڑائی جھگڑوں سے نفرت تھی جس کا برملا اظہار وہ اپنے والد اور چچا کے سامنے کرچکا تھا۔ وہ ایک بااخلاق، باحیا اور خاموش طبع نوجوان تھا البتہ علم کے حصول میں اس نے اتنی محنت کی تھی کہ اس کے استاد کو بھی اس پر غرور تھا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک دن دربار جانے لگے تو شرمیلے صلاح الدین کو بھی ساتھ لے گئے۔

سلطان، قاضی ابن عرسون سے کسی اہم معاملے پر گفتگو کر رہا تھا۔ اس لیے وہ قاضی کے ساتھ آئے ہوئے نوجوان پر توجہ نہ دے سکا البتہ وہ پہلی نظر میں اس سے متاثر ضرور ہوا تھا۔ یہ خیال ضرور گزرا تھا کہ یہ لڑکا عام نوجوانوں سے مختلف ہے۔

جب سلطان، قاضی صاحب سے فارغ ہوا تو اس نے صلاح الدین کی بابت پوچھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نوجوان نجم الدین ایوب کا بیٹا ہے تو ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ ''جس درخت کے تم پھل ہو تمہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔''

اس کے بعد سلطان نے اس کا امتحان لینے کے لیے اس سے کچھ علمی سوال پوچھے۔ صلاح الدین نے ایسے مدلل جواب دیے کہ سلطان لاجواب ہوگیا۔ سلطان خود بھی مروجہ اسلامی نصاب پر دسترس رکھتا تھا لیکن صلاح الدین کی علمی استعداد دیکھ کر اس کو رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ایک سپاہی باپ کے بیٹے ہو۔ فنون حرب سے بھی کچھ تعلق ہے؟''

''برائے نام۔ ابا جان کی کوششوں سے کچھ سیکھ گیا ہوں البتہ شہسواری پر مجھے مکمل عبور ہے۔''

''بہت خوب! یہ تو ہمارا بھی محبوب مشغلہ ہے۔''

''جب شہسوار اچھے ہو تو چوگان بھی کھیلتے ہوگے۔''

''مجھے اس کھیل سے کیا کسی کھیل سے بھی دلچسپی نہیں۔ کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کھیل میں اپنا وقت ضائع کرے۔''

''یہ کھیل نہیں ہے، گھوڑے اور سوار کی ورزش ہے۔ یہ ورزش میدان جنگ میں کام آتی ہے، یہ کھیل کھیلا کرو۔''

صلاح الدین کو معلوم تھا کہ سلطان کو چوگان بازی سے عشق ہے۔ اس لیے اس نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی اور خاموش رہا۔

صلاح الدین کو وہ واقعہ بھی یاد تھا جب صالحین میں سے کسی بڑے بزرگ نے اس کھیل پر سلطان کو تنبیہہ کی تھی تو سلطان نے فرمایا تھا۔ ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اس کھیل سے میرا مقصد گھوڑوں کو جنگی تربیت دینا ہے کیونکہ ہم جہاد نہیں چھوڑ سکتے۔''

اس لیے صلاح الدین نے خاموشی اختیار کی۔

جب صلاح الدین رخصت ہونے لگا تو سلطان نے ایک نصیحت اور بھی کی۔ ''کتابوں کی ورق گردانی اپنی جگہ لیکن فنون حرب پر بھی پوری توجہ مرکوز رکھو کیونکہ جہاد ہم مسلمانوں کا شیوہ ہے۔ تمہیں کسی روز جہاد پر بھی جانا ہوگا۔ دشمن کا سر کاٹنے کے لیے شمشیرزنی لازمی ہے۔''

صلاح الدین کہہ سکتا تھا کہ جہاد بالقلم بھی تو ہوسکتا ہے لیکن اسے بڑوں کا ادب سکھایا گیا تھا۔ وہ چپ رہا۔

سلطان نے اس سے یہ بھی کہا۔ ''تم پابندی سے ہمارے دربار میں حاضری دیا کرو۔''

سلطان نے یہ پیشکش اس طرح کی جیسے وہ حکم دے رہا ہو۔ صلاح الدین اس حکم کے جواب میں صرف ''جی بہتر!'' کہہ سکا۔

وہ گھر پہنچا تو یہ خبر پہلے ہی اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔ پورا گھر سراپا مسرت بنا ہوا تھا۔ نجم الدین ایوب کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ جس بیٹے کو وہ ناکارہ سمجھنے لگے تھے، اسے اتنا بڑا اعزاز ملے گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

''بھلا بتاؤ، حاکم وقت خود کہے کہ ہمارے دربار میں پابندی سے آیا کرو۔''

وہ بار بار یہ جملہ دہرا رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ پھر ان کی نظر صلاح الدین پر پڑی جس کے چہرے پر خوشی کا کوئی رنگ نمایاں نہیں تھا۔

''یوسف، ذرا میرے قریب تو آؤ۔'' نجم الدین نے کہا اور صلاح الدین ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ''اتنا بڑا اعزاز تمہیں ملا ہے اور تم خوش نہیں ہو، کیا بات ہے؟''

''ابا جان، خوشی کی بات تو ہے لیکن رسمی دربار داری میں میرا دل نہیں لگتا۔ قاضی صاحب کے پاس جانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''قاضی صاحب سے تمہیں جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ چکے۔ اب اپنی ترقی کی فکر کرو۔''

''جی بہتر۔ میں وہی کروں گا جو آپ فرمائیں گے۔''

دوسرے دن وہ دربار گیا تو سلطان کے حکم پر اسے سب سے اگلی قطار میں بٹھایا گیا۔ ایک سولہ سالہ نوجوان کی یہ قدر و منزلت دیکھی تو کئی امرا کے ماتھے شکن آلود ہوگئے۔

پہلے دن سے ہی اس کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ ان امرا کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ایک معمولی خاندان کا کرد نوجوان، ہم سب پر بازی لے گیا ہے۔ پھر اس سازش نے یہ رخ اختیار کیا کہ اس میں نجم الدین ایوب کو بھی ملوث کرلیا گیا۔ امرا میں یہ باتیں ہونے لگیں کہ نجم الدین تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس نے اپنے بیٹے کو دربار میں بھیجا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب نجم الدین سلطان کا تختہ الٹ کر خود تخت پر بیٹھ جائے گا۔ سلطان کے چند با اعتماد امرا کو اعتماد میں لیا گیا اور انہوں نے یہ اندیشہ سلطان کے کانوں میں ڈال دیا۔ سلطان بھی سوچ میں پڑ گیا۔ کیا نجم الدین اور شیرکوہ مجھ سے غداری کے مرتکب ہوسکتے ہیں؟ وہ خود سے بار بار سوال کرتا تھا اور بار بار جواب نفی میں آتا تھا۔ وہ تھک ہار کر قاضی ابن عرسون کی خانقاہ میں پہنچ گیا۔ وہ قاضی کو ہمیشہ دربار میں طلب کرتا تھا لیکن آج اس کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''حضرت، یہ کیا وحشت ہے۔ آپ نے مجھے طلب فرمالیا ہوتا۔''

''اس وقت امورِ سلطنت سے متعلق کوئی کام درپیش نہیں تھا۔ میری ذات کا معاملہ تھا اس لیے میرا آنا ہی مناسب تھا۔''

''امیر محترم! فرمایئے، نصیبِ دشمناں کیا پریشانی ہے؟''

سلطان نے تمام ماجرا تفصیل سے قاضی کے سامنے بیان کردیا۔ قاضی صاحب نے تین مرتبہ اپنی گردن کو ادھر ادھر گھمایا جیسے انکار کررہے ہوں اور پھر مراقبے کی حالت میں چلے گئے۔

کچھ دیر بعد مراقبے سے باہر آئے تو فرمایا۔ ''وہ تین اشخاص جو آپ کے پاس آئے تھے جلد اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ آپ اپنے سالار کی جانب سے کوئی کھٹکا دل میں نہ لائیں۔''

قاضی کی پیش گوئی بہت جلد ظاہر ہوگئی۔ ان امیروں میں سے ایک گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ دوسرے کو اس کے غلام نے سوتے میں قتل کردیا اور تیرے کو جذام کے مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ تصویرِ عبرت بن کر دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔

لوگوں نے اسے محض اتفاق سمجھا لیکن سلطان جانتا تھا کہ یہ ان کے اعمال کی سزا ہے جو انہیں ملی ہے۔ صلاح الدین پر سلطان کی مہربانیاں روز بہ روز بڑھنے لگیں۔ نجم الدین کی طرف سے بھی اس کا دل صاف ہوگیا۔

⁂

سلطان نور الدین زنگی کے ہاتھوں جوسلن کی دوبار شکست نے صلیبیوں کو پاگل کردیا۔ انہیں یقین آگیا کہ اگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روکا گیا تو یہ سیلاب سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔

پوپ کے ایک اعلان نے جلتی ہوئی اس آگ کو اور بھی ہوا دی۔

''ارضِ مشرق کے عیسائیوں کی مدد کرنا خداوند یسوع مسیح کے تمام نام لیواؤں کا فرض اولین ہے۔ اگر وہ اس وقت نہ اٹھے تو یروشلم کو بھی اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھیں گے۔''

پوپ کا یہ فرمان گویا جنگِ مقدس کا اعلان تھا۔

اس اعلان کے بعد گرجاؤں میں مذہبی تقریریں ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کے جذبات بھڑکائے جانے لگے لیکن اس للکار کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ اہلِ صلیب ان دنیادار پادریوں کے دام میں آنے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ مسلمانوں کا خوف ان پر غالب تھا۔ ماضی میں وہ کئی شکستیں دیکھ چکے تھے۔ اب مزید کسی بربادی کے لیے تیار نہیں تھے۔

جب ان پادریوں کو اپنی ناکامی نظر آئی تو انہیں ایک پراسرار راہب کو مہرے کے طور پر استعمال کرنے کا خیال آیا۔

اس راہب کا نام سینٹ برنارڈ تھا جو برگنڈی کے ایک امیر کا بیٹا تھا جو تارک الدنیا ہوکر پچھلے پندرہ برسوں سے ایک غار میں عبادت کررہا تھا۔ کچھ پادریوں کو اس غار کا علم تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئے اور عیسائی قوم کی حالت زار اس کے سامنے بیان کی اور ایڈیسہ کے عیسائیوں کا حال نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ اس کے سامنے ایسی دردناک تصویر کھینچی کہ برنارڈ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''عیسائی قوم پر یہ کچھ گزر گئی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا۔''

''آپ تو عبادت میں مصروف ہیں اور یسوع مسیح کے ماننے والوں کا نام و نشان مٹنے کو ہے۔''

''آپ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ذمے داری تو عیسائی بادشاہوں پر عائد ہوتی ہے۔ وہ کیوں خاموش بیٹھے ہیں؟''

''وہ جنگ لڑ سکتے ہیں لیکن قوم کو یک جا کرنا تو ان کا کام نہیں۔''

''آپ لوگ کس مرض کی دوا ہیں۔ یہ کام آپ کریں۔''

''آپ باہر کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ ہماری قوم اتنی بگڑ گئی ہے کہ ہماری بات سننے کو تیار ہی نہیں۔ کوئی ایسا ہو جو ان میں مذہبی جوش پیدا کردے۔''

''اگر یوں بھی ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''یہ وقت غار میں بیٹھے رہنے کا نہیں ہے۔ آپ باہر نکلیں اور اپنی تقریروں سے عیسائیوں کے دلوں کو مذہبی جوش سے بھردیں۔''

''آپ لوگ کمال کرتے ہیں۔ میں پندرہ سال سے اپنی قوم سے دور ہوں۔ کوئی مجھے جانتا تک نہیں، میری بات کون سنے گا۔''

''یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ ہم آپ کے روحانی مرتبے سے لوگوں کو آگاہ کریں گے۔ بس آپ خاموشی سے ہمیں وہ کرنے دیں جو ہم کررہے ہیں۔''

سینٹ برنارڈ خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا اور پھر ان پادریوں کی ہدایت پر عمل کرنے کی ہامی بھر لی۔

ان پادریوں نے غار سے نکلنے کے بعد مزید چند لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا اور نہایت شد و مد سے اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہوگئے۔

انہوں نے لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ فلاں غار میں موجود ہیں۔ خداوند مسیح ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ان کو دیکھنا عبادت ہے، ان سے ملنا سعادت ہے۔ ان سے محیر العقول معجزات بھی سرزد ہوتے ہیں۔

پادریوں کے گماشتے یہ باتیں شد و مد سے پھیلا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ فرانس کے مشہور شہر ویزلی کے گلی کوچوں میں سینٹ برنارڈ کا نام عقیدت سے لیا جانے لگا۔

غار سے باہر لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ مصیبت زدہ، افلاس کے مارے عیسائی اپنی حاجتیں لے کر حاضر ہونے لگے۔

ان منصوبہ سازوں نے بڑی خوب صورتی سے ایسے لوگوں کو عوام میں شامل کردیا جو کہتے پھرتے تھے کہ ہماری بینائی چلی گئی تھی، سینٹ برنارڈ نے ہمیں آنکھیں بخش دیں۔ ہمیں فالج ہوگیا تھا، چلنے سے معذور ہوگئے تھے۔ سینٹ نے ہماری ٹانگوں پر ہاتھ پھیرا اور ہم چلنے کے قابل ہوگئے۔ یہ داستانیں اتنی تیزی سے پھیلیں کہ لوگوں کو یقین آنے لگا۔ کہیں راز نہ کھل جائے، اس کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ غار کے دہانے پر محافظ کھڑے کردیے گئے۔ ان کی اجازت کے بغیر کوئی اندر نہیں جاسکتا تھا۔ یہ لوگ اپنے لوگوں کو اندر جانے دیتے تھے جو باہر آکر سینٹ کی کرامتیں بیان کرتے تھے۔

سینٹ برنارڈ کی شہرت دور دور پھیلنے لگی۔ کچھ لوگ اگر نامراد لوٹے بھی تھے تو کوئی ان کی سننے کو تیار نہیں تھا۔ پادریوں کے گماشتے اس کی شہرت کو دور دور پہنچا رہے تھے، پورا فرانس سینٹ برنارڈ کے نام سے گونجنے لگا۔

پادری اسی وقت کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے اعلان کردیا کہ مقدس سینٹ برنارڈ غار سے باہر نکل کر اپنا دیدار کرائیں گے اور خطاب کریں گے۔

اہلِ صلیب کا اشتیاق دیدنی تھا۔ ہر آنکھ بے قرار تھی، ہر دل بے چین۔ شہنشاہ فرانس لوئیس ہفتم تک خبر پہنچی تو اسے بھی اشتیاق ہوا۔ اس نے بھی اعلان کردیا کہ وہ بھی اس اجتماع میں شریک ہوگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی سرکاری طور پر انتظامات ہونے لگے۔

ایک طویل و عریض میدان میں اس اجلاس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لوگ پہنچنا شروع ہوگئے اور وقت سے پہلے ہی میدان کھچا کھچ بھر گیا۔

شاہ فرانس کی سواری آگئی تو پادری حضرات سینٹ برنارڈ کو لے کر مسند پر پہنچے۔ اسے پہلے ہی سمجھا دیا گیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

سینٹ برنارڈ سیاہ عبا میں ملبوس تھا اور اس کے

ہاتھ میں صلیب تھی۔ ہزاروں کا مجمع سانس لیے بغیر کھڑا تھا۔ یسوع مسیح جس سے کلام کرتے ہیں وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔

سینٹ برنارڈ نے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر حاضرین سے مخاطب ہوا۔

''میں خود نہیں آیا ہوں، یسوع مسیح نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تمہیں نیند سے جھنجوڑ کر بیدار کروں۔ اگر تم اب بھی نہ جاگے تو مسیح تم سے ناراض ہوگا اور اس کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے۔ اس وقت ہر عبادت چھوڑ دو اور ارضِ مشرق کے عیسائیوں کی مدد کو پہنچو۔ مقدس باپ کے قہر سے بچو ورنہ آج ایڈیسہ گیا ہے، کل یروشلم بھی چھن جائے گا۔ مسیح کہتے ہیں وہ تمہاری مدد کو آئیں گے، تم اٹھو تو سہی۔''

سینٹ برنارڈ کی تقریر جاری تھی اور میدان چیخوں اور آہوں سے گونج رہا تھا اور اس وقت تو پورا میدان، میدان حشر بن گیا جب شاہ فرانس نے آگے بڑھ کر سینٹ برنارڈ کے ہاتھوں سے صلیب چھین لی اور تمام مجمع کے سامنے اسے سینے سے لگا کر اعلان کیا کہ میں جنگ مقدس میں ضرور حصہ لوں گا اور عمادالدین زنگی کے بیٹوں سے انتقام لوں گا، ایڈیسہ کی شکست کا' عیسائیوں کے قتل عام کا۔

مورخین لکھتے ہیں ''ویزلی کے اس اجلاس کے بعد گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر خالی ہو گئے سوائے اپاہجوں کے وہاں کوئی نظر نہ آتا تھا باقی سب لوگ صلیب برداروں میں شامل ہو گئے تھے۔ جن لوگوں نے ہتھیار اٹھانے سے انکار کیا صلیب برداروں نے ان کو غیرت دلانے کے لیے چرخے اور تکلے بھیجے۔''

ویزلی کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد سینٹ برنارڈ جرمنی گیا اور شاہ کانرڈ سوم کو جنگ مقدس میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ شاہِ جرمنی اس جنگ کے حق میں نہیں تھا لہٰذا اس نے سرد مہری سے اس کی بات سنی اور اسے ٹال دیا۔ سینٹ برنارڈ ایک چالاک انسان تھا۔ اس نے افسردگی سے سر جھکا لیا اور دردناک لہجے میں مخاطب ہوا۔

''میں اپنی غرض سے آپ کے پاس نہیں آیا تھا۔ مجھے تو یسوع مسیح کا پیغام آپ تک پہنچانا تھا۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا اور کہا تھا کانرڈ سے کہنا۔ ''کیا تو ایڈیسہ کے عیسائیوں کا بدلہ نہیں لے گا؟'' سینٹ نے سر جھکائے جھکائے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں نے پیغام پہنچا دیا اب میں چلتا ہوں۔ آپ کا جواب جو انکار میں ہے، وہ بھی خداوند کو پہنچا دوں گا۔''

یہ سننا تھا کہ شاہِ جرمنی تخت سے نیچے اتر آیا اور سینٹ کی قبا کا دامن پکڑ لیا۔

''یسوع مسیح مجھے پیغام بھیجیں اور میں اس پر عمل نہ کروں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے لیکن میری آپ سے ایک گزارش ہے۔ یہ پیغام آپ میرے درباریوں کے سامنے بھی دہرا دیں تاکہ انہیں بھی یقین آجائے اور وہ میرا ساتھ دیں۔''

سینٹ برنارڈ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اگلے دن جب دربار سجا تو سینٹ نے ان کے سامنے نہ صرف پیغام دہرایا بلکہ اپنی جانب سے ایسی پراثر تقریر کی کہ درباری جوش جذبات میں نعرے بلند کرنے لگے اور اپنے بادشاہ سے منتیں کرنے لگے کہ وہ انہیں جلد سے جلد اس جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے۔ بادشاہ نے اسی وقت ''جنگ مقدس'' میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا۔

اعلان ہوتے ہی جرمنی اور فرانس سے صلیبی جنونیوں کا سیلاب امڈ آیا۔

سینٹ کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ مسلسل دوروں پر تھا، اب اس کا نشانہ فرانس اور جرمنی کے سرمایہ دار تھے جن سے وہ دولت اکٹھی کرتا پھر رہا تھا۔ مذہب کے نام پر اس سے بڑی جعل سازی شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام استعمال کرتا اور دولت جمع کرتا رہا۔ اس دولت سے اسلحہ خریدا گیا۔ تیروں، نیزوں، شمشیروں کے انبار لگ گئے۔ اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی قطاریں میلوں تک پھیل گئیں۔

یہ جنگ مذہب کے نام پر لڑی جانے والی تھی اس لیے عورتیں بھی کیوں پیچھے رہتیں۔ انہوں نے بھی اپنی ایک فوج تیار کر لی جس کی قیادت شاہ فرانس کی ملکہ ایلیز کر رہی تھی۔

اس نسوانی فوج میں ہزاروں فاحشہ عورتیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ ان عورتوں کے لالچ میں ہزاروں اوباش نوجوان جنہیں نہ صلیب سے محبت تھی نہ سینٹ برنارڈ سے، اس صلیبی جنگ میں حصہ لینے کے لیے پہنچ گئے تھے۔

لوئیس ہفتم اور کانرڈ نے اپنی اپنی سلطنتوں کے انتظام کے لیے نائب مقرر کیے اور خود جرار فوجیں لے کر قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوئے۔

شاہ فرانس کے ہمراہ عورتوں کی فوج (50 ہزار) کے علاوہ ایک لاکھ جنگجو تھے۔ کانرڈ کے ساتھ اس قدر فوج تھی کہ بقول مورخین نہ تو ان کو سمندر کی لہریں اٹھا سکتی تھیں اور نہ ان کو سمانے کے لیے میدان تھے۔

مورخین کا اندازہ ہے کہ دونوں بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے نو لاکھ جنگجو تھے۔

صلیبی لشکر کا پہلا پڑاؤ قسطنطنیہ تھا۔ وہاں شاہ مینوئل کی حکومت تھی۔ وہ اتنی بڑی فوج کو دیکھ کر گھبرا گیا اور دکھاوے کے لیے پرجوش خیر مقدم کیا۔

کئی ہفتوں کی مہمانداری کے بعد یہ بلا یہاں سے ٹلی۔

یہ فوج دو حصوں میں تقسیم ہوئی اور ایشیائے کوچک میں داخل ہو گئی۔ پہاڑوں میں کیا قدم رکھا موت کے منہ میں پاؤں رکھ دیا۔ دونوں بادشاہان یہاں داخل تو ہو گئے تھے لیکن پرپیچ راستوں کی دشواریوں کا اندازہ نہیں تھا۔ راستوں سے ناواقفیت الگ مصیبت بنی ہوئی تھی۔

ایشیائے کوچک میں اس وقت سلطان مسعود سلجوقی (اول) کی حکومت تھی۔ اس نے جو اس ٹڈی دل کو علاقے میں داخل ہوتے دیکھا تو اپنی فوجوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھیلا دیا۔ صلیبی فوج جونہی ان کی زد میں آئی سلجوقی سپاہیوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور پھر نیچے اتر کر چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جس پہاڑ کی طرف بھاگتے وہاں سلجوقی سپاہی موجود ملتے۔ وہ اس طرح کٹتے رہے جیسے نہتے ہوں۔ کسی کو تلوار اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ چیخ چیخ کر یسوع مسیح کو پکارتے تھے۔ ان کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی۔

اتنا خون بہا کہ صلیبی فوج کے نو حصے مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔

شہنشاہِ جرمنی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو شاہ فرانس غائب تھا۔ اس کے اعصاب پر بھی موت کا خوف ایسا طاری ہوا کہ اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ ایک وادی میں اتر گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی قسمت اسے کہاں لے جا رہی ہے۔ بالآخر وہ کسی نہ کسی طرح ''نیقیہ'' پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شاہ فرانس اس سے پہلے ''نیقیہ'' پہنچ چکا ہے۔ اس کی بیوی ملکہ ایلیز اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے ہمراہ ہے البتہ عورتوں کی فوج جو اس نے بنائی تھی وہ سب کٹ چکی تھی۔

دونوں حکمران جب آپس میں ملے تو اپنی بربادی پر آنسو بہانے کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ دونوں گلے مل کر رو رہے تھے۔

''ہم اس حادثاتی شکست سے ناامید ہونے والے نہیں۔ اب ہمارے دشمنوں میں ایک اور دشمن کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب ہمیں اس سے بھی بدلہ لینا ہے۔ کہو دوست میرا ساتھ دو گے؟''

''اس وقت میں جرمن فوجیوں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتا۔ میں اس موضوع پر تم سے کسی اور وقت بات کروں گا۔''

شہنشاہ جرمنی اس وقت کسی نئے عہد نامے کو ٹال گیا تھا لیکن درحقیقت وہ حوصلہ ہار چکا تھا۔ یہ اس وقت ظاہر ہو گیا جب وہ موسم سرما گزارنے کے بہانے قسطنطنیہ چلا گیا۔

جرمن فرماں روا کے چلے جانے کے بعد بھی شاہ لوئیس اپنے عزم پر قائم رہا اور اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اکیلا ہی مسلمانوں سے انتقام لینے پر عمل پیرا رہے گا۔

وہ نہایت احتیاط سے نیقیہ سے لاؤڈیسیا کی طرف روانہ ہوا۔

اس نے ایک حکمتِ عملی کے تحت فوج کے دو حصے کر دیے جو ہر روز دو نئے سرداروں کے تحت بادشاہ کی ہدایت کے مطابق سفر کرتے تھے۔ ایک دن اگلے حصے کی کمان جیافری ڈی رینکن کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا تھا کہ سمانہ کے بلند پہاڑ کوہ باباداغ کی چوٹی پر جا کر ٹھہر جائے۔ ملکہ ایلیز نے جو اگلے حصے میں سفر کر رہی تھی اصرار کیا کہ سرسبز نشیبی وادی میں قیام کرنا چاہیے۔ جیافری نے بادشاہ کے حکم کو نظر انداز کر دیا اور نشیبی وادی میں اتر گیا۔ اس نے جونہی پہاڑ کی بلندی کو چھوڑا، سلجوقی فوج جو گھات لگائے بیٹھی تھی، اس پر قابض ہو گئی۔

صلیبی فوج کے پچھلے حصے کی قیادت خود بادشاہ کر رہا تھا۔ اس کو اس واقعے کے مطلق خبر نہ ہوئی اور اس نے اطمینان سے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ ہر طرف سے نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند ہوئیں اور سلجوقی ان پر ٹوٹ پڑے۔ ہزاروں صلیبیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ فرانس کے تیس نامور امرا، جو بادشاہ کے محافظ دستے میں شامل تھے، اس معرکے میں ایک ایک کر کے مارے گئے۔

دمشق تک پہنچنے کی آرزو میں لوئیس کا آدھے سے زیادہ لشکر کھیت ہو گیا۔

لوئیس بچے کھچے لشکر کے ساتھ اطالیہ کی بندگارہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

مورخ آرچر ''کارزارِ صلیبیہ'' میں لکھتا ہے۔

''یہ ایک مہلک صدمہ تھا۔ فرانس کا پھول دمشق تک پہنچنے اور پکنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔''

اطالیہ کی بندرگاہ سے وہ جہاز میں بیٹھا اور انطاکیہ پہنچ گیا۔ انطاکیہ..... جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کا حکمران ریمنڈ اس کی بیوی کا چچا تھا۔

ریمنڈ نے اپنی بھتیجی ایلیز کی وجہ سے اس کی خوب پذیرائی کی اور پے در پے شکستوں کا غم بھلانے کے لیے جشن طرب آراستہ کیے۔ شراب کے جام لنڈھائے گئے۔ ایسی بے ہودگی ہوئی کہ مرد عورت کی تمیز ختم ہوگئی۔ شاہی خاندان کی عورتیں صلیبی سورماؤں سے آلودہ ہونے لگیں۔ ملکہ ایلیز ان میں پیش پیش تھی۔

ایلیز کو یہاں ایک ترک مسلمان ملا جس پر وہ ایسی فریفتہ ہوئی کہ وہ دن رات اس کے قدموں میں پڑی رہتی تھی۔ لوئیس کو اپنی بیوی کی خفیہ داستانوں کا علم تھا لیکن یہ کہانی خفیہ نہیں رہ سکی تھی اس لیے لوئیس نے اسے سمجھانا ضروری سمجھا۔

اس نے ایلیز کو خلوت میں بلایا اور جواب طلب کیا۔

''وہ ترک نوجوان کون ہے جس کے ساتھ تمہاری کہانیاں مشہور ہو رہی ہیں؟''

''ایک مضبوط سپاہی۔''

''اور تم اس کی بانہوں میں رہتی ہو۔''

''جس طرح بہت سی کنیزیں آپ کے بستر پر ہوتی ہیں۔''

''میری جان! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ عوامی سطح پر ہماری رسوائی ہو رہی ہے۔''

''رسوائی کا ڈر ہے تو مجھے طلاق دے دو۔''

طلاق کا نام سن کر لوئیس ڈر گیا۔ اس نے ریمنڈ کو درمیان میں ڈالا اور وقتی طور پر صلح کر لی۔ ریمنڈ نے مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن ایلیز کو اس ترک نوجوان کے عشق نے ایسا بے قابو کر دیا تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہی تھی۔ اسے اب لوئیس کا وجود برا لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چچا ریمنڈ کو مجبور کیا کہ وہ لوئیس سے بات کرے اور اسے طلاق دلوا دے۔

شہنشاہ لوئیس نے اس کے بعد بھی صلح کرنی چاہی لیکن ایلیز طلاق لینے پر بضد تھی لہٰذا لوئیس کو طلاق دینی پڑی۔

ایلیز کو طلاق دینے کے بعد لوئیس کا انطاکیہ میں رہنے کا جواز ہی نہیں بنتا تھا۔ اس کی پذیرائی تو اس لیے ہو رہی تھی کہ وہ ایلیز کا شوہر تھا۔ ایلیز کو طلاق دینے کے بعد ریمنڈ کے رویے میں لوئیس کی طرف سے سرد مہری آ گئی تھی لہٰذا اس نے انطاکیہ چھوڑ دیا۔

ایلیز نے بھی کچھ دنوں بعد انگلستان کے شہنشاہ ہنری دوم سے شادی کر لی۔ ترک نوجوان اب بھی اس کے ساتھ تھا جسے وہ انطاکیہ سے انگلستان لے آئی تھی۔ ایک سال بعد ایلیز نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ اس کا نام رچرڈ رکھا۔ اسی بچے کو آگے چل کر عیسائی دنیا نے رچرڈ شیر دل کے نام سے یاد کیا۔ یہی وہ بچہ تھا جس نے جوان ہو کر سلطان صلاح الدین ایوبی سے کئی صلیبی جنگیں لڑیں۔

☆☆☆

شاہ لوئیس انطاکیہ سے نکلا تو اسے دو شکستوں کا دکھ تھا۔ سلجوقیوں سے عبرت ناک شکست اور ایلیز سے جدائی کا دکھ۔ وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنے لوگوں کو منہ دکھاتا۔ اس نے فرانس جانا مناسب نہ سمجھا اور یروشلم پہنچ گیا۔

ان دنوں یروشلم کا بادشاہ بالڈون تھا جو صرف متعصب ہی نہیں تھا بلکہ حدود سلطنت کی وسعت کا شائق بھی تھا۔ اس کا یہ جذبہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنی تخت نشینی کے دن ہی سے یروشلم کی سلطنت کو وسیع کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب جو اس نے شہنشاہ فرانس کو یروشلم میں دیکھا تو اس کو اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی۔ اس نے شاہ فرانس کی خوب آؤ بھگت کی۔

اتفاق کی بات تھی کہ شہنشاہ جرمنی بھی شکست کا داغ لے کر اپنے ملک نہ جا سکا تھا۔ اس نے سوچا کہ یروشلم جا کر بالڈون سے ملے اور اس کی مدد سے کسی مسلم ریاست پر قبضہ کر لے۔ اس کے بعد جرمنی جائے تاکہ فاتح کہلا سکے۔

وہ یروشلم میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لوئیس وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اس اتفاقی ملاقات کو ان دونوں نے نیک شگون سمجھا۔

''یسوع مسیح ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔ ہم دونوں کو اس نے اپنے گھر بلایا ہے تاکہ ہم دونوں متحد ہو کر دشمن سے مقابلہ کریں۔ اس مرتبہ ہمیں ضرور کامیابی ہوگی۔''

دونوں نے متحد رہنے کا عہد کیا اور قسم کھائی کہ وہ آخری مسلمان کے قتل ہونے تک ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

بالڈون کی ہوس ملک گیری نے انگڑائی لی۔ تینوں بادشاہ کئی دن تک اکیلے میں ملاقاتیں کرتے رہے آخر یہ عہد کر کے اٹھے کہ پورے علاقے میں صلیبی اقتدار قائم کر کے دم لیں گے۔

تینوں عیسائی بادشاہوں کا متحدہ لشکر طے شدہ منصوبے کے مطابق تیزی سے دمشق کی طرف بڑھا اور اس شہر کے سامنے پہنچ گیا۔ شہر کے تین طرف مٹی کی مضبوط فصیل بنی ہوئی

تھی اور ایک طرف گنجان باغوں کی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی بڑا لشکر ان سب سے آسانی سے نہ گزر سکتا تھا۔ صلیبیوں نے اس طرف سے شہر کا محاصرہ کرلیا۔

دمشق پر امیر مجیر الدین کی حکومت تھی جو نہایت عیش پرست اور نااہل حکمران تھا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور اس کے وزیر معین الدین نے سنبھال لی تھی اور اب وہ ہی سیاہ وسپید کا مالک تھا۔

وزیر معین الدین کی ہمت تھی کہ وہ کئی ماہ تک صلیبیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ صلیبیوں کا لشکر کئی لاکھ پر مشتمل تھا۔ دمشق کی معمولی سی فوج کب تک مقابلہ کرتی۔ صلیبی آگے بڑھتے ہوئے شہر سے متصل میدان اخضر تک پہنچ گئے۔ اب محض چند ہفتوں کی بات تھی۔ اس کے بعد دمشق کی عظمت خاک میں مل جاتی۔

وزیر معین الدین نے چند سوار شام کی طرف دوڑا دیے کہ نور الدین زنگی کی خدمت میں پہنچ کر دمشق کی حالت زار بیان کریں۔ اس کی زبردست قوت ہی صلیبیوں کا سر توڑ سکتی ہے۔

شام کی سرحدوں پر شام کے سائے دراز ہو رہے تھے کہ یہ سوار سلطان زنگی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حلب کے گلی کوچے اور بازار لوگوں کی چہل پہل سے آباد تھے۔ انہیں یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ چند سوار دمشق سے یہاں پہنچے ہیں لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دمشق پر کیا بیت گئی ہے۔

ان سواروں میں سے ایک وزیر دمشق معین الدین کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔

”اگر اس وقت دمشق عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تو پھر انہیں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ ہم نے جب تک ممکن ہوا دفاع کیا لیکن اب شہر کو بچانے والا کوئی نہیں۔ آپ مسلمانوں کی مدد کو پہنچیے ورنہ دمشق کا ایک مسلمان بھی زندہ نہیں بچے گا۔ شیخ عبدالرحمٰن اور امام یوسف مالکی جیسے مشائخ کبار شہید ہو چکے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سوار بے تحاشا رونے لگا۔

سلطان نور الدین بے چین ہوگیا۔ وہ تاسف سے ہاتھ ملتا جا رہا تھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ پھر اس نے ان سواروں کو تسلی دے کر رخصت کردیا۔

ان کے رخصت ہوتے ہی نجم الدین ایوب اور شیر کوہ کو طلب کرلیا گیا۔ دوسرے مرا بھی بھاگے چلے آئے۔ ان میں صلاح الدین ایوبی بھی تھا۔ سلطان نے ان سب کو دمشق کے نازک حالات سے آگاہ کیا۔ سب کی رائے یہی تھی کہ مسلمانوں کی مدد کو فوراً پہنچا جائے۔ سلطان نے روانگی کا حکم دے دیا۔

”ہمیں رات ہی میں روانہ ہو جانا چاہیے۔“

صلاح الدین نے مشورہ دیا۔ ”روانگی سے قبل اپنے بھائی سیف الدین غازی سلطان موصل کے پاس بھی پیغام پہنچا دیجیے۔ کیا اچھا ہو اگر وہ بھی اپنی فوجیں لے کر دمشق پہنچ جائیں کیونکہ عیسائیوں کے عزائم سیاسی سے زیادہ مذہبی ہیں۔ وہ صرف دمشق کو نہیں مسلمانوں کو کچلنے کے لیے نکلے ہیں۔ وہ اکٹھے ہوئے ہیں تو مسلمانوں کو بھی اکٹھا ہونا چاہیے۔“

سلطان نے تحسین آمیز نظروں سے صلاح الدین کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”شاباش! صلاح الدین مجھے تم سے اسی مشورے کی توقع تھی۔“

”سلطان عالی! آپ سے ایک درخواست بھی ہے۔“

”کہو صلاح الدین۔“

”مجھے بھی اس جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔“

”تم نے اپنے استاد قاضی ابن عرسون سے اجازت لے لی؟ میرا مطلب ہے تمہیں تو خون بہانا اچھا نہیں لگتا۔“

”یہ معاملہ اسلام اور مسلمانوں کا ہے۔“

سلطان زنگی نے اس کا مشورہ بھی قبول کیا اور درخواست بھی۔ اس نے اپنے بھائی سیف الدین غازی کو پیغام بھجوایا اور صلاح الدین کو جہاد میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔

یہ پہلا موقع تھا جب صلاح الدین ایک سپاہی کی حیثیت سے اس جنگ میں شرکت کر رہا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اس کے بعد اس کی پوری زندگی میدان جنگ میں گزرے گی۔

سیف الدین یہ پیغام ملتے ہی ایک جرار فوج لے کر دمشق کی طرف چل پڑا۔ دوسری طرف سے سلطان نور الدین بھی حلب سے دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ یہ دونوں لشکر حمص میں آکر مل گئے۔

صلیبیوں نے جب اس زبردست لشکر کی آمد کی خبر سنی تو انہوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ فی الفور دمشق سے اپنا محاصرہ اٹھالیں چنانچہ وہ راتوں رات دمشق سے یروشلم کی طرف روانہ ہوگئے۔ جنگ کی نوبت ہی نہ آئی۔

اس کے بعد صلیبی لشکر نے عسقلان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی کیونکہ شہنشاہ جرمنی اپنے وطن واپس چلا گیا۔ شاہ فرانس کچھ عرصہ فلسطین میں رہا

پھر اس نے بھی گھر کی راہ لی۔

دوسری صلیبی جنگ جس سرگرمی سے شروع ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ ناکامی اور تباہی پر ختم ہوئی۔

اس جنگ کے تینوں کردار عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ شہنشاہ جرمنی اور شہنشاہ فرانس دونوں نے پھر ”مقدس جنگ“ کا نام نہیں لیا۔ سینٹ برنارڈ اپنے محافظ کے ہاتھوں اس وقت قتل ہوگیا جب وہ کسی فاحشہ عورت کے ساتھ ملوث تھا۔

شہنشاہ جرمنی اور شہنشاہ فرانس نے جنگ سے ہاتھ اٹھالیا تھا لیکن اس بجھی ہوئی آگ میں ایک چنگاری دبی رہ گئی تھی۔ اس چنگاری کا نام گارنیٹ تھا جو والی طلیطلہ (اندلس) کا بیٹا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہونے آیا تھا۔

دونوں شہنشاہوں کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا تھا لیکن اس کی ماں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کی قسم دی اور عہد کیا کہ وہ اس وقت تک اندلس واپس نہیں جائے گی جب تک اس کا بیٹا کسی نہ کسی عیسائی ریاست پر قبضہ نہیں کرا دیتا۔

یہ نوجوان بھی ایسا باہمت اور سعادت مند نکلا کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ یروشلم کی قریب کی بستیوں میں نکل جاتا اور لوگوں کو جنگ کی ترغیب دیتا۔ دولت کا لالچ بھی اس کا ایک ہتھیار تھا۔ اس نے مقامی عیسائیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کرلی۔ وہ برق رفتاری سے نکلا اور سب سے پہلے ”حصن عریمہ“ کا قلعہ فتح کرکے طرابلس کی طرف بڑھنے لگا۔

یہ قلعہ طرابلس کے عیسائی حکمران کی ملکیت تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک عیسائی لشکر دوسری عیسائی سلطنت پر حملہ آور ہوگا۔ اس نے بھی تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق سلطان نور الدین کو لکھا۔ ”میں حصن عریمہ پر عیسائیوں کے قبضے کی نسبت مسلمانوں کے قبضے کو ترجیح دیتا ہوں۔ آپ اس کو فتح کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

نور الدین ان دنوں دمشق آیا ہوا تھا۔ اس کا مصاحب خاص صلاح الدین بھی اس کے ساتھ تھا اور اتنا لشکر بھی اس کے ساتھ تھا کہ گارنیٹ کا دماغ درست کیا جا سکتا تھا۔ سیف الدین غازی کا لشکر بھی اس کی مدد کو آگیا۔ یہ متحدہ لشکر دو تین دن میں ”حصن عریمہ“ پہنچ گیا اور اسے محاصرے میں لے لیا۔

چار دن تک مسلمانوں کی ہمت نہ ہو سکی کہ فصیل کے قریب پہنچتے کیونکہ تیروں کی زبردست بارش ہو رہی تھی۔ پانچویں دن مسلمانوں نے بارودی سرنگ لگا کر قلعے کی جنوبی دیوار کو اڑا دیا اور پھر قلعے میں گھس گئے۔ صلیبیوں نے مقدور بھر مقابلہ کیا لیکن جب کثیر تعداد میں اپنے ساتھیوں کو قتل ہوتے دیکھا تو ہتھیار ڈال کر امان کی التجا کرنے لگے۔ مسلمانوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور صلیبیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں گارنیٹ اور اس کی ماں بھی شامل تھی۔ جب ان دونوں کو سلطان کے سامنے لایا گیا تو سلطان نے سوال طلب نظروں سے صلاح الدین کی طرف دیکھا، مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟

”امیر محترم! ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا دین ہمیں عورتوں کے ساتھ رعایت کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اس خاتون کو اندلس جانے کی اجازت دے دی جائے۔ رہا معاملہ گارنیٹ کا تو یہ ہتھیار ڈال چکا ہے اس لیے ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اسے قتل کریں۔ اسے داخل زنداں کیا جائے کیونکہ اس جنگ میں قتل ہونے والے عیسائیوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔“

سلطان نے صلاح الدین کے مشورے کو شرف قبولیت بخشا اور ان سرداروں کے مشوروں کو رد کردیا جو چاہتے تھے گارنیٹ اور اس کی ماں کو قتل کردیا جائے۔

☆☆☆

ایک سال بعد عیسائیوں نے ایک مرتبہ پھر جسارت کی اور وہ بصریٰ کے مقام پر آئندہ لائحہ عمل تجویز کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ طے یہ پایا کہ ارض شام کے تمام عیسائی متحد ہو کر ”حلب“ پر حملہ کردیں۔ جب نور الدین ان کے مقابلے پر آئے تو نصف عیسائی لشکر اس کو لڑائی میں الجھائے رکھے اور نصف دوسرے اسلامی مقبوضات پر حملہ کردے۔ اس طرح نور الدین کی قوت کئی محاذوں پر بٹ جائے گی اور وہ آسانی سے اس کو مغلوب کرلیں گے۔

دوسری طرف اسی سازش کے تحت شامی مقبوضات میں عیسائیوں نے بغاوت کردی۔ جگہ جگہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔

سلطان نور الدین کے وقائع نگاروں نے خبر پہنچائی کہ عیسائی بصریٰ میں جمع ہو رہے ہیں اور حلب پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ وقت سلطان کے لیے بہت مشکل تھا۔ ایک طرف اپنے علاقے کی بغاوت تھی دوسری طرف حلب پر حملہ کرنے والے عیسائی تھے۔ اس مرتبہ بھی صلاح الدین کی دانش نے

سلطان کو ایک راہ دکھائی۔

''آپ اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک کو بصریٰ کی طرف بھیجیں۔ دوسری فوج کو بغاوت کچلنے پر مامور کر دیں۔''

سلطان نے اس مشورے پر عمل کیا۔ ایک مختصر سی فوج باغیوں کے لیے مختص کی اور اس کا نگراں صلاح الدین ایوبی کو بنایا۔ یہ اس کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ سلطان زنگی نے اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ لیا تھا کہ اس نوجوان کو ابھی بہت سے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ وہ اسی لیے اسے تربیتی مراحل سے گزار رہا تھا۔

عیسائیوں کی یہ بغاوت کوئی عام بغاوت نہیں تھی۔ اس بغاوت کی جڑیں یروشلم میں تھیں۔ اس بغاوت کا سرغنہ سینٹ مارلو تھا جو یروشلم کے حکمراں بالڈون ثالث کی ایما پر شام میں داخل ہوا تھا اور عام عیسائیوں کو اس بغاوت پر اکسایا تھا۔ رقم بھی اسی نے مخصوص کی تھی۔ شام کا گرجا گھر اس بغاوت کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس گرجا گھر کے تہ خانے میں ہتھیار جمع کیے گئے تھے جو عیسائیوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔

صلاح الدین نے باغیوں کے قلب میں داخل ہو کر اس قدر شدید حملے کیے کہ ہزاروں عیسائی مسلمانوں کی شمشیروں کی غذا بن گئے۔

کہتے ہیں بالڈون شاہ یروشلم نے ان باغیوں کی مدد کے لیے لشکر بھیجا تھا لیکن وہ خوفزدہ ہو کر سرحدوں ہی سے واپس چلا گیا۔

مسلمانوں نے کئی ماہ تک پرورش پانے والی بغاوت کو چند گھنٹوں میں فرو کر دیا۔ باغی ملیامیٹ ہو گئے اور سینٹ مارلو نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گرجا گھر میں پناہ لی۔

صلاح الدین ایوبی بڑی آسانی سے گرجا گھر میں داخل ہو کر سینٹ مارلو کو گرفتار کر سکتا تھا لیکن صلاح الدین نے اپنے سپاہیوں کو اس کی اجازت نہیں دی۔

''میرا طریقۂ جنگ یہ ہے کہ جنگ کے دوران تمام گرجا گھر محفوظ رہیں گے، اگر کوئی عیسائی اپنے عبادت خانے میں پناہ حاصل کر لے تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔''

''اس طرح تو ہماری محنت ہی اکارت چلی جائے گی۔ وہ اگر گرفتار نہ ہوا تو کسی دن پر خطرے کا سبب بنے گا۔'' کئی سرداروں نے کہا۔

صلاح الدین بھی یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس کی دانش نے درمیان کا ایک راستہ نکالا۔

''ایک غیر مسلح سپاہی کو گرجا میں بھیجا جائے جو سینٹ مارلو کو میرے سامنے پیش ہونے کا حکم دے۔''

''اگر وہ پھر بھی نہ آیا؟''

''گرجا کا محاصرہ کیے رہو۔ جب خوراک ختم ہو جائے گی تو خود باہر نکل آئے گا۔ پھر بھی نہیں آیا تو بھوک سے مر جائے گا۔ ہم پر قتل کا الزام تو نہیں آئے گا۔''

وہی ہوا، ایک رات اور ایک دن کے بعد سینٹ مارلو اور اس کے ساتھی بھوک پیاس سے نڈھال باہر نکل آئے۔

وہ دن عجیب تھا۔ صلاح الدین اپنے پہلے باقاعدہ معرکے میں سرخرو ہو کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کا ایک بڑا دشمن سینٹ مارلو قیدی کی شکل میں تھا۔

سلطان پر پہلی مرتبہ صلاح الدین کے جنگی جوہر کھلے تھے۔ اس نے سر دربار اس کی تعریف کی اور مختلف شہروں میں اسے جاگیریں عطا کیں۔

سلطان کی دوسری فوج جو عیسائیوں کی سرکوبی کے لیے بصریٰ کی طرف گئی تھی اس نے بھی کامیابی حاصل کی۔ کثیر التعداد عیسائی جو شام کے کونے کونے سے یہاں جمع ہوئے تھے، مقتول ہوئے اور باقی نہایت بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

⚑⚑⚑

سلطان زنگی کا بھائی سیف الدین غازی، حاکم موصل ایک مہم سے فارغ ہو کر موصل واپس آ رہا تھا کہ راستے میں سخت بیمار ہو گیا اور موصل پہنچتے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس کی موت کے بعد موصل بھی نور الدین کے تصرف میں آ گیا۔

انہی دنوں دمشق کے وزیر معین الدین کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے ساتھ ہی دمشق کا نظام دگرگوں ہو گیا۔ حاکم امیر مجیر الدین ایک نااہل حکمران تھا۔ عیسائیوں نے اس کی نااہلی سے فائدہ اٹھایا اور ''جران'' کے نواحی علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ وہ دن دہاڑے مسلمان عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لے جاتے تھے اور ان کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالتے تھے۔

نور الدین کو اس کا علم ہوا تو اس نے عیسائیوں کی سرکوبی کا ارادہ کر لیا اور ایک سفارتی وفد شیر کوہ کی قیادت میں امیر مجیر الدین کے پاس روانہ کیا۔ صلاح الدین بھی بہ طور نائب اس وفد کے ہمراہ تھا۔

شیر کوہ کا خیال تھا کہ اس کا زبردست استقبال کیا جائے گا لیکن سرحدی سپاہیوں نے نہ صرف بے رخی کا مظاہرہ

کیا بلکہ وفد کو آگے بڑھنے سے بھی روک دیا۔ شیر کوہ نے اپنے ایک فوجی افسر کو امیر کے پاس بھیجا اور اس سے ملاقات کا خواہش مند ہوا۔

یہ فوجی افسر واپس آیا تو غصے سے اس کی مٹھیاں بند تھیں۔

امیر مجیر الدین نے کہا ہے۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے واپس چلے جاؤ ورنہ ہماری تلواریں اور نیزے تمہارا استقبال کریں گے اور تم کو شکست اور نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

یہ ایسا سخت جواب تھا کہ شیر کوہ اسے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس اس وقت ایک ہزار سوار تھے اور وہ خود ایسا جری سالار تھا کہ ان ایک ہزار سواروں کے ساتھ دمشق میں گھس جانا اس کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا لیکن ظاہر ہے وہ سلطان کی اجازت کے بغیر یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا اور دمشق سے چالیس میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا۔ ایک خط میں اس ذلت آمیز واقعے کی تفصیلات لکھیں اور اپنے بھتیجے صلاح الدین کے حوالے کر دیا۔

''اس خط کو فوراً سلطان تک پہنچا دو اور سلطان جو کچھ کہیں مجھ تک پہنچا دو۔''

صلاح الدین شہسواری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے فاصلہ سمیٹا اور حلب پہنچ کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سلطان تک تفصیلات پہنچیں تو وہ غصے کے عالم میں مسند سے نیچے اتر آیا۔

''کیا اب بھی مجھے زیب دیتا ہے کہ میں مسند پر بیٹھا رہوں۔ اب دمشق کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔''

دوسرے دن وہ ایک لشکر جرار لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ صلاح الدین اس کے ساتھ تھا۔ دمشق سے چالیس میل پہلے اسد الدین شیر کوہ خیمہ ڈالے ہوئے تھا۔ سلطان نے بھی وہیں پڑاؤ کیا اور امیر مجیر الدین کے پاس یہ خط روانہ کیا۔

''تم خود یہاں آ ؤ یا اپنے کسی معتمد امیر کو میرے پاس بھیجو تاکہ باہمی گفت و شنید سے ہم کسی فیصلے پر پہنچ جائیں اور ناحق مسلمانوں کی خوں ریزی نہ ہو۔''

سلطان کو یہ خبریں مل رہی تھیں کہ امیر مجیر الدین نے شاہ یروشلم اور دوسرے عیسائی حکمرانوں سے ساز باز کر لی ہے۔ سلطان اس لیے اسے بلا رہا تھا تاکہ وہ اس سے تصدیق کر سکے۔

امیر مجیر الدین نے سلطان کے اس رویے کو کمزوری پر محمول کیا اور بہ دستور اپنے نامعقول رویے پر اڑا رہا، اس نے سلطان کے سفیر کو بھی بے عزتی کر کے دربار سے نکال دیا تھا۔

سلطان کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے دمشق کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایسا سخت دباؤ ڈالا کہ مجیر الدین گھبرا گیا اور صلح کا خواہش مند ہوا۔ سلطان ہمیشہ اس کا قائل رہا تھا کہ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں۔ اس نے یہ درخواست قبول کر لی۔

اس معاہدے کے مطابق مجیر الدین نے تسلیم کیا کہ جامع دمشق میں خلیفۂ بغداد اور سلطان سلجوقی کے نام کے بعد خطبوں میں سلطان نور الدین کا نام بھی پڑھا جائے گا۔ تمام فوجی سرداروں کا تقرر نور الدین کی منظوری سے ہوا کرے گا اور اسی کے نام کا سکہ دمشق میں رائج کیا جائے گا البتہ مالی انتظامات مجیر الدین کے پاس رہیں گے۔

اس سے اگلے سال سلطان نور الدین افامیہ کے قلعے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ قلعہ انطاکیہ سے پچاس میل دور جنوب مشرق میں عیسائیوں کا ایک مضبوط گڑھ تھا۔ عیسائی فوجیں یہاں سے اکثر حماۃ اور شیزر کے نواحی علاقوں پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ ان کا قلع قمع کرنا ضروری تھا۔

نور الدین صرف سات ہزار سوار لے کر حلب سے نکلا اور افامیہ پہنچ گیا اور قلعے کی ناکہ بندی کر لی۔ صلاح الدین کے چچا شیر کوہ کی بے مثال بہادری نے اس پہاڑی قلعے کو فتح کر لیا۔ نور الدین اپنے لشکر کے ساتھ مظفر و منصور قلعہ کے اندر داخل ہوا اور خود اپنے ہاتھ سے قلعے کے سب سے بلند برج پر اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

⚑⚑⚑

ایڈیسہ کا پرانا حاکم جوسلن ثانی ابھی تک مفرور تھا۔ اس نے حلب کے شمال میں کچھ علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور آئے دن اسلامی علاقوں پر چھاپے مارتا رہتا تھا۔

وہ ایڈیسہ میں دو مرتبہ شکست کھا چکا تھا لیکن ابھی تک ایڈیسہ کو بھولا نہیں تھا۔ اس نے جب سنا کہ نور الدین افامیہ کی طرف گیا ہوا ہے تو وہ اپنے دارالحکومت ایڈیسہ پر فیصلہ کن حملے کے لیے نکلا۔ یہ اس کی بدبختی کہ افامیہ کا قضیہ بہت جلد نمٹ گیا۔ سلطان واپس آ رہا تھا کہ راستے میں جوسلن کی فوج سے اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔

سلطان نے خلاف معمول قلب لشکر کو اسد الدین شیر کوہ کے سپرد کیا اور خود میمنہ کی قیادت سنبھالی۔ یہ اس کی ایک جنگی چال تھی جسے جوسلن سمجھ نہیں سکا اور اپنا سارا زور

قلب لشکر پر ڈال دیا۔ شیرکوہ نے سلطان کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ ادھر سلطان اپنے میمنہ کے ہمراہ دو کوس کا چکر کاٹ کر عیسائیوں کی پشت پر حملہ آور ہو گیا۔ عیسائیوں نے اس سے مقابلے کے لیے جونہی پیچھے کی طرف گردن گھمائی، شیرکوہ نے دلیرانہ حملہ کر دیا۔ عیسائی لشکر درمیان میں پھنس گیا۔ عیسائیوں کی ترتیب ٹوٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوب ہو گئے۔ جوسلن نہایت بے بسی کے عالم میں گرفتار ہوا۔

حلب کے بازاروں میں لوگ قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ وہ اتنے بے قابو ہو رہے تھے کہ قطاریں توڑ کر باہر نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔ شاہی کارندے ہاتھوں میں کوڑے لیے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے ورنہ کب کی قطاریں ٹوٹ چکی ہوتیں۔

ہٹو بچو کا شور بلند ہوا۔ وہ منظر نظروں کے سامنے آ گیا جس کے انتظار میں لوگ تاروں کی چھاؤں میں یہاں آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور اب دوپہر ہونے کو تھی۔

ایڈیسہ کا حاکم جوسلن ثانی زنجیروں میں جکڑا فوجیوں کی نگرانی میں پیدل چلا آ رہا تھا۔ ندامت سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا، سپاہی اسے کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔

اسے دیکھتے ہی مجمع بے قابو ہو گیا۔ لوگ نعرے بلند کر رہے تھے کہ اسے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ کچھ لوگ مطالبہ کر رہے تھے کہ اس دشمن اسلام کے ٹکڑے کر کے سڑک پر پھینک دیے جائیں۔

شور اتنا بڑھا کہ سپاہیوں کو کوڑے برسانے پڑے۔ قیدی کو بڑی مشکل سے دربار شام تک پہنچایا گیا۔ یہاں بھی حال کچھ مختلف نہیں تھا۔ امرائے کبار جوسلن کی تکا بوٹی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ آج سب کو وہ دن یاد آ رہا تھا جب جوسلن نے ایڈیسہ پر شب خون مارا تھا اور ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ جوسلن کو قتل کر کے اس کی لاش سڑک پر پھینک دی جائے جسے کتے بھنبوڑتے پھریں۔

سلطان نے ایک اجلاس پھر بلایا جس میں یہ طے کیا جانا تھا کہ جوسلن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے اس کے لیے سزائیں تجویز کیں۔

صلاح الدین کو بھی بولنے کا موقع دیا گیا۔ اس کا ہمیشہ سے کہنا تھا کہ مجھے جنگ سے نفرت نہیں لیکن میں خون بہتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے اس وقت بھی خون بہانے سے گریز کیا۔

''اگر جوسلن کو قتل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ایک نہیں تو دو دن میں اسے بھول جائیں گے۔ اس کے لیے تو ایسی سزا ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عبرت کے نشان کے طور پر یاد رکھیں اور وہ خود بھی اپنے جرائم کی فہرست کو دہراتا رہے اور آنسو بہاتا رہے۔ وہ زندہ ہو لیکن مردوں سے بدتر ہو۔ اسے قتل کر کے تکلیفوں سے نجات دینے کے بجائے زندہ رکھ کر تکلیفیں پہنچائی جائیں۔''

سلطان نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور اسے حلب کے قید خانے کی ایک اندھیری کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ حلب کے اس قید خانے میں وہ نو برس تک زندہ رہا۔ اس دوران وہ اپنی بصارت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

جوسلن کو سپرد زنداں کرنے کے بعد سلطان نورالدین نے ریاست ایڈیسہ کے باقی علاقوں کی طرف فاتحانہ پیش قدمی شروع کر دی اور بہت تھوڑے عرصے میں قورس، تل فالہ، کفر سوب راوندان، مرعش، عینی تاب، نہر الجور، حصن البارہ وغیرہ کے قلعے چھین لیے، اس کے بعد مضبوط ترین قلعہ ''تل باشر'' پر بھی سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

ان تمام مہمات میں صلاح الدین ایوبی سلطان کے ہمراہ تھا اور اس کی بہادری کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے۔ سلطان اس کی فہم و فراست کا بھی قائل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے مشورے ہمیشہ صائب ہوتے۔

☆☆☆

دمشق کے حکمراں امیر مجیرالدین سے صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا لیکن اس نے بدعہدی پر کمر باندھی۔ جو شرائط ہوئی تھیں ان سے نہ صرف روگردانی کی بلکہ عیسائیوں سے ساز باز شروع کر دی۔ بعض مورخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس نے یروشلم کی صلیبی ریاست کو خراج دینا منظور کر لیا تھا۔ اس کے عوض شاہ یروشلم نے خطرے کے وقت فوجی مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ امداد کا یہ وعدہ یونہی نہیں تھا بلکہ دوستانہ تعلقات کے پردے میں عیسائی دمشق پر اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ شاہ یروشلم کی نظر ایک طرف تو دمشق پر تھی اور دوسری طرف خاص مصر پر۔

سلطان نورالدین اس صورت حال پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ یہ کیسے گوارہ کر سکتا تھا کہ عیسائی مصر اور دمشق پر قبضہ کر کے وہاں کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیں اور پھر خود اس کو گھیرے میں لے لیں لیکن والی دمشق کے منافقانہ کردار نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ دمشق کے اس

سنگ گراں کی وجہ سے نہ تو وہ مصر کی طرف بڑھ سکتا تھا اور نہ یروشلم کی توسیع پسند صلیبی ریاست پر کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ بار بار کیے گئے معاہدوں کی خلاف ورزی کے بعد جب امیر دمشق کا چہرہ کھل کر سامنے آ گیا تو نورالدین کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ جسد اسلام کے اس رستے ہوئے ناسور کو ہمیشہ کے لیے کاٹ کر پھینک دے۔

سلطان نے ایک مرتبہ پھر حجت پوری کی اور امیر دمشق کے پاس اپنے قاصد حمیدالدین کو بھیجا اور اس سے ملاقات کا خواہاں ہوا۔

قاضی حمیدالدین واپس آئے تو ان کا چہرہ جگہ جگہ سے زخمی تھا، ہونٹ پھٹا ہوا تھا۔ پورا چہرہ جمے ہوئے خون سے آلودہ تھا۔

''قاضی صاحب، یہ آپ کے چہرے کو کیا ہوا؟''

''یہ آپ کے خط کا جواب ہے امیر محترم!''

''ہمیں اس جواب کی توقع تو نہیں تھی۔''

''امیر مجیرالدین نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ میں یہ چہرہ اپنے امیر کو دکھا دوں اور کہوں کہ یہ آپ کے خط کا جواب ہے۔''

سلطان اپنی مسند سے نیچے اتر آیا اور شمشیر بے نیام کر لی۔ ''وہ اگر یہ چاہتا ہے کہ فیصلہ تلوار سے ہو تو ہم اس کی خواہش کا احترام کریں گے۔''

سلطان اس وقت دمشق سے کچھ فاصلے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ منزلیں طے کرتا ہوا دمشق کے مشرقی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ صلاح الدین ایوبی ایک محافظ کے طور پر اس کے ساتھ تھا۔ شمال کی طرف سے شیرکوہ نے حملہ کیا۔ اس دن دمشقی لشکر نے پیچھے ہٹ کر شہر کے دروازے بند کر دیے اور فصیلوں پر سے آگ برسانی شروع کر دی۔ ایک دن اور ایک رات یہی کیفیت رہی۔ تیسرے دن سلطان اور شیرکوہ نے مل کر ایک فیصلہ کن حملہ کیا اور فصیل کو ایک جگہ سے توڑ کر شہر کے اندر داخل ہو گئے۔

دمشقی فوج پہلے ہی بددل ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً ہتھیار رکھ دیے۔ سلطان نے اہل دمشق کو عام معافی دے دی اور دمشق کو اپنے تسلط میں لے لیا۔

مجیرالدین اپنے چند امرا کے ساتھ قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ اسے امید تھی کہ معاہدے کے مطابق بالڈون اس کی مدد کو ضرور آئے گا لیکن تین دن کے انتظار کے بعد چوتھے دن وہ قلعہ سے باہر نکل آیا اور اپنے آپ کو زنگی سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ اسے فوراً سلطان کے پاس پہنچا دیا گیا۔

مجیرالدین نے سلطان کے سامنے پہنچتے ہی اپنی تلوار کمر سے کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔

''میں کرم کا خواستگار ہوں۔ پچھلے عہد ناموں میں آپ میری جاں بخشی کا وعدہ فرما چکے ہیں۔''

''تم نے کئی وعدے فراموش کیے لیکن میں اپنا وعدہ نہیں بھولا ہوں۔''

سلطان نے اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں اور اسے حمص کی جاگیر دے کر ہمیشہ کے لیے دمشق سے رخصت کر دیا۔

مجیرالدین کے دمشق سے رخصت ہونے کے بعد دربار عام منعقد کیا جس میں شہر کے تمام اہل علم، ذی ثروت اور تجارت پیشہ لوگ موجود تھے۔ سلطان نے ان تمام لوگوں کو جن کا مال و اسباب لڑائی میں برباد ہو گیا تھا، معقول معاوضہ دیا اور علما کو خلعتوں سے نوازا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف قسم کے محاصل میں زبردست رعایتوں کا اعلان کیا۔

اسی دربار میں سلطان نے صلاح الدین ایوبی کو کوتوال شہر مقرر کیا۔ ابوسالم ہمام دمشق کا دیوان تھا۔ ان تقرریوں کے بعد سلطان حلب لوٹ گیا۔

دمشق کا کوتوال بننے کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اس شہر کا بگڑا ہوا انتظام اس عمدگی سے درست کیا کہ چند ماہ میں لوگوں کی بگڑی ہوئی عادتیں سدھر گئیں۔ اس کے نائبین حلیہ بدل کر گلیوں میں گشت کرتے تھے اور مقامی باشندوں کی حرکات کی نگرانی کرتے تھے اور پل پل کی خبریں صلاح الدین تک پہنچاتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ خود بھی حلیہ بدل کر دمشق کی گلیوں میں گھوما کرتا تھا۔ اس کی ان انتظامی صلاحیتوں نے دمشق میں امن و امان کی فضا پیدا کر دی۔

بعد میں جب نورالدین نے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنایا تو عمارتوں، باغات اور مساجد کا ایسا جال بچھ گیا کہ یہ شہر عروس البلاد کہلانے لگا۔

مشہور مورخ ہیرلڈ لیم نے دمشق کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''عروس البلاد دمشق نورالدین کا پایۂ تخت تھا۔ لیمو اور سفیدے کے درخت اس کے شاداب باغوں کی زینت تھے۔ سبزے کی افراط کی وجہ سے فضا صحرا کے گرد و غبار سے پاک رہتی تھی۔ مسجد کی رنگین شیشوں والی کھڑکیوں سے سفید عمامے باندھے حافظ پیہم تلاوت قرآن میں مشغول

نظر آتے۔ رقت وسوز کی ایک عجیب کیفیت طاری رہتی۔ اسی مسجد کے اردگرد شہتوت کے گہرے سایوں تلے گلاب کے باغیچوں میں اسلام کے اولین دور کے مشاہیر کی قبریں اور مزار تھے۔ شہر کے چاروں طرف (دروازوں) سے کبھی بچوں کے تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی جو بھاگتے ہوئے مکتب جاتے، کہیں ہانپتے ہوئے سست خرام مریض دکھائی دیتے اور کبھی امرا کے پُرتمکنت قدموں کی آواز کانوں میں پڑتی۔

سلطان نے دمشق کو امن بخشا تھا۔ ہر طرف خوش حالی تھی، سکون تھا۔ محراب دار گلیوں کی سنگین جالیوں کے پیچھے کئی بوڑھے بےفکری سے آبنوس اور ہاتھی دانت کی مرصع بساط پر سفید سر جھکائے شطرنج کھیلنے میں مستغرق نظر آتے۔ کئی باریش جوان بازاری گپ سے دل بہلاتے۔ رات کو ہر طرف رنگینی ورعنائی کا سماں ہوتا۔ پُرشکوہ ایوانوں میں رنگین قالینوں پر اجلے دسترخوان بچھے ہوتے۔ لوبان کی تیز خوشبو سے فضا گراں بار ہوتی اور عود ورباب کے تاروں کی کیف آفرینی سے ایک سرخوشی کا عالم طاری ہوتا۔ معزز شخصیتیں تمکنت وشان سے ایوانوں میں جلوہ افروز ہوتیں اور ضیافت کا پُرمسرت ہنگامہ شروع ہوجاتا۔ جھروکوں کی مرمریں جالیوں سے لگے ہوئے کسی حسین چہرے کی منتظر سیاہ غزالی آنکھیں کوچہ وبازار سے گزرنے والے سایوں کا تعاقب کرتی ہوئی کسی امیر کے رسالے کی مشعلوں کی روشنی یا کسی نیم خوابیدہ راہرو کے چراغ کی جھلملاتی لو میں گم ہوجاتیں۔''

یہ کہانی ہے تو ذرا بعد کی کہانی لیکن ہے تو سلطان نورالدین اور اس کے معتمد خاص کی کوششوں کی داستان۔

☆☆☆

یہ خبر ہی ایسی تھی کہ یروشلم تک محدود نہیں رہ سکتی تھی۔ عیسائیوں کی آہ وبکا کی آوازیں ''شام'' تک سنائی دیں۔ دمشق کے بازاروں میں اس خبر پر تبصرے ہورہے تھے۔

''شاہ یروشلم بالڈون ثالث دنیا سے رخصت ہوگیا۔''

چند سفید سر والے بوڑھے ایک جگہ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے دوسرے بوڑھے کا فرزیں پیٹتے ہوئے بساط الٹ دی۔

''اب مہرے چلنے کا وقت گزر گیا۔ جن ہاتھوں نے یروشلم ہم سے چھینا تھا وہی ہاتھ ہمیں یروشلم واپس کریں گے۔''

''بے چارہ دمشق پر قبضہ کرنے کی حسرت میں دنیا سے چلا گیا۔''

''اب کون بادشاہ بنا ہے۔''

''امارک نام ہے۔ اموری کے نام سے مشہور ہے۔''

''دیکھو یہ شخص مسلمانوں کے لیے کیسا ثابت ہوتا ہے۔''

''عیسائی سب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ متعصب، کینہ ور، یہ بھی ہوش میں آتے ہی مسلمان ریاستوں پر حملے کرے گا۔''

''سلطان کو چاہیے، اسی وقت یروشلم پر حملہ کردے۔''

''ہاں چاہیے تو یہی۔ سلطان خود بھی یہی سوچ رہا ہوگا۔''

دمشق میں ہر جگہ یہی باتیں ہورہی تھیں۔ یہی باتیں سلطان کے امرا کے درمیان بھی ہورہی تھیں۔ پھر چند امرا نے سلطان کو بھی یہی مشورہ دیا کہ ہمیں عیسائیوں کے ضعف سے فائدہ اٹھا کر یروشلم پر حملہ کردینا چاہیے۔

سلطان کی اعلیٰ ظرفی نے یہ گوارا نہیں کیا، اس نے اپنے امرا کو سمجھایا۔

''ہم کو غم زدہ عیسائیوں پر رحم کھانا چاہیے۔ بالڈون ان کے نزدیک بہت اچھا بادشاہ تھا۔ اس وقت جبکہ وہ اس کا سوگ منا رہے ہیں ان پر حملہ کرنا مردانگی سے بعید ہے۔ ان کے ہوش وحواس بحال ہولیں تو میں ان سے ہر وقت لڑ سکتا ہوں۔''

بعض لوگوں کے نزدیک سلطان نے یروشلم پر قبضہ کرنے کا ایک سنہری موقع ضائع کردیا۔

☆☆☆

مصر کی فاطمی خلافت کی شوکت وسطوت کا انحطاط پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کے وسط سے شروع ہوگیا تھا۔ ظاہری آب وتاب کسی حد تک برقرار رہی لیکن بعد میں یہ ظاہری ڈھانچا بھی تیزی سے درہم برہم ہونا شروع ہوگیا۔

دسویں فاطمی خلیفہ کے عہد میں مصر کے ضعف واضمحلال کی یہ کیفیت ہوگئی کہ حکومت مصر ہر سال صلیبی فرماں رواؤں کو ایک کثیر رقم محض اسی لیے بھیجتی تھی کہ وہ مصر پر چڑھائی نہ کریں۔ خلیفہ کی حکومت برائے نام تھی۔ وہ اپنے وزیر شاور کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور شاور کا حال یہ تھا کہ اس نے شاہ یروشلم سے خفیہ معاہدہ کرلیا تھا۔ وہ خلیفہ کو قتل کرکے خود حکمران بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ یروشلم کا نیا فرماں روا اموری مدت سے مصر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور بڑی دلچسپی

سے اس بدقسمت ملک کے مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ گزشتہ چند سالوں کی وزارت گروی نے مصر کے قوائے حکومت کو مفلوج بنا کر رکھ دیا تھا۔ وزرا کے درمیان جنگ اقتدار نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔

اموری اعلیٰ پائے کا جنگ آزما تھا۔ اس نے یقینی طور پر محسوس کرلیا تھا کہ قاہرہ اور سرزمین نیل کی تسخیر کے بعد ہی صلیبی حقیقی غلبہ کرسکتے ہیں۔ اس طرح وہ دمشق کے سلطان کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔ اگر وہ قاہرہ اور رودبار سوئز فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو دنیائے اسلام کو شمالی افریقا کی مسلمان سلطنتوں سے جدا کرسکیں گے۔

اپنے ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے اموری ایک جرار فوج لے کر مصر پر چڑھ دوڑا اور بلبیس کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ خلیفہ عاضدالدین اتنا بدحواس ہوا کہ اس نے سلطان نورالدین کے نام خط تحریر کیا۔ اس خط میں اس نے اللہ اور رسول کا واسطہ دے کر سلطان کو اپنی مدد کے لیے پکارا تھا۔

نورالدین اس خط سے پہلے ہی مصر کے حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مصر کے داخلی معاملات میں دخل دینے سے ہمیشہ گریز کیا تھا لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ عیسائی مصر پر قابض ہوکر یروشلم کے مسلمانوں کی تباہی کی تاریخ کو دہرائیں اور عالم اسلام کے لیے خطرہ بن جائیں۔ یہ خط اس کے لیے مزید تشویش کا باعث بنا۔ اس نے فوری طور پر اسدالدین شیرکوہ اور صلاح الدین کو ایک لشکر جرار کے ساتھ مصر روانہ کیا۔

شیرکوہ اور صلاح الدین نے بڑی جانبازی سے جنگ کی اور صلیبی فوج کو فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ اس نے اموری کی پسپائی کو غنیمت سمجھا اور شجاعانہ یلغار کرتا ہوا مصر کے نجات دہندہ کی حیثیت سے قاہرہ میں داخل ہوگیا۔

خلیفہ نے بہ ظاہر گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا لیکن اس کے دل میں شکوک وشبہات سر اٹھا رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ شیرکوہ کو وزارت کا منصب دینے پر مجبور تھا۔

شیرکوہ نے یہ وزارت صرف نام ونمود کے لیے نہیں لی تھی۔ اسے مصر کا انتظام اس حد تک درست کرنا تھا کہ آئندہ صلیبی فوج کو اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہو۔ اس نے خود اپنے محاصل جمع کرنے شروع کیے۔ فاطمی عاملوں کو اس نے پس پشت ڈال دیا اور ہر کام اپنی مرضی سے کرنے لگا۔ اہل قاہرہ خوف وتحسین کے ملے جلے جذبات سے اس کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کررہے تھے۔ وہ ایک نامور سالار تھا اور پھر سلطان زنگی کی پشت پناہی اسے حاصل تھی۔ کس کی مجال تھی جو اس کے خلاف لب کشائی کرتا۔

ابھی شیرکوہ کو وزیر بنے دو تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ خناق کے عارضے میں اس کا انتقال ہوگیا۔

اس کی موت عرصے تک بحث طلب بنی رہی۔ لوگ دبے دبے لفظوں میں کہتے رہے کہ شیرکوہ کو راستے سے ہٹایا گیا ہے لیکن کسی کے پاس اس کا ثبوت نہیں تھا۔

یہ شبہ اس لیے تقویت پکڑ گیا تھا کہ خلیفہ عاضدالدین باطنی عقائد سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا شاہی حکیم باریطون بھی حسن بن صباح (باطنی عقائد کا بانی) کا معتقد تھا۔ اسی حکیم باریطون نے علاج کے بہانے شیرکوہ کو کوئی ایسی دوا دے دی جس سے اس کا دم گھٹ گیا۔ قصہ اس طرح پاک کردیا گیا کہ کسی کو اس سازش کا علم نہ ہوسکا۔ شیرکوہ کے خون ناحق کا کوئی دعویٰ نہ کرسکا۔

باطنی عقائد کے لوگ مصر میں داخل ہوچکے تھے جو مصر کی جڑ بنیادیں ایک کیے دے رہے تھے۔ وہ سلطان زنگی سے خائف تھے اس لیے سازشوں سے اپنے کام نکال رہے تھے۔

شیرکوہ کی موت سے نورالدین کی فوج قیادت سے محروم ہوگئی۔ صورت حال نہایت نازک تھی۔ فوجی سردار خلیفہ سے اصرار کررہے تھے کہ فوری طور پر وزیر کا انتخاب ہونا چاہیے۔ خلیفہ کے لیے مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ امرا دو گروہوں میں بٹ گئے۔ مصری اور شامی امرا آمنے سامنے تھے۔ اب اگر خلیفہ ایک گروہ کی طرف داری کرتا ہے تو دوسرے گروہ کی ناراضی کا خطرہ ہے۔

خلیفہ کئی دن برابر غور کرتا رہا اور پھر شیرکوہ کے بھتیجے صلاح الدین ایوبی کے نام پر آکر رک گیا۔ وہ نوجوان ہے تو ناتجربہ کار بھی ہوگا۔ اس سے کام لینے میں آسانی ہوگی۔ سلطان زنگی بھی خوش ہوگا اور شیرکوہ کے مملوک امیروں کی حمایت بھی حاصل ہوگی۔ اس نے طے کرلیا کہ صلاح الدین ایوبی کو وزارت کا منصب سونپ دیا جائے۔

خلیفہ کے حکم سے علما اور قاضی نہایت تزک واحتشام سے ایک خلعت فاخرہ لے کر اس کے خیمے میں گئے اور نئے وزیر کو الملک الناصر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

صلاح الدین ایوبی اس عہدے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا بلکہ وہ تو شیرکوہ کے ساتھ مصر آنے کے لیے ہی تیار نہیں تھا۔ اس نے اس موقعے پر کہا تھا۔ ''خدا کی قسم اگر مجھے مصر کا تاج وتخت بھی پیش کیا جائے تو میں نہیں جاؤں گا۔''

اس وقت وہ سلطان کے حکم سے مجبور ہوکر مصر چلا آیا اور اب خلیفہ کے حکم سے مجبور تھا۔

خلیفہ عاضد نے جب صلاح الدین کی وزارت عظمیٰ کا فرمان جاری کیا تو حاضرین دربار بے حد برہم ہوئے۔ مصری امرا تو اتنے برہم ہوئے کہ دربار سے اٹھ کر چلے گئے۔

خلیفہ کے باطنی دوستوں پر تو جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔

''آپ نے زنگی سلطان کا ایک جاسوس اپنی آستین میں پال لیا ہے۔''

''اس وقت حکمت کا یہی تقاضا تھا ورنہ شیر کوہ کے قتل کا الزام بھی ہم پر ہی آتا۔ میں نے سلطان کا منہ بند کردیا ہے۔''

''سانپ کے اس سنپولیے سے کس طرح نمٹیں گے؟''

''میں موقع دیکھتے ہی اسے بھی راستے سے ہٹادوں گا۔''

''یہ کام جتنی جلدی ہوسکے کیجیے گا ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

خلیفہ کے دربار میں جو باتیں ہورہی تھیں صلاح الدین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پورا مصر سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اسے ان سازشوں سے نمٹنا تھا۔ اس کے پاس کوئی فوج نہیں تھی۔ اسے مصری فوج کو اپنا ہمنوا بنانا تھا۔ خلیفہ کے امرا کے دلوں میں بھی جگہ بنانی تھی۔ یہ ایسے مشکل کام تھے جن سے نمٹنے کے لیے وہ خود میں سکت نہیں پاتا تھا چنانچہ جب اس کا باپ، جو ان دنوں دمشق کا والی تھا، اس سے ملنے قاہرہ آیا تو وہ ان کے حق میں وزارت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوگیا لیکن نجم الدین نے اس کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کردیا۔

''میں تمہاری قسمت میں کیوں دخل دوں۔ خدا وزارت تمہیں مبارک کرے۔''

اب صلاح الدین کو اپنی تمام توجہ بدنظمی کا انسداد اور نظام حکومت بحال کرنے پر مبذول کرنی پڑی۔

قاہرہ الف لیلہ کی دنیا کا ایک شہر تھا۔ شب وروز پررونق رہنے والا۔ عافیت کدہ اور دانش گاہ۔ جبہ وعمامہ سے آراستہ عرب شیوخ اور سرخ کپڑوں میں ملبوس حبشی بازاروں میں شانہ بہ شانہ چلتے نظر آتے۔ دیبا وحریر میں سرتاپا ملفوف نازک اندام کنیزیں، عصا بردار سیاہ فام خواجہ سراؤں کے حلقوں میں تیزی سے گزر جاتیں اور فضا خوشبو سے مہک اٹھتی۔ غلاموں کی منڈی میں نووارد نیلی آنکھوں والی سفید فام یونانی کنیزوں کو ترک زاد بے باک نگاہوں سے گھورتے۔ جواہر نگار خلعتوں میں ملبوس مملوک امرا مہینا بھر میں کچی اینٹوں سے محل کھڑے کردیتے اور مقتول دشمن کی لاش پر قالین بچھا کر دعوت اڑانے سے بھی گریز نہ کرتے۔

فاطمی خلیفہ عالی شان محل میں رہتا تھا۔ غلام گردشوں میں سیاہ فام سوڈانی محافظ آبدار تلواریں سونتے پہرا دیتے رہتے۔ مرمریں فواروں کے گرد ہفت رنگ مور ناچتے اور زیرزمیں طوطے شور مچاتے۔ ایوان عام بھرپور خزانے کی طرح جگ مگ کرتا۔ اس کی مرصع چوبی چھت پر سونے کی کندہ کاری تھی جس کی روپہلی ضیا میں نقرئی پرندوں کے سیمیں پر اور یاقوتی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ اس کے اہل حرم طلائی طشتریوں میں کھاتے اور عنبریں پیالوں میں پیتے تھے۔

صلاح الدین اس گہما گہمی اور ہنگامہ پروری سے بے تعلق رہا۔ وہ مسجد کے نزدیک ایک چھوٹے سے گھر میں مقیم رہا۔ اس نے شہر میں ایک گراں قدر کتب خانہ ڈھونڈ نکالا جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کتابیں تھیں۔

صلاح الدین کے تمام اعزہ قاہرہ میں جمع ہوگئے تھے۔ ان میں اس کا بھائی توران شاہ بھی تھا۔ صلاح الدین نے اپنے گرد صحیح العقیدہ لوگوں کو جمع کرلیا تھا۔ یہی تھے جو صلاح الدین کی محافظت کررہے تھے۔

سلطان نورالدین اپنے خطوں میں صلاح الدین کو بار بار مشورے دے رہا تھا کہ خلیفۂ مصر کو معزول کرکے عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ جاری کردو ورنہ یہ سازشی شخص تمہاری جان لے کر رہے گا۔

صلاح الدین فوری طور پر سلطان کا فرمان پورا نہ کرسکا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ اگر اس نے سلطان کا فرمان پورا نہیں کیا تو سلطان اس کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ یہ افواہ بھی اڑنے لگی تھی کہ سلطان مصر پر اقدام کرکے اس نوجوان مالک کو معزول کردینا چاہتا ہے۔

صلاح الدین نے اپنے محافظوں کی وفاداری جانچنے کے لیے ایک مجلس مشاورت طلب کی۔ اس نے سوال کیا۔

''اگر سلطان نورالدین مصر پر حملہ آور ہو تو آپ لوگ کیا کریں گے؟''

صلاح الدین کے بھتیجے تقی الدین نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''ہم سلطان سے جنگ کریں گے اور اسے سرزمین مصر سے دھکیل دیں گے۔''

دوسرے حاضرین نے بھی تقی الدین کا ساتھ دیا اور عہد کیا کہ وہ سلطان کے مقابلے میں صلاح الدین کا ساتھ دیں گے۔ نجم الدین ایوب بھی اس مجلس مشاورت میں شریک تھا، وہ بپھر گیا۔

''کوئی ہے جو مجھ سے زیادہ تمہارا خیر خواہ ہو کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔''

''بے شک آپ سے زیادہ میرا کون خیر خواہ ہوگا۔''

''تو پھر غور سے سنو۔ میں سلطان کا اتنا ادب کرتا ہوں کہ اس کے مقابلے پر آنا تو درکنار اگر وہ تمہاری گردن اڑانے کا حکم دے تو میں اس کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ یہ جو اس وقت تیری ہم رکابی کا عہد کررہے ہیں، اگر سلطان کو دیکھ پائیں تو ہر ایک قدم بوسی کو دوڑے گا۔''

جب مجلس مشاورت برخواست ہوگئی تو نجم الدین ایوب نے اکیلے میں بیٹے کو سمجھایا۔ ''یہ کیا حماقت کی، سب لوگوں کو جمع کرکے اپنے ارادے پیش کرنے شروع کردیے۔ مجھے تو شک ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی سلطان کو منع کردے گا۔ اگر سلطان مصر پر حملہ آور ہوگیا تو تمہاری مدد کو کوئی بھی نہیں آئے گا۔''

''یہ تو میں اب سمجھا ہوں ابا جان۔ مجھے بتائیے اب میں کیا کروں۔''

''تم اسی وقت سلطان کو لکھو، مجھے حلقہ بگوش بنانے کے لیے حضور لشکر کشی کیوں کریں۔ اس سے بہتر ہے کہ میری گردن میں کپڑا ڈال کر میرا گلا گھونٹ دیا جائے۔ جب سلطان یہ خط پڑھے گا تو تمہاری طرف سے اس کا دل صاف ہوجائے گا۔''

صلاح الدین نے اس سے بھی بڑا قدم اٹھایا، جو وہی اٹھا سکتا تھا۔

اگلے جمعے کو لوگ گروہ درگروہ جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ یہ عالی شان مسجد بہت کشادہ تھی۔ اس کے صحن اور برآمدوں میں نمازیوں کی صفیں آراستہ تھیں۔ مسجد کی اونچی چھت میں قندیلیں اور بلوریں فانوس آویزاں تھے جن کی روشنی صاف اور خوش رنگ قالینوں پر پڑ رہی تھی۔

جب امام حجرے سے منبر کی طرف بڑھا تو ہر سمت سے نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ گہرا سکوت چھا گیا جس میں لوگوں کے تیز تنفس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ امام حسبِ دستور سفید کپڑوں میں نہیں بلکہ عباسیوں کے سیاہ لباس میں ملبوس ہے۔ اس کا عمامہ بھی سیاہ تھا اور سنتِ صحابہ کے طور پر اس کے پٹکے سے تلوار بھی آویزاں تھی۔

امام نے تسبیح وتہلیل کے بعد خطبہ شروع کیا۔ اس کی مترنم آواز مسجد کی محرابوں میں گونجنے لگی۔ امام نے فاطمی خلیفہ کے بجائے خلیفۂ بغداد کے نام کا خطبہ پڑھا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صلاح الدین نے خلیفۂ مصر کو عملاً معزول کردیا تھا اور واضح کردیا تھا کہ خلیفۂ بغداد کے سوا وہ کسی اور کی خلافت تسلیم نہیں کرتا۔

صلاح الدین نے فوراً خلیفہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرلیا جن کی سنگین دیواروں کے اندر سونے اور چاندی کی اینٹیں چھت تک چنی ہوئی تھیں۔ کافوری صندوقچے نایاب قیمتی پتھروں سے لبریز تھے۔ اس کے علاوہ بیش قرار موتیوں سے مرصع طلائی طاؤس اور آبنوسی چیتا بھی دستیاب ہوئے۔ خلیفہ کو محل تک محدود کردیا گیا۔

خلیفہ کو اب اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا لیکن اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک قیدی کی طرح تھا اور مصری فوج صلاح الدین کی وفادار ہوگئی تھی۔ اس کا سازشی ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اچانک اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اسے خواجہ سرا موتمن الخلافہ کی یاد آئی۔ یہ خواجہ سرا ماضی میں قصر خلافت کے جملہ امور کا متصر، اور محافظ اعلیٰ تھا۔ اس کے زیر اثر پچاس ہزار سوڈانی حبشی تھے۔ اس لیے تمام امرا اسے بھاری رشوت دے کر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خلیفہ بھی اس سے ڈرتا رہتا تھا۔ شیرکوہ اور پھر صلاح الدین کے آنے کے بعد اس کی حیثیت تقریباً ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ اس لیے وہ صلاح الدین کے خلاف تھا۔

خلیفہ نے اسے رات کے کسی حصے میں طلب کیا۔ موتمن محل میں داخل ہوا تو خلیفہ پریشان حال بیٹھا تھا۔ موتمن کو دیکھ کر وہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''تم دیکھ رہے ہو اس کرد بچے (صلاح الدین) نے مصر کا کیا حال کردیا ہے۔ کچھ دن جاتے ہیں، وہ یہاں کا خلیفہ بن بیٹھے گا۔''

''بہت سے لوگوں نے آپ کو روکنے کی کوشش کی تھی کہ وزارت کا منصب صلاح الدین کو نہ دیا جائے۔''

''میں نے اپنی اسی غلطی کے ازالے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''میں نے تو ہمیشہ آپ کی خدمت ہی کی ہے۔''

''اگر صلاح الدین کو قتل کردیا جائے یا اسے مصر سے نکال دیا جائے تو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ میں تمہیں دے دوں گا۔ جو خزانہ تمہارے ہاتھ آئے گا۔ اس کا نصف میں تمہیں دے دوں گا۔''

اس پیش کش نے موتمن کی برسوں کی خواہش پوری کر دی تھی لیکن اس نے اپنی خوشی کو ظاہر نہیں ہونے دیا تاکہ یہ کام اتنا آسان نظر نہ آئے۔

''اس کام میں کچھ دیر لگ جائے گی کیونکہ میرے سامنے بہت چالاک دشمن ہے۔''

''اتنی دیر نہ لگ جائے کہ میرا ہی کام تمام ہوجائے۔''

''میں جو کروں گا اور جس طریقے سے کروں گا، اس میں آپ دخل اندازی نہیں کریں گے۔''

''آج کے بعد میں تم سے ملوں گا بھی نہیں دخل اندازی کیسی۔ رازداری اسی میں ہے کہ تم اپنا کام خاموشی سے کرتے رہو۔''

موتمن قصر خلافت سے باہر نکلا تو سرشاری سے اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ مصر کی خلافت اس کے نام لکھی جانے والی تھی۔ پہلے صلاح الدین کا قتل پھر کمزور خلیفہ کا قتل۔ یہی میرا مشن ہوگا۔ اس مشن کی تکمیل کیسے ہو؟ کیا میں اپنے پچاس ہزار سوڈانیوں کو لے کر قصر وزارت پر حملہ آور ہوجاؤں؟ حبشیوں کو فوجی تربیت حاصل نہیں ہے۔ وہ سب کے سب کٹ جائیں گے۔ اس طرح خانہ جنگی پھیلنے کا بھی خدشہ ہے۔ موقعے کا انتظار کروں؟ اس میں بہت دیر ہوجائے گی۔ صلاح الدین کبھی اکیلا نہیں نکلتا۔ اس کے محافظ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ کئی مرتبہ فدائیوں کے حملوں سے بھی بچ نکلا ہے۔ میرے ہاتھ کب لگے گا۔ پھر اس کے ذہن میں وہی ترکیب آئی جو اس وقت ہر غدار مسلمان سوچا کرتا تھا۔ اگر شاہ یروشلم کو خط لکھا جائے اور اسے قاہرہ پر حملے کی دعوت دی جائے تو صلاح الدین سے نجات مل سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے ایک تیز رفتار قاصد کی ضرورت تھی جو یروشلم جائے اور شاہ یروشلم سے ملاقات کرے۔

کام بہت نازک تھا۔ اس میں کئی خطرے پوشیدہ تھے لیکن موتمن کی آنکھوں پر لالچ کی ایسی پٹی بندھی ہوئی تھی کہ اس نے کسی خطرے کی پروا نہیں کی۔ اس کے جاں نثاروں میں کئی ایسے لوگ تھے جو یہ کام کرسکتے تھے۔ اس نے ایک مضبوط شہسوار کو شاہ یروشلم کے نام خط دے کر روانہ کردیا۔ خط کا بنیادی نکتہ یہی تھا کہ مصر کو صلاح الدین کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔

یہ قاصد کچھ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ قاہرہ کی سرحد پر پہنچا تو چند شہسواروں نے اسے روک لیا۔

موتمن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صلاح الدین یہ حکم جاری کر چکا ہے کہ کوئی پیشگی اجازت یا جامہ تلاشی کے بغیر نہ تو قاہرہ سے باہر جاسکتا ہے نہ اندر آسکتا ہے۔ وہ اگر باخبر ہوتا تو کوئی اور راستہ اختیار کر چکا ہوتا۔

سرحدی سپاہی قاصد کو روکے کھڑے تھے اور جامہ تلاشی پر اصرار کر رہے تھے۔ قاصد کو معلوم تھا کہ اس کی عبا میں وہ خط چھپا ہوا ہے جو یروشلم کے بادشاہ کے نام لکھا گیا

ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن کچھ دور جا کر پکڑا گیا۔ تلاشی لی گئی تو خط برآمد ہوگیا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے غداری کی بو آرہی تھی۔

''یہ خط تو کس کے حکم سے لے جارہا تھا؟'' محافظ سرحد نے اپنی تلوار اس کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ خط مجھے خواجہ سرا موتمن الخلافہ نے دیا تھا۔ ایک بھاری رقم بھی مجھے دی تھی۔ میں اس کے لالچ میں آگیا۔''

محافظوں نے اسے اس خط کے ساتھ صلاح الدین ایوبی کے پاس پہنچادیا۔

قاصد کی گرفتاری کی خبر موتمن تک پہنچ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ وہ خفیہ راستوں سے مصر سے نکل بھاگا۔

صلاح الدین کے جاسوس اسے گلی گلی ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ آخرکار اسے مصر کے قریب ایک گاؤں میں تلاش کرلیا گیا۔

وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا صلاح الدین کے روبرو آیا تو اس نے صلاح الدین کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اپنے جرم سے انکار ممکن نہیں تھا لہٰذا رو رو کر معافی مانگنے لگا۔

''بدبخت مخنث! تو اگر میری ذات کا دشمن ہوتا تو میں تجھے معاف کردیتا۔ تو دین و ملت کا غدار ہے، تجھے میں کیسے معاف کرسکتا ہوں۔''

''میں نے جو کچھ کیا، خلیفہ کے حکم سے کیا۔'' موتمن نے اپنی صفائی پیش کی۔

صلاح الدین نے جلاد کو حکم دینے کی زحمت بھی نہ کی۔ اپنی شمشیر بے نیام کی اور خواجہ سرا کا سر اس کے تن سے جدا کردیا۔

''اس مردود کا سر ایک خوان میں رکھ کر خلیفہ کے سامنے پیش کردو۔''

اس خوان میں وہ خط بھی رکھ دیا گیا جو شاہ یروشلم کے نام لکھا گیا تھا۔

خلیفہ کے سامنے طشت کا کپڑا ہٹایا گیا تو خلیفہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ صلاح الدین نے خط اٹھا کر خلیفہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اس خط کی عبارت کو ذرا غور سے پڑھیے۔''

خلیفہ کانپتے ہاتھوں سے خط کا متن پڑھنے لگا پھر کمال اداکاری سے بولا۔ ''واقعی یہ تو بہت خطرناک ہے۔ خواجہ سرا موتمن سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔''

''یہ خط آپ ہی کے کہنے پر اس نے تحریر کیا تھا۔''

''میں نے اسے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔''

''آپ نے مجھے راستے سے ہٹانے کا حکم تو دیا تھا۔''

''میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔''

''مرنے سے پہلے موتمن نے مجھے سب بتادیا تھا۔''

''اس نے جھوٹ بولا ہے۔''

''مرنے سے پہلے انسان جھوٹ نہیں بولتا۔''

''وہ انسان نہیں شیطان تھا۔''

''اور آپ کا دوست تھا۔ ایسے شیطانوں سے آپ کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔ آپ کی اور آپ کے حرم کی حفاظت اسی طرح کی جاسکتی ہے کہ آپ اس محل میں خود کو قیدی سمجھیں۔ میرے آدمی قصر میں موجود رہیں گے۔ ان کی اجازت کے بغیر نہ کوئی اندر جاسکے گا نہ باہر آسکے گا۔''

خواجہ سرا موتمن بڑے اثر رسوخ کا امیر تھا۔ پچاس ہزار سوڈانی حبشی اس کے جاں نثاروں میں تھے۔ اس کے قتل کی خبر سن کر سوڈانی حبشیوں میں اشتعال پھیل گیا۔ وہ مسلح ہوکر قصر وزارت پر حملہ آور ہوگئے۔ صلاح الدین اس حملے سے بے خبر نہیں تھا۔ اسے توقع تھی کہ موتمن کے قتل کا ردعمل ضرور ہوگا۔ اس نے پہلے ہی تمام انتظامات مکمل کرلیے تھے۔

سوڈانی بغداد میں بہت زیادہ تھے لیکن غیر تربیت یافتہ تھے۔ مرنے مارنے کی قسم کھا کر آئے تھے۔ لہٰذا دو دن تک جمے رہے اور پھر جو بچ گئے تھے، بھاگ کھڑے ہوئے۔

خلیفہ مصر کے آخری حمایتی بھی رخصت ہوئے۔ خلیفہ سرکاری طور پر معزول نہیں ہوا تھا لیکن اب مصر پر صلاح الدین کی حکومت تھی، وہ خود مختار تھا۔

مصر پر صلاح الدین کی حکومت عیسائیوں کے لیے معمولی بات نہیں تھی۔ مصر کی جغرافیائی پوزیشن یہ تھی کہ وہاں سے براہ راست یروشلم پر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ مصر پر سلطان زنگی کی حکومت کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی وقت یروشلم نشانے پر آسکتا تھا۔

شاہ یروشلم اس خبر سے بوکھلا اٹھا۔ اس کی ریاست تو چکی کے دو پاٹوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اس نے قسطنطنیہ اور سسلی کے عیسائی حکمرانوں کے درباروں میں قاصد دوڑائے۔

''میری فوجیں یروشلم سے نکل کر دمیاط پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں لیکن یہ کام آپ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ عیسائی دنیا کو بچانے کا یہ آخری موقع ہے۔ جلد میری مدد کو آیئے۔''

دمیاط پر قبضہ کرنے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں بیٹھ کر مصر پر بار بار حملے کرے یہاں تک کہ صلاح الدین وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوجائے اور پھر وہ خلیفہ عاضد سے

معاہدہ کرلے۔
عیسائیوں کا متحد لشکر دمیاط پر قبضے کے لیے روانہ ہوا۔ صلاح الدین کے جاسوس حرکت میں آئے، صلاح الدین کو باخبر کردیا کہ عیسائی دمیاط پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس اطلاع کے ملتے ہی صلاح الدین نے اپنی فوج کو دمیاط کے قلعے میں پہنچا دیا اور انہیں یہ ہدایت کردی کہ وہ خود کو قلعے میں محصور کرلیں۔ باہر نکلنے اور لڑنے کی غلطی ہرگز نہ کریں۔

وہ خود قاہرہ میں مقیم رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں خلیفہ کی شہ پاکر امرائے مصر کوئی فتنہ کھڑا نہ کردیں۔

اس نے سلطان نورالدین کو بھی خط لکھ دیا۔ ''میں اگر مصر چھوڑ کر دمیاط کی طرف بڑھتا ہوں تو خدشہ ہے کہ مصری امرا کوئی فتنہ کھڑا نہ کردیں اور اگر دمیاط کو صلیبی محاصرین سے بچانے کے لیے تاخیر کرتا ہوں تو شہر ان کے قبضے میں چلا جائے گا۔''

صلاح الدین کا خط ملتے ہی نورالدین نے منتخب جانبازوں پر مشتمل فوجی جتھے پے در پے دمیاط کی طرف بھیجنے شروع کردیے اور خود عیسائی مقبوضات کو تاراج کرنا شروع کر دیا تاکہ عیسائیوں کی توجہ دمیاط کی طرف سے ہٹ جائے۔

صلیبیوں نے دمیاط کا محاصرہ کیا تو ان کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ محاصرہ کیے پڑے تھے کہ انہیں ان کارروائیوں کا علم ہوا جو نورالدین عیسائی مقبوضات میں کررہا تھا۔ شاہ یروشلم پھر بھی ڈٹا رہا، اس کے بعد سلطان کے بھیجے ہوئے لشکر آنے شروع ہوگئے۔ اب شاہ یروشلم بدحواس ہوگیا۔ اس وقت تک محاصرہ کیے ہوئے 43 دن ہوچکے تھے۔

صلاح الدین عجیب بے بسی کے عالم میں قاہرہ کی سرحدوں پر ٹہلتا رہتا تھا۔ قاہرہ چھوڑ نہیں سکتا تھا اور دمیاط کے جانے کا دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔

پھر ایک دن خدا نے جیسے اس کی سن لی۔ آسمانی آفت نے صلیبی لشکر کو گھیر لیا۔ آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اتنا پانی جمع ہوگیا کہ لشکر گاہ ڈوب گئی۔ بارش تھمی تو خوفناک آندھی چلنے لگی۔ خیمے اکھڑ گئے بحری بیڑے تباہ ہوگئے۔

تمام لوگ بددل ہوگئے۔ یہاں تک کہ محاصرہ اٹھا لینے کا حکم ہوا۔

عیسائی لشکر بہت نقصان اٹھا کر دمیاط سے واپس آیا۔ فتح صلاح الدین کے ہاتھ رہی۔

مورخ اسٹینلے پول لکھتا ہے۔ ''محاصرۂ دمیاط میں خدا نے مسلمانوں کی پوری مدد کی۔ پہلے سخت بارش ہوئی اور عیسائیوں کی لشکر گاہ پانی میں ڈوب گئی۔ پھر ایک سخت ہوا چلی جس سے ان کے خیمے اکھڑ گئے اور بحری بیڑا تباہ ہوگیا۔ بے شمار لوگ ہلاک ہوگئے اور ان کی لاشیں ان شہروں کے قریب بہنے لگیں جن کو وہ فتح کرنے کے لیے آئے تھے۔''

☙☙☙

دمیاط کی شکست عیسائیوں کے گلے میں ایسا زخم چھوڑ گئی تھی جو کسی طرح بھرنے میں نہیں آرہا تھا۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے انہوں نے ایک خوفناک منصوبہ تیار کیا۔
صلاح الدین کو اس منصوبے کی فوری اطلاع مل گئی۔
''ایلہ کے قلعے میں عیسائی جمع ہورہے ہیں۔ انہوں نے اب ایک نیا منصوبہ اختراع کیا ہے۔ مصر کو چھوڑ کر انہوں نے حجاز مقدس پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کا خالق حاکم کرک ریجنالڈ ہے۔ وہ برسوں سلطان نورالدین کی قید میں رہا ہے اور اب اسی کا بدلہ لے رہا ہے۔''

حجاز مقدس کا نام سنتے ہی صلاح الدین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔
''میری زندگی پر لعنت ہے اگر میرے ہوتے ہوئے مدینۂ منورہ عیسائیوں کا ہدف بن جائے۔''

صلاح الدین نے مصر کا انتظام اپنے والد نجم الدین ایوب کے سپرد کیا اور لشکر جرار لے کر نکلا۔ اس کے نشانے پر عسقلان اور رملہ کے قلعے تھے کیونکہ ''ایلہ'' تک پہنچنے کے لیے یہ دونوں شہر سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

اس دوران عیسائیوں کی لوٹ مار جاری رہی۔ وہ پرامن دیہات اور قافلوں کو اپنے سفاکانہ حملوں کا نشانہ بناتے رہے۔

صلاح الدین نے عسقلان اور رملہ میں خونریزی سے پہلے دونوں شہروں کے عیسائی حکمرانوں کے نام پیغام بھیجا اور ان سے راستہ طلب کیا۔
''اگر تم عسقلان اور رملہ سے گزرنے کے لیے راہ داری دے دو تو میں جنگ سے گریز کروں گا ورنہ میری طاقت میرا راستہ بنائے گی۔''
یہ حکمران ''ایلہ'' تک پہنچنے کے لیے مسلمانوں کو کیسے راستہ فراہم کرسکتے تھے۔ وہ جنگ پر آمادہ ہوگئے لیکن شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

بحیرۂ احمر کے شمال میں ''ایلہ'' واقع تھا۔ صلاح الدین

کی فوج کے وہاں پہنچتے ہی صلیبی سپاہی محصور ہوگئے۔ ان کے پاس ایک سال کا سامان غذا موجود تھا اور ان کے خیال میں صلاح الدین زیادہ دن محاصرہ جاری نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس رسد پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور قلعہ بہت مضبوط تھا۔

عیسائیوں کا خیال غلط نہیں تھا، کئی ماہ گزر گئے لیکن قلعے کی فصیل میں مسلسل سنگ باری کے باوجود ایک شگاف بھی نہیں پڑسکا تھا۔

صلاح الدین کا خیمہ ہر وقت جنگی ماہرین سے بھرا رہتا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس قلعے کو کیسے سر کیا جائے۔ زیادہ وقت یہاں گزارا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ یہ خدشہ الگ تھا کہ مصر میں کوئی فتنہ کھڑا نہ ہوجائے۔ محاصرہ اٹھا کر جا بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ معاملہ حجازِ مقدس کا تھا۔

صلاح الدین اس روز رات بھر عبادت کرتا رہا تھا۔ صبح ہوئی تو ایک خیال اس کے دل میں جاگزیں ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا لیکن اپنے فیصلے پر آج ہی عمل کرنا تھا۔ اس نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ حکم کیسے جاری ہوگیا۔ لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس طویل محاصرے سے سب ہی بددل تھے۔ اب رہائی کا حکم مل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خیمے اکھڑ گئے۔ عیسائی قلعے کی فصیلوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ خوشی کی لہر ان میں بھی دوڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی کئی مہینوں سے قلعے میں قید تھے۔ انہیں بھی باہر نکلنے کی فکر تھی۔

صلاح الدین کا لشکر پڑاؤ اٹھا کر چل دیا۔ یہ لشکر پورے دن سفر کرتا رہا۔ رات کو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ تھکے ہوئے فوجیوں نے آرام کیا۔ صلاح الدین نے بھی نیند پوری کی۔ صبح ہوئی تو لشکر نے ایک عجیب و غریب حکم سنا۔
''واپس ایلہ کی طرف چلو اور اس سے پہلے کہ عیسائی قلعہ بند ہوں ان پر ٹوٹ پڑو۔''

بات سب کی سمجھ میں آگئی کہ صلاح الدین کا منصوبہ کیا ہے اس کی مزید وضاحت اس وقت ہوگئی جب اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔
''ایک فوجی دستہ دائیں طرف مڑ جائے دوسرا بائیں طرف۔ دونوں فوجی دستوں کو ہدایت تھی کہ وہ طویل چکر کاٹ کر قلعے کے عقب میں پہنچ جائیں اور دونوں دائیں بائیں سے ایک ساتھ حملہ آور ہوجائیں۔

مسلمانوں کے پڑاؤ اٹھاتے ہی قلعے کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ لوگ چل پھر رہے تھے۔ عیسائی

سپاہی نشے میں بدمست غفلت کی نیند میں تھے۔

صلاح الدین کے فوجی قلعے کے عقب میں آکر جمع ہوئے اور پھر دائیں بائیں سے شہر پر ٹوٹ پڑے۔ عیسائی سپاہی مقابلے پر آئے ضرور لیکن گھبرائے ہوئے تھے، قتل ہوتے چلے گئے۔ بہت ہی معمولی تعداد فرار ہونے میں کامیاب ہوسکی۔

ان فراریوں میں ریجنالڈ بھی تھا جو دوبارہ کرک پہنچ گیا۔

صلاح الدین نے معمولی سی فوج شہر میں چھوڑی اور ''کرک'' کے محاصرے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ریجنالڈ قلعہ بند ہوچکا تھا۔ صلاح الدین کو کرک کا محاصرہ کرنا پڑا۔

وہ کرک میں تھا کہ اسے باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس نے محاصرہ اٹھایا اور قاہرہ کی طرف دوڑ پڑا۔ اسے بس ایک فکر تھی کہ کسی طرح باپ کا دیدار کرلے۔ وہ کمال کا شہسوار تھا۔ اس قدر تیز گھوڑا دوڑاتا تھا کہ دیکھنے والے دہشت زدہ ہوجاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ لشکر کو پیچھے چھوڑ کر اکیلا قاہرہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

نجم الدین کو چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ 18 ذی الحجہ کو وہ قاہرہ کے باب النصر کے قریب چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا اور سخت مجروح ہوگیا۔ طبیبوں نے علاج کے تمام جتن کرلیے لیکن اس کا آخری وقت آپہنچا تھا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور 28 ذی الحجہ کو اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگیا۔

بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس وقت صلاح الدین ''کرک'' سے واپس آچکا تھا۔ کچھ دوسرے لکھتے ہیں کہ نجم الدین اس کے آنے سے پہلے ہی فوت ہوچکا تھا۔

ابھی وہ باپ کے صدمے سے نکلا بھی نہیں تھا کہ خبر ملی کہ ایک شخص عبدالنبی بن مہدی خارجی نے یمن پر اپنا تسلط جمالیا اور بنو عباس کا خطبہ موقوف کرکے اپنا خطبہ جاری کردیا ہے۔ صلاح الدین نے شمس الدولہ توران شاہ کو یمن پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔ توران شاہ نے اپنا لشکر خشکی کے راستے روانہ کیا اور سامان حرب بحری جہاز کے ذریعے بھیجا۔ پہلے وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہاں سے زبید پہنچ کر عبدالنبی کو شکست دی اور اس کو اپنے نائب سیف الدولہ کے سپرد کرکے عدن پر حملہ آور ہوا۔ اس اثنا میں سیف الدولہ نے عبدالنبی کو قتل کرڈالا۔

یمن پر شمس الدولہ کا اقتدار قائم ہوگیا اور اس نے یہ خوش خبری صلاح الدین کو لکھ بھیجی۔

☆☆☆

دمشق کے میدان اخضر میں چوگان کھیلا جارہا تھا۔ سلطان نورالدین کچھ دیر چوگان کھیلتا رہا پھر امرا کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوگیا۔ اچانک ایک امیر کے منہ سے نکلا۔ ''کتنا سعید اور بابرکت دن ہے کہ آج ہم سب اس میدان میں جمع ہیں لیکن خدا معلوم آئندہ سال ہم میں سے کون یہاں ہوگا۔''

سلطان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''سال تو بڑا لمبا عرصہ ہے۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ایک مہینے کے بعد ہم سب یہاں جمع ہوسکیں گے یا نہیں۔''

یہ الفاظ شاید قدرت سلطان کے منہ سے نکلوا رہی تھی۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ سلطان کے گلے میں معمولی تکلیف ہوئی اور پھر یہ بڑھتے بڑھتے خناق کی صورت اختیار کرگئی۔

خناق تو محض ایک بہانہ تھا فی الحقیقت سلطان مرض الموت میں مبتلا تھا جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ مجرب ترین نسخے اس کی موت کو نہ ٹال سکے اور سلطان انتقال کرگیا (21 شوال 569ھ)

صلاح الدین مصر میں مصروف تھا اور دمشق نہ جاسکا تھا۔ بس ایک یہی بات اس کے دشمنوں کے لیے مخالفت کا بہانہ بن گئی۔ انہوں نے سلطان کی بیوہ سے یہ کہنے میں بھی عار نہیں سمجھا۔

''جب نجم الدین ایوب کا انتقال ہوا تھا تو صلاح الدین ''کرک'' کا محاصرہ ادھورا چھوڑ کر قاہرہ پہنچ گیا تھا۔ سلطان کی تدفین میں شرکت کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ سلطان کے بیٹے ملک الصالح کے ہاتھ پر بیعت کرنے بھی نہیں آیا۔''

سلطان کی بیوہ کے دل پر ان باتوں نے کوئی اثر نہیں کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ''صلاح الدین کی وفاداری پر مجھے کوئی شک نہیں۔ اسے جب بھی فرصت ملے گی وہ ضرور آئے گا۔''

صلاح الدین کی وفاداری پر واقعی کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے مصر کی مساجد میں ملک الصالح کا خطبہ پڑھوایا اور اس کے نام کا سکہ ڈھالا۔ اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ اس نے ملک الصالح کو سلطان زنگی کا جانشین تسلیم کرلیا ہے۔

موقع ملتے ہی صلاح الدین مصر سے دمشق کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے جیسے ہی قصر خلافت میں قدم رکھا، مخالفین کے دل آتش حسد سے جل اٹھے۔ پھر دوسرے دن دربار لگا تھا، گیارہ سالہ ملک الصالح تخت پر بیٹھا تھا۔ کہنے والے کہہ رہے تھے کہ اگر صلاح الدین کو اقتدار کا لالچ ہوتا تو دمشق پر قبضہ کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں تھا۔

صلاح الدین کا ماتھا اس وقت ٹھنکا تھا جب سلطان

زنگی کا ایک امیر شمس الدین ابن مقدم جو شامی فوج کا سپہ سالار بھی تھا، اچانک دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔

دربار ختم ہونے کے بعد صلاح الدین نے رضیع خاتون سے کہا تھا۔ ''میں ہمیشہ دمشق میں نہیں رہ سکتا۔ میرے چلے جانے کے بعد شمس الدین کی طرف سے ہوشیار رہیے گا۔ یہ شخص ''سلطان نوریہ'' کا وفادار نہیں۔''

صلاح الدین مصر لوٹ آیا تھا لیکن اس کی نظریں دمشق پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے یہ خبریں ملنے میں دیر نہیں لگی کہ شمس الدین بڑی رازداری سے شاہ یروشلم سے خط کتابت کرنے میں مشغول ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ سلطان زنگی کی موت سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے شام کے سرحدی علاقے ''بانیاس'' پر حملہ کردیا۔ صلاح الدین نے بانیاس کی طرف قدم بڑھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ یہ خبر آگئی کہ شام کے غدار امرا نے عیسائیوں سے صلح کرلی۔ اس صلح کا روح رواں شمس الدین تھا۔ اس صلح کے نتیجے میں بانیاس کا آدھا علاقہ صلیبیوں کے قبضے میں چلا گیا۔

صلاح الدین اب بانیاس جانے کے بجائے دمشق پہنچ گیا۔ دس ہزار شہسوار اس کے ساتھ تھے۔ وہ ان تمام حالات سے رضیع خاتون کو باخبر کرنا چاہتا تھا۔

اس کے دمشق پہنچتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ شمس الدین شام کی سرحد پر تھا۔ وہ بلانے کے باوجود نہیں آیا۔ اسے یقیناً اپنی گرفتاری کا خدشہ ہوگا۔

رضیع خاتون بھی صلاح الدین کے انکشافات پر سکتے میں آگئیں۔ صلاح الدین کی باتوں سے ظاہر ہورہا تھا کہ اگر پیش بندی نہیں کی گئی تو دمشق، شام اور مصر میں کوئی رشتہ ورابطہ برقرار نہیں رہ سکے گا۔ سلطان زنگی کی سلطنت کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوجائے گی۔

''مادر ملکہ! ملک الصالح تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اگر آپ مجھے حکم دیں تو ان غدار امرا کے دماغ ٹھکانے لگا دوں جو ملت کی حمیت داؤ پر لگا کر عیسائیوں کی گود میں گرے پڑ رہے ہیں۔''

''سلطان عادل تمہیں اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ جو تم بہتر سمجھتے ہو وہ کرو۔''

''مجھے مسلمان ہوکر مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانا اچھا نہیں لگتا لیکن اب شاید ایسا کرنا پڑے۔''

''خدا تمہارا حامی وناصر ہو۔''

اسی رات رضیع خاتون نے خواب میں اپنے شوہر سلطان نورالدین زنگی کو دیکھا۔ وہ ان سے کہہ رہے تھے کہ میری بیٹی شمس النسا جوان ہوگئی ہے۔ اس کے بہت سے رشتے آرہے ہوں گے۔ تم یہ شرف صلاح الدین ایوبی کو بخشو۔ اسے اپنی دامادی میں قبول کرلو۔

رضیع خاتون یہ خواب دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ بہت دیر تک اس خواب پر غور کرتی رہیں۔ دل تو یہ کہتا تھا کہ شمس النسا بادشاہ زادی ہے اس کے لیے کسی حکمراں کا رشتہ ہونا چاہیے۔ صلاح الدین تو سلطان کے نوکر کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پھر خواب سوچنے لگتی تھیں۔ اسی کشمکش میں دن نکل آیا۔ انہوں نے نماز ادا کی اور پھر جب ذرا دن چڑھ آیا تو انہوں نے صلاح الدین کو بلا بھیجا۔ صلاح الدین جیسا بیٹھا تھا، اٹھ کر چلا آیا۔ رضیع خاتون نے اس کے سامنے خواب دُہرایا۔

''سلطان نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کرلیا۔ اب یہ بار انہوں نے میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ مجھے امید ہے تم ان کی یہ خواہش ضرور پوری کروگے۔''

''مادر ملکہ! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے ہمیشہ سلطان مرحوم کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ میں تو یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ میں آپ کا غلام ہوں اور شمس النسا شہزادی ہیں۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم غلام ہو۔''

''غلام کو اپنی حیثیت معلوم ہے۔''

اس شادی میں ایک مصلحت چھپی ہوئی تھی جو صلاح الدین کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اگر وہ سلطان کے خاندان کا فرد بن جاتا ہے تو دمشق اور سلطنت نوریہ کے دیگر علاقوں کا دفاع کرتے ہوئے اس پر اقتدار کے لالچی ہونے کا الزام نہیں آئے گا۔

اس نے سلطان مرحوم کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے گردن خم کردی۔

''میں اس شادی کے لیے تیار ہوں۔''

پندرہ دن بعد صلاح الدین کی شادی سلطان مرحوم کی صاحبزادی شمس النسا سے انجام پاگئی۔ شمس الدین ابن مقدم کے لیے یہ بے جوڑ شادی حیرت سے زیادہ خوف کا باعث بن گئی۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے گھوڑا تیار کیا اور قلعہ بانیاس کی طرف دوڑ لگادی جس کے آدھے علاقے پر صلیبیوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ سالار اعظم گرانٹ اپنی فوج کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ شمس الدین اس سے جاکر ملا۔

''کیا میری ملاقات شاہ یروشلم سے ہوسکتی ہے؟''

''شہنشاہ نے تمام اختیارات مجھے دے دیے ہیں۔''

''بعض باتیں ایسی ہیں جو میں صرف شہنشاہ کے

سامنے کرسکتا ہوں۔"

"وہ ہر ایک سے نہیں ملتے۔"

"کیا میرا شمار "ہر ایک" میں ہوتا ہے۔ میں نے آپ لوگوں سے اتحاد کیا۔ بانیاس کا آدھا علاقہ آپ کو دے دیا۔ یہ اتحاد اگر برقرار رہے تو اور بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔"

گرانٹ نے بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سنیں اور پھر یہ سوچ کر بے اختیار قہقہہ لگا دیا کہ لالچ انسان کو بے دین بنا دیتا ہے۔

"کیا میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ آپ قہقہہ لگانے پر مجبور ہوگئے۔" شمس الدین نے کہا۔

"نہیں کوئی ایسی بات نہیں۔ آپ چلنے کی تیاری کیجیے۔ ہم یروشلم جائیں گے۔"

"صلاح الدین کے جاسوس قدم قدم پر لگے ہوئے ہیں۔"

"آپ عیسائیوں کا لباس پہن لیں۔ ویسے بھی میں آپ کو خفیہ راستوں سے لے کر جاؤں گا۔"

شاہ یروشلم، شمس الدین کی ذات سے بے خبر نہیں تھا۔ خط کتابت کے ذریعے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس سے بے رخی سے مل رہا تھا جبکہ شمس الدین اس کے سامنے بچھے جا رہا تھا لیکن جب شمس الدین نے اسے یہ بتایا کہ صلاح الدین، سلطان زنگی کا داماد بن گیا ہے تو وہ اس طرح اچھلا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

"میں یہی بتانے حاضر ہوا ہوں کہ صلاح الدین اب شام کی طرف بڑھے گا اور پھر میرے منہ میں خاک، یروشلم کی طرف آئے گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"اگر صلاح الدین شام کی طرف آئے تو آپ ہماری مدد کریں گے۔"

"میں صلاح الدین کو ایسا الجھا دوں گا کہ وہ شام کی طرف آنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔"

"اگر وہ پھر بھی آیا؟"

"تو ہم تمہاری مدد کو ضرور پہنچیں گے۔"

"ملک الصالح کو قتل کرنا اور دمشق پر قبضہ کرنا ہمارا مشن ہے۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" شاہ یروشلم نے کہا۔

دونوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ تحریر ہوگیا۔

رہی صلاح الدین کو الجھانے کی بات تو شاہ یروشلم نے ان صلیبیوں کو جنگ کے لیے آمادہ کیا جو مصر سے کم فاصلے پر آباد تھے۔ جب وہ لوگ مان گئے تو اپنی فوج کے ایک دستے کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ ان کی منزل "اسکندریہ" تھی۔ اسکندریہ پر قبضے کا مطلب تھا کہ مصر کے گرد گھیرا تنگ ہوگیا۔

صلاح الدین کی شادی کو ابھی ایک دن ہوا تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ صلیبیوں کا ایک بحری بیڑہ اسکندریہ کی بندرگاہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ وہ صرف سن لیتا اور نئی دلہن کے ناز نخرے اٹھانے میں لگا رہتا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس سے پہلے یہی صلیبی مصر کے ایک اور ساحلی شہر "دمیاط" پر چڑھ آئے تھے اور اس وقت تو وہ مصر سے دور بیٹھا تھا۔

اس نے اپنی ساس سے اجازت لی اور شمس النسا کو ساتھ لے کر مصر آ گیا۔ اس نے بیوی کو اپنی والدہ کے پاس چھوڑا اور خود اسکندریہ کی طرف بڑھا۔ وہ اس برق رفتاری سے جا رہا تھا جیسے کسی گھڑ دوڑ کے مقابلے میں شریک ہو۔

ساحل پر پہنچتے ہی اس نے عجیب و غریب حکم صادر کیا۔ اپنے بحری دستے کو حکم دیا کہ وہ فوراً کھلا سمندر چھوڑ دے اور ساحل پر آ جائے۔

بحری دستہ جونہی کنارے پر پہنچا، صلاح الدین سپاہیوں کو لے کر اسکندریہ کے قلعے کی طرف بڑھ گیا۔

صلاح الدین نے تمام ساحلی شہروں میں بڑی بڑی خندقیں کھدوا رکھی تھیں۔ اس نے تمام سپاہیوں کو ان خندقوں میں اتار دیا۔ اب دور تک سناٹا تھا اور دھوپ تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا یہاں کوئی آیا ہی نہیں۔

عیسائیوں کا بحری بیڑہ سمندر میں بلا روک ٹوک سفر کر رہا تھا۔ آپس میں چہ میگوئیاں ضرور ہو رہی تھیں کہ صلاح الدین نے سمندری حدود کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہی نہیں کیا۔ عیسائی سالار نے خیال ظاہر کیا کہ صلاح الدین نے اپنی پوری طاقت ساحل پر جمع کر دی ہوگی۔ ساحل پر اترتے ہی ہمیں سخت مدافعت کا سامنا ہوگا۔

(جاری ہے)

ماخذات

سیرت صلاح الدین(ترجمہ)، بہاء الدین ابن شداد. صلاح الدین ایوبی، ہیرلڈ لیم/محمد یوسف عباسی.
صلاح الدین ایوبی(انگریزی)، لین پول. نورالدین زنگی، کامران اعظم سوہدروی.
دمشق، خواجہ عباداللہ اختر امرتسری. تاریخ ابن کثیر، علامہ ابن کثیر. البدایہ والنہایہ ابن کثیر/ابوطلحہ.

مداری

ایم اے راحت

انسان باشعور ہو یا بہت نادان... عقل نہ تو کسی کی میراث ہوتی ہے اور نہ ہی کسی سے ناراض... اس کی ادا تو بس نرالی ہوتی ہے۔ کسی پہ مہربان ہوجائے تو سائبان بن جاتی ہے اور اگر ستانے پر آجائے تو دور کھڑی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ ان پر بھی قسمت کی دیوی مہربان ہوئی تھی مگر ایک لمبی چھلانگ لگانے کے لیے ان کے پاس جگہ بہت کم تھی... اور یہ بھی خبر نہ تھی کہ مقدر کی ڈگڈگی تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ بے شک کوئی تدبیر سے تقدیر بدلنے کی کوشش کرتا رہے مگر تقدیر کی تحریر بالآخر خود کو منوا ہی لیتی ہے۔

دولت ہاتھ کا میل سہی مگر اس کی خاطر متاع جاں لٹانے والوں کی روداد الم

بیرسٹر خورشید بیگ نے گردن اٹھائی اور کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بجنے میں صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ چونک پڑے۔ تھوڑے فاصلے پر منشی فرید علی اپنے کام میں معروف تھے۔

"منشی جی!" انہوں نے کسی قدر درشت لہجے میں کہا اور منشی فرید علی چونک کر کھڑے ہوگئے۔

"جج...... جناب عالی!" ان کی آواز کانپ گئی تھی۔

"افوہ، آپ مجھ سے زیادہ غیر حاضر رہنے لگے ہیں۔

میں نے آپ سے کچھ درخواست کی تھی۔''

''جی...... جی...... ہاں......'' منشی جی کی نظریں دیوار گیر گھڑی کی جانب اٹھ گئیں اور پھر ان کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور وہ پھیکے سے انداز میں بولے۔ ''پپ...... پانچ بج رہے ہیں جناب!''

''جی ہاں اور مجھے ٹھیک پانچ بجے یہاں سے چار میل دور ایک انتہائی اہم میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔ اب گردن جھکائے کیا کھڑے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ساڑھے چار بجے مجھے یاد دلا دیں۔'' خورشید بیگ نے کہا اور منشی کی گردن جھک گئی۔

''جی جناب۔'' منشی جی مجرمانہ انداز میں بولے۔

''کیا دوسرے لوگ چلے گئے؟''

''ابھی نہیں جناب! وہ پانچ بجے اٹھتے ہیں۔''

''نثار کو روکیے۔ مجھ میں سکت نہیں کہ ڈرائیونگ کرسکوں۔'' منشی فرید علی باہر دوڑ گئے۔ بیرسٹر صاحب اس دوران سامنے پھیلے ہوئے کاغذات سمیٹ رہے تھے۔ چند ہی لمحات میں منشی فرید علی واپس آ گئے۔

''نثار تیار ہے جناب۔''

''اب ان سب کا کیا کروں میں۔ آپ کی سزا یہ ہے کہ آپ اس وقت تک یہاں رکیں جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔'' خورشید بیگ نے اپنی میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ''واپس آ کر ہی ان کی ترتیب کی جاسکتی ہے۔''

''بہتر ہے جناب! میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

''کسی چیز کو منتشر نہ کریں اور کسی کو یہاں آنے نہ دیں۔ یہ بے حد اہم کاغذات ہیں۔''

''آپ مطمئن رہیں جناب۔'' منشی فرید علی نے کہا اور بیرسٹر صاحب اپنا لباس درست کر کے باہر نکل گئے۔ منشی فرید علی اس دوران ایک جگہ کھڑے رہے تھے۔

دیوار گیر گھڑی نے پانچ بجائے اور منشی فرید علی ایک گہری سانس لے کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ بڑے سے ہال میں اب کوئی نہیں تھا سوائے چپڑاسی کے جو الماریاں وغیرہ بند کر رہا تھا۔

''اور کوئی حکم منشی جی!'' چپڑاسی نے منشی جی کو دیکھ کر پوچھا۔

''سب کام کرلیا؟''

''جی!''

''ٹھیک ہے۔ چابیاں مجھے دے دو۔''

''آپ ابھی رکیں گے جی؟''

''ہاں......'' منشی جی نے کہا اور چپڑاسی نے چابیاں ان کے حوالے کر دیں اور پھر وہ باہر نکل گیا۔ منشی فرید علی نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔

اب بیرسٹر خورشید بیگ کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور وقت کا کوئی تعین نہیں تھا۔ تقریباً چودہ سال سے وہ بیرسٹر خورشید بیگ کے منشی تھے اور سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے۔ خورشید بیگ کا کوئی راز فرید علی کے لیے راز نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خورشید بیگ اپنے گھریلو حالات کے سلسلے میں بھی ان سے مشورے کرتے تھے۔

یوں بھی خورشید بیگ نے اپنی زندگی میں ترقی کے مدارج فرید علی کے سامنے ہی طے کیے تھے لیکن فرید علی، وہ خود اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ انہیں اپنی منشی گیری بھی پسند نہ تھی لیکن حالات یہ سب سوچنے کی اجازت کہاں دیتے ہیں۔ زندگی کی ایک ڈگر بن گئی تھی۔ گھر...... گھر سے دفتر اور دفتر سے کورٹ یہ ہی روزانہ کے معمولات تھے۔

گھر میں زبیدہ بیگم تھیں، عائشہ تھی اور بس۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں اور کچھ نہ تھا۔ حالانکہ کبھی انہوں نے بھی اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ بہت خواب دیکھے تھے۔ بعد میں یہ یقین کرلیا تھا کہ خواب انسانی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، جن کے بغیر زندہ نہ رہ سکیں۔ حالات سے مجبور کچھ کرنے کی آرزو نہ ہونے کی بے بسی خوابوں میں ڈھل جائے تو تھوڑا سا سکون مل جاتا ہے۔ زبیدہ بیگم اور عائشہ ان کی زندگی کے دو اہم ستون تھے۔ وہ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ لیکن بس ایک حد تک۔ وقت پر تنخواہ مل جاتی تھی۔ کوئی چھوٹی موٹی ضرورت ہوتی تو خورشید بیگ بھی پوری کر دیتے تھے لیکن ضرورتوں کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں؟

یہ دوسری بات ہے کہ نامساعد حالات خواہشات کو مردہ کر دیتے ہیں اور پھر انسان صرف اور صرف ضرورتوں کا تابع ہو کر رہ جاتا ہے، خواہشات تو اس کی ختم ہو جاتی ہیں۔ منشی فرید علی بھی اپنی تمام جائز ضرورتیں پوری کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو ایک انسان کی زندگی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

ضرورتیں جائز ہوں یا ناجائز، ان کی تکمیل کی کوئی سند نہیں ہوتی۔ تنہا اور خاموش دفتر میں وہ اپنی کرسی پر بیٹھے نجانے کب تک انہی سوچوں میں گم رہے کہ اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے کچھ کاغذات بیرسٹر خورشید بیگ کی میز

سے اڑے اور کمرے میں بکھر گئے۔ منشی فرید علی ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ ان کی ذمے داری تھی کہ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہونے پائے مگر ہوا پر قابو کیسے پایا جاتا۔

سب سے پہلے انہوں نے بیرسٹر خورشید بیگ کی میز کے عقبی حصے میں بنی ہوئی کھڑکی بند کی جسے وہ اتفاق سے بند کرنا بھول گئے تھے۔ اس کے بعد کاغذات سمیٹنے لگے۔ تین چار ہی کاغذ تھے جنہیں انہوں نے سمیٹ کر ترتیب سے رکھنا چاہا، جانے ان کی ترتیب کیا تھی؟ بیرسٹر صاحب کی خصوصی ہدایت تھی کہ کوئی شے ادھر سے ادھر نہ ہونے پائے۔

وہ بیرسٹر صاحب کی کرسی پر بیٹھ گئے اور یہ اندازہ لگانے لگے کہ کاغذات کہاں سے اڑے ہیں اور ان کی ترتیب کیا ہے۔ سامنے رکھی ہوئی فائلوں میں سے ایک دو فائلوں کے کور کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کاغذات سے متعلق عبارتیں ان فائلوں میں تلاش کرنا شروع کر دیں پھر ان فائلوں کی دلچسپیوں میں وہ اس طرح سے گم ہو گئے کہ اصل کام بھول گئے۔ چودہ سال سے خورشید بیگ کی منشی گیری کر رہے تھے اور خورشید بیگ کی تمام تر کارروائیوں کے بارے میں ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

بعض معاملات میں فرید علی کی ذہانت بے مثال تھی جس کا اظہار خورشید بیگ بھی کر چکے تھے۔ ان کے بارے میں بیرسٹر خورشید بیگ نے بارہا یہ اعتراف کیا تھا کہ منشی فرید علی مکمل وکیل ہیں۔ بس اتنی سی کسر ہے کہ انہوں نے وکالت کی ڈگری حاصل نہیں کی۔ منشی جی بھی اس بات سے خوش ہو جایا کرتے تھے، اس وقت بھی وہ اس دلچسپ فائل کو بڑی گہری نگاہ سے پڑھ رہے تھے۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے فائل کا آخری ورق بھی پڑھ لیا۔ اس کے بعد پھر انہیں اصل کام یاد آیا اور وہ فائل بند کر کے دوسرے کاغذات دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کاغذات کی ترتیب انہیں مل گئی اور جب تک انہوں نے کاغذات ترتیب سے نہ رکھ لیے وہ بے سکونی کا شکار رہے۔ کاغذات کو ترتیب دینے کے بعد وہ بیرسٹر صاحب کی کرسی سے اٹھ آئے اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔

ان کا ذہن گہری سوچ کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی ان پر سوار ہو گئی تھی اور یہ بے کلی اس وقت تک ان کے ذہن پر طاری رہی جب تک باہر سے دستک نہ سنائی دی۔ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ جلدی سے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔

خورشید بیگ اندر داخل ہوئے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہنے لگے۔ ''معاف کیجیے گا منشی جی! واقعی زیادتی ہو گئی آپ کے ساتھ۔''

''نہیں جناب زیادتی کیسی؟''

''مگر میں کیا کرتا، آپ خود بتائیے، ان سب کاغذات کو کیسے سمیٹتا۔ بہرحال شکر ہے کہ میٹنگ میں صحیح وقت پر پہنچا نثار نے بہت تیز گاڑی چلائی تھی، ایک جگہ تو حادثہ بھی ہوتے ہوتے بچا۔''

''خدا خیر کرے۔'' فرید علی نے خلوص سے کہا۔

''بہت بہت شکریہ۔

'' البتہ یہ کاغذات سمیٹے بغیر میں دفتر بند کرنا نہیں چاہتا۔ کل پتا نہیں کیا، کیا مصروفیات نکل آئیں۔ بہت اہم کام ذمے لگ گئے ہیں۔ بس یہ کاغذات سمیٹ کر چلا جاؤں گا۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔'' فرید علی نے کہا۔

''شکریہ! تو پھر آئیے، ذرا انہیں ترتیب سے رکھوا دیں۔''

دونوں دیر تک کاغذات سمیٹنے میں مصروف رہے اور خورشید بیگ نے سکون کی گہری سانس لی۔

''آئیے چلتے ہیں۔'' دروازے بند کیے گئے اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔ خورشید بیگ نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''آئیے منشی جی آپ کو چھوڑتا چلوں۔''

منشی فرید علی مسکراتے ہوئے خورشید بیگ کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے اور پھر خورشید بیگ انہیں ان کے گھر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

منشی جی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور زبیدہ بیگم ان کے انتظار میں ہول رہی تھیں۔ منشی جی کو دیکھتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''خدا خیر کرے۔ خیریت تو ہے اتنی دیر کیسے ہو گئی؟''

''بھئی مرد بچے ہیں گھر سے نکلتے ہیں تو ہزار کام ہوتے ہیں۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ دفتر ہی میں کچھ کام تھا۔''

''ہوں۔ تو اب مرد بچے کو جلدی سے منہ ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ ہم بھی بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔'' زبیدہ بیگم نے ظرافت سے کہا اور فرید علی مسکراتے ہوئے باتھ روم کی

طرف بڑھ گئے۔

پھر کھانا کھانے کے دوران بھی ان کے چہرے پر ہلکی ہلکی سوچ کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔ فرید علی، عائشہ سے اس کے کالج کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ اکلوتی بیٹی تھی وہ ان کی اور فرید علی کسی آرزو کی تکمیل کر سکے ہوں یا نہ کر سکے ہوں لیکن عائشہ کے سلسلے میں وہ یہی کوشش کرتے تھے کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

کافی دیر تک عائشہ سے گفتگو کرنے کے بعد ذہن کو فرحت کا احساس ہوا اور اس کے بعد سونے کا وقت آگیا۔ لیکن بستر پر لیٹ کر بھی فرید علی صاحب کی کروٹیں نہ تھم سکیں۔ تب زبیدہ بیگم بول اٹھیں۔

''منشی جی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں...... ہاں۔ ضرور کہو شریک حیات۔'' فرید علی مسکرا کر بولے۔

''یہ دیر میرے لیے اب معنی خیز ہوتی جا رہی ہے۔''

''سمجھا نہیں گھر والی۔'' فرید علی بہ دستور مزاحیہ لہجے میں بولے۔

''آپ کچھ بے چین سے ہیں۔''

''نہیں بیوی، ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے، بس بعض اوقات ذہن میں کچھ ایسے خیالات آجاتے ہیں جو دماغ پر مسلط ہو کر رہ جاتے ہیں اور نکالے نہیں نکلتے۔''

''ارے چھوڑیے ان باتوں کو، بہت سی باتوں کو نظر انداز کر دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

''ہاں...... کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن ایسی ہی کوئی بات ہے جو میرے ذہن پر طاری ہو گئی ہے۔''

''ایسی کون سی بات ہے آخر۔ میں کہتی ہوں ذہن کو خالی کر لیجیے۔ چھوڑیے ان تمام باتوں کو زندگی بہر طور گزر رہی جاتی ہے، اپنے دماغ کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔'' زبیدہ بیگم نے کہا اور منشی جی! سر ہلانے لگے، پھر بولے۔

''زبیدہ بیگم ایک مشورہ کرنا ہے، تم سے۔''

''کیجیے؟'' زبیدہ بیگم نے کہا اور فرید علی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

''کیا نیند آگئی، منشی جی!'' کافی دیر کے بعد زبیدہ بیگم نے کہا۔

''نہیں بھئی کچھ سوچ رہا ہوں اور تمہیں بتانے کے لیے غور کر رہا ہوں کہ کہاں سے شروع کروں۔'' فرید علی نے کہا اور زبیدہ بیگم سننے لگیں۔ نیند کمبخت دماغ پر مسلط ہوتی جا رہی تھی لیکن بہر طور شوہر کی باتیں سننا یا ان کی دلجوئی کرنا بھی ان کا فرض تھا، چنانچہ فرید علی جو کچھ کہتے رہے وہ سنتی رہیں اور پھر شاید نیند ان کی آنکھوں سے بھی غائب ہو گئی۔

❧❧❧

عائشہ نے عمر کی اکیسویں سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔ اس عمر میں اس کے معمولات دوسری لڑکیوں سے قطعی مختلف نہیں تھے۔ بچپن میں جس ماحول میں آنکھ کھولی جائے وہی ماحول انسان کا راہبر بن جاتا ہے اور عائشہ کی راہبر زبیدہ بیگم تھیں چنانچہ ماں ہی کی طرح سادہ سی، معصوم فطرت کی مالک تھی۔ بچپن کا زمانہ گزرا اور نوخیزیت کا دور آیا۔

زندگی کے معمولات اس کی نگاہ میں وہی تھے جو اس جیسے گھر میں رہنے والی کسی بھی لڑکی کی نگاہ میں ہو سکتے ہیں۔ فرید علی نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ سکھ دے سکیں لیکن رفتہ رفتہ یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ ان کی پہنچ صرف اسی حد تک ہے۔ اس سے آگے کا کوئی تصور ذہن میں بسا کر اس زندگی کو پراگندہ ہی کیا جا سکتا ہے، خوشگواریت کے ساتھ گزارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسکول کی لائف تک کوئی ایسی سوچ دامن گیر نہ ہوئی جو کسی قسم کی محرومی کا احساس دلاتی۔

لیکن کالج کی دنیا ذرا مختلف تھی۔

یہاں نمود و نمائش کے احساس میں بھی لڑکے لڑکیاں اپنی حیثیت سے زیادہ بلند نظر آنے کی کوشش کرتے اور ان کوششوں میں کچھ کامیاب ہو جاتے تھے اور کچھ ناکام اور کچھ ناکام ہونے کے بعد بلند حیثیت اختیار کرنے کے لیے غلط راہوں کا انتخاب بھی کر لیتے تھے۔ مگر ان بھانت بھانت کے لوگوں میں عائشہ کو کسی قسم کا احساس کمتری نہیں تھا۔

فرید علی نے اپنے طور پر ہر وہ شے اسے فراہم کر دی تھی جو اس کے لیے اہمیت رکھتی تھی اور اپنے طور پر اس کے اندر کافی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ چنانچہ کالج کی زندگی میں اس نے خود کو ضم کر لیا۔ اپنے معیار کی کچھ لڑکیاں اس کی دوست بھی تھیں اور ساری خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ اسے یہ احساس بھی تھا کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے وہ ان اونچی سطح کی لڑکیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اس لیے وہ دوستی کرنے میں بھی محتاط رہتی تھی۔ اس کی دنیا گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک محدود تھی۔ دیگر معمولات میں مکمل اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی اس کا روزمرہ کا معمول تھی۔ کبھی کبھی کالج سے آنے کے بعد گھر کے امور نمٹانے کے بعد.... کسی دوست کے گھر چلی جاتی، وہ بھی ماں باپ کی اجازت کے ساتھ۔

زندگی میں ابھی تک کسی اور تردد نے جگہ نہیں پائی تھی۔ اس لیے وہ مکمل طور پر شاداب تھی۔ والدین شکل وصورت میں خوب صورت نہیں تھے۔ بس درمیانہ شکل وصورت کے مالک تھے لیکن قدرت نے اسے ایک انوکھے حسن سے نوازا تھا۔ لیکن یہ بھی بس قدرت ہی کا عطیہ تھا جو شاید اسے اس کی اچھی شکل وصورت کی بنا پر کوئی اچھا مستقبل دینا چاہتی تھی۔ یوں زندگی گزر رہی تھی عائشہ کی اور وہ اپنے ماحول اور اپنے حالات سے مطمئن تھی۔ مستقبل کی فکر کرنے والے ماں باپ موجود تھے تو وہ فضول باتیں کیوں سوچتی صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر وہ کالج جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ سامنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے منشی فرید علی اسے بہ غور دیکھ رہے تھے۔ ایک دو بار تو اس نے اس بات پر توجہ نہ دی لیکن جب منشی فرید علی کی نگاہیں مسلسل اپنی جانب نگراں پائیں تو وہ ہنس پڑی۔

''ابو کیا بات ہے، آپ بہت غور سے دیکھ رہے ہیں مجھے آج؟'' اس نے قریب پہنچ کر کہا۔

''ہاں ذرا ادھر آؤ...... میرے قریب۔'' منشی فرید علی نے کسی قدر متفکر لہجے میں کہا اور وہ ان کے قریب آکر تخت پر بیٹھ گئی۔ منشی جی اب بھی اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

''آخر بات کیا ہے ابو۔ کوئی خاص بات نظر آرہی ہے آپ کو مجھ میں؟''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹے! طبیعت کچھ خراب ہے کیا؟'' منشی فرید علی نے سوال کیا۔

''نہیں تو ابو...... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' عائشہ بولی۔

''تو پھر چہرے پر یہ ہلکی سی پیلاہٹ کیوں ہے؟''

''پیلاہٹ؟'' وہ پھر ہنس پڑی۔

''یار، بار ہنسے جا رہی ہو۔ کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ تاکہ ڈاکٹر سے رجوع کیا جا سکے۔''

''واہ، ابو! آپ تو مجھے بیمار بنا رہے ہیں، خوامخواہ ہی۔ اگر مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے تو کیا آپ کی تسلی کے لیے مجھے کوئی تکلیف پیدا کرنی پڑے گی۔''

''بیٹی باپ کے دل کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی...... لیکن یہ پیلاہٹ مجھے تشویش کا شکار کر رہی ہے۔ بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن اگر ڈاکٹر کو دکھا لوں تو بہتر ہے، دل کو اطمینان ہو جائے گا۔''

''ارے ابو میں تو بالکل ٹھیک ہوں خدا کے فضل سے، کوئی تکلیف نہیں ہے مجھے۔''

''پھر بھی میری تسلی کے لیے تم کسی ڈاکٹر کو دکھا لو۔''

''کمال ہے ابو۔ میں جسمانی طور پر قطعی ان فٹ نہیں ہوں، پھر ڈاکٹر کو کس لیے دکھاؤں۔''

''میں نے کہا ناں بیٹی۔ چیک اپ کرا لو گی تو کیا حرج ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، ابو آپ کی تسلی کے لیے میں چیک اپ کرا لوں گی۔''

''ہاں بیٹے تم صحت مند رہو، تندرست رہو۔ یہی میرا سرمایہ ہے، تمہارے علاوہ میرے پاس اور ہے ہی کیا۔''

''نہیں ابو، میں آپ کے پاس ہوں اور آپ کی بات ماننا میرا فرض ہے، آپ اپنے لیے کوئی روگ نہ پالیں بس، میں ڈاکٹر کو دکھا لوں گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔''

''ہاں بیٹی جیتی رہو۔'' فرید علی نے کہا اور پھر عائشہ بولی۔

''اب میں جاؤں ابو؟''

''ہاں......'' عائشہ چلی گئی اور منشی فرید علی چند لمحات خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد وہ دفتر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

جب وہ دفتر پہنچے تو خورشید بیگ آچکے تھے۔ منشی جی نے ذرا دیر سے آنے کی معذرت کی تو خورشید بیگ کہنے لگے۔

''کوئی بات نہیں ہے منشی جی۔ آپ ذرا تین نمبر کے کیبنٹ سے فائل نکال لیجیے۔ فائل نمبر پانچ، چھ اور سات۔''

''آج کورٹ جانے کا ارادہ تو نہیں ہے؟''

''کورٹ تو نہیں جاؤں گا آج لیکن بارہ بجے کے قریب مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ آپ براہ کرم یاد دلا دیجیے گا اور یہ کاغذات ذرا ٹائپسٹ کو دے آئیں۔'' خورشید بیگ نے کچھ کاغذات ان کی جانب بڑھا دیے جنہیں منشی جی نے لے کر اپنی میز پر رکھا اور اس کے بعد کیبنٹ سے مطلوبہ فائل نکالنے لگے۔ تمام کام کرنے کے بعد وہ اپنی میز پر آبیٹھے پھر خورشید بیگ نے ایک دو بار ان کا چہرہ دیکھا اور اپنی فائلوں پر مصروف ہو گئے۔ پھر ایک طویل سانس لے کر انہوں نے فرید علی کی جانب دیکھا اور بولے۔

''منشی جی۔ ذرا ادھر آیئے۔''

''جی جناب۔'' منشی جی جلدی سے خورشید بیگ کے سامنے پہنچ گئے۔

''بیٹھ جایئے۔''

’’شکریہ۔‘‘

’’آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں، خیریت تو ہے ناں؟‘‘

’’سب ٹھیک ہے جناب۔‘‘

’’بھئی کوئی بات ہے تو آپ کم ازکم مجھ سے نہ چھپائیں۔ میں آپ کا چودہ پندرہ سالہ پرانا ساتھی ہوں اور آپ کے چہرے کو پڑھنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ دیکھیے، منشی جی! خودداری بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ میں خود اس کی قدر کرتا ہوں لیکن انسان اپنے دوستوں سے ہی دل کی باتیں کہتا ہے۔‘‘

’’وہ جناب کوئی بات نہیں ہے، بس ذرا عائشہ بیمار ہے آج کل، میں سوچ رہا ہوں کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھادوں۔ پریشان ہوں اس لیے۔‘‘

’’آپ کی بیٹی؟‘‘

’’جی...... جی ہاں...... جی ہاں۔‘‘ منشی فرید علی نے آہستہ سے کہا۔

’’کیا بیماری ہے اسے؟‘‘

’’پتا نہیں، بس چہرے پر کچھ پیلاہٹ سی آرہی ہے۔ حالانکہ بہ ظاہر تندرست ہے لیکن پتا نہیں کیوں، دل میں کچھ پریشانی سی پیدا ہوگئی ہے۔‘‘

’’تو اس میں الجھنے کی کیا بات ہے۔ آپ یوں کریں کہ ڈاکٹر جاوید فاروقی کے پاس چلے جائیں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ ڈاکٹر جاوید کو تو جانتے ہیں آپ؟‘‘

’’جی ہاں۔ میں جانتا ہوں انہیں۔‘‘

’’ہاں بہت نفیس انسان ہیں۔ میں کارڈ پر لکھے دیتا ہوں۔ آپ یہ کارڈ انہیں دے دیں اور عائشہ کو کل دن میں اپنے ساتھ لے جائیے۔ اور کل کی چھٹی کرلیں آپ یا پھر اگر جلدی فراغت ہوجائے تو آجایئے گا۔‘‘

’’شکریہ جناب...... بے حد شکریہ...... میں دراصل اسی لیے الجھا ہوا تھا۔‘‘

’’تو بھئی اپنی الجھنیں ہمیں بھی بتادیا کریں۔ اب ہم اتنے بھی غیر نہیں آپ کے لیے۔‘‘

’’نہیں جناب عالی۔ آپ کے احسانات تو......‘‘

’’بس...... بس...... منشی جی، بے کار باتوں کا تذکرہ مت کیا کریں۔ کوئی کسی پر احسان نہیں کرسکتا۔ اگر خدا اسے اس کی توفیق نہ دے تو۔‘‘

’’یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے، جناب عالی۔‘‘

’’بس...... بس پریشان نہ ہوں، جایئے۔ اس لیے میں نے آپ کو بلایا تھا۔‘‘ منشی فرید علی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتا کرتے ہوئے انہوں نے عائشہ سے کہا۔

’’عائشہ بیٹی آج کالج میں کوئی ضروری کام تو نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں ابو جی، کالج میں سب سے اہم کام پڑھائی ہوتا ہے اور کیا ہوسکتا ہے۔‘‘

’’تو پھر آج کا دن ہمیں دے دو۔‘‘

’’جی ابو، میں سمجھی نہیں؟‘‘

’’وہ ڈاکٹر جاوید کے ہاں چلنا ہے۔‘‘

’’اوہ...... ابو آپ پر اب بھی وہی دھن سوار ہے۔‘‘

’’تم نے وعدہ کیا تھا نا...... کہ...... کہ......‘‘

’’ٹھیک ہے، ابو، جو آپ کا حکم۔‘‘ عائشہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ بہر طور وہ جانتی تھی کہ یہ باپ کی انتہائی محبت ہے ورنہ اپنے طور پر اس نے اپنے اندر کسی قسم کی کوئی کمزوری نہیں پائی تھی۔

ساڑھے نو بجے فرید علی بیٹی کو لے کر باہر نکل آئے اور ڈاکٹر جاوید فاروقی کے کلینک پہنچ گئے۔ کلینک میں زیادہ رش نہیں تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی ابھی ابھی کلینک پہنچے تھے‘ وہ ایک معمر اور سنجیدہ انسان تھے۔ شاندار پریکٹس چل رہی تھی، بہر طور منشی فرید علی نے خورشید بیگ کا کارڈ ان کے اردلی کے ہاتھ میں دے دیا اور چند لمحات بعد ہی انہیں طلب کرلیا گیا۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی خورشید بیگ کے دوستوں میں سے تھے اور اکثر ان کے آفس آتے رہتے تھے اور اسی وجہ سے منشی فرید علی سے بھی واقف تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ خورشید بیگ کے بہت پرانے ساتھی ہیں۔ انہوں نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔

’’آیئے منشی جی! یہ کارڈ آپ کیوں لے آئے خورشید بیگ سے، کیا ہم آپ سے واقف نہیں ہیں۔‘‘

’’نہیں ڈاکٹر صاحب ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ بس خورشید بیگ صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میرا یہ کارڈ ڈاکٹر صاحب کو دے دیں اور میں نے یہ کارڈ آپ تک پہنچادیا۔‘‘

’’تشریف رکھیے، یہ کون ہیں؟‘‘

’’یہ...... یہ میری بیٹی ہے۔‘‘

’’اچھا...... اچھا...... جاؤ بیٹے اس طرف بیٹھ جاؤ۔‘‘ ڈاکٹر جاوید فاروقی نے ایک سمت اشارہ کیا جہاں دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس طرف غالباً خواتین کے لیے خصوصی نشست

گاہ تھی۔ منشی جی کو انہوں نے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور منشی جی پر اطمینان انداز میں بیٹھ گئے۔

’’جی فرمایئے میرے لائق کیا خدمت ہے؟‘‘

’’ڈاکٹر صاحب، چند دن سے میں محسوس کر رہا ہوں جیسے عائشہ بیمار ہے، میں اس کے چہرے پر کچھ پیلاہٹ سی دیکھ رہا ہوں۔ بس اسی لیے تشویش ہوگئی تھی۔ خورشید بیگ نے مجھے تشویش زدہ دیکھا تو کہنے لگے کہ بچی کا چیک اپ کرالوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے چیک اپ میں کرلیتا ہوں۔ لیکن ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں پہلا اطمینان آپ کو یہ دلاتا ہوں کہ بچی کو میں نے صرف ایک نگاہ دیکھا ہے لیکن وہ ٹھیک نظر آرہی ہے، بہ ظاہر اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آرہی۔‘‘

’’ٹھیک ہے، ڈاکٹر صاحب۔ آپ درست فرمارہے ہیں لیکن میری اس تشویش کی بھی کوئی وجہ ہے۔ دراصل میں تھوڑی سی بدنصیبیوں اور محرومیوں کا شکار رہا ہوں۔ میری اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ قدرت نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔‘‘ فرید علی نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’جی میں سمجھا نہیں۔ پھر یہ بچی ہے کون آپ کی؟‘‘

’’یہ......‘‘ منشی فرید علی نے گہری سانس لی۔ ’’یہ میری اولاد نہیں ہے لیکن ڈاکٹر صاحب، انسان بہت عجیب مخلوق ہے، خدا نے اسے محبت کی دولت دے کر دنیا کی تمام نعمتوں سے نواز دیا ہے۔ بس کبھی کبھی یہ احساس آجاتا ہے کہ اس نے ہمارے گھر میں جنم نہیں لیا مگر...... جب بھی یہ کچھ بیمار ہوتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے کسی بڑے فرض سے غفلت برتی ہے یا کوئی جرم سرزد ہوگیا ہے مجھ سے۔‘‘

’’پھر یہ کس کی بچی ہے؟‘‘ ڈاکٹر جاوید نے پوچھا۔

’’یہ......‘‘ منشی جی نے گہری سانس لی۔ ’’لاوارث اور بے سہارا۔ اس کے والدین مرچکے تھے لیکن ہم نے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہماری اولاد نہیں ہے۔‘‘

منشی فرید علی کے جملے ابھی پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ دفعتاً پردے کے دوسری طرف سے ایک دلدوز چیخ ابھری اور یوں لگا جیسے کوئی گرا ہو۔ ڈاکٹر جاوید اور منشی فرید علی گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ پھر دونوں ایک ساتھ دوسری طرف دوڑ پڑے۔

⁂

عائشہ نے اس طرح کے ماحول میں ہوش سنبھالا تھا کہ مامتا کی تمام تر دولت سے مالا مال ماں اور شفقت کے تمام خزانوں سے بھرپور باپ۔ اکلوتی تھی اس لیے زیادہ نازونعم میں پرورش ہوئی تھی۔ حیثیت سے زیادہ درجہ ملا ہوا تھا اسے۔ وہ تمام خواہشات جنہیں پورا کرنا منشی فرید علی کے بس میں تھا، ضرور پوری کی جاتی تھیں اور اس سلسلے میں عائشہ کو کبھی مایوسی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا تھا۔ بچپن پرمسرت گزرا۔ جوانی کا دور آیا۔ زبیدہ بیگم سمجھدار خاتون تھیں، انہوں نے اسے دنیا کے سرد و گرم سمجھائے، اپنی حیثیت سے روشناس کرایا تاکہ وہ کسی احساس کا شکار نہ ہونے پائے۔

منشی فرید علی کی پوری آمدنی عائشہ کے علم میں تھی اور زبیدہ بیگم نے اس کے دل میں ماں باپ کی طرف سے اعتماد قائم کیا تھا۔ اس لیے عائشہ ایک نارمل لڑکی تھی۔ کالج کی روشن زندگی میں بھی وہ کبھی نہیں بھٹکی تھی۔ اس نے ہر لمحہ اپنی خوداعتمادی کو قائم رکھا تھا اور یوں وہ بہت سے لوگوں میں ہردلعزیزی کا باعث بن گئی تھی۔ بہرحال وہ ایک پراعتماد زندگی گزار رہی تھی۔ مستقبل کے اندیشے اس کے دل میں نہیں آئے تھے۔

یہاں اس کا یقین پختہ تھا کہ تقدیر آسمانوں پر لکھی جاتی ہے اور جہاں لوح محفوظ ہے، وہاں انسان کی میلی آنکھ نہیں پہنچ پاتی کہ وہ انسان کی دسترس سے محفوظ ہے۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ جو کچھ مقدر میں ہے وہ ہرحال میں ہوگا اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

فرید علی نے اسے تعلیم کی اجازت دے دی تھی اور کہا تھا کہ جتنا دل چاہے پڑھے، وہ حارج نہ ہوں گے۔ چنانچہ بی اے کے آخری سال میں تھی اور بی اے کے بعد یونیورسٹی میں داخلے کا ارادہ رکھتی تھی۔ فرید علی کی سوچ میں یہ احساس بھی شامل تھا کہ عائشہ کے مستقبل کے دوسرے دور کے لیے ان کے پاس کیا ہے۔ ہاں وقت کے بدلنے سے وہ مایوس نہیں تھے اور بس یہی سوچتے رہتے تھے‘ ایسے بہت سے واقعات ان کے علم میں تھے جب اچانک رحمت خداوندی جوش میں آئی اور تقدیریں بدل گئیں۔ وہ اپنی تقدیر بدلنے کے خواب اکثر دیکھتے رہتے تھے۔

ایک بے کس انسان کی حیثیت سے انہوں نے عائشہ کے حسن کو بھی گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔ جس کی بے مثال شادابی کسی رئیس زادے کو دیوانہ کرسکتی تھی۔ اس امید پر انہوں نے عائشہ پر کوئی پابندی بھی روا نہ رکھی تھی حالانکہ ایک باپ کے لیے یہ شرمناک تصور تھا۔

عائشہ کو اس چھوٹے سے گھر پر بہت اعتماد تھا اور بعض اوقات اپنی خواہش کے خلاف بھی ماں باپ کی مرضی کے مطابق عمل کرتی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر کے پاس چلے آنا بھی

ایک ایسا ہی مسئلہ تھا۔ خوامخواہ بس ابو کو شک ہو گیا ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پردے کے دوسری طرف سے اس کے کانوں میں کچھ ایسے الفاظ پڑے جو اس کے لیے غیر متوقع تھے، اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، منشی فرید کہہ رہے تھے۔

''یہ میری اولاد نہیں ہے۔'' میں...... میں......

عائشہ نے اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔

''میں...... میں...... منشی فرید کی بیٹی نہیں ہوں۔''

اسے اچانک محسوس ہوا جیسے واقعی اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہو۔ اس نے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھالا۔ باہر سے آواز ابھر رہی تھی۔

''لاوارث اور بے سہارا۔ جس کے والدین مر چکے ہیں۔'' ایک دم زمین و آسمان گھوم گئے۔ اسے بس یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔ ''ناممکن۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اسے اپنی کرسی چھت کی طرف بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔

ڈاکٹر جاوید نے کہا۔ ''گھبرائیے نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد نارمل ہو جائے گی۔''

''یہ...... یہ کوئی مرض ہے، ڈاکٹر صاحب۔'' منشی فرید علی کا لہجہ پھنسا پھنسا سا تھا۔

''ہرگز نہیں...... آپ سے غلطی ہوئی ہے۔''

''مجھ سے؟''

''اسے یہ بات پہلے سے معلوم نہیں تھی ناں؟''

''کون سی؟''

''جو آپ مجھے بتا رہے تھے۔''

''قطعی نہیں، ہم نے کبھی اسے احساس نہیں ہونے دیا۔''

''اور اس وقت اچانک آپ نے یہ انکشاف کر دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے اور ہمارے درمیان صرف ایک پردہ حائل ہے اور وہ سب کچھ سن سکتی ہے۔''

''اوہ...... اوہ......'' منشی فرید علی کو دفعتاً اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا اور وہ نادم نظر آنے لگے۔

''اسے شاک لگا ہے اور وہ اچانک اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکی۔''

''اسے کوئی خطرہ تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''نہیں...... ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''مجھے بہت افسوس ہے۔ نجانے کیوں میں اس وقت یہ تذکرہ نکال بیٹھا۔'' منشی فرید علی گلوگیر لہجے میں بولے۔

''اس کے والدین کون تھے؟'' ڈاکٹر فاروقی نے پوچھا۔

''لمبی کہانی ہے ڈاکٹر صاحب۔ مختصر بتا رہا ہوں، ان دنوں میں پورن نگر میں تھا۔ پورن نگر میں میری بیوی کے کچھ رشتے دار رہتے تھے۔ ان کے پاس ہی میرا قیام تھا۔ پورن نگر کی ایک غریب لڑکی ایک دولت مند شخص سے محبت کرنے لگی۔ لڑکے کا نام اسد، اسد رحمان اور لڑکی کا نام حسنہ، لڑکی کا باپ نہیں تھا، صرف ماں تھی اور وہ بھی ایک غریب عورت۔ بوڑھی عورت کو معلوم ہوا تو وہ کلیجا پکڑ کر بیٹھ گئی۔

لیکن چھوٹی آبادیوں میں عزت کا معاملہ کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ لوگوں نے اسد رحمان کو پکڑ لیا۔ لڑکا برا نہ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ حسنہ سے سچی محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا باپ کبھی ایسا نہ ہونے دے گا۔ اس کے باپ کا نام اکبر تھا۔

لوگوں کو اسد رحمان کی سچائی پسند آئی۔ پھر لڑکے نے کہا کہ وہ حسنہ سے شادی کر کے پورن نگر ہی میں رہنا چاہتا ہے اور حسنہ کے لیے سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ پورن نگر ہی میں اسے ایک اسکول میں مدرس کی جگہ دے دی گئی۔

اسکول ہی کی طرف سے انہیں رہائش گاہ بھی دے دی گئی تھی اور ان دونوں کی شادی کر دی گئی تھی۔ اسد نیک دل اور سچا انسان نکلا۔ تین سال تک اس کے باپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن پورن نگر میں سروے کے لیے آنے والی ٹیم کے کچھ افراد اسد کو جانتے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر اسد کے باپ کو اطلاع دے دی اور اکبر رحمان فوراً وہاں پہنچ گیا۔ وہ آتش فشاں بنا ہوا تھا اور پوری بستی کو سزا دینے کے لیے تیار تھا لیکن بیٹا سامنے آ گیا اور اس نے کہا کہ اس نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے اور اکبر رحمان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کرے۔ اکبر رحمان اسد کی وجہ سے مجبور ہو گیا اور اس نے کہا کہ وہ زندگی بھر اسد کی صورت نہیں دیکھے گا اور اسے اپنی جائداد سے بھی عاق کر دے گا۔ اسد نے خندہ پیشانی سے باپ کی دولت ٹھکرا دی اور اکبر رحمان چلا گیا۔ سات سال اطمینان سے گزر گئے۔

پھر پورن نگر میں ہیضے کی شدید وبا پھیلی اور میں اپنی بیوی کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

میں نے اس شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ کوئی ایک سال بعد ایک بار پھر میں اپنے رشتے داروں سے ملاقات کے لیے پورن نگر چلا گیا۔ تب مجھے علم ہوا کہ ہیضے کی وبا نے جہاں دوسرے لوگوں کو لقمۂ اجل بنا دیا وہیں اسد رحمان اور اس کی بیوی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ چھ مہینے کی ایک بچی چھوڑ گئے تھے جسے اس کی نانی پال رہی تھی، بے سہارا عورت بچی کی پرورش خیرات پر کر رہی تھی۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ خدا نے ہمیں اولاد نہیں دی اور میری بیوی کو اولاد کی بہت خواہش تھی۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ اگر عائشہ کی نانی تیار ہو جائے تو اس بچی کو ہم لے لیں۔ اس وقت اس بچی کا نام نایاب تھا۔ بہرحال عائشہ کی نانی بہ خوشی اس بات پر تیار ہو گئی کہ ہم بچی کو گود لے لیں۔ یوں ہم بچی کو لے کر یہاں چلے آئے۔ اس کے بعد ہم نے اس کی پرورش سگی اولاد کی طرح کی۔ پتا نہیں مجھ بدنصیب کے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکل گئے ورنہ عائشہ آج تک اس بات سے لاعلم ہے۔''

فرید علی خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی نے کہا۔

''بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا، لڑکی پر بہت شدید ردعمل ہوا ہے۔ بہر طور آگے کے حالات آپ کو اب نہایت احتیاط کے ساتھ بہتر بنانے ہوں گے۔''

''کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب؟''

فرید علی نے ایک بار پھر پوچھا۔

''نہیں۔ بس بچی شدید شاک کا شکار ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر جاوید فاروقی نے کہا اور فرید علی گردن ہلانے لگے۔

٭٭٭

''امی۔'' عائشہ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا اور زبیدہ بیگم کانپ گئیں۔

''میری بچی، میری آنکھوں کا نور۔'' انہوں نے پیار سے عائشہ کو سینے میں بھینچ لیا۔

''میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟''

''عائشہ کیوں مجھے رلا رہی ہے میری بچی، تجھے میری آغوش میں سکون نہیں ملتا کیا؟''

''یہی تو حیرت ہے امی۔ مجھے تو آپ کے بدن سے اپنی بو آتی ہے مگر میرے بدن میں آپ کا خون نہیں ہے۔''

زبیدہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کے چہرے پر عجیب سے آثار تھے۔ اسی وقت منشی فرید علی آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے، بھئی...... ساون بھادوں کیوں گلے مل رہے ہیں۔''

''ابو آپ نے اچانک مجھے بے سہارا کر دیا۔'' عائشہ ماں کے سینے سے ہٹ کر باپ سے چمٹ گئی۔

''عائشہ میری بچی، تو نے صرف چند جملوں سے متاثر ہو کر میری محبت کے برسہا برس بھلا دیے، تجھے کبھی یہ احساس ہوا کہ تو میرے بدن کا حصہ نہیں ہے۔''

''لیکن ایسے جملے آپ نے کیوں کہے ابو، آپ نے اچانک ہی مجھے اکیلا کیوں کر دیا؟'' عائشہ نے روتے ہوئے کہا۔

''اگر میرے ان دو جملوں نے تجھے ہم سے اتنا دور کر دیا ہے عائشہ تو یہ تیری نہیں ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم تیرے دل میں اپنا پیار نہ اتار سکے۔'' فرید علی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''مگر آپ کے منہ سے یہ سب سن کر میں برداشت نہ کر سکی۔ ابو مجھے یقین دلا دیجیے کہ میں آپ ہی کا خون ہوں۔''

''کیا میرے ہوتے ہوئے تجھے اپنی ذات کے لیے کوئی کمی محسوس ہوئی؟''

''نہیں، ابو نہیں۔''

''تو پھر میرے یہ چند جملے تیرے لیے اس قدر اہمیت کیوں اختیار کر گئے۔ عائشہ تو نے یہ جملے سنے ہی کیوں۔ تو نے اس پر توجہ ہی کیوں دی؟'' منشی فرید علی نے آنسو بھری آواز میں کہا اور عائشہ خاموش ہو گئی اور زبیدہ بیگم شاکی نگاہوں سے فرید علی کو دیکھ رہی تھیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔ فرید علی نے انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر رخ تبدیل کر لیا۔ آج کل وہ دفتر سے ذرا جلدی آ جاتے تھے کیونکہ خورشید بیگ کسی کاروباری دورے پر گئے ہوئے تھے اور کئی دن سے دفتر منشی جی کو سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ تمام کیسوں کی تاریخیں حاصل کی جا رہی تھیں اور کورٹ کے بعد بھی فرید علی دفتر جانے کے بجائے گھر ہی واپس آ جاتے تھے۔

تقریباً دس دن گزر گئے۔ عائشہ کو اب کسی قدر قرار آ گیا تھا۔ گیارھویں دن وہ کالج بھی گئی۔ بہرحال اب اس نے رونا چھوڑ دیا تھا لیکن دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ماں باپ کا پیار کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ تیرھویں دن خورشید بیگ صاحب واپس آ گئے۔ منشی فرید علی سے بولے۔

''سنائیے منشی جی، کیا حال چال ہیں؟''

''سب ٹھیک ہے، جناب عالی۔''

''کوئی اہم بات؟''

''جی نہیں۔''

''اچھا میں جا رہا ہوں، ریلوے اسٹیشن سے سیدھا آ رہا ہوں۔ سامان بھی نیچے پڑا ہوا ہے۔''

"آپ نے ٹرین سے سفر کیا، جناب۔"

"ہاں منشی جی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا، بہرحال آپ معمول کے مطابق کام کرتے رہیں، میرے آنے کی اطلاع کسی کو نہ دیں۔ کم از کم دو دن آرام کروں گا اس کے بعد دفتر آسکوں گا۔"

"بہتر ہے، جناب عالی۔" فرید علی نے نیاز مندی سے کہا اور خورشید بیگ واپس چلے گئے۔

اس رات خورشید بیگ، ڈاکٹر جاوید فاروقی کے گھر موجود تھے ڈاکٹر جاوید نے ان کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں خاصے گہرے دوست تھے۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی انہیں دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے تھے پھر "سناؤ، بیرسٹر کیا حال ہیں تمہارے، کتنے سولی چڑھوائے اور کتنے بچائے۔" کہتے ہوئے حال دریافت کیا۔

"لعنت ہے یار! تم نے میرے پیشے کو بھی کوئی ڈاکٹر کا پیشہ سمجھ رکھا ہے۔" بیرسٹر خورشید بیگ نے بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر مسز جاوید فاروقی کی طرف رخ کر کے بولے۔

"کیوں بھابی میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔" مسز جاوید فاروقی مسکرا کر خاموش ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی نے خورشید بیگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہو کیا مصروفیات چل رہی ہیں؟"

"بس یار! اپنا پیشہ ہی عجیب ہے، دکھ درد کی کہانیاں سنتے رہو۔ عدالتوں میں جا کر بک بک جھک جھک کرتے رہو، کبھی تو ذہن بڑا ہی الجھ جاتا ہے۔" خورشید بیگ نے گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کوئی مسئلہ الجھ گیا ہے؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی الجھن رہتی ہے۔"

"بھئی میرا تو خیال ہے کہ ساٹھا، تو پاٹھا۔ میرا مطلب ہے وکیل جتنا تجربے کار ہو، اتنا ہی منجھتا ہے۔"

"بات صرف وکالت ہو تب ناں۔" خورشید بیگ نے کہا، پھر بولے۔ "بھئی بھابی، اتنی دیر ہوگئی بیٹھے بیٹھے آپ نے چائے یا کافی کے لیے نہیں پوچھا۔"

"میں تو کھانے کے لیے پوچھنا چاہتی تھی بھائی صاحب۔" مسز جاوید فاروقی بولیں۔

"نہیں بھابی ایسے نہیں چلے گی۔ ایک دعوت آپ پر ڈیو ہے۔ کتنا عرصہ ہوگیا یاد ہے آپ کو۔" خورشید بیگ نے کہا۔

"دیکھا، دیکھا...... یہ وکیل عدالتوں میں جھوٹ بولتے بولتے اتنے پختہ ہوجاتے ہیں کہ پھر ان کی زندگی سے سچائیاں ہی نکل جاتی ہیں اور ہٹ دھرم ایسے کہ منہ ہی منہ پر جھوٹ بولیں۔ بھئی کب وعدہ کیا تھا تم نے ان سے دعوت کا۔" جاوید نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، بھیا جی کے لیے ہر وقت دعوت موجود ہے۔" مسز جاوید فاروقی مسکرا کر بولیں۔

"واہ، بھاوج ہو تو ایسی۔" خورشید بیگ نے کہا اور ڈاکٹر فاروقی اپنی بیوی کو گھورنے لگے۔

"یار ڈاکٹر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تھکن کی بھی کوئی دوا ہے تمہارے پاس۔ یقین کرو ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا تھک گیا ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔"

"غلط جگہ آگئے ہو یار تھکن کی دوا تو تمہارے اپنے گھر میں موجود ہے۔"

"یعنی۔" خورشید بیگ تعجب سے ڈاکٹر فاروقی کو دیکھنے لگے۔

"بھئی بھابی کی پرخلوص اور محبت بھری مسکراہٹ۔ مجھے دیکھو، جب بھی بہت زیادہ تھک جاتا ہوں تو اپنی بیوی کی زلفوں کی چھاؤں میں آرام کرلیتا ہوں۔ یار ساری تھکن دور ہوجاتی ہے۔" ڈاکٹر فاروقی نے اپنی مسز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مسز فاروقی جھینپے ہوئے انداز میں مسکرادیں۔

"یار ڈاکٹر تمہیں ڈاکٹر سے زیادہ ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو! میں ہوں بیرسٹر، حق گوئی کا عادی، سچ بولنا میری فطرت ہے کیونکہ اسی سے میں اپنی روزی کماتا ہوں اور زبان پر پابندی بھی نہیں لگا سکتا۔ بیویوں کے سامنے بہت زیادہ سعادت منداور محبت کرنے والے شوہر کا روپ وہی دھارتے ہیں جو بیویوں کو بے وقوف بنانا چاہتے ہیں۔"

"مطلب؟" ڈاکٹر فاروقی نے خورشید بیگ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو تم بھابی کے گھنے بالوں کا ذکر کررہے ہو اور اس دن مس نازلی سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کون مس نازلی؟"

"وہی جو ایک بار تمہارے پاس آنے کے بعد مستقل تمہاری مریضہ بن گئی ہیں، ہر روز چیک اپ، ہر روز دوائیں حالانکہ مس نازلی کی شادابیاں گلوں کو شرماتی ہیں۔"

"اے...... اے، بیرسٹر ہوش میں رہو۔ کیوں میرا گھر تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو، یہ...... یہ فضول بکواس کررہا

ہے بیگم! تم اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔" ڈاکٹر فاروقی نے اپنی بیگم سے کہا لیکن مسز فاروقی کی آنکھوں میں شکوک کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

"یہ مس نازلی کون ہیں بھائی صاحب! نام تو میں نے بھی سنا ہے ان کا۔" مسز فاروقی بولیں۔

"رات کو سوتے میں ان کے منہ سے سنا ہوگا۔" خورشید بیگ مسکرا کر بولے۔

"دیکھ بیرسٹر، میرے گھر میں آگ لگا کر تجھے سکون نہیں ملے گا۔ کیوں میرا گھر برباد کررہا ہے، لعنت ہے تجھ پر یار۔ بھائی تکلیف کی دوا لے لے۔ میں نے کب منع کیا ہے، پر خدا کے لیے یہ جو آگ لگائی ہے۔ اسے ٹھنڈا کر کے جانا۔ تجھے پتا نہیں میری بیگم سچ سمجھ بیٹھتی ہیں۔"

"خیر مرد گھر سے باہر نکلے تو گھر میں رہنے والی بیچاری اس کا پیچھا تو نہیں کرسکتی۔ اگر بھائی صاحب نے مذاق کیا ہے تو دوسری بات ہے ورنہ اگر سچ بھی ہو تو میں کیا کرسکتی ہوں۔" مسز فاروقی سنجیدگی سے بولیں اور ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر کنفیوز ہوگئے۔

"ارے بیگم یہ سب مذاق ہے، اللہ کی بندی اس عمر میں ان باتوں کو سچ مانتی ہو یہ بیرسٹر...... یہ...... یہ تو شیطان کی اولاد ہے۔" ڈاکٹر فاروقی نے بوکھلا کر کہا۔

"چھوڑیں بھائی صاحب یہ بتائیں کیا پئیں گے؟"

"اس وقت ان حالات میں جو بھی پلا دیں گی پی لیں گے۔" خورشید بیگ نے کہا اور مسز فاروقی اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر فاروقی بولے۔

"ہاں تو کہاں گئے تھے تم جاسوسی کرنے؟"

"پورن نگر گیا تھا اور اس کے بعد آس پاس کی بستیوں کے چکر بھی لگانے پڑے۔ یار اس میں کوئی شک نہیں کہ شہری زندگی سے تھوڑا سا دور ہٹ کر بڑی فرحت ملتی ہے لیکن بات صرف تفریح کی حد تک ہو تب، دراصل میرے سپرد ایک ذمے داری آپڑی ہے اور اس کی تکمیل کے لیے مجھے بہت سے کام ترک کر کے پورن نگر جانا پڑا، اب یہاں آیا ہوں تو مزید بوجھ پڑ جائے گا بس اس چیز نے ذہنی طور پر مجھے تھکا دیا ہے۔"

"پورن نگر میں کیا کام تھا؟"

"بس بھئی ایک ذمے داری آن پڑی تھی مجھ پر۔ ہمارے ایک کلائنٹ تھے، ایسٹ افریقا میں، پہلے یہیں رہتے تھے بعد میں ایسٹ افریقا چلے گئے اور وہاں جا کر آباد ہوگئے۔ یہاں پر بھی بڑے کاروباری تھے۔ وہاں کچھ کانیں وغیرہ خرید لیں اور کروڑوں اربوں بناتے رہے۔ یہاں انہوں نے کافی جائداد میری معرفت خریدی تھی۔ بہرطور وہاں ان کا ذاتی طیارہ بھی تھا۔ طیارے میں بیٹھ کر کہیں جارہے تھے کہ طیارہ حادثے کا شکار ہوگیا اور وہ اس دنیا میں نہ رہے۔ بہرطور مقامی طور پر کارروائیاں ہوتی رہیں لیکن کوئی خاص بات پتا نہیں چل سکی۔ البتہ وہاں ان کا اپنا کوئی تھا نہیں۔ سو ان کی وصیت مجھ تک پہنچا دی گئی جس نے مجھے الجھا دیا اور اب اسی چکر میں گھن چکر بنا ہوا ہوں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا۔" خورشید بیگ بولے۔

"خوب۔ وصیت کیا تھی ان کی؟" جاوید فاروقی نے سوال کیا۔

"وہی جو بڑے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں، ایک بیٹا تھا ان کا یہاں جس نے ایک غریب لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ بس اسی بنا پر اسے عاق کردیا انہوں نے اور تنہا رہنے لگے، پھر شاید بیٹے سے بددل ہو کر یہاں سے چلے گئے اور ان کی غیر موجودگی میں بیٹا اور اس کی بیوی کسی وبائی مرض کا شکار ہو کر مرگئے۔ ایک بچی تھی ان کی جو پورن نگر میں اپنی نانی کے پاس رہتی تھی اور وہیں پرورش پارہی تھی۔ اکبر رحمان اپنی جائداد اپنی تمام تر دولت اسی بچی کے نام یعنی اپنی پوتی کے نام کر گئے ہیں اور اب یہ ذمے داری میری ہے کہ اس بچی کو تلاش کر کے وہ تمام دولت اس کے حوالے کردوں۔ بس اسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔" خورشید بیگ نے کہا اور ڈاکٹر جاوید فاروقی بری طرح اچھل پڑے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب وغریب تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ چند لمحات وہ خورشید بیگ کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"ذرا یہ تو بتاؤ، دولت کتنی ہے؟"

"یوں سمجھ لو، اربوں روپے کی مالیت ہے۔ ابھی تو مجھے اس کا صحیح تخمینہ نہیں مل سکا۔ لیکن تم ہی بتاؤ کہ ایسی لڑکی کو کہاں تلاش کروں جس کے ماں باپ مرچکے ہیں، پتا نہیں وہ خود زندہ ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے نانی بھی اس کی مرچکی ہوگی۔ پورن نگر گیا تھا وہاں سے کوئی صحیح بات معلوم ہی نہیں ہوسکی۔ بے چارے گاؤں کے سادہ لوح لوگ ہیں، کوئی کام نہیں بنا وہاں۔"

"اور اگر تمہارا کام میں یہیں بنا دوں تو؟" ڈاکٹر جاوید نے کہا تو بیرسٹر خورشید بیگ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ڈاکٹر صاحب زندگی میں ایک ہی شے تو کمائی ہے۔

جس پر میں فخر کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ربِ کریم اسی عالم میں زندگی گزروادے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے بیرسٹر، میں تمہیں فریب کی تعلیم دوں گا۔'' ڈاکٹر جاوید فاروقی نے کہا اور اسی وقت مسز جاوید فاروقی چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آگئی تھیں۔ ڈاکٹر جاوید فاروقی نے کہا۔

''سنا بھئی بیگم! تمہارے بھیا کسی غریب لڑکی کی تقدیر روشن کرنے کے لیے چراغ ہاتھ میں لیے پھر رہے ہیں اور اسے کہتے ہیں بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ بیگم چند روز پہلے میں نے تمہیں ایک کہانی سنائی تھی۔''

''کون سی کہانی؟'' مسز فاروقی نے پوچھا۔

''کچھ نام بتاتا ہوں، یاد کر کے بتایئے۔''

''ہوں۔ بولیے۔''

''اکبر رحمان۔''

''اچھا...... وہ ...... ہاں یاد آگیا۔'' مسز فاروقی بولیں۔

''اب تم دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔'' خورشید بیگ نے ہنستے ہوئے ٹرالی اپنی سمت کھسکالی۔

''تم نے مجھے صرف اکبر رحمان کا نام بتایا ہے ناں۔ دوسرے نام سنو...... اکبر رحمان کے بیٹے کا نام اسد رحمان تھا ناں؟''

''ایں...... ہاں...... ہاں۔'' بیرسٹر صاحب کے ہاتھ چائے بناتے بناتے رک گئے۔ ''جس لڑکی سے اس نے شادی کی اس کا نام۔ اس کا نام حسنہ تھا ناں؟''

''کک...... کیا بکواس کر رہے ہو تم، تم اسے کس طرح جانتے ہو؟''

''حسنہ کا باپ مر چکا تھا اور اس کی صرف ماں تھی۔''

''ہاں۔ بالکل درست ہے لیکن...... لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟''

''یار دل تو چاہ رہا ہے تمہیں خوب ستاؤں۔ سارے بدلے لے لوں تم سے۔ لیکن بات کچھ ایسی ہے کہ میں خود بھی ہل کر رہ گیا ہوں۔ میں اس بچی کو جانتا ہوں خورشید بیگ، اچھی طرح جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر فاروقی نے کہا اور خورشید بیگ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ پریشان نظروں سے ڈاکٹر فاروقی کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے کہا۔

''جو ریفرنس تم نے دیے ہیں ڈاکٹر۔ وہ واقعی درست ہیں، خدا کے لیے بتاؤ۔ تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟ میرے بارے میں معلوم ہے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں نے زندگی دیانت داری سے گزاری ہے اور اسی عالم میں مرنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ دولت کا ہے اور اس کے لیے اچھے اچھوں کی نیت خراب ہو سکتی ہے، اس لیے براہِ کرم سنجیدہ ہو جاؤ۔''

''میں سنجیدہ ہوں بیرسٹر۔ بس بات اتنی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ ہم غیر سنجیدہ ہو گئے تھے۔''

''تو پھر بتاؤ۔''

''فرید علی صاحب کو جانتے ہو؟''

''کون فرید علی؟''

''سنا ہے کسی بیرسٹر کے منشی ہیں۔''

''اوہ...... اپنے فرید صاحب؟''

''ہاں...... ان کی بیٹی عائشہ کو ایک دن تم نے کلینک بھیجا تھا۔ اسی دن یہ انوکھا انکشاف ہوا۔'' ڈاکٹر فاروقی نے پوری کہانی بیرسٹر صاحب کو سنا دی اور وہ گنگ رہ گئے۔ دیر تک ان پر سکتہ طاری رہا۔ پھر وہ بولے۔

''فرید علی کی دیانت پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتا ہوں۔ وہ شخص فرشتہ صفت ہے مگر...... مگر کبھی تذکرہ نہیں کیا اس نے۔''

''کیا تذکرہ کرتا اور کیوں کرتا'' اس بے چارے کو کیا معلوم کہ ایک دن ایسا آئے گا۔''

''شدید حیرت کی بات ہے، مگر کچھ الجھنیں ہیں ڈاکٹر؟''

''کیا؟''

''تحقیق ضروری ہے، میری پوزیشن خراب ہو سکتی ہے کیونکہ فرید علی میرا چودہ سالہ ساتھی ہے۔''

''قانونی معاملات تم جانو بیرسٹر صاحب، ایک بات میرے علم میں تھی، میں نے تمہیں بتا دی۔'' بیرسٹر خورشید بیگ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ازحد ضروری ہے۔ میں فرید علی پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکتا ہوں لیکن یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ایک بات بتاؤ...... ڈاکٹر! کیا تم اس سلسلے میں گواہ بن سکتے ہو۔''

''تمہارے ہر سلسلے میں مجھے گواہ بننا منظور ہے۔''

''تو پھر کل تھوڑی سی تکلیف کرنا پڑے گی تمہیں۔''

''ضرور۔''

''میں تمہیں فون کروں گا۔''

''ہاں۔ میں تیار ہوں۔''

دوسرے دن بیرسٹر خورشید بیگ نے فرید علی صاحب کو دفتر فون کیا اور فرید علی نے فون ریسیو کر لیا۔ ''کہیے منشی

جی! کیا ہو رہا ہے۔''

''کوئی خاص کام نہیں جناب۔''

''دفتر میں کتنی دیر بیٹھیں گے؟''

''شام تک ہوں جناب! کوئی اور حکم ہو تو فرما دیجیے۔''

''نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا، ہو سکتا ہے شام تک میں چکر لگاؤں آپ کے پاس۔''

''جی بہتر۔'' منشی فرید علی نے معمول کے مطابق مودبانہ انداز میں کہا اور بیرسٹر صاحب نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ڈاکٹر فاروقی کو فون کیا اور انہیں ایک مقررہ جگہ پہنچنے کے لیے کہا۔ پھر ان کی کار ان کی کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر فاروقی اس جگہ موجود تھے جہاں انہیں ملنے کے لیے کہا گیا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور اس کے بعد منشی فرید علی کے گھر کی جانب چل پڑے۔ راستے میں دونوں خاموش رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ فرید علی کے معمولی سے مکان کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ زبیدہ بیگم نے دروازہ کھولا تو بیرسٹر صاحب نے انہیں سلام کیا اور زبیدہ بیگم حیرت زدہ رہ گئیں۔

''بھابی! آپ کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا ہوں۔ کیا عائشہ گھر پر موجود ہے؟''

''جی۔ اس کی طبیعت کچھ خراب ہے، سو رہی ہے اپنے کمرے میں۔''

''خیر ٹھیک ہے، مجھے آپ سے بات کرنی ہے بھابی۔''

''آیئے بھائی صاحب۔ کیا انہیں آپ کی یہاں آمد کے بارے میں معلوم نہیں ہے؟''

''نہیں، بتایا نہیں تھا میں نے فرید علی کو۔ کچھ ایسی ہی اہم گفتگو تھی۔'' زبیدہ بیگم نے انہیں کمرے میں بٹھایا اور چائے تیار کرنے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے چائے کی دو پیالیاں لا کر ان کے سامنے رکھ دیں اور سر جھکا کر سامنے بیٹھ گئیں۔

''بھابی ایک ایسا اہم اور ذاتی سوال کرنا چاہتا ہوں میں آپ سے جس کی اجازت یقیناً آپ نے فرید علی سے نہیں لی ہو گی لیکن معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ معلومات کرنا بے حد ضروری ہے۔ براہ کرم جھوٹ نہ بولیے گا۔ جو کچھ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں سچ بتایئے گا۔''

''ایسی کیا بات ہے بھائی صاحب!''

بے اعتبار

ایک لڑکی اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی۔

''مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ آج سے میں نے قسم کھا لی ہے کہ طارق کا منہ نہیں دیکھوں گی اور مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کروں گی۔''

''آخر ہوا کیا؟'' دوسری سہیلی نے پوچھا۔ ''کیا طارق کو کسی دوسری لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہے؟''

''نہیں، بلکہ طارق نے مجھے دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ لیا ہے جبکہ وہ مجھے کل بتا کر گیا تھا کہ وہ کراچی جا رہا ہے۔''

ساجدہ راجہ کی شرارت ہنڈواں، سرگودھا

''بس ایسی ہی بات ہے۔ میں آپ سے اگر یہ سوال کروں بھابی بیگم کہ کیا عائشہ آپ کی بیٹی ہے تو آپ مجھے کیا جواب دیں گی؟'' بیرسٹر صاحب نے زبیدہ بیگم کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ زبیدہ بیگم کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ہکا بکا سی نظر آنے لگیں۔ ڈاکٹر فاروقی نے مسکراتی نگاہوں سے بیرسٹر خورشید بیگ کو دیکھا۔ غالباً یہ کہنا چاہتے تھے کہ دیکھا تم نے، اصلیت عیاں ہو گئی۔ زبیدہ بیگم کے بدن پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ سوال آپ کیوں پوچھ رہے ہیں بھائی صاحب!''

''بس یوں سمجھ لیجیے کہ اس میں منشی فرید علی کی خیریت چھپی ہوئی ہے۔ آپ نے جوابات اگر سچ نہ دیے تو آپ لوگ بہت بڑی مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں۔''

''بب...... بھائی صاحب یہ ہماری زندگی کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے ہم پر رحم کیجیے۔''

''دراصل بھابی آپ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ سوال اتنا ضروری ہے کہ اگر آپ نے اس کا جواب نہ دیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔''

''عائشہ...... عائشہ میری بیٹی نہیں ہے۔'' زبیدہ بیگم نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''کس کی بیٹی ہے وہ؟'' بیرسٹر صاحب نے پوچھا۔

''بہت پرانی بات ہے، بھائی صاحب۔ بہت ننھی سی تھی وہ۔ ہم اسے پورن نگر سے لائے تھے۔ پورن نگر میں وہ ایک بوڑھی عورت کے پاس پرورش پا رہی تھی جو اس کی نانی

تھی اور اس بوڑھی عورت کی بیٹی مر چکی تھی۔ ایک عجیب وغریب کہانی ہے بھائی صاحب۔ بہت ہی عجیب وغریب۔ لڑکی کی ماں ایک غریب آدمی کی بیٹی تھی اور اس کا باپ کسی دولت مند باپ کا بیٹا۔ دولت مند باپ نے اس شادی پر اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا اور بعد میں وہ لڑکا پورن نگر ہی میں انتقال کر گیا اور اس کی بیوی بھی۔ بے سہارا بچی کا کوئی پرورش کرنے والا نہیں تھا، کوئی سہارا نہیں تھا، ہم چونکہ بے اولاد تھے اس لیے ہمیں یہ لڑکی مل گئی۔ مگر ہم نے اس کا نام تک تبدیل کر دیا اور اسے کبھی پتا نہ چلنے دیا کہ وہ ہماری بیٹی نہیں ہے۔ ابھی چند روز قبل اسے ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس لے جایا گیا تھا، وہاں نہ جانے کیسے فرید علی صاحب کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ عائشہ اسی دن سے بیمار ہے۔ اس نے اس بات کا بہت گہرا اثر لیا ہے۔ حالانکہ ہم اسے دن رات سمجھاتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ہم نے کبھی اسے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہمارے گھر میں پیدا نہیں ہوئی مگر اس پر شدید ردعمل ہوا ہے، وہ بیمار پڑ گئی ہے۔ بھائی صاحب اسے ہلکا پھلکا بخار رہنے لگا ہے، نہ جانے...... نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

بیرسٹر صاحب نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو لڑکی کے باپ کا نام یاد ہے؟''

''تھوڑا سا، شاید کچھ رحمان...... تھا۔ اسد رحمان، ہاں اسد رحمان۔''

''اور اس کے والد کا نام، میرا مطلب ہے لڑکی کے دادا کا نام۔''

''شاید...... اکبر رحمان...... یقیناً یہی نام تھا۔ بہت پرانی بات ہے، کہیں غلطی ہو گئی ہو تو کہہ نہیں سکتی۔''

''اور اس لڑکی کا نام کیا تھا؟''

''اس کی نانی نے اس کا نام نایاب بتایا تھا۔''

''ہوں...... پورن نگر میں کچھ ایسے گواہ مل سکیں گے جو اس بات کی گواہی دے سکیں؟''

''میں نہیں جانتی بھائی صاحب۔ مگر خدا کے لیے اس بات کو دبا دیجیے گا۔ ایک غلطی ہو گئی، اس کی ہمیں کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے۔ اگر اس لڑکی کا کوئی دعویدار ہوتا تو ہم اسے اس کے حوالے ضرور کر دیتے مگر اب تو...... اب تو وہ ہماری پھوٹی آنکھ کا نور ہے۔'' زبیدہ بیگم رونے لگیں۔ بیرسٹر خورشید بیگ صاحب کے چہرے پر مسرت کے آثار پھوٹ پڑے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''نہیں بھابی جی! رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عائشہ ہمیشہ آپ ہی کے پاس رہے گی۔ اس کے والدین تو مر چکے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' واپسی پر بیرسٹر خورشید بیگ نے مسرور لہجے میں کہا۔

''یار یہ کام ایسے ہو جائے گا۔ میں نے تو کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

''گویا اب تمہیں اس بات کا یقین ہو گیا۔''

''سو فیصدی۔ اب بھلا شک کی کیا گنجائش ہے، لیکن بھائی بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ بڑی محنت کرنا پڑے گی اس سلسلے میں۔'' بیرسٹر خورشید بیگ نے منشی فرید علی کو تو کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ بس اس سلسلے میں ضروری کارروائیاں کرتے رہے۔ کئی حلف نامے تیار کرائے گئے۔ گواہ کی حیثیت سے ڈاکٹر فاروقی کا نام اور ان کی بیگم کا نام شامل کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جو قانونی نکات تھے۔ ان کی تکمیل بھی کی گئی اور اس کے بعد انہوں نے منشی فرید علی کو اس سلسلے میں تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''منشی جی! آپ کی بیگم نے آپ کو عائشہ کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''بتایا تھا جناب عالی۔ وہ بھلا مجھ سے کیسے چھپا سکتی ہے، ہم لوگ اسی دن سے اپنی بدنصیبی کا انتظار کر رہے ہیں۔ پتا نہیں آپ کو اس کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ کیا کوئی دعویدار منظر عام پر آیا ہے؟''

''جی ہاں...... آپ کو اس بات کی خوشی ہونی چاہیے منشی فرید علی صاحب کہ وہ لڑکی جس کی پرورش آپ نے اتنی محنت کے ساتھ کی۔ کروڑوں روپے کی جائداد کی مالک ہے۔ جائداد کی منتقلی کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اب اسے اس کی نئی کوٹھی میں شفٹ ہونا ہوگا۔ یہ بات اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے ساتھ رہنا پسند کرے یا نہ کرے۔'' منشی فرید علی رو پڑے اور ایسے بلک بلک کر روئے کہ بیرسٹر خورشید بیگ بھی پریشان ہو گئے۔

''ارے...... ارے منشی جی کیا بچوں کی سی حرکتیں کر رہے ہیں آپ۔ لڑکی کو ایک شاندار زندگی مل جائے گی، آپ کو اس سے زیادہ اور کیا درکار ہے۔''

''وہ ہم سے چھن گئی بیرسٹر صاحب! وہ ہم سے چھن گئی۔ اب...... اب ہمارا اور اس کا ناتا ٹوٹ گیا۔ عجیب انداز میں ٹوٹا ہے یہ ناتا، کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''کیسا ناتا ٹوٹ گیا بھئی۔ آپ مسلسل اس کی دیکھ بھال کیجیے۔''

''نہیں بیرسٹر صاحب چودہ سالوں سے آپ کی نمک خواری کر رہا ہوں۔ میں بھلا کہاں جانے والا ہوں۔ وہ...... وہ جس کی اولاد ہے، بس اس کو مبارک ہو۔ عمر کے اس آخری حصے میں کیا اپنی عاقبت خراب کروں گا۔ ایک دولت مند لڑکی کی پرورش کر کے اس کی دولت سے کوئی فائدہ اٹھاؤں گا۔''

''آپ بہت عظیم انسان ہیں فرید علی صاحب لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عائشہ بھی شاید آپ کے بغیر نہ رہ سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ آپ صرف ایک سرپرست کی حیثیت سے اس کی جائداد کا نظام سنبھالیں اور بالآخر کوئی مناسب ساتھی، اس کی زندگی میں داخل کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔'' بیرسٹر صاحب بہت دیر تک منشی فرید علی کو سمجھاتے رہے اور بہ مشکل تمام منشی فرید علی اس بات پر تیار ہوئے تھے کہ اگر عائشہ پسند کرے تو وہ اس کے سرپرست بن جائیں گے۔

عائشہ تک جب یہ بات پہنچی تو اس پر غشی کا دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر فاروقی بھی ساتھ تھے۔ بیرسٹر صاحب ہی نے عائشہ کے لیے ایک کوٹھی خریدی تھی اور اسے تمام ساز وسامان سے آراستہ کرا دیا تھا۔ عائشہ کی دیکھ بھال ڈاکٹر فاروقی نے کی اور اسے انجکشن وغیرہ لگا کر ہوش میں لایا گیا۔

وہ بلک بلک کر کہہ رہی تھی کہ اسے یہ دولت نہیں چاہیے۔ وہ اپنے امی ابو کے ساتھ اسی عسرت میں زندگی بسر کرنا زیادہ بہتر سمجھتی ہے لیکن بیرسٹر صاحب نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس کے امی ابو تو اس سے علیحدہ نہیں ہو جائیں گے، وہ اس کے ساتھ ہی رہیں گے۔ منشی فرید علی کے لیے عائشہ یا نایاب کی حالت کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس سے الگ نہ ہوں۔ عالیشان کوٹھی کو دیکھ کر دونوں میاں بیوی دنگ رہ گئے تھے لیکن عائشہ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ لاغر نظر آنے لگی تھی۔

ڈاکٹر فاروقی نے اس کے علاج کی ذمے داری سنبھال لی۔ بیرسٹر خورشید بیگ سے گفتگو ہوتی تو ڈاکٹر فاروقی کہتے۔

''ایک عجیب کیس ہے میرے لیے یہ۔ انسان کو اگر کچھ مل جائے تو وہ بڑا مسرور ہو جاتا ہے لیکن یہاں معاملہ الٹ ہے۔ اس لڑکی پر ایسے شدید ذہنی اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ مجھے تو خاصی ذہنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خدانخواستہ یہ احساس کہیں اس کی جان نہ لے لے۔''

''بعض اوقات ایسے ہی عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔'' بیرسٹر صاحب نے کہا اور ڈاکٹر فاروقی بھی سر ہلانے لگے۔

❂❂❂

وسیع وعریض کوٹھی انتہائی شاندار بنی ہوئی تھی۔ داہنی سمت اور بائیں جانب وسیع وعریض لان تھے۔ درمیان میں سرخ روش تھی، ایک جانب ایک بڑا سا پورچ بنا ہوا تھا جس میں ایک انتہائی قیمتی کار بھی کھڑی تھی۔ منشی فرید علی مرنجان مرنج انسان تھے۔ بیرسٹر صاحب کے ہاں...... ان کی ذمے داریاں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی جگہ ایک اور شخص ملازم رکھ لیا گیا تھا لیکن انہیں کوئی بھی الجھن ہوتی تو سیدھے بیرسٹر صاحب کے پاس ہی پہنچتے تھے۔

''میں تو عجیب وغریب کیفیات کا شکار ہو کر رہ گیا

ہوں۔ بیرسٹر صاحب، مجھے سرپرست کی حیثیت سے یہ سب کچھ سنبھالنا نہیں آتا اور پھر عائشہ کی حالت بھی اس قدر خراب ہوتی جارہی ہے کہ میں پریشان ہوگیا ہوں۔''

''ڈاکٹر فاروقی کا کہنا ہے کہ یہ کیفیت کچھ عرصے تک رہے گی اور آہستہ آہستہ وہ اعتدال پر آجائے گی۔ آپ لوگ کوششیں جاری رکھیں، ہاں میں نے کوٹھی کے کچھ ملازمین کا بھی بندوبست کیا ہے، دو ایک روز میں وہ کوٹھی پہنچ جائیں گے۔'' خورشید بیگ نے کہا اور فرید علی گردن ہلانے لگے۔

وہ بیرسٹر خورشید بیگ کے نیاز مند تھے۔ زندگی بڑے عیش میں بسر ہوسکتی تھی۔ اگر عائشہ کی حالت درست ہوجاتی، ویسے اب اسے نایاب ہی کہا جاتا تھا۔ منشی جی اور زبیدہ بیگم ہروقت اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔

لیکن عائشہ کے چہرے پر ایک عجیب مردنی چھائی رہتی تھی۔ ایک دن فرید علی نے عائشہ سے کہا۔

''دیکھو بیٹی! تم نے بلاوجہ ہی اپنے ذہن پر اتنا بوجھ لاد رکھا ہے، ذرا اس عیش وعشرت کو دیکھو...... اس کا کوئی تصور کیا جاسکتا تھا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے عائشہ تمہاری وجہ سے ہماری زندگی بھی سکھی گزر جائے گی۔ جو کچھ آئندہ ہوگا وہ بھی تمہاری مرضی سے ہی ہوگا۔'' عائشہ نے دکھ بھری نگاہوں سے فرید علی اور زبیدہ بیگم کو دیکھا اور بولی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ابو۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن ایک بات بتاؤں' یقین کریں گے آپ؟''

''ہاں...... کیوں نہیں؟''

''مجھے آپ کے پاس کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی ابو۔ وہ سب کچھ میرا اعتماد تھا، میرا بھروسا تھا۔ میری شخصیت میں کوئی دراڑ نہیں تھی، میرا سینہ آپ لوگوں کے تصور اور محبت سے سجا ہوا تھا۔ لیکن اب...... اب ابو میرا سینہ خالی ہوگیا ہے۔ آپ لوگوں کی محبت سر آنکھوں پر، لیکن سینے میں سجی ہوئی وہ تصویر دھندلی پڑگئی ہے، چند اجنبی چہرے جن کے کوئی نقوش نہیں ہوتے، میری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے رہتے ہیں۔ بے خدوخال چہرے مجھے یاد دلاتے ہیں کہ وہ میرے ماں اور باپ تھے اور میں ان کے نقوش سے محروم رہ جاتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں وہ کیسے ہوں گے؟ کیسے تھے؟ وہ کہاں ہیں؟ اگر وہ میرے تھے تو میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا کیوں نہیں اور اس کے بعد ابو یہ سب کچھ زہر لگنے لگتا ہے۔ آپ جب میرے سامنے ہوتے ہیں تو میرے دل میں ایک حسرت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ حسرت یہ ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ صرف آپ ہوتے، صرف آپ۔ آپ ہی میرے ماں، باپ ہوتے کتنا اعتماد محسوس ہوتا تھا مجھے آپ کے سینے سے لگ کر کتنا سکون ملتا تھا مجھے آپ کے شفقت بھرے ہاتھ کو سر پر محسوس کرکے۔ اب اگر آپ میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی قابلِ رحم ہستی ہوں۔ جس کا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں۔ مجھے اب آپ لوگوں کی محبت بھی پرائی لگتی ہے، آپ برا نہیں مانیں میری بات کا، ابو یہ میرے احساسات ہیں۔ مجھے...... مجھے یہ پھولوں کے رنگ پسند نہیں ہیں۔ ابو مجھے تو اپنے چھوٹے گھر کی وہ دہلیز پسند تھی جس کا کوئی رنگ نہیں تھا۔'' عائشہ کے دانت بھنچ گئے۔ چہرہ سرخ ہوگیا، آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور پھر اس کے حلق سے دلدوز چیخیں نکلنے لگیں۔

فرید علی بری طرح گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے بھاگ کر ملازم کو بلایا اور تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر فاروقی صاحب آگئے۔ عائشہ کی طبیعت کافی خراب تھی، وہ بری طرح چیخ رہی تھی اس وقت تک جب ڈاکٹر نے اسے بے ہوشی کا انجکشن نہ لگایا اور پھر یہ دورے مستقل ہوگئے۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس پر دورہ پڑتا تھا اور اس کی کیفیت یہی ہوجاتی تھی۔ یہاں تک کہ ایک شام جب اس پر دورہ پڑا تو ڈاکٹر فاروقی کے چہرے پر پسینا آگیا۔ انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا، فوراً۔'' اور اس کے بعد انہوں نے اسپتال فون کرکے ایمبولینس منگوالی۔ عائشہ کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال لے جایا گیا۔ راستے میں اس کی ناک اور منہ سے خون جاری ہوگیا تھا۔ فرید علی ساتھ تھے، اسپتال پہنچ کر ڈاکٹر فاروقی نے بیرسٹر خورشید کو بھی طلب کرلیا تھا اور انہوں نے انہیں بتایا تھا۔

''خدانخواستہ اسے برین ہیمبرج ہوگیا ہے، اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئی ہیں بہرطور میں کوشش کررہا ہوں اس کی زندگی کے لیے۔ یہ سب کچھ...... یہ سب کچھ خورشید بیگ، یہ سب کچھ......'' ڈاکٹر فاروقی اپنے معاون ڈاکٹروں کی پوری ٹیم کے ساتھ بہت دیر تک عائشہ پر مصروف رہے۔ ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ عائشہ اب بالکل ساکت تھی۔ اس کا چہرہ بری طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی نے وہ تمام طبی کوششیں کر ڈالیں جو اس وقت کی جاسکتی تھیں۔ زبیدہ بیگم ادھر کوٹھی میں سخت پریشان تھیں اور فرید علی سر جھکائے عائشہ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ عام لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی

لیکن معاملہ ڈاکٹر فاروقی کے کلینک کا تھا اس لیے کوئی دقت نہیں تھی۔ ادھر زبیدہ بیگم شدت پریشانی سے پاگل ہوگئی تھیں۔ بالآخر وہ ایک ملازم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گئیں اور دیوانہ وار اس کمرے میں داخل ہوگئیں جہاں عائشہ زندگی اور موت کی کشمکش کا شکار پڑی ہوئی تھی۔

زبیدہ بیگم پر ایک دیوانگی سی طاری ہورہی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اندر داخل ہوئیں اور عائشہ کے قریب پہنچ گئیں۔ انہوں نے عائشہ کے پاؤں چھوتے ہوئے وحشیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''نہیں' عائشہ نہیں۔ نہیں' میری بیٹی...... نہیں' میری بچی، اپنے ذہن سے ہر تردد جھٹک دے۔ میں بتاتی ہوں تجھے۔ سن عائشہ' میں بتاتی ہوں تجھے۔ تو نایاب نہیں، عائشہ ہے' ہماری بیٹی۔ فرید علی کی بیٹی، میری بیٹی۔ ہاں عائشہ تو نایاب نہیں ہے۔ سب جھوٹ ہے، سب جھوٹ ہے۔ ماں اور باپ میں فرق ہوتا ہے۔ عائشہ...... سن...... یہ سب تیرے باپ کی کارستانی ہے جو دولت کی چمک سے دیوانے ہوگئے تھے۔

میں' عائشہ...... میں اب تجھے اس حالت میں نہیں رہنے دوں گی۔ میں تیری ماں ہوں ری، جنم دیا ہے میں نے تجھے، نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے تجھے لعنت ہے ایسی دولت پر جو مجھ سے میری اولاد چھین لے۔ فرید علی صاحب تم پاگل ہوگئے ہو، تم نے وہ حرکت کی ہے جو کوئی باپ کسی بیٹی کے ساتھ نہیں کرسکتا۔ سنیے بیرسٹر صاحب...... سنیئے ڈاکٹر صاحب، یہ سازش ہے، یہ صرف سازش ہے۔ میں بتاؤں آپ کو یہ سازش کیا تھی، یہ فریب تھا، سب کچھ فریب تھا۔ کچھ عرصے پہلے فرید علی صاحب نے بیرسٹر صاحب کے دفتر میں ایک فائل پڑھ لی تھی۔ یہ فائل ایک ایسی لڑکی کی تھی جس کی تلاش کی جارہی تھی اور اس میں اس لڑکی کے بارے میں پوری پوری تفصیلات درج تھیں، جو کوئی بھی نام تھا اس لڑکی کے وارثوں کا اسے فرید علی نے ذہن نشین کرلیا اور اس کے بعد نہایت چالاکی سے یہ ساری باتیں ڈاکٹر فاروقی صاحب کے کلینک پر دہرائیں تاکہ عائشہ کو نایاب کی حیثیت سے پیش کرکے دولت حاصل کی جاسکے۔ لعنت بھیجتی ہوں میں ایسی دولت پر جو میری بیٹی کی زندگی کی گاہک بن جائے۔ ہاں، فرید علی صاحب نے یہ فائل پڑھنے کے بعد مجھے بھی اپنی اس سازش میں شامل کرلیا تھا اور مجھ سے کہا کہ بے پناہ دولت مل جائے گی تو عائشہ کی زندگی بن جائے گی اور ہمارا بڑھاپا سکون سے کٹ جائے گا۔ ارے ماں باپ تو اپنا خون دے کر اپنی اولاد کے ہاتھ پیلے کرتے ہیں، یہ کیسے باپ ہیں۔ آپ دیکھیے ناں بیرسٹر صاحب، یہ کتنے نیک نفس انسان تھے لیکن دولت نے انہیں اندھا کردیا۔ آپ...... آپ عائشہ کو بتا دیجیے۔ عائشہ بیٹی سنو...... سنو تم ہماری ہی بیٹی ہو، اپنے دل سے ان خیالی چہروں کو مٹا دو جن سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ سب فریب ہے تم صرف اور صرف ہماری بیٹی ہو، ہماری اکلوتی بیٹی......''

ڈاکٹر فاروقی اور بیرسٹر خورشید بیگ صاحب کے اوپر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ یہ انکشاف بڑا جان لیوا تھا۔ منشی فرید علی کا چہرہ بھی پیلا پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی نے منشی فرید علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے، فرید صاحب؟''

''ہاں، ڈاکٹر صاحب یہ سچ ہے۔ میں بھی اب جھوٹ نہیں بول سکتا، میری بچی کی زندگی بچا لیجیے۔ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ نہیں چاہیے ہمیں یہ دولت، یہ کوٹھی، یہ کار، کچھ نہیں چاہیے۔ جو کچھ بھی کرسکے ہم خود ہی اس کے لیے کریں گے۔''

دفعتاً ڈاکٹر فاروقی چونک پڑے۔

وہ عائشہ کی جانب متوجہ ہوئے اور اس کے بعد وہ اس کے سینے پر مٹھی بند کرکے گھونسے مارنے لگے۔ انہوں نے اس کے سینے کو پمپ کیا اور معاون ڈاکٹر بھی دوڑ پڑے لیکن تھوڑی دیر بعد انہوں نے عائشہ کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کردیا تھا اور تلخ انداز میں مسکراتے ہوئے فرید علی کی طرف پلٹے۔

''فرید علی صاحب مبارک ہو! آپ کی بیٹی...... آپ کی بیٹی آپ کی سازش کا شکار ہوکر مرچکی ہے۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہوچکا ہے۔ اب یہ ساری دولت اس کے ساتھ قبر میں دفن کردیجیے اور اپنے لیے تھوڑی سی دولت نکال لیجئے۔ بیرسٹر صاحب ان دونوں کے لیے...... ان دونوں کے لیے یہی سزا کافی نہیں ہے کہ یہ اپنی اصل بیٹی سے محروم ہوچکے ہیں۔ مجرم ہیں یہ دونوں...... ان کی حیات کا ایک ایک لمحہ سزا میں بسر ہونا چاہیے۔ لعنت ہے آپ پر فرید علی...... لعنت ہے آپ پر کہ آپ نے دولت کے لیے لختِ جگر کو اپنے آپ سے اجنبی بنا دیا۔''

زبیدہ بیگم نے دیوار سے سر دے مارا۔ ان کا سر پھٹ گیا تھا۔ معاون ڈاکٹروں نے انہیں سنبھال لیا۔ منشی فرید علی شدت غم سے دیوانے ہوگئے تھے اور بلک بلک کر رو رہے تھے لیکن بیرسٹر صاحب کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔

کشکول

انوار صدیقی

پندرھویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہوکے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روندکر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی پگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی۔ شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہوگئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو جب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر بھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہوجاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دومنزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ وسلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈرورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کرکے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی ”بلیک ٹائیگر“ تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈرورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیام فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند

کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ دوسرے مخالفین کو بھی زیر کرنے کی خاطر سازشوں کے جال بنتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے جب شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابلِ اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ شیخ حامد کے تعلقات مرکز تک تھے جس کی وجہ سے پولیس کے کچھ اعلیٰ آفیسران بھی اپنی روایتی مجبوری کے تحت اس کے راستے میں آنے کی غلطی نہیں کرتے تھے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج ہے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے۔ شیخ حامد کے غنڈے الماس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے باس ورڈے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ "بلیک ٹائیگر" کی موت شیخ حامد کے لیے ایک جھٹکا ثابت ہوتی ہے۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذاتِ خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ امداد سے ملاقات کے بعد جب جگا اپنے ایک مخصوص ٹھکانے پر واپس آتا ہے تو ایک شخص کو دیکھ کر چونکتا ہے جو اس کمرے تک آ گیا تھا جہاں کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جگا اور اس نووارد کے درمیان معمولی جھڑپ ہوتی ہے پھر چند اہم انکشاف رونما ہوتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد نے کنول سے شادی کے بعد دونوں گواہوں اور کنول کی ماں کے قتل کے احکامات جاری کر دیے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملہ کیا گیا لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کے سبب محفوظ رہا۔ ایس پی اورنگ زیب نے حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابلِ اعتماد افسر کو ہدایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دوسری جانب شیخ حامد پر بھی برا وقت تھا۔ اس کی رہائش گاہ

پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے بھارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"اسی بہانے آپ کی نظر میں آ گیا۔ یہ بھی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔" آغا منظور نے میڈم کی نظروں میں دور تک جھانک کر دل کی گہرائیوں سے کہا تو میڈم نے لاجواب ہو کر نظریں جھکا لیں۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں ذرا جا کر ایک نظر ڈرائنگ روم میں بھی جھانک لوں۔" تھریسا اٹھی تو آغا منظور نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا میری باتیں آپ کو پسند نہیں آ رہیں؟"

"جی نہیں......" تھریسا برجستہ بولی۔ "یہ سوچ کر جا رہی ہوں کہ ذرا کبابوں کے لیے تیار ہونے والے قیمے کو ایک نظر دیکھ لوں۔ کباب کے درمیان میں ہڈی آ جائے تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔"

تھریسا مسکرا کر چلی گئی تو آغا منظور نے میڈم سے کہا۔

"آپ کی یہ سیکریٹری خاصی سمجھ دار نظر آتی ہے۔"

"میں اسے سیکریٹری سے زیادہ اپنی بہن ہی سمجھتی ہوں۔" میڈم نے مسکرا کر کہا پھر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

"جن لوگوں نے سراج صاحب پر حملہ کیا تھا، ان کا کیا بنا؟"

"ایس پی اورنگ زیب کے بیان کے مطابق وہ حملہ صرف ایک وارننگ تھی، بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس بار بھی اتفاق سے سیٹھ عثمان کا ڈرائیور لیاقت حسین گاڑی چلا رہا تھا۔ اس نے بروقت گاڑی کو نہ کاٹا ہوتا تو یہی وارننگ کوئی خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتی تھی۔"

"حملہ کس کے اشارے پر ہوا تھا؟" میڈم نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ہمارے ایس پی نے اس کا نام آکٹوپس رکھا ہے۔ ویسے آپ بھی شاید شیخ حامد کے نام سے واقف ہوں گی۔"

"اس کے خلاف کوئی ایکشن بھی ہوا یا نہیں......؟"

"کوئی ثبوت ملے بغیر ایسے بڑے مگرمچھ کو آسانی سے نہیں پکڑا جا سکتا۔"

"سنا ہے کہ پولیس کے کچھ ذمے دار افسران بھی اس کے نمک خوار ہیں۔" میڈم نے پہلو بدل کر چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

آغا منظور نے میڈم کو غور سے دیکھا پھر سنبھل کر بولا۔

"ان میں کبھی نہیں...... بلکہ اب بھی میرا نام بھی شامل ہے۔"

"آپ شاید......"

"جی نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔" ڈی آئی جی نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ "کبھی کبھی انسان کو مجبوراً بھی اپنے ضمیر کا سودا کرنا پڑتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شیخ حامد کی سفارش ہی سے میری دو بار ترقی ہوئی لیکن یہ بھی میں بہ زبان خود کہہ رہا ہوں کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا ہے، اگر ہمیں کوئی موقع ملا تو شاید ہم اس کا قصہ پاک کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہیں کریں گے۔"

"آپ کے اس عہد میں اور کون کون شامل ہے؟"

"فی الحال ایس پی اورنگ زیب ڈنکے کی چوٹ پر سینہ تان کر سامنے آ گیا ہے۔ سراج صاحب پہلے ہی سے آکٹوپس کے خلاف کچھ ثبوت جمع کر رہے ہیں۔ اب میں بھی اس کی آئے دن کی دھونس سے تنگ آ چکا ہوں۔ آپ چاہیں تو سراج سے معلوم کر سکتی ہیں۔"

"سنا کچھ میں نے بھی ایسا ہی تھا لیکن......" میڈم نے پہلو بدل کر پوچھا۔ "اس سے خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی؟"

"جی ہاں......" آغا منظور نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "مرکز تک اس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں اس لیے وہ ہم جیسے افسران کی بھی پروا نہیں کرتا۔ سب سے زیادہ دشمن ایس پی اورنگ زیب کا ہے لیکن کچھ مراسم اوپر تک ایس پی کے بھی ہیں جس کی وجہ سے وہ کھل کر مقابلہ کر رہا ہے۔ جو کچھ آکٹوپس نے سیٹھ عثمان کے ساتھ کیا پھر رستم علی آغا خانی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ اس کے بارے میں تھوڑی بھنک آپ کو بھی ضرور سراج کے ذریعے ملی ہو گی۔"

"جی ہاں......" میڈم نے کسمسا کر کہا۔ "کسی وجہ

سے وہ میرا جانی دشمن بھی ہے۔ایک مرتبہ آپ کی عنایت تھی جو مسٹر سراج کام آ گئے، اس وقت بھی لیاقت حسین غیبی مرد بن کر میرے کام آیا تھا۔اس کے بعد بھی سراج صاحب نے ایک اور موقع پر مجھے تباہ ہونے سے بچالیا تھا۔شاید وہ عنایت بھی آپ ہی کی ہدایت کی بنا پر ہوئی ہو۔"میڈم نے بڑی انکساری سے بات جاری رکھی۔"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو مجھ پر قرض تھا۔ایک بات اور بھی پوچھنا چاہوں گی۔آپ نے کس کی سفارش پر مسٹر سراج کو میری حفاظت کی خاطر مامور کیا تھا؟"

آغا منظور نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، کچھ توقف سے پوچھا۔"سراج نے آپ کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟"

"میں آپ کے منہ سے بھی سننا پسند کروں گی۔کوئی قباحت ہو تو جانے دیجیے۔"

"بات قباحت کی نہیں لیکن...... کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اگر انسان خود نہ کرے تو زیادہ مناسب ہوتا ہے۔"

"اور دوسرے کبھی کبھی بات کا بتنگڑ بھی بنا دیتے ہیں۔" میڈم نے سنبھل کر کہا۔"ویسے بھی اب ہم اس دور سے گزر چکے ہیں جب انسان اپنے منہ سے کسی بات کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔"

"وہ...... بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی لاولد ہی فوت ہو گئی تھی۔" آغا منظور نے ایک سرد آہ بھر کر خلا میں گھورتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔"بچے ہوتے تو دل بہل جاتا لیکن تنہائی کا احساس کبھی کبھی انسان کو ڈسنے لگتا ہے...... آپ بھی اسی غم سے دوچار ہیں۔میں نے سوچا تھا کہ اگر ہم اپنے غم شیئر (SHARE) کرلیں تو اس میں کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔"

میڈم نے ڈی آئی جی کے چہرے کے تاثرات کو بہت غور سے پڑھا، کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے نظریں نیچی کیے بڑی صاف گوئی سے کہا۔"ہوسکتا ہے کہ میں جو کچھ کہنے جارہی ہوں وہ آپ کو برا محسوس ہو لیکن...... پہلی بار میں نے ایک طویل خاموشی کے بعد جب گھر سے باہر قدم نکالا تھا، اس وقت بھی میرا صرف ہی ایک مقصد تھا۔شیخ حامد کی عبرت ناک موت...... میں افضل خان کے فلیٹ بھی ایک آفر لے کر گئی تھی۔اگر وہ میری خواہش کے پیش نظر میرے شوہر کے قاتل کو ختم کردیتا تو میں اس کو نہ صرف ایک نہایت معقول طے شدہ رقم دیتی بلکہ جائز طریقے سے اس سے نکاح بھی کرلیتی لیکن...... اس نے مجھے دھوکا دیا۔میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس نے میرے خلاف ایسا بلیک میلنگ مواد حاصل کرنا چاہا جس کے بعد شاید میں کسی کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکتی...... اس وقت بھی قدرت کو میری حفاظت منظور تھی جو مسٹر سراج فرشتۂ رحمت بن کر میری مدد کو آ گئے۔" ایک لمحہ خاموشی کے بعد میڈم نے نظریں اٹھا کر کہا"یہ باتیں میں آپ کو بتادینا پسند کروں گی تا کہ بعد میں آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔"

"آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ کسی حد تک مجھے معلوم ہے۔آپ نے خود اپنی زبان سے دہرا دیا۔یہ آپ کی بڑائی ہے...... میں اس کے باوجود اپنی درخواست واپس نہیں لوں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ہر قیمت پر شیخ حامد سے اپنے بے گناہ مرحوم شوہر کا انتقام لینا پسند کروں گی۔"

"نہایت مناسب شرط ہے۔" آغا منظور نے فوری جواب دیا۔"میں بھی اس وقت تک کسی کو اپنا کر اس کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا جب تک آکٹوپس کا وجود ملیا میٹ نہیں ہوجاتا۔"

"وِش یو آل دی بیسٹ۔" تھریسا اچانک تالی بجاتی ہنستی مسکراتی سامنے آ گئی پھر اس نے آغا منظور کو مخاطب کر کے شوخی سے کہا۔"دیکھا جناب آپ نے...... کباب کے درمیان سے ہڈی نکل جانے سے آپ دونوں کا مسئلہ کس قدر جلد آسان ہو گیا۔"

"یس...... اس کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر سجے گا۔" آغا منظور نے بے تکلفی سے اٹھ کر تھریسا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔"آپ دعا کیجیے کہ آکٹوپس کے تیجے (سوم) میں اب کوئی تاخیر نہ ہو۔"

"اس کے غم کا لنچ بعد میں ہوتا رہے گا۔فی الحال آپ لوگ اس وقت اپنی خوشی کا ڈنر تناول فرمالیں۔"

ڈائننگ روم میں کھانے کے دوران بھی تھریسا چہکتی رہی۔جب کچھ دیر میں بے تکلفی کا ماحول ہموار ہو گیا تو تھریسا نے ہی دبی زبان میں آغا منظور سے پوچھا۔"سنا ہے کہ آج کل آپ کے آکٹوپس کے کچھ مہربان بھی اس کے ساتھ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا سلوک کر رہے ہیں۔"

"درست سنا ہے آپ نے۔"

"شبنم کے بارے میں کیا خبر ہے...... شاید اسے اغوا کرلیا گیا ہے؟"

"ہاں......" آغا منظور نے اس بار پھر بھی اپنی حیثیت کا خیال کرتے ہوئے بات ٹالنے کی کوشش کی۔"آکٹوپس کو بھی اس کی فکر لاحق ہے۔"

"میرا ذاتی خیال ہے کہ اس میں بھی بڑے مگرمچھ کی کوئی گہری چال ہوگی۔" میڈم نے کہا......"افضل خان کے

ساتھ بھی ڈراما رچایا گیا تھا۔اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر شبنم کا افضل خان کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونا اور پھر وہیں سے اس کا اغوا...... اس کے بعد افضل خان کا بھی وہاں شفٹ ہوجانا...... ایک عام آدمی بھی اس سے بہت سارے نتائج اخذ کرسکتا ہے...... ممکن ہے کہ شبنم کو بھی کسی پروجیکٹ میں ناکام ہونے کی سزا دی گئی ہو......؟"

"میں آپ کے ان اندیشوں کو رد نہیں کروں گا لیکن بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے......"

"ثبوت دینے کی خاطر زبان کون کھولے گا؟" میڈم نے کسمسا کر جواب دیا۔"افضل خان نے بھی تاریکی کی سمت سے آنے والی کسی گولی کے خوف سے ابھی تک زبان کھولنے کی جرأت نہیں کی۔اب بھی اس نے شبنم کو اغوا کرنے والوں کے حلیے کے بارے میں زبان نہ کھولی، نہ کسی پر شک کا اظہار کیا۔"

"اور بھی بہت سی شہادتیں سامنے آنے سے کتراتی ہیں۔" آغا منظور نے کچھ توقف سے کہا۔"لیکن اب جو صورت نظر آرہی ہے اس نے آکٹوپس کے ہاتھ پیر بھی پھلا دیے ہیں...... کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

"آپ کس قسم کی صورت کی بات کر رہے ہیں؟"

تھریسا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ایک صورت آج بھی کھل کر سامنے آئی ہے جس نے کسی ذمے دار آفیسر کو بھی آکٹوپس کے خلاف اور اکسا دیا ہے۔" جواب دیتے ہوئے آغا منظور نے معنی خیز انداز میں میڈم کو کنکھیوں سے دیکھا تو تھریسا نے شوخی سے کہا۔

"سچ کہا ہے دانشوروں نے...... بیشتر پولیس والے بغیر لالچ کے کسی کے کام نہیں آتے......"

جواب میں میڈم کے ساتھ آغا منظور بھی ہنسنے لگے۔

☠☠☠

سراج دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ راستے میں اسے ایس پی اورنگ زیب کی کال آ گئی۔

"آپ اپنے آفس جانے کے بجائے سیدھے میرے دفتر آ جائیں۔"

"خیریت تو ہے......؟"

"ہاں، کچھ معاملات درپیش آ گئے ہیں۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔"فی الحال یہ بتا سکتا ہوں کہ صبح چھ بجے تک ڈیوٹی دیتا رہا ہوں۔"

سراج نے تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن ایس پی کی سنجیدگی سے اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ معاملہ اہم نوعیت کا حامل ہوگا۔گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنی رہائش پر تعینات گارڈز کو چوکس رہنے کے احکامات دینے کے بعد الماس کو بھی تاکید کردی تھی کہ وہ کہیں باہر آنے جانے کی غلطی نہ کرے، آفس کے نذر آتش ہوجانے کے بعد شیخ حامد یقیناً اپنے ذہن میں منفی ہتھکنڈے اختیار کرنے کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔اس کا نزلہ کسی طرف بھی گرسکتا تھا۔ڈوما اور لوچن کے سامنے آنے کے بعد اس کے ذہن میں بار بار میڈم روبی کا تصور بھی کلبلا رہا تھا جو سیاہ فام افریقی باشندے ہاشم کی پراسرار خودکشی کے بعد اچانک سامنے آ گئی تھی۔ڈویا کی جلی ہوئی لاش شیخ حامد کے دفتر کے اندر سے دستیاب ہوئی تھی جبکہ لوچن کو بھی جائے حادثہ سے فرار ہوتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔لوچن گرفتاری کے بعد بھی بڑا پرسکون نظر آرہا تھا۔اس نے اورنگ زیب کے سامنے سختی سے زبان بند رکھی تھی، یہ بھی کہا تھا کہ موت اس کے اختیار میں ہے جس کی خاطر وہ جب چاہے حوالات میں ہونے کے باوجود ایسے طریقے اختیار کرسکتا ہے جو ہتھکڑی و بیڑی کے باوجود اسے آزادی کا پروانہ تھما دے۔ہاشم کی موت میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی کسی سریع التاثیر زہر کی کہانی بیان کی تھی، بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جرائم پیشہ زبان بند رکھنے کی خاطر جن جدید اور حیرت انگیز طریقوں کو اختیار کر رہے تھے اس نے انٹرنیشنل پولیس کو بھی متحیر کردیا تھا۔لوچن نے بھی بڑی بے فکری سے اسی بات کا کھل کر اظہار کیا تھا جس کے بعد اورنگ زیب نے اسے تھرڈ ڈگری ڈرائنگ روم ٹریٹمنٹ دینے کے بجائے صرف لاک اپ کردینے کو ترجیح دی تھی۔

میڈم سے سابقہ گفتگو کے بعد سراج نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ اس نے شیخ حامد سے انتقام لینے کی خاطر ایک کمزور عورت کی وجہ سے خود کھل کر سامنے آنے سے گریز کیا ہوگا۔اس کے پاس دولت کی فراوانی تھی جس سے وہ بین الاقوامی شہریت یافتہ یا انڈر ورلڈ کے خطرناک لوگوں کی خدمات حاصل کرسکتی تھی۔سراج سے گفتگو کے دوران اس نے دبی زبان میں یہ بھی کہا تھا کہ کبھی کبھی پیروں تلے آنے والی چیونٹی بھی کاٹنے سے گریز نہیں کرتی۔اس کے علاوہ ہاشم کی موت کے سلسلے میں اس نے ایر کمپنی کے ریکارڈ سے جو معلومات حاصل کی تھیں اس نے یہی انکشاف کیا تھا کہ ہاشم، ڈوما اور لوچن ایک ہی فلائٹ سے الگ الگ سیٹوں پر سفر کرتے ہوئے آئے تھے جن میں سے ہاشم نے کسی خاص وجہ سے زہر کھا کر خودکشی کا راستہ اختیار کیا تھا اور اب پولیس کی تلاش بسیار کے باوجود وہ کچھ عرصے روپوش رہنے کے

بعد سامنے آئے تھے۔ شیخ حامد کے کاروباری دفتر کو آگ لگانے میں ان دونوں کے ہاتھ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، یہ بھی سامنے کی بات تھی کہ اس کام کے لیے کسی نے ان کو حکم دیا ہوگا۔ ذاتی رنجش یا فساد کا معاملہ ہوتا تو دفتر کو برباد کرنے کے بجائے وہ براہ راست شیخ حامد کو موت کے گھاٹ اتارنے کو زیادہ ترجیح دیتے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ اسپتال میں پیش آنے والے حادثے کے بعد میڈم نے سراج سے دبی زبان میں جگا کی سفارش بھی کی تھی۔ اگر جگا جیسے گروہ کے سرغنہ تک اس کی رسائی ممکن تھی تو اور بھی بہت کچھ سوچا جاسکتا تھا۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ سراج اور اورنگ زیب پر ہونے والے بم دھماکے کے سلسلے میں بگ باس کو اس کا موثر اور منہ توڑ جواب بھی دینے میں کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ ان تمام ٹھوس باتوں کی موجودگی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ ہاشم، ڈوما اور لوچن کی خدمات بھی میڈم نے مستعار لے رکھی ہوں۔ الماس سے بہن کا رشتہ جوڑنے کے بعد اس نے کئی بار سراج سے روبرو ملنے اور اس کے گھر آنے کو بھی کہا تھا لیکن سراج نے اسی کو لاحق آنے والے خطرات کی بنا پر روک دیا تھا۔ سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ میڈم نے اورنگ زیب کے اشارے کے بعد ہی شیخ حامد کو ہراساں کرنے کی خاطر جگا کو ہموار کیا تھا۔ سراج کا ذہن اسی پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے میں الجھ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر دوبارہ سگنل موصول ہوا۔ اس نے نظریں گھما کر برابر والی سیٹ پر پڑے موبائل پر نظر ڈالی تو اس کی روشن اسکرین پر میڈم روبی کے نمبر نظر آرہے تھے۔

''ہیلو......'' سراج نے موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کان سے لگالیا۔ ''اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟''

''اب میں آپ کو الماس کے رشتے سے زیادہ قریب محسوس کرتی ہوں اس لیے جب چاہے آپ سے رابطہ بھی قائم کرسکتی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''جی نہیں لیکن اس وقت میں ڈیوٹی پر جارہا ہوں۔''

''آپ کو ایک اطلاع دینی تھی......''

''ڈوما اور لوچن کے سلسلے میں......؟'' سراج نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''آپ اگر اصرار کریں گے تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی لیکن اس وقت میں آپ کو ایک اور اطلاع دینا چاہ رہی تھی۔''

''چلیں...... پہلے آپ وہی اطلاع فراہم کردیں جس کی خاطر رابطہ قائم کیا ہے۔''

''کل رات کا ڈنر آپ کے ڈی آئی جی صاحب نے ہمارے غریب خانے پر کیا تھا۔''

''اور اس کی اطلاع آپ اب ڈنر ہضم ہونے کے بعد مجھے دے رہی ہیں۔'' سراج نے خوشگوار موڈ میں شکوہ کیا۔

''سفارش سب سے پہلے آپ ہی نے کی تھی۔'' میڈم نے قدرے بے باکی سے جواب دیا۔ ''موجودہ حالات کے پیش نظر میں نے آپ کی سفارش اور تھریسا کے مشورے کے بعد ہی اسے آغا منظور کی دعوت دینے کی اجازت دی تھی۔''

''کندھا کسی اور کا سہی لیکن ٹریگر دبانے میں آپ کی رضامندی کا دخل بھی ضرور ہوگا۔''

''میں انکار نہیں کروں گی۔'' میڈم نے اس بار معنی خیز سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ایک بار پہلے میں نے انتقامی جذبے کے تحت کسی کے مشورے کے بغیر کچھ ایسی ہی کوشش افضل خان کے سلسلے میں بھی کی تھی جس نے مجھے دھوکا دیا لیکن اس بار میں نے ایسی کوئی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔''

''آپ نے ضرورت مند کو گھر کا راستہ دکھا دیا ہے تو باقی خدمت میں بھی انجام دے سکتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ لیکن اس وقت میں نے آپ کو ایک اور خیال سے فون کیا تھا۔'' میڈم نے بات جاری رکھی۔ ''میں آپ سے لوچن کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں جو فی الحال اورنگ زیب کے قبضے میں ہے۔''

سراج نے لوچن کے حوالے پر چونک کر سوال کیا۔

''آپ لوچن کو کس طرح جانتی ہیں؟''

''کم و بیش اس طرح جس طرح میں نے جگا کے سلسلے میں آپ سے سفارش کی تھی بعد میں آپ کے حوالے سے میں نے آپ کے ایس پی کو مایوس بھی نہیں کیا تھا۔''

''لوچن کے بارے میں آپ سے مزید کوئی سوال کرنے سے پیشتر میں الماس ہی کے رشتے سے آپ کو یہ باور کرانا چاہوں گا کہ آپ آگ سے کھیلنے کی کوشش ترک کردیں۔''

''میں آپ کے مشورے کی قدر کرتی ہوں لیکن اپنے مرحوم شوہر کا انتقام لیے بغیر شاید میں موت کو بھی نہ قبول کر سکوں گا۔''

''لوچن کے سلسلے میں کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' سراج نے اورنگ زیب کے آفس کے باہر گاڑی پارک کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ خفیہ چیزیں اور راستے ایسے بھی ہوتے ہیں جن

کو آسانی سے دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ تاوقتیکہ اس کا کوڈ ورڈ آپ کو نہ معلوم ہو۔'' میڈم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لوچن بھی ایک خاص پاس ورڈ یا کوڈ کے تحت حسبِ منشا استعمال کیا جاسکتا ہے۔''

''وہ کیا ہے......؟''

''سیون اسٹار......'' میڈم نے قدرے توقف سے کہا۔ ''آپ یہ ماسٹر کی اورنگ زیب کے حوالے کرسکتے ہیں لیکن ایک شرط پر۔ میرا نام کسی صورت درمیان میں نہ آئے۔''

''ٹھیک ہے...... میں آپ سے پھر کچھ دیر بعد رابطہ قائم کروں گا۔''

''میں پھر درخواست کروں گی آپ میرے نام کو سامنے نہیں آنے دیں گے۔''

''او۔کے......'' سراج نے مختصر جواب دے کر موبائل بند کیا پھر نیچے اتر کر اورنگ زیب کے دفتر کی طرف قدم بڑھانے لگا جو اس وقت اپنے آفس میں تنہا تھا اور سراج کا منتظر بھی۔ شاید اسی بے چینی کے پیش نظر اس نے رسمی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''رات آپ کے جانے کے بعد مجھے اور آپ کے ڈی آئی جی صاحب کو دوبارہ آکٹوپس کے سامنے منہ دکھانے کی خاطر جانا پڑا تھا۔''

''کوئی نئی واردات......؟''

''اسے واردات کے بجائے اگر آپ صور پھونکے جانے کا نام دیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔''

''اوہ...... آئی ،سی۔ گویا کوئی ناقابلِ یقین حادثہ پیش آگیا تھا۔''

''ہاں......'' اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''کل رات کو کسی لوڈنگ ٹرک کے ذریعے آکٹوپس کو اپنے ان تین آدمیوں کی پیٹی بند لاشوں کا تحفہ بھی موصول ہوگیا جنہیں اس نے ڈی آئی جی سے سفارش کر کے میری حراست سے آزادی کا پروانہ دلایا تھا۔''

''یہ انوکھی خبر میرے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔''

''اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ لوڈنگ ٹرک بھی خود آکٹوپس کی ملکیت ثابت ہوا جو پولیس نے نائٹ پیٹرولنگ کرنے والے عملے کی انفارمیشن پر آکٹوپس کی فیکٹری کے قریب سے دریافت کرلیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو مردہ شخص ملا وہ بھی آکٹوپس کا آدمی تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔'' سراج نے کرسی پر کسمسا کر کہا۔ ''جو ڈوز آکٹوپس کے حلق کے نیچے اتاری گئی ہے اس کی کڑواہٹ کا احساس اسے بھی ضرور ہوگیا ہوگا۔''

''اس سے زیادہ تشویش ناک ایک اطلاع اور بھی ہے۔'' اورنگ زیب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے ڈی آئی جی کی موجودگی میں نہ صرف پولیس محکمے کی نااہلی کا اعتراف کرلیا ہے بلکہ یہ زبان بھی دے بیٹھا ہوں کہ دو تین دنوں کے اندر اگر کسی مشتبہ شخص کو تلاش نہ کرسکا تو اس کو خط غلامی لکھ کر دے دوں گا۔''

''یہ آپ نے کیا غلطی کی؟'' سراج نے تعجب سے پوچھا۔ ''اب مشتبہ شخص کہاں سے پیدا ہوگا؟''

''اس کا جواب آنے والا وقت دے گا۔'' اورنگ زیب نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''ڈی آئی جی نے بھی مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔''

''میں اس سلسلے میں کس کام آسکتا ہوں؟''

''صرف اس حد تک کہ تم اپنی زبان بند ہی رکھنا۔'' اورنگ زیب نے بے تکلفی سے جواب دیا۔ پھر موبائل اٹھا کر کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا، رابطہ قائم ہونے پر ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''میں تمہاری اب تک کی کارکردگی سے مطمئن ہوں...... بات شکریہ یا احسان کی نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ کی ہے...... مجھے یقین ہے۔ فی الحال ایک کام اور درپیش ہے......'' اورنگ زیب نے اس ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتاتے ہوئے کہا جہاں افضل خان قیام پذیر تھا ''تمہیں آج رات کسی وقت اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ اس کمرے پر فائرنگ کرنی ہے...... نہیں، مقصد اسے مارنا نہیں ہے، میرے کچھ ذاتی آدمی بھی اس کی نگرانی پر مامور ہیں، وہ تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کریں گے لیکن کچھ اور افراد ممکن ہے کہ اس فائرنگ کے خلاف مداخلت کریں، تمہیں ان میں کسی ایک کی رہائش کا سراغ لگانا ہے...... ہاں، ہوسکتا ہے کہ ہوٹل کا عملہ بھی مداخلت کرے، بہر حال...... اگر تم بڑے مگرمچھ کے کسی آدمی کا سراغ لگا سکو تو یہ ایک اہم کام ہوگا...... ضروری نہیں ہے کہ آج ہی یہ کام ہو لیکن جتنی جلدی ممکن ہے ہوجائے تو بہتر ہوگا، مداخلت کرنے والے کا پتا معلوم کرنے کی خاطر تمہارے کسی اعتماد کے آدمی کا ہونا شرط ہے...... تمہاری اور تمہارے آدمیوں کی حفاظت میرے ذمے ہوگی...... گڈ...... جگا سے کہنا کہ فی الحال انڈر گراؤنڈ ہی رہے...... او۔کے!''

''آپ کا کیا خیال ہے......'' سراج نے کال ختم ہونے

کے بعد اورنگ زیب سے دریافت کیا۔ ''کیا آکٹوپس کا کوئی خاص آدمی ہمارے ہاتھ آسانی سے آجائے گا؟''

''تم اس زخمی کو کیوں فراموش کر رہے ہو جو ہماری تحویل میں ہے...... اس کی زبان بھی کوئی بڑا لالچ دے کر کھلوائی جاسکتی ہے۔''

''آپ نے لوچن کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' سراج نے موقع دیکھ کر دبی زبان میں سوال کیا۔

''وہ سب سے اہم ہے لیکن...... فی الحال میں اس پر آخری حربہ استعمال نہیں کروں گا۔''

''ایک بات مجھے بھی آپ سے دریافت کرنی ہے...... کیا آپ علی بابا کی کہانی میں کھل جا سم سم کے پاس ورڈ پر یقین رکھتے ہیں؟''

''سب داستانوی خرافات ہیں۔''

''اسی قسم کی ایک ٹپ آج کسی نو وارد نے مجھے آپ کے پاس آتے وقت دی ہے۔'' سراج نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''جو کچھ اس نے کہا وہ صرف اس لیے قابل عمل ہے کہ میں اس اجنبی کی آواز ایک دو بار پہلے بھی سن چکا ہوں...... ایک موقعے پر اس کی اطلاع ٹھیک بھی ثابت ہوئی تھی۔''

''اب کیا اطلاع دی ہے؟''

''اس نے سیون اسٹار کا ایک کوڈ ورڈ بتایا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس پاس ورڈ کو لوچن کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ بڑی آسانی سے اپنی زبان کھول دے گا۔''

اورنگ زیب نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے تک وہ سراج کو بہ غور دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''کیا جس آدمی نے تمہیں یہ کوڈ بتایا ہے وہ...... میڈم روبی کا کوئی نمائندہ نہیں ہوسکتا؟''

''یہ شبہ آپ کو کس طرح ہو رہا ہے......؟''

''اس لیے کہ تمہارے علاوہ خود مجھے بھی یہ شبہ ہے کہ ہاشم، ڈوما اور لوچن تینوں میڈم ہی کے آدمی ہوسکتے ہیں جنہیں ممکن ہے اسی سیون اسٹار کے کوڈ کے ذریعے احکامات دیے جاتے ہوں...... میرے ایک سوال کے جواب میں لوچن نے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی کہ اس کو احکامات کسی عورت کی طرف سے ملتے ہیں یا مرد کی طرف سے......''

''اوہ......'' سراج نے چونکنے کی بڑی خوب صورت اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آپ کا اندازہ درست ہو۔''

''او۔ کے...... میں اس ٹپ کو بھی کسی خوب صورت انداز میں لوچن پر آزما کر دیکھ لوں گا۔'' پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، اورنگ زیب نے ریسیور اٹھا کر گفتگو کی پھر کال ختم ہونے کے بعد سراج سے کہا۔

''تمہارے محترم ڈی آئی جی صاحب کی کال تھی...... مجھے فوری طور پر یاد کیا گیا ہے...... تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

''کیا مجھے ساتھ لانے کو کہا گیا ہے......؟''

''نہیں...... لیکن تم اس وقت میرے دفتر میں موجود ہو اس لیے میری خواہش پر میرے ساتھ چلنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

سراج نے اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا۔

❀❀❀

لیاقت حسین بڑی حویلی کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔

بڑے عرصے کے بعد اسے خود اپنی ہی حویلی میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایک عجیب سی افسردگی کا احساس ہو رہا تھا، اس حویلی کا چپا چپا اس کے وجود کا گواہ تھا۔ اس کے در و دیوار سے اس کے بچپن اور جوانی کی نہ جانے کتنی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اس حویلی کی سب سے پسندیدہ شخصیت تھی، ماں باپ دونوں اس کے گن گاتے تھے، اس لیے کہ شروع ہی سے اس کا رجحان مذہبی تعلیم کی طرف تھا، وہ نماز روزے کا پابند تھا۔ اسلامی تعلیمات میں اس کی دلچسپی کی تعریف اس کے استاد بھی سردار سرفراز خان سے کرتے تھے، اس کے اندر ماں کی تربیت اور باپ کی خودداری اور انسان دوستی دونوں کا ہاتھ تھا۔ وہ اپنی ذات سے دوسروں کا خیال رکھنے کا عادی تھا۔ غریبوں میں گھلنا ملنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا اور ہر طرح سے ان کی مدد کرنا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سردار سرفراز خان حلقے میں اپنی امارت، اپنی حیثیت کے سبب خود کو لیے دیے رکھنے کا عادی تھا، وہ سخت اور ٹھوس اصولوں کا مالک تھا۔ یہی عادت لیاقت حسین کو بھی ورثے میں ملی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرلیتا اس سے پیچھے ہٹنا اسے بھی باپ کی طرح پسند نہیں تھا لیکن شادی کے معاملے میں پسند ناپسند کی بات نے باپ اور بیٹے کے درمیان ایک دیوار ضرور حائل کردی تھی۔ لیاقت حسین اس دیوار کو بھی باپ کی مرضی پر ڈھا دینے کا ارادہ کرچکا تھا۔ وہ باپ کی خوشی پر شاید اپنا گلا بھی گھونٹ لیتا لیکن جب اس نے ماں سے کھل کر اپنی پسند اور اپنے دل کا حال بیان کیا اور ماں نے بھی صاف گوئی سے کھل کر فرحین کے حق میں ووٹ دیا تو اس کا پلڑا وزن کے اعتبار سے بھاری ہوگیا۔ پہلی بار اس نے باپ سے اپنا حق مانگنے کی خاطر زبان کھولی۔ سرفراز خان کو بھی شاہ پری کے باپ کو زبان دینے کا خیال تھا، وہ مرد تھا، سردار تھا، بیٹے کی خوشی کی خاطر بھی اپنی پگڑی کا شملہ گرانے پر آمادہ نہیں ہوا لیکن اس کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بنا۔ یہ نادر شاہی حکم سنا دیا کہ لیاقت حسین اگر فرحین کو زبان دے چکا ہے تو خوشی سے اسے اپنا لے لیکن اس صورت میں اسے وہ حویلی چھوڑنی پڑے گی جہاں سرفراز کے فیصلے گونجتے تھے۔ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لے کر فرحین کا ہاتھ تھام لیا تھا اور آج...... آج ایک عرصے بعد وہ پھر اسی دہلیز کو عبور کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

گاؤں میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے فرحین کو اپنے آنے کی اطلاع کردی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ حویلی جا کر اس کا انتظار کرے، اس نے بس سے اتر کر فرحین کے گھر یا کہیں اور جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ جس عمل سے اس کے باپ کا وقار، اس کے اونچے شملے کی وابستگی مجروح ہونے کا خطرہ ہو، وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ وہ اس وقت اپنا ایک سفری تھیلا لیے بس اسٹاپ سے سیدھا اپنی حویلی ہی گیا تھا، اسے امید تھی کہ شاہ پری کا گھر آباد ہوجانے کے بعد اب اگر اس نے باپ سے معافی مانگی تو شاید اسے قبول کرلیا جائے گا، اسی امید اور ناامیدی کی رسا کشی کے درمیان وہ حویلی کی سیڑھیوں پر کھڑا گومگو کی کیفیت سے دوچار تھا جب حویلی کا بڑا دروازہ کھلا پھر ماں کی ممتا بھری آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

''پاخیر راغلے (خوش آمدید) لیاقت خاناں۔''

ماں کی آواز سن کر وہ چونکا، اس نے دروازے کی سمت نظر ڈالی جہاں اس کی ماں اپنے ہاتھ کشادہ کیے اسے اپنے سینے کی گہرائیوں میں سمیٹ لینے کی آرزو لیے کھڑی تھی، اس کی پشت پر اسے فرحین بھی نظر آئی تو اس نے تھیلا سیڑھیوں پر چھوڑا اور لپک کر ماں کے سینے سے سر لگا کر رونے لگا۔

''مجھے پورا یقین تھا ماں کا جان کہ تم ایک دن ضرور ماں کے پاس آئے گا۔ ادھر باہر کیوں کھڑا ہے؟''

''ماں...... وہ بابا......''

''تم اب اس کا پھکر مت کرو۔'' ماں نے اسے حوصلہ دیا۔ ''شاہ پری کا باپ نے جب اس کا شادی دوسری جگہ بنا دیا تھا تو پھر ہمارا زبان بھی آزاد ہوگیا۔''

لیاقت حسین اب بھی باپ کے خوف سے ہچکچا رہا تھا جب فرحین نے اشارے سے بتا دیا کہ سردار سرفراز خان اس وقت موجود نہیں ہے، لیاقت حسین ماں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے حصار میں لیے اندر آگیا۔ ماں کا چہرہ مسرت سے گلنار ہو رہا تھا، پرانی خادمائیں خاطر مدارت میں لگ گئیں، فرحین بھی بہت خوش تھی لیکن لیاقت حسین کے دل میں ابھی تک باپ کی طرف سے ایک دھڑکا سا لگا تھا پھر بھی اس نے ماں کے اصرار پر اٹھ کر غسل کیا، نیا شلوار سوٹ پہن کر ماں کے سامنے آیا تو ماں نے پھر اس کی بلائیں لینی شروع کردیں۔ وہ ماں کو اپنے بارے میں سیٹھ عثمان کا نام درمیان سے نکال کر، ایک ایک بات کی تفصیل بتاتا رہا، ماں کی روشن آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی۔

''فرحین نے بتایا تھا کہ تم ادھر شہر میں ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتا ہے۔''

''ہاں ماں...... سب تیری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

''ابھی ہمارا پیارا بہو نے ایک اور خوش خبری سنایا ہے۔'' ماں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ''تمہارا شاید ترقی بھی ہوگیا ہے، بڑا آپھیسر بن گیا ہے؟''

''ہاں ماں...... اب میری تنخواہ ایک دم تیس ہزار روپے ماہانہ ہوگئی ہے۔''

''خدا تم کو امارا بہو کو اور دے گا لیکن ماں کا ایک بات یاد رکھنا لیاقت...... ہمیشہ سچ بولنا اور کسی کے ساتھ کبھی دھوکا نہ کرنا۔ نہ کبھی کسی غریب کا امداد کرنے سے منہ موڑنا، اوپر والا بھی انہی کو نوازتا ہے جو اس کے راستے پر قدم اٹھانے سے نہیں ڈرتا۔ موت اور زندگی، اچھا اور برا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تم اس کے راستے پر چلے گا تو وہ بھی اپنا رحمت کا سارا راستہ تمہارے لیے کھول دے گا۔''

لیاقت حسین ماں کی باتیں سن کر خوش ہوتا رہا، اس کی خاطر مدارت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس وقت وہ بہت عرصے بعد اپنے گھر کی کشمیری چائے پی رہا تھا اور اس کی لذت اور سوندھی سوندھی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا، جب فرحین دوپٹا سر پر ڈالتی جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی، لیاقت حسین نے چونک کر نظریں گھمائیں تو وہ بھی چائے کا کپ رکھ کر کھڑا ہوگیا...... سامنے اس کا باپ سردار سرفراز خان کھڑا اسے تیز نظروں سے گھور رہا تھا، اس کی پگڑی کا شملہ اس وقت بھی پوری شان سے اٹھا ہوا تھا۔ لیاقت حسین نے باپ کو ادب سے سلام کیا۔ ''سلام بابا جان......''

''تم...... ادھر کب آیا؟'' سرفراز خان نے اس سے ٹھوس لہجے میں سوال کیا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے آیا ہوں بابا...... بس سے اتر کر سیدھا آپ کے قدموں میں چلا آیا۔'' لیاقت حسین نے

مدھم لہجے میں کہا۔ ''آپ سے معافی مانگنے۔''

''فرحین کا اور بات ہے......'' سرفراز خان سے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہم نے اس کا داخلہ بند نہیں کیا تھا لیکن تم......''

''اب تو شاہ پری بھی اپنا گھر کا ہو گیا۔'' لیاقت حسین کی ماں نے شوہر سے اولاد کی سفارش کی۔ ''کیا اب بھی تم لیاقت کے لیے اپنا پھیسلہ نہیں بدلے گا۔ وہ تم سے ماپھی بھی مانگ رہا ہے......''

''تم ادھر شہر میں کیا کام کرتا ہے......؟'' سرفراز خان نے ہاتھ اٹھا کر بیوی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''ایک روز پہلے تک کسی کا ڈرائیور تھا۔ کل سے میری ترقی ہو گیا ہے۔ لیاقت حسین نے کھل کر مگر بہ دستور مدھم لہجے میں باپ کو بتایا۔ ''سیٹھ نے ہماری محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر اپنے دفتر کا سپروائزر بنا دیا ہے۔''

''تمہارا پرانا تنخواہ کتنا تھا...... اور اب کیا ملے گا......؟'' اس بار بھی سرفراز خان نے خشک اور اکھڑ انداز میں سوال کیا، اس کی تیز نظریں بہ دستور لیاقت حسین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''پہلے پانچ ہزار ملتے تھے پھر ترقی ہوتے ہوئے آٹھ ہزار ملنے لگے، جہاں کام کرتا ہوں وہاں صاحب نے نیا بنگلا خریدا تو اس کے اندر بنی ہوئی رہائش گاہ بھی مجھے مفت دے دی اور اب......''

''اب آٹھ ہزار سے ایک دم تیس ہزار۔'' سرفراز خان نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اتنا ترقی ایکدم کیسے ہو گیا......؟''

''سب خدا کی مہربانی اور آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔''

''تم جہاں کام کرتے ہو اس کے مالک کا نام کیا ہے؟''

لیاقت حسین نے جواب دینے میں تاخیر کی تو ماں نے پھر اس کی سفارش میں زبان کھولی۔

''اب میں بیٹے کا ترپھ سے تم سے ماپھی مانگتا...... خدا کے لیے اس کا کھسور ماپھ کر دو۔''

''لیاقت......'' سرفراز خان نے اس بار قدرے نرم لہجے میں براہ راست لیاقت حسین سے کہا۔ ''میں اِدھر رہ کر بھی اُدھر کا سارا خیر خبر رکھتا ہوں۔ میری اطلاع یہ ہے کہ تمہاری ترقی اس لیے ہوا کہ تم نے مالک اور اس کی بیوی کا کئی موقع پر جان بچایا تھا، کیا یہ درست ہے؟''

''جان بچانے والی ذات خدا کی ہے بابا......''

لیاقت حسین نے پھر بات گول کرتے ہوئے نہایت سعادت مندی سے کہا۔ ''میں نے خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دی ہوئی تعلیم کے پیشِ نظر صرف ان کی نمک حلالی کی تھی۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے دوسرے کلمہ گو مسلمان کی مدد کی تھی۔''

''فرحین......'' سرفراز خان نے نظر گھما کر بہو کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا تم بھی سردار خان کے سامنے گھما پھرا کر بات کرنے کی کوشش کرو گی؟...... کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ لیاقت حسین جس کے پاس کام کرتا ہے اس کا نام کیا ہے......؟''

''میں آپ کے حکم سے انکار نہیں کروں گی۔'' فرحین نے کن انکھیوں سے لیاقت حسین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس بھلے آدمی کا نام سیٹھ عثمان ہے اور اس کی نیک سیرت بیوی کا نام راحیلہ بیگم ہے خان بابا...... ان کے بڑے احسانات ہیں ہم دونوں پر۔''

''کیوں لیاقت...... کیا فرحین نے سچ بتایا ہے؟'' سرفراز خان نے دوبارہ بیٹے کو دیکھا۔

''ہاں بابا......''

''پھر...... تمہاری زبان کو تالا کیوں لگا تھا؟''

''بابا...... وہ...... دراصل......''

''مجھے سب کچھ معلوم ہے۔'' سرفراز خان نے کھل کر کہا۔ ''آج سیٹھ عثمان سے ہماری گفتگو بھی ہوئی تھی۔ تمہاری خاموشی کی وجہ بھی جانتا ہوں۔ یہ بھی خبر ہے کہ تم نے پہلے اسے میرا نام نہیں بتایا تھا، کچھ دن پہلے زبان کھولی ہے لیکن......'' سرفراز خان نے کچھ توقف سے کہا۔ ''تمہیں چار بڑوں کے سامنے میرے پاؤں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگنی ہوگی...... تمہارا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں پورے قبیلے کی موجودگی میں بھی آپ کے پیروں کو چھو کر اور ہاتھ باندھ کر معافی مانگنا اپنے لیے فخر سمجھوں گا۔''

''سچ بول رہے ہو......؟''

''میں آپ ہی کا خون ہوں بابا......'' لیاقت حسین نے بہ دستور ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ ''مر جاؤں گا لیکن جھوٹ نہیں بولوں گا......''

سردار سرفراز خان کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھری۔ ایک لمحے وہ بیٹے کو دیکھتا رہا پھر اس نے مسکرا کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے...... لیاقت حسین دیوانوں کی طرح لپک کر باپ کی کشادہ چھاتی سے چمٹ گیا۔

فرحین اور لیاقت حسین کی ماں کی نظریں بھی خوشی کے

آنسوؤں سے چھلک اٹھیں۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا جب سڑک کے جانب کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ ایک جھنکار کی تیز آواز سے ٹوٹ کر گرا تو افضل خان ہڑبڑا کر اٹھا۔ خطرے کا پہلا احساس ہوتے ہی اس نے جھپٹ کر تکیے کے نیچے سے اپنا لوڈڈ پستول نکالا اور لیٹے ہی لیٹے بستر سے نیچے فرش پر آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر فوری طور پر نائٹ بلب کو سوئچ کے ذریعے بند کیا پھر کسی آدم خور مگرمچھ کی طرح تیزی سے فرش پر رینگتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی وہ آدھے راستے میں تھا کہ باہر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آوازیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دو پارٹیاں کھل کر ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہوں، ایک پارٹی یقیناً ان لوگوں کی رہی ہو گی جنہوں نے شبنم کو اغوا کرنے کے بعد اب اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی ہو گی۔ ان کے بارے میں وہ ابھی تک کوئی آخری نتیجہ نہیں قائم کر سکا تھا، دوسری پارٹی اس کے گمان کے مطابق شیخ حامد کے اس خاص آدمی کی بھی ہو سکتی تھی جس نے بلیک ٹائیگر کے حوالے سے اس سے بات کی تھی۔ دونوں صورتوں میں اس کی جان کو جو خطرہ لاحق تھا وہ اب اس میں خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر وہ دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ پہلی فرصت میں پستول کا رخ سڑک کی جانب دو فائر جھونک دیے۔ وہ دونوں ہی پارٹیوں کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ بیدار ہو کر جوابی کارروائی کے لیے پوری طرح آمادہ ہے۔ اس کے فائر کرنے کے فوراً ہی بعد دوسری جانب سے کسی دور مار رائفل کے ذریعے کھڑکی کی سمت فائر کیا گیا۔ سنسناتی ہوئی گولیاں کھڑکی سے گزر کر چھت سے ٹکرائی تھیں۔ وہ تیزی سے آڑ میں ہو گیا۔ جوابی حملے نے اس کو اور زیادہ ہوشیار کر دیا۔ اب شاید اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ ہو گیا تھا لیکن وہ تر نوالہ بن کر کسی کے حلق کے نیچے اترنے کو تیار نہیں تھا۔ جو کھیل اب شروع ہوا تھا، وہ اس کا پرانا اور منجھا ہوا کھلاڑی تھا۔ وہ حفظ ماتقدم کے طور پر ایک کمرے کے دروازے کے قریب آ گیا۔ ایک دو افراد اس کی نگرانی پر بھی کہیں قریب موجود ہو سکتے تھے جو پہلے کی طرح دروازے کا لاک کھول کر اندر آ سکتے تھے۔

افضل خان کے پستول کے میگزین میں ابھی چار گولیاں اور موجود تھیں، وہ انہیں ضائع نہیں کر سکتا تھا، کسی کی گرفت میں آنے سے پیشتر وہ کم از کم تین، چاروں گولیوں کو کارآمد بنانے کی ٹھان چکا تھا۔ پستول کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط تھی، آنکھیں کسی چیتے کے مانند چمکتی ہوئی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

دو منٹ تک سڑک سے گولیوں کے تبادلے کی آواز آتی رہی پھر شاید ایک پارٹی فرار ہو گئی تھی جس کے بعد دوسری پارٹی نے مزید ایک دو ہوائی فائر کرنے کے بعد پولیس سے بچنے کی خاطر موقع واردات سے دور ہٹ جانا مناسب سمجھا ہو گا۔ افضل خان فائرنگ بند ہونے کے بعد بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا...... اس کے کان دروازے کے آس پاس کسی بھی آہٹ کو سننے کی خاطر بیتاب تھے۔

پانچ منٹ اور گزر گئے۔ دروازے کے باہر کوئی آہٹ نہیں ابھری البتہ بستر پر پڑے ہوئے اس کے موبائل سے کسی جھینگر کے ٹرٹرانے جیسی آواز ابھرنے لگی، افضل خان نے پنجوں کے بل تیزی سے لپک کر موبائل اٹھا لیا۔ دروازے کے قریب آ کر اس نے دوبارہ پوزیشن سنبھالی پھر موبائل آن کر کے دبنگ آواز میں بولا۔ ''کون ہے......؟''

''صرف تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔'' دوسری جانب سے وہی آواز سنائی دی جس نے پہلے بلیک ٹائیگر کے حوالے سے فون کیا تھا۔

''اوہ...... پہلے تم نے دوسرے نمبر سے کال کیا تھا۔''

''فضول باتوں سے پرہیز کی عادت ڈالو...... میں نے تمہاری خیریت پوچھی تھی۔'' خشک لہجے میں سوال دہرایا گیا۔

''میں کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی پستول لیے دروازے سے لگا کھڑا ہوں۔'' افضل خان نے بھی جواب میں سرد رویہ اختیار کیا۔ ''اب میں نے بھی ان لوگوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا ہے جن کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی تھی، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا میری پرانی عادت ہے۔''

''گڈ...... ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ تم دوبارہ کمر کس لو...... ہو سکتا ہے پھر کوئی ذمے داری تمہارے سپرد کی جائے اور ایک بات اور......'' دوسری جانب سے جملہ مکمل نہیں کیا گیا۔ شاید دروازے پر ہونے والی تیز آواز کی دستک ادھر بھی سن لی گئی تھی، افضل خان نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈال لیا، بلند اور تیز للکارتی آواز میں آنے والے سے دریافت کیا۔

''کیا بات ہے...... کون ہے؟''

''میں ہوٹل کا منیجر باجوہ ہوں۔'' باہر سے کہا گیا۔ ''تمہاری کھڑکی پر باہر سے گولی چلائی گئی تھی۔ دروازہ

کھولو...... میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا نقصان ہوا۔ پولیس کو بھی فون کرنا ہے۔''

افضل خان نے مزید اطمینان کر لینے کے بعد دروازہ کھول دیا۔ آنے والا ہوٹل کا منیجر ہی تھا، کچی نیند سے اٹھنے کے بعد وہ بھی جھلایا ہوا تھا۔ کھڑکی کا چکنا چور شیشہ دیکھ کر اس نے افضل خان سے دریافت کیا۔ ''گولی داغنے والے کون لوگ تھے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے انہیں دعوت نامہ بھیج کر بلوایا تھا۔'' افضل خان بھی تلملا کر بولا۔

''میرا مطلب یہ تھا جنہوں نے تمہارے کمرے کا نشانہ لیا ہوگا ان کے ارادے بھی خطرناک ہوں گے۔''

''مجھ سے پہلے یہاں کون کرایہ دار تھا؟'' افضل خان نے اسے ٹالنے کی خاطر تفتیش کی۔

''ایک مرد اور ایک عورت، ادھر تفریح کی غرض سے آئے تھے۔'' باجوہ نے بتایا۔ ''میں نے مرد کا شناختی کارڈ جمع کرنے کے بعد ہی انہیں کمرا دیا تھا۔ تمہارے آنے سے دو روز پہلے ہی وہ چلے گئے تھے۔''

''ہوسکتا ہے کہ وہ عورت گھر سے بھاگی ہوئی ہو جس کے ورثا اس کی بُو سونگھتے ہوئے اب یہاں پہنچے ہوں۔''

''یہ بھی ممکن ہے تمہارا اندیشہ درست ہو لیکن پولیس کو بہرحال اطلاع دینی ہوگی۔ اس کے علاوہ تمہیں بھی اب دوسرے کمرے میں شفٹ کرنا ہوگا، مالک نے اطلاع ملنے پر مجھے تاکید کی ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کی فوری مرمت کرالی جائے، ہمیں ہوٹل کی ریپوٹیشن کا بھی خیال رکھنا ہے۔''

''اتنی رات گئے کیا کاریگروں کو گھر سے اٹھواؤ گے؟''

''ہمارے کاریگر ادھر ساتھ ہی رہتے ہیں۔'' باجوہ نے کہا۔ ''ان سے یہی معاہدہ ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی خاطر کسی وقت بھی بلایا جاسکتا ہے۔''

''میں صبح کمرا خالی کردوں گا۔'' افضل خان نے جھلّا کر جواب دیا۔ ''پوری رات برباد نہیں کرسکتا۔''

''ہوٹل کی ریپوٹیشن کے علاوہ میری ملازمت کا معاملہ بھی ہے۔ میں آپ کو اس سے بہتر کمرا دینے کو تیار ہوں۔''

افضل خان اور اس کے درمیان بحث طول پکڑ رہی تھی جب موبائل پر پھر وہی نمبر ابھرے جو کچھ دیر پہلے نظر آئے تھے۔ افضل خان نے ریسیور آن کر کے فوراً ہی کہا۔ ''جی بھائی جی...... میں خیریت سے ہوں۔''

''تمہارے کمرے میں غالباً ہوٹل کا منیجر موجود ہے......؟''

''جی...... جی ہاں۔''

''میرے ایک ساتھی نے جو اسی ہوٹل میں موجود ہے مجھے فون پر اطلاع دی ہے۔ شاید منیجر تم سے کمرا خالی کرانے کی اور دوسرے کمرے میں جانے کی درخواست کر رہا ہوگا۔ میں ہوٹل کے مالک کی عادت سے بھی واقف ہوں۔ وہ ہر کام مرمت بڑی عجلت میں کرانے کا عادی ہے۔''

''ہاں جی...... اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' افضل خان نے پھر مختصر اً بات کی۔

''تم اپنا ایمرجنسی کا سامان ہینڈ بیگ میں رکھ کر ہوٹل چھوڑ دو۔'' دوسری جانب سے تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ''سامان کی فکر مت کرو، وہ میرے آدمی کی ذمے داری ہے۔ تم ہوٹل سے نکل کر کوئی کرائے کی سواری پکڑو اور جنرل پوسٹ آفس کے صدر دروازے کے سامنے اتر جاؤ، باقی ہدایت تمہیں وہاں پہنچنے کے بعد ملے گی۔'' جملہ مکمل کرتے ہی رابطہ بھی منقطع کردیا گیا۔

''کیا بات ہے جناب؟'' منیجر نے افضل خان کے چہرے پر ابھرنے والی جھلاہٹ دیکھ کر سوال کیا۔ ''کس کا فون تھا؟''

''بڑے بھائی صاحب کا...... میں گھر سے ناراض ہو کر آیا تھا۔ انہوں نے فوراً واپس آنے کی تاکید کی ہے۔ یہ بھی کہا ہے کہ میرا گھر چھوڑنے کا جو مطالبہ تھا وہ پورا کردیا جائے گا۔'' افضل خان نے بات بنائی۔ ''میں ہینڈ بیگ لے کر نکلتا ہوں، باقی سامان میرا دوست آکر لے جائے گا۔''

''جیسا تم مناسب خیال کرو۔'' باجوہ نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ ''ہم آپ کی کسی شے کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے، مرمت کا کام بھی میں اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔''

''پولیس کو میرے جانے کے بارے میں کیا بیان دو گے؟''

''تھانے کے وڈے آفیسر سے بھی اپنی جان پہچان پرانی ہے جناب۔ بیان شیان کیا دینا ہے، ضابطے کی کارروائی کی خاطر کاغذ کی خانہ پری ہوگی...... ہم بھی لمبے پھڈوں میں نہیں پڑنا چاہتے، آپ کے بارے میں بتادوں گا کہ پرانی واقفیت ہے۔ وقتی طور پر ایک دن کے لیے دوسرے ہوٹل میں شفٹ کردیا ہے۔''

''خاصے سمجھدار، ذہین اور گھاگ آدمی معلوم ہوتے ہو۔''

''بننا پڑتا ہے جناب...... بغیر مک مکا کے ہوٹل کا دھندا بھی نہیں چلتا۔''

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس بگ باس کے خاص آدمی کی ہدایت پر عمل کرنے سے سوا انکار کی کوئی گنجائش بھی نہیں تھی، اس نے ضروری سامان اٹھا کر ہینڈ بیگ میں ڈالا اور ہوٹل کے باہر آگیا۔ قسمت اچھی تھی جو اس وقت ایک بہکا ہوا شرابی کسی برقع پوش لڑکی کے ساتھ ہوٹل کے سامنے ٹیکسی سے اترا۔ جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی سیٹ کی طرف بڑی فیاضی سے پھینکا پھر لڑکی کا ہاتھ تھام کر ہوٹل کے ریسپشن کی طرف چلا گیا۔ افضل خان نے وہی ٹیکسی پکڑ کر اسے جنرل پوسٹ آفس کی طرف چلنے کی تاکید کی پھر تھکے ہوئے انداز میں پشت سے ٹیک لگالی...... اس کا ذہن آئندہ پیش آنے والے لمحات سے نمٹنے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا، ایک یہ خیال بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ آخر دوسری پارٹی کون تھی جس نے بڑے مگر مچھ کے مضبوط شکنجوں میں جکڑے ہوئے شکار کو اس سے چھیننے کی جسارت کی تھی؟

☙☙☙

کمرے میں داخل ہونے والا ایس پی اورنگ زیب اس وقت تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا جس نے اپنے ہاتھ میں ڈاکٹروں والا پروفیشنل بیگ تھام رکھا تھا۔ اورنگ زیب کے چہرے پر بھی خلاف معمول سنجیدگی طاری دیکھ کر شبنم تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیرونی دروازہ ان دونوں کے اندر آتے ہی باہر سے بند کر دیا گیا۔ اورنگ زیب چند لمحے شبنم کو عجیب قہر آلود نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ ''کسی نے سچ کہا ہے کہ خوب صورت ناگن کو دودھ پلا کر اس کی پرورش کرنا کسی منجھے ہوئے شکاری کے لیے بھی ہمیشہ خطرناک ہی ثابت ہوتا ہے۔''

''جی......'' شبنم نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ''مم...... میں سمجھی نہیں؟''

''جو موبائل تم کو دیا گیا تھا وہ اب کہاں ہے؟''

شبنم نے جواب میں موبائل اٹھا کر اورنگ زیب کے حوالے کر دیا لیکن وہ ابھی تک اس کے لہجے کی تلخی کا سبب نہیں جان سکی تھی۔

''ایک بات ذہن نشین کر لو۔'' اس نے شبنم کو تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام اورنگ زیب ہے جو تمہارے بگ باس کو بھی ہمیشہ جوتے کی نوک پر مارتا رہا ہے۔ تم کس کھیت کی مولی ہو؟...... افضل خان کو میں اس کی قبر کھود کر بھی برآمد کر لوں گا لیکن تم...... تمہارا انجام اب ان ہی لوگوں کے ہاتھوں خطرناک ہوگا جن کے لیے تم کام کرتی رہی ہو۔''

''آپ کیا کہہ رہے ہیں...... میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکی۔''

''بکو مت...... کیا تم نے افضل خان کو فون کرنے کا اعتراف مجھ سے نہیں کیا تھا؟''

''کیا تھا لیکن......''

''وہ مجھے تاریکی میں رکھنے کی خاطر۔ میرا اعتماد حاصل کرنے کے لیے تمہاری ایک خوب صورت چال تھی، فریب تھا۔''

''نہیں۔'' شبنم نے ایس پی کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی خاطر بڑی عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو میری طرف سے ضرور کوئی بدگمانی ہوئی ہے۔ میں نے دوبارہ افضل سے کبھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔''

''گڈ......'' اورنگ زیب کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر کر گہری ہونے لگی۔ ''تم لفظوں کے الٹ پھیر کے فن سے بھی واقف ہو...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے اسے دوبارہ فون نہیں کیا ہوگا۔ تمہاری ہدایت پر وہ تم سے رابطہ کرتا رہا ہوگا۔''

''یہ بھی غلط ہے......''

''پھر......'' اورنگ زیب نے گرج کر کہا۔ ''سچ کیا ہے۔ افضل خان وقتی طور پر میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے لیکن میرے جال سے نکل کر زیادہ دور نہیں جا سکے گا مگر اب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ تم اب اسی بگ باس کے ہاتھوں اپنے انجام تک پہنچو گی جو تمہاری کسی کمزوری کے ذریعے تمہیں بلیک میل کرتا رہا ہے۔''

شبنم ایس پی کے تیور دیکھ کر پہلے ہی خوفزدہ ہو گئی تھی، اب اس نے کھل کر جو کچھ کہا، اسے سن کر ہی وہ لرز اٹھی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''پلیز۔ آپ مجھے خود گولی مار دیں لیکن اس درندے کے حوالے نہ کریں...... میں عزت کی موت مرنا زیادہ پسند کروں گی۔''

''ایک ہی صورت ہے......'' اورنگ زیب نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے بتا دو کہ افضل خان ہوٹل سے فرار ہو کر اب کہاں روپوش ہوگا؟''

''مم...... میں، اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، آپ کو یقیناً کوئی......''

''بکواس بند کرو۔'' اورنگ زیب نے تلملا کر کہا پھر ساتھ کھڑے آدمی سے بولا۔ ''اس لڑکی سے پوچھو کہ کیا یہ

خوشی سے انجکشن لگوائے گی یا مجھے اپنے آدمیوں کو اسے بے بس کرنے کی خاطر طلب کرنا پڑے گا۔''

''اگر مجھے کسی زہر کا انجکشن بھی لگوانا چاہیں گے تو میں انکار نہیں کروں گی لیکن پلیز میری بات کا یقین کر لیں کہ میں افضل خان کے بارے میں......''

''شٹ اپ۔ یو چیٹر (CHEATER)'' اورنگ زیب کسی زخمی شیر کی طرح اس زور سے دہاڑا کہ شبنم سہم کر رہ گئی پھر اس نے انجکشن لگوانے میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، یہ تصور ہی اس کے لیے بڑا بھیانک تھا کہ اسے دوبارہ بگ باس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ افضل خان بھی تمام تر نمک حلالی کے باوجود بغیر کسی قصور کے بگ باس کی مصلحتوں کا شکار ہو کر بربادی کے دہانے تک پہنچ گیا تھا، اس پر جو مظالم ڈھائے گئے شبنم اس کی چشم دید گواہ بھی تھی اور اب...... اب شاید تقدیر اسے بھی بدنامی اور بے حیائی کے آخری انجام تک پہنچانے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اسے شبہ تھا کہ جو انجکشن اسے لگوایا جا رہا تھا وہ بے ہوشی کا ہوگا جس کے بعد وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہوگی۔ اورنگ زیب کے ساتھ آنے والا۔ انجکشن لگا کر اورنگ زیب کے اشارے پر چلا گیا تو اس نے رندھی ہوئی آواز میں پھر منت کی۔

''میں ہر طرح سے آپ کے رحم و کرم کی محتاج ہوں۔ پلیز...... مجھے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دیں لیکن ذلت کی اس دنیا میں واپس نہ جھونکیں جہاں میرا انجام آپ کے تصور سے بھی زیادہ بھیانک ہو سکتا ہے۔''

''آن دن کنڈیشن اونلی......'' اورنگ زیب نے بہ دستور خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''اب بھی وقت ہے۔ افضل خان کہاں ملے گا۔ اس کا پتا مجھے بتا دو......''

''آپ ایک بار پہلے بھی میرے سلسلے میں میڈم سے تصدیق کر چکے ہیں، ایک بار پھر......''

جواب میں اورنگ زیب کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ''تمہاری میڈم کیا ہے؟ مجھے اس کا اندازہ بھی ہو چکا ہے، اپنا مطلب نکالنے کے بعد میں اسے بھی قانون کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' شبنم نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ ''آپ شاید اچھی طرح واقف ہوں گے کہ میری طرح میڈم بھی آپ کے آکٹوپس کی درندگی کا شکار ہو چکی ہیں، ہم دونوں ہی اس سے انتقام کی خاطر زندگی کی بازی لگا چکے ہیں اور آپ......''

اورنگ زیب نے اس کی بات پر دھیان دینا مناسب نہیں سمجھا، جیب سے موبائل نکال کر کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا، اس کے چہرے سے بہ دستور الجھن اور جھلاہٹ عیاں تھی، رابطہ ہونے کے بعد اس نے سنسناتے ہوئے افسرانہ لہجے میں ہدایت دی۔ ''پندرہ منٹ بعد وین لے کر بتائے ہوئے اسپاٹ پر پہنچو...... لڑکی وہیں تمہیں پہنچا دی جائے گی...... ہاں...... ٹھیک ہے لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو اس کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہیے...... ہاں، اس کے بعد تمہیں کو یہاں بھی ایسا ڈراما اسٹیج کرنا ہے جس سے یہی ظاہر ہو کہ مخالف پارٹی کے بدمعاش ہمارے آدمیوں کی غفلت اور بے فکری سے فائدہ اٹھا کر لڑکی کو دوبارہ لے گئے...... ایک دو آدمیوں کے زخمی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... یس، اٹ از مائی آرڈر۔''

آخری جملہ بڑے تحکمانہ انداز میں ادا کرنے کے بعد اس نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈالا، شبنم کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تمہارے لیے اب بھی زبان کھولنے کا ایک آخری موقع ہے...... بے ہوشی سے دوچار ہونے کے بعد جو کچھ ہوگا وہ تمہاری اپنی حماقت اور زبان بند رکھنے کا نتیجہ ہوگا۔''

''مم...... میرے پاس اب اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کوئی طریقہ بھی نہیں ہے......''

''تمہارا یہ آخری حربہ بھی مجھے میرے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتا...... میرا نام اورنگ زیب ہے جس کے فیصلے ہمیشہ اٹل ہوتے ہیں، نہ ہوتے تو آج میں اس عہدے پر نہ ہوتا۔''

شبنم کے ذہن پر ہلکی ہلکی غنودگی اپنا اثر تیز کر رہی تھی۔ تقدیر نے جو اچانک اپنا رخ تبدیل کیا تھا، اس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ نیند کے خمار سے اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہو چکی تھیں لیکن وہ آخری وقت تک اورنگ زیب کو بار بار رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ جو فیصلہ کر چکا اس سے کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

توازن بگڑنے لگا تو شبنم آہستہ سے خود کو سنبھالتی مسہری پر دراز ہو گئی پھر جلد ہی وہ بے ہوشی سے دوچار ہو کر ہر چیز، ہر سوچ سے بے نیاز ہو گئی۔

☙☙☙

پرتاب بھوشن اپنے منڈپ میں آلتی پالتی مارے دھونی

رمائے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیاں موٹے دانوں کی مالا پر تیز تیز چل رہی تھیں، ہونٹ مشینی انداز میں کسی منتر کا جاپ کر رہے تھے۔ وہ اپنے عمل میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے گزرتے وقت کا مطلق احساس بھی نہیں ہوا تھا، برفانی پہاڑیوں کی گپھا میں بیٹھک جما کر اس نے جو کٹھن جاپ کیا تھا اس کے عوض کالی کی شکتیوں نے اسے پراسرار شیطانی قوتوں کا مالک بنا دیا تھا جس کے بعد وہ خود کو بہت بلند قامت سمجھ رہا تھا، اس کے دھرم کرم کے مطابق اس کا خیال تھا کہ اب وہ دیوی دیوتاؤں کا آشیر باد حاصل کرنے کے بعد اتنا مہان ہو گیا ہے کہ دھرتی کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یہ اس کا جاپ منتر اور دیوی کی کرپا ہی تھی جس نے اس کو گھمنڈی بنا دیا تھا۔ برفانی غار سے نکلنے کے بعد اس کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر کوئی بھی سمجھدار عورت اس کے قریب آنے سے بھی یقیناً گریز کرتی لیکن ایک الہڑ پجارن اپنے شریر کی تمام تر سندرتا اور اٹھان کے ساتھ بنی ٹھنی، مٹکتی چٹکتی اس کے سامنے آ گئی تھی، اس کی سندرتا دیکھ کر خود پرتاب بھی اسے کوئی سپنا ہی سمجھ رہا تھا لیکن جب پجارن نے ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے ڈنڈوت کیا اور کجرا لگے نین کے ساغر چھلکاتے اس کے من کو لبھاتے ہوئے اس بات کا اقرار کیا کہ کالی کی پجارن ہے جسے کالی نے پرتاب بھوشن کی داسی بنا کر اس کی سیوا کرنے کا حکم دیا ہے تو پرتاب کے اندر چھپے شیطان کو احساس ہوا کہ اس نے کالی کے لیے جاپ مکمل کر کے جو طاقت حاصل کر لی ہے اس کے بعد وہ اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں دنیا کی کوئی اور قوت اس کے ساتھ پنجا لڑانے کی ہمت نہیں کر سکے گی۔ اس نے جب اپنی تمام تر غلاظتوں اور جسم پر اٹی دھول مٹی کے ساتھ پجارن مدھو کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا، اس وقت بھی مدھو نے کوئی اعتراض کرنے کے بجائے خود کو بڑے چاؤ سے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی کہ پرتاب بھوشن نے کالی کے لیے جو دھونی رمائی تھی، دنیا سے الگ تھلگ ہو کر صرف ایک لنگوٹی باندھ کر بلند اور دشوار گزار پہاڑیوں کے ایک غار میں بیٹھ کر جو جاپ کرنے کی ٹھانی تھی، وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ لیاقت حسین سے اس کی اس غلطی کا انتقام لے سکتا تھا جو اس نے پرتاب بھوشن کا راستہ کھوٹا کر کے کی تھی...... کسی کی موت کی خاطر پرتاب بھوشن نے ایک تازہ لیموں پر گندا عمل کرنے کے بعد اس میں پڑھی ہوئی سوئیاں آر پار کر دی تھیں جو لیموں کے عرق کو اس کے کالے منتروں کے گندے بیروں کے ذریعے اس شخص کے جسم کا خون پی رہی تھیں جو اس بات سے ناواقف تھا۔ پرتاب بھوشن اس سے پہلے بھی کئی بار ایسے ہی گندے عمل کے ذریعے کچھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا، اسے وشواس تھا کہ جو بھی اس عمل کا توڑ کرنے کی کوشش کرے گا وہ بھی اس پلید عمل کے بیروں کا شکار ہو کر، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ کوئی طاقت اس کا بچاؤ نہیں کر سکے گی لیکن جب لیاقت حسین نے اتفاقاً گل خان کی زبانی یہ جان لینے کے بعد کہ وہ ہلاکت خیز سوئیاں کسی کی جان لینے کی خاطر لیموں میں پھنسائی گئی ہیں، ان کو لیموں سے نکالنے کی ٹھانی تو گل خان کے علاوہ فرحین نے بھی رو رو کر اس کی منت کی تھی کہ وہ اس ارادے سے باز رہے لیکن لیاقت حسین نے کسی کی جان بچانے کی خاطر خدا کا نام لے کر ان سوئیوں کو نکال پھینکا تھا اور لیموں کو اپنے قدموں تلے کچل ڈالا تھا مگر...... قدرت کی لازوال قوتوں نے اس نیک عمل کے عوض لیاقت حسین کو نہ صرف تمام باطل اور ناپاک قوتوں سے محفوظ کر دیا تھا بلکہ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے ذریعے اس طرح نواز دیا تھا کہ کوئی نہ کوئی غیبی اشارہ اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکنے یا کفر کی گندی چالوں سے محفوظ کر لیتا تھا، لیکن پرتاب بھوشن کو اپنے دھرم کے مطابق اپنے دیوی دیوتاؤں پر پورا وشواس تھا کہ ان کی طاقت کے آگے تمام طاقتیں ہیچ ہیں۔

اس وقت بھی وہ اس پرچھائیں کے بارے میں جاننے کی خاطر کالی کے نام پر ایک منتر کا جاپ کر رہا تھا جس نے لیاقت حسین کو مدھو کے ایک عارضی روپ کے دھوکے سے بچا لیا تھا بلکہ گیندے کے پھول کی موجودگی نے اسے چونکا بھی دیا تھا۔ پرتاب اپنے گندے عمل میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اسے گزرتے وقت کا کوئی احساس نہیں ہوا، کب دن رات کے اندھیرے میں تبدیل ہوا، کب ایک مندر کی پجارن اس کی کٹیا میں دیا روشن کر کے چلی گئی اور کتنی بار مدھو بھی چپکے چپکے اس کی کٹیا کے اندر جھانک چکی تھی، اسے اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس کی انگلیاں مشینی انداز میں مالا کے دانوں کو عبور کر رہی تھیں، اس کے ہونٹوں پر ایک منتر بار بار ابھر رہا تھا جب اس کی نظروں کے سامنے چھائے گھپ اندھیرے میں ایک روشن دائرہ نمودار ہوا۔ اس دائرے کو بند نظروں سے دیکھنے کے بعد پرتاب کے اندر کامیابی کی ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ شاید وہ روشنی بھی کالی مائی کی گندی قوتوں کا کوئی چمتکار تھی، پرتاب نے یہی جان کر منتر کو اور تیز تیز پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے سانسوں کی آواز آہستہ

آہستہ تیز ہو رہی تھی جب اس کے ہونٹوں نے اچانک ہلنا بند کر دیا۔ اس کے سامنے نظر آنے والے روشنی کے ہالے میں ایک انسانی ہیولا دھوئیں کی شکل میں لہرانے لگا۔ پرتاب کے پلید جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اس نے من ہی من میں دیوی کو یاد کیا پھر لرزتی، کانپتی اور بگڑتی بنتی پرچھائیں کو بڑے گھمنڈ سے مخاطب کیا۔

''مجھے وشواش تھا کہ دیوی کی مہان شکتی تجھے باندھ کر میرے سامنے آنے پر اوش مجبور کر دے گی۔ اب مجھے بتا پاپی کہ تو کون ہے؟...... کیوں میرا راستہ بار بار کھوٹا کر کے اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے...... تو نے زبان نہ کھولی تو میری مہان شکتی تجھے جلا کر بھسم بھی کر سکتی ہے۔''

''نادان...... کم عقل...... بدبخت!'' جواب میں پرتاب کے کانوں میں ایک مدھم آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ ''تو اپنی جن گندی اور ناپاک قوتوں پر گھمنڈ کر رہا ہے وہ ایک فریب اور گندے خواب سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔''

''سمجھا...... تو شاید مجھے جل دے کر پھر بھاگنے کی سوچ رہا ہے لیکن اب تو میرے پنجے سے نہیں بچ سکے گا۔''

''عقل کے دشمن...... بدنصیب، میری ایک بات غور سے سن لے...... کسی سچے مسلمان کے ایمان کو گندا کرنے کا خیال دل سے نکال دے ورنہ خدا کا قہر تجھے جلا کر راکھ کر دے گا......'' اس بار اس کی آواز میں کھلی تنبیہ تھی۔ ''اس نیک مرد کا پیچھا چھوڑ دے جسے خدا کے فرشتوں نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ اپنا راستہ بدل دے ورنہ...... ورنہ تیرا انجام بھیانک ہوگا۔''

پرتاب کے ذہن میں شعلے لپک رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کا بے بس شکار اس کے جال سے نکل جانے کی خاطر بڑکیں مار رہا ہے۔ اس نے من ہی من میں ایک منتر پڑھ کر ''جے بھوانی'' کا نعرہ بلند کیا پھر بڑے غضب ناک انداز میں دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے روشن دائرے میں نظر آنے والی پرچھائیں کی طرف جھٹک دیا لیکن...... دوسرے ہی لمحے اسے اتنا شدید جھٹکا لگا کہ وہ خود کو سنبھال نہ سکا۔ کریہہ چیخ کے ساتھ قلابازی کھاتا منڈل سے دور جا کر منہ کے بل گرا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس کے اوسان خطا ہو گئے پھر وہ سنبھل کر اٹھا تو اس نے کٹیا کے دروازے پر مندر کے بڑے پجاری اور پجارن مدھو کو دیکھا۔ بڑا پجاری پرتاب بھوشن کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، پجارن مدھو کی پلکیں بھی رہ رہ کر جھپک رہی تھیں۔ جو منظر اس کی نظروں نے دیکھا شاید وہ اس پر وشواس کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

پرتاب کے اپنے من میں بھی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی......!

پرتاب بھوشن ایک لمحے تک ہکا بکا کٹیا کے فرش پر پڑا پیش آنے والے حالات پر غور کرتا رہا پھر وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس کی پیشانی پر آڑی ترچھی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ کٹیا کے دروازے پر بڑے پجاری کے ساتھ دو تین پجاری اور بھی جمع ہونے لگے۔

''کیا ہوا پرتاب مہاراج؟......'' بڑے پجاری نے تعجب سے پوچھا۔ ''ہم آپ کی چیخ سن کر ادھر آئے ہیں۔''

''وہ...... وہ میرے جال میں آ کر نکل گیا۔ میں اسی پر چیخا تھا۔'' پرتاب نے سینہ تان کر جواب دیا۔

''وہ کون......؟''

''تھا ایک دشٹ، کالی کی آگیا پر میں اسے سراپ دینے کے لیے ایک منتر پڑھ رہا تھا لیکن...... تھوڑی سی چوک ہو گئی۔''

''ہاں......'' بڑے پجاری نے مدھو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اس پجارن نے بتایا تھا کہ آپ نے پہاڑی گپھا میں بیٹھک لگا کر کالی کے نام پر کوئی جاپ کیا تھا جس میں سپھل ہونے کے بعد دیوی نے آپ کو مہان شکتی سونپ دی ہے۔''

''اس بار وہ پاپی مجھے جل دے کر نکل گیا، پرنتو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

''میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟''

''کیول تمہارا آشیر باد ہی کافی ہوگا...... میں اس مسئلے کو اکیلا گھیر کر چتا کی آگ تک گھسیٹ سکتا ہوں۔''

پرتاب نے رعونت سے جواب دیا تو بڑے پجاری نے اپنی سبکی محسوس کی۔ دوسرے پجاری ساتھ کھڑے تھے اس لیے اس نے پرتاب کو ترچھی نظروں سے گھورا۔

''تم شاید بھول رہے ہو پجاری مہاراج کہ میں کالی کے اس بڑے مندر کا بڑا پجاری ہوں۔ دیوی نے یہ مان دیا ہے تو اس کا کوئی کارن بھی ہوگا۔''

''اوش ہوگا مہاراج......'' پرتاب نے کینچلی بدل کے مدھم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری سہائتا کی ضرورت ہوئی تو بنتی کرنے میں ہچکچاؤں گا نہیں لیکن...... پہلے میں خود اس پاپی سے دو دو ہاتھ کر لوں۔''

''تمہاری مرضی......'' بڑے پجاری نے شانے اچکا کر جواب دیا پھر واپس لوٹ گیا، اس کے ساتھ دوسرے

پجاری بھی چلے گئے، پجارن مدھو قدم بڑھاتی اندر آگئی۔ پرتاب نے سب کے جانے کے بعد مدھو کو تیز نظروں سے گھورا۔

''مورکھ...... تو نے کسی کو میرے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں؟''

''کیول بڑے پجاری کو بتایا تھا مہاراج کہ کالی نے مجھے اپنی سبھا سے چن کر تمہاری سیوا کے لیے آکاش سے دھرتی پر اتار دیا ہے۔''

''اب کسی کے سامنے زبان کھولنے کی بھول نہ کرنا......'' پرتاب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جو مہان ہوتے ہیں وہ سب کے سامنے ڈگڈگی نہیں پیٹتے۔ لک چھپ کر اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مہاراج لیکن......'' مدھو کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''تو کیا پوچھنا چاہتی ہے......؟''

''مجھے اچنبھا ہو رہا ہے مہاراج کہ کوئی پاپی تمہارے ہاتھ آکر چھومنتر کیسے ہوگیا؟''

''ایک چھوٹی سی بھول ہوگئی تھی پرنتو میں نے اس کا توڑ سوچ لیا ہے، دوبارہ اسے ایسا جکڑوں گا کہ سانس بھی نہ لے سکے گا۔''

''وہ...... وہ کون تھا مہاراج؟''

''تو پوچھ رہی ہے......؟'' پرتاب نے اسے غصے سے دیکھا۔ ''کیا تو بھول گئی کہ تیرے گیندے کے پھول نے اس مسلے کو چونکا دیا ہے، جو چھایا اس کی سہائتا کر رہی ہے وہ بھی ہوشیار ہوگئی ہے۔ میں نے اسے سامنے آنے پر مجبور کر دیا تھا پرنتو جلد بازی میں اسے بھسم کرنے کی بھول کر بیٹھا۔ پل دو پل اسے اور الجھائے رکھتا تو پوری طرح دلدل میں پھنس جاتا۔''

''کالی کا آشیرباد تمہارے ساتھ ہے تو چنتا کیوں کرتے ہو مہاراج...... وہ ایک بار نکل گیا لیکن مجھے وشواس ہے کہ دوبارہ تم اسے گانٹھنے میں اوش پھل ہو جاؤ گے۔ جسے دیوی نے سویکار کر لیا ہو وہ کبھی نراش نہیں ہوسکتا۔''

''بڑے پجاری سے تیری اور کیا بات ہوئی تھی؟''

''میں اس کے پاس نہیں گئی تھی، اسی نے مجھے بلوا لیا تھا۔'' مدھو نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''تمہارے بارے میں ٹٹول رہا تھا۔''

''تو نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے اسے بتا دیا کہ دیوی نے مجھے کیول تمہاری سیوا میں جیون بتانے کو کہا ہے۔'' اس بار مدھو نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ ''بڑا پجاری بھی مجھے ایک نمبر کا گھاگ نظر آتا ہے، مندر کی ایک نئی پجارن ہر روز رات کو اس کی سیوا کرنے جاتی ہے۔''

''جانتا ہوں۔ یہ مندر کے بڑے پجاری اپنی گدی پر براجمان ہونے کے بعد سندر پجارنوں کو بھی مندر کا پرساد سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، ہر نئی پجارن پر پہلا ادھیکار ان ہی کا ہوتا ہے پھر دوسرے چھوڑے موٹے پجاری بھی دانا چگتے رہتے ہیں۔''

''جانتی ہوں...... اس نے مجھے بھی شاید اسی کارن بلایا تھا پرنتو...... تمہارے لیے دیوی کا دین سمجھنے کے بعد اس نے دھرم کرم کی باتیں شروع کر دی تھیں۔''

''تیرے شریر کو ہاتھ تو نہیں لگایا تھا۔'' پرتاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تم میری طرف سے کبھی دل کھوٹا نہ کرنا مہاراج......'' مدھو کھسک کر پرتاب کے کولہے سے لگ گئی، مسکرا کر بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ جس دن میرے شریر کو کسی اور نے ہاتھ لگایا تو دیوی بھی منہ پھیر لی گی۔''

پرتاب کی نظریں مدھو کی سرکش جوانی پر پھسلنے لگیں لیکن اس کے ذہن میں ابھی ہاتھ سے نکل جانے والی پرچھائیں کسی زہریلے کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس نے صرف مدھو کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تو نے بھی میری چیخ کی آواز سنی تھی؟''

''ہاں مہاراج...... تم کئی بار چیخے تھے، بڑا پجاری مجھے ساتھ لے کر ادھر آیا تھا، اس سمے تم ہوش میں نہیں تھے۔'' مدھو نے دبی زبان میں کہا۔ ''تم نے مجھے آنے کو منع کیا تھا مہاراج لیکن میں تمہاری طرف سے ودیاکل تھی، دن میں کئی چکر لگائے تھے، سانجھ بھئے کٹی میں ایک نئی پجارن نے دیا جلا کر اجنیارا کیا تھا، اس سمے تم گیان دھیان میں تھے۔ آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا، جس پجارن نے دیا جلایا تھا وہ بھی نراش ہوگئی تھی۔''

''کیا مطلب ہے تیرا......؟'' پرتاب، مدھو کے آخری جملے پر چونکا۔

''تم نہیں جانتے مہاراج لیکن ایک ناری دوسری نار کے من کا بھید جان لیتی ہے۔'' مدھو شوخی سے بولی۔ ''جس طرح جوان پجارنوں کو دیکھ کر پجاریوں کے من میں کھل بل ہوتی ہے اسی انوسار کسی ناری کا دل بھی تمہارے جیسے پرش کو دیکھ کر اندر ہی اندر سپنوں کے جال بننے لگتا ہے۔ جس

پجارن نے تمہاری کٹی میں دیا جلایا تھا وہ کسی مدھ بھرے چھلکتے پیالے سے کم نہیں ہے۔ آٹھ دن پہلے ادھر آئی ہے۔ بڑا پجاری بھی اس کی تاک میں ہے لیکن ابھی تک اس کی منوکامنائیں پوری نہیں ہوئیں۔''

''کیا نام ہے اس کا......؟''

''نام بھی سلونی ہے...... خود بھی کسی کٹار سے کم نہیں ہے......'' مدھو نے پرتاب کے شانوں سے گال رگڑتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ایک اشارہ کیا تو کسی پکے ہوئے پھل کی طرح تمہارے چرنوں میں گرنے سے انکار بھی نہیں کرے گی۔''

''تجھے برا نہیں لگے گا؟''

''لگے گا تو مہاراج لیکن تم مرد ہو...... دس جگہ منہ مار سکتے ہو تمہارا کچھ نہیں بگڑتا لیکن...... ناری کی دھینگا مستی سے کے ساتھ ساتھ سب کی نظروں میں آجاتی ہے اور تم کو دیوی کا آشیرباد بھی ہے۔ میں کیسے تمہارا راستہ روک سکتی ہوں۔''

''پھر بھی تو چنتا مت کر۔'' پرتاب نے...... ایک پل کو اسے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا۔ گالوں کا رس چوستے ہوئے بولا۔ ''جب تک تو میری سیوا کرتی رہی۔ میں کسی دوسری پجارن کے ساتھ پیچ نہیں لڑاؤں گا۔ تھوڑی بہت ٹھٹھول کرنے کی اور بات ہے۔''

''تمہارے لیے کچھ بھوجن...... کچھ پھل فروٹ لادوں۔'' مدھو نے جواب میں اس کا ہاتھ تھام کر چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کل سے کچھ کھایا۔ میں اسی کارن بار بار تمہاری کٹی میں جھانک رہی تھی۔''

''جو تیرا من کرے لادے...... میں تیرا من نہیں توڑوں گا لیکن میں نے بھی سوگند اٹھائی ہے کہ جب تک اس پلید مسلے کو اور اس کی ہتھیلی لگانے والی چھایا سے دو دو ہاتھ نہیں کر لیتا، پیٹ بھر کر بھوجن بھی نہیں کروں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی مہاراج۔'' مدھو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں تمہاری سیوا سے کبھی منہ نہیں موڑوں گی۔''

مدھو کٹی سے چلی گئی تو پرتاب کا دھیان پھر اس پرچھائیں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے جو منتر پڑھ کر پھونکا تھا وہ اس کے خیال سے روشن دائرے پر بل کھاتی پرچھائیں کو جلا دینے کے لیے کافی تھا لیکن اس کے بجائے خود وہ چیختا ہوا زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس سے منتر کے جاپ میں کوئی بھول چوک ضرور ہوگئی تھی۔ پرتاب اسی کے بارے میں دماغ کی مشینری کی جانچ پڑتال کرنے میں پوری طرح گم تھا۔

⁂⁂⁂

دارا، روشنا اور میجر عاطف اس وقت کلب کے دوسرے ممبران کے ساتھ باہر لان پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے جب میجر کو موبائل پر کسی کی کال موصول ہوئی۔ اس نے روشن اسکرین پر ابھرنے والے نمبروں کو دیکھ کر موبائل کان سے لگالیا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سنتا رہا پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''فی الحال مناسب نہیں رہے گا۔ میں جانتا ہوں لیکن اس وقت گفتگو نہیں کرسکتا...... ہاں، میں تمہیں دوبارہ کال کرلوں گا...... اوکے۔''

میجر عاطف نے موبائل آف کیا تو ایک بے تکلف ممبر نے مسکرا کر چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ''کس کا فون تھا جس سے اس وقت ہماری موجودگی میں گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی؟''

''بتانے والی بات نہیں ہے۔'' میجر عاطف نے بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا تو روشنا بولی۔

''میرا مشورہ ہے کہ اب آپ کو دوسری شادی کرلینی چاہیے۔ اس طرح کب تک گزارہ ہوگا۔''

''روشنا ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' دارا نے بیوی کی حمایت میں زبان کھولی۔ ''تم جس کی طرف اشارہ کردو ہم وہیں بات شروع کردیں گے۔''

''مشکل ہے۔'' دوسرے ممبر نے کہا۔ ''ملٹری کا بندہ ہے۔ ایک محاذ پر گزارا نہیں کرتا، جب تک بھابی زندہ رہی اس نے پرانے اسٹاک کے گودام کو بھی لاک کر دیا تھا لیکن اب خود اسٹاک متحرک ہو رہا ہے تو ہمارے میجر نے بھی......''

''نان سنس!'' میجر عاطف نے ہنس کر اس کی بات کاٹی۔ ''تم لوگ جو سمجھ رہے ہو وہ معاملہ نہیں ہے۔''

''پھر ایسی کیا بات تھی جو اس وقت گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی۔'' روشنا نے شوخی سے سوال کیا تو میجر نے دارا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کیوں دارا ڈیئر...... بتادوں کس کا فون تھا؟ تم بعد میں ناراض تو نہیں ہوگے؟''

''اس کی باتوں میں نہ آنا روشنا۔'' دارا نے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ اب بلف کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

دوستوں کے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی پھر وہ سب اٹھ کر ریفریشمنٹ روم میں آگئے جہاں کلب کے بہت سارے ممبر موجود تھے۔ روشنا کو کلب کی پرانی لڑکیوں نے گھیر لیا، باقی افراد بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ باتوں

میں مصروف ہوگئے۔ میجر عاطف نے موقع دیکھ کر دارا کو ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے کاؤنٹر پر جاکر آئس کریم کے اسکوپ لیے پھر میجر عاطف نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"کچھ دیر پہلے جو کال آئی تھی۔ وہ کمانڈو ڈاٹ، ڈاٹ، ون فور کی تھی۔"

"کیا اس نے شیخ حامد کے کچھ اسکروٹائٹ کردیے؟" دارا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اس کی نوبت ابھی نہیں آئی اس لیے کہ شیخ حامد کے ساتھ پہلے ہی بہت برا ہوچکا ہے۔" میجر عاطف نے کمانڈو کی طرف سے ملنے والی اطلاع کو مختصر دہراتے ہوئے کہا۔ "بزنس فلور کے علاوہ آس پاس کی ایک دو عمارتوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ تمہارے مطلوبہ دشمن کے دس بارہ آدمی بھی مارے گئے ہیں۔ اس کے بعد شیخ حامد کے گھر کے باہر سڑکوں سے تین پیٹیاں بھی ملی ہیں جس میں شیخ حامد کے خاص کارندے موت کا لباس پہنے آرام کی نیند سو رہے تھے۔"

"یہ کب کی بات ہے......؟" دارا نے حیرت سے دریافت کیا۔

"غالباً کل رات کی...... اخبارات نے شاید شیخ حامد کے اثر ورسوخ کی وجہ سے فی الحال ان خبروں کو شائع نہیں کیا لیکن...... کمانڈو ڈاٹ ڈاٹ، ون فور کی انفارمیشن غلط نہیں ہوسکتی۔ اس کا خیال ہے کہ فی الحال پارٹی کو جو ہیوی ڈوز مل چکی ہے وہی کافی ہے، میں نے اسی لیے کہا تھا کہ اس وقت گفتگو نہیں ہوسکتی۔"

"تم نے ایس پی اورنگ زیب سے خبر کی تصدیق کی؟"

"موقع کہاں ملا...... اب کیے لیتا ہوں۔" میجر عاطف نے موبائل نکال کر اورنگ زیب کے نمبر پنچ کیے پھر جب ایس پی نے بھی کمانڈو کی اطلاع کی تصدیق کردی تو دارا نے کچھ تامل سے کہا۔

"ایک پریشانی اب بھی ہے...... شیخ حامد ان وارداتوں میں ڈیڈ کے ہاتھ ملوث ہونے کے بارے میں بھی غور کرسکتا ہے۔ انتہائی خبیث آدمی ہے۔ بلاوجہ دوسروں سے دشمنیاں مول لیتا پھرتا ہے۔"

"ڈونٹ وری...... اورنگ زیب نے جو مختصر تفصیل بتائی ہے اس میں شیخ حامد اپنے ممکنہ دشمنوں کا نام بھی لے چکا ہے۔ ایک ہی رات میں دو بڑے حادثوں نے اس کے دماغ کی چولیں بھی ہلا کر رکھ دی ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ابھی تم کمانڈو کو روک دو...... بعد میں دیکھا جائے گا۔" دارا نے جواب دیا پھر وہ بھی میجر عاطف کے ساتھ قدم بڑھاتا اس گروپ میں شامل ہوگیا جس میں [illegible] کے دوست اور روشنا کی پرانی کلب ممبرز شامل تھیں۔

☆☆☆

اڑتالیس گھنٹوں کے اندر جو سنگین واقعات اور حادثات رونما ہوئے تھے انہوں نے خاص طور سے سراج کو الجھن میں ڈال دیا تھا، شیخ حامد کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے سلسلے میں ابھی چھان بین شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک ہی رات میں افضل خان کا ہوٹل سے فائرنگ کے بعد چھومنتر ہوجانا اور شبنم کا پُراسرار طور پر ہاتھ سے نکل جانا ایسی باتیں نہیں تھیں جنہیں آسانی سے نظرانداز کردیا جاتا۔ افضل خان کی بات اور تھی، اس کی نگرانی بھی اورنگ زیب کے دو آدمی کررہے تھے لیکن شاید ہوٹل پر فائرنگ کرنے والے تعداد میں زیادہ رہے ہوں اس لیے وہ افضل خان کو چھوڑ کر جان بچانے کے لیے موقع سے اِدھر اُدھر ہوگئے ہوں، لیکن شبنم...... اسے خاص طور پر اورنگ زیب اور سراج نے ایک مخصوص مقام پر اپنے خاص آدمیوں کی نگرانی میں رکھا تھا پھر اس کا غائب ہوجانا تعجب خیز ہی تھا، جو افراد شبنم کی نگرانی پر تعینات تھے انہوں نے یہی بیان دیا تھا کہ رات کا کھانا انہوں نے ایک ساتھ ہی کھایا تھا پھر وہ بے ہوشی سے دوچار ہونے کے بعد اس وقت ہوش میں آئے جب شبنم وہاں سے غائب ہوچکی تھی۔

سراج اس وقت اورنگ زیب کے آفس میں موجود تھا۔ صبح وہ اورنگ زیب کی ارجنٹ کال کے بعد اتنی جلدی میں نکلا تھا کہ ناشتا بھی نہیں کرسکا۔ خود اورنگ زیب کے چہرے سے بھی یہی لگ رہا تھا کہ شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ بھی ذہنی طور پر مفلوج ہوکر رہ گیا تھا۔

سراج کو دونوں واقعات کی اطلاع سنانے کے بعد وہ بھی بری طرح الجھ گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر اس نے اپنے مختلف خاص آدمیوں سے فون پر گفتگو بھی کی تھی لیکن شاید دوسری جانب سے کوئی امید افزا خبر نہیں ملی تھی جس نے اسے مزید ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"جو کچھ خاص طور سے شبنم کے سلسلے میں ہوگیا وہ بات کسی پُراسرار معمے سے کم نہیں ہے......" سراج نے دبی زبان میں کہا۔

"میرا ذہن ابھی تک خود بھی چکرا رہا ہے۔" اورنگ زیب نے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے آدمی میرے ساتھ ڈبل کراس کرنے کے سلسلے میں کبھی غور نہیں

کرسکتے لیکن بہرحال جو کھانا انہوں نے کھایا وہ تیز نشہ آور ضرور تھا۔"

"کھانے میں نشے کی آمیزش کس نے کی ہوگی؟"

"یہی بات غور طلب ہے۔" اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "جو آدمی ان کے لیے کھانا لاتا تھا وہ فی الحال غائب ہے لیکن میرے سادہ لباس والے اسے بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"کون تھا کھانا لانے والا؟"

"ان ہی کا ایک پرانا واقف کار تھا لیکن وہ اب وہاں نہیں ہے جہاں رہتا تھا...... ہوسکتا ہے دشمنوں کے کسی آدمی نے اسے خرید لیا ہو...... یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی گھر والی کو قابو کرنے کے بعد اسے اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کردیا گیا ہو۔ کھانے والے کے گھر کو بھی اندر سے کھنگال لیا گیا ہے۔ وہاں کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا ہے کچھ لوگوں نے ان دونوں کو غائب کرنے سے پیشتر پورے گھر کے سامان کی بھی تلاشی لی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی کے ٹکڑوں کے علاوہ خون کے دو چار قطرے بھی ایک میز پوش پر ملے ہیں۔"

"کوئی فنگر پرنٹس......" سراج نے کسمسا کر دریافت کیا۔

"ان کا نہ ملنا ہی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو لوگ اس کارروائی میں ملوث تھے وہ ہر طرح سے پوری طرح محتاط تھے۔"

ایک منٹ خاموشی رہی پھر سراج نے مدھم لہجے میں کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا شبنم کو ساتھ لے جانے والے اسے زندہ چھوڑ دیں گے؟"

"فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، ویسے اسے مار دیے جانے کے امکانات زیادہ نہیں ہیں۔ اگر صرف اسے مارنا مقصود ہوتا تو وہ ان کے لیے زیادہ آسان تھا۔ یہ بات اور ہے کہ اس میں شاید میرے ایک دو آدمی بھی کام آجاتے۔"

"ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"ون منٹ......" اورنگ زیب نے سراج کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ "کیا تم اب بھی مجھ سے اس قسم کی اجازت ضروری سمجھتے ہو؟"

"سوری......" سراج نے مسکرا کر سوال کیا۔ "آپ نے شبنم کے علاوہ اور بھی ایک دو معاملات میں ڈی آئی جی کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔"

"اس لیے کہ مجھے اس پر مکمل اعتماد نہیں ہے۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی اور صاف گوئی سے کہا۔ "کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو میں خود اپنے آپ سے بھی شیئر (SHARE) نہیں کرتا۔ کسی بھی پولیس آفیسر کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ حساس معاملات میں خود اپنی پرچھائیں سے بھی محتاط رہے لیکن...... تم نے اس وقت خاص طور پر یہ سوال کیوں کیا جبکہ میں تم سے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے آغا منظور صاحب بہت زیادہ ٹھنڈا کرکے کھانے کے عادی ہیں اور، ایسے لوگ کبھی کبھی اپنی دوررس پالیسی کے سبب غلطی کا ارتکاب بھی کرجاتے ہیں۔"

"میں آپ کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔" سراج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میری اطلاع بھی یہی ہے کہ آپ کا آکٹوپس ہمارے ڈی آئی جی پر شبنم کی بازیابی کے لیے زیادہ زور ڈال رہا ہے۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔"

سراج کچھ مزید بات کرنا چاہتا تھا کہ اس کے موبائل پر سگنل ملا۔ نمبر دیکھے بھالے نہیں تھے پھر بھی سراج نے موبائل آن کرکے کان سے لگالیا۔ "ہیلو...... سراج اسپیکنگ۔"

"میں آپ کا ایک پرانا خادم بول رہا ہوں جناب۔"

"نام کیا ہے مجھے یاد نہیں آرہا......" سراج نے سپاٹ لہجے میں پوچھا، بولنے والے کی آواز وہ پہلی بار سن رہا تھا۔

"میں نے نام پہلے بھی نہیں بتایا تھا، اب بھی آپ اس کو دریافت کرنے کی زحمت نہ کریں۔" سپاٹ لہجے میں جواب ملا، صاف لگ رہا تھا کہ دوسری جانب سے بات کرنے والا آواز بنانے کی کوشش کررہا ہے۔

"اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"ایک اہم اطلاع دینی تھی۔" جواب میں معنی خیز انداز اختیار کیا گیا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ اس وقت ایس پی صاحب کے دفتر میں بیٹھے غالباً شبنم نامی لڑکی کے سلسلے میں الجھ رہے ہوں گے۔"

سراج، شبنم کے نام پر چونکا۔ "تم اس سلسلے میں کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے موبائل کا اسپیکر بھی آن کردیا۔

"میں اس قسم کے معاملات میں ٹانگ نہیں الجھاتا لیکن اتفاق سے کوئی بات معلوم ہوجائے تو آپ حضرات کو بتائے بنا چین بھی نہیں ملتا۔"

"اس وقت کیا خاص معاملہ درپیش ہے؟" سراج نے الجھ کر دریافت کیا۔ "تم نے جو نام لیا ہے اس کے بارے میں کیا بتانا مقصود تھا؟"

''اگر میں آپ حضرات کو اس کا پتا اور ٹھکانا بتادوں تو آپ کیا انعام دیں گے؟''

''غلط اندازہ ہے تمہارا۔'' سراج نے اس بار قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ابھی تک اس نے بھی کوئی انعام کا اعلان نہیں کرایا جس کو اس کی سب سے زیادہ تلاش ہے۔ پولیس کا کام صرف اس کو ڈھونڈنا ہے جو ہمارے لوگ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ ایک بات اور سن لو۔ دوبارہ میرے بارے میں زیادہ سن گن لینے کی حماقت نہ کرنا ورنہ اس کا انجام تمہارے حق میں خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔''

''میں نے اس وقت بھی تمہارا پیچھا نہیں کیا تھا آفیسر......'' دوسری طرف سے بولنے والے نے بھی کینچلی بدل کر جواب دیا۔ ''اندھیرے میں ایک تیر چلایا تھا جو شاید نشانے پر نہیں لگا۔''

سراج نے جواب دینے کے بعد اورنگ زیب کے اشارے پر موبائل اس کو دے دیا۔

''ایس پی اورنگ زیب بول رہا ہوں۔ تم کو لڑکی کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟''

''جب تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تو پھر پیٹ میں مروڑ کیوں شروع ہوگیا؟''

''بات مروڑ کی نہیں...... فرض کی ادائیگی کی ہے۔'' خلاف توقع اورنگ زیب نے سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لڑکی کی بازیابی کے بعد ہم تمہیں دوسری پارٹی سے ایک بڑی رقم بھی دلوا سکتے ہیں۔''

''دوسری پارٹی کس کی ہے؟''

''آم کھانے سے غرض رکھو، پیڑ گننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی ضرور جانتے ہوگے کہ میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتا۔''

''جال پھینکنے کی کوشش کر رہے ہو؟...... میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔''

''پھر...... اپنا اور ہمارا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''دو تین روز میں اس کا جواب دے دوں گا لیکن نئے نمبروں کی سم سے...... وہ بھی ان رجسٹرڈ ہوگی۔'' دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

''کون ہوسکتا ہے؟'' سراج نے کرسی پر پہلو بدل کر پوچھا۔

''ہوسکتا ہے یہ بھی ہمیں ٹٹولنے کی ایک چال ہو۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فون کرنے والا آکٹوپس کا کوئی ایجنٹ تھا جس کو یہ شبہ ہوگیا ہے کہ شبنم کہاں تھی اور اب کہاں ہوسکتی ہے؟''

''تم نے ادھر آتے وقت کسی تعاقب پر توجہ نہیں دی تھی؟'' اورنگ زیب نے سوال کیا۔

''اس کا خیال رکھنا اب میری عادت بن چکی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔''

''پھر ایک بات اور بھی ممکن ہوسکتی ہے۔'' اورنگ زیب بدستور سنجیدگی سے بولا۔ ''ممکن ہے اس وقت تمہاری یہاں موجودگی کی اطلاع کسی کالی بھیڑ نے ڈی آئی جی تک پہنچادی ہو اور وہ ہماری ملاقات کی وجہ جاننے کے لیے کسی آدمی کے ذریعے تکے لگا رہا ہو۔''

''لیکن شبنم کے ہاتھ سے نکل جانے کی اطلاع اسے کس نے دی ہوگی؟'' سراج نے کہا۔ ''شبنم کے بارے میں صحیح صورتِ حال کی اطلاع ہمارے علاوہ اور کسے تھی؟''

''یہی ایک اہم پوائنٹ ہے جو میرے ذہن میں بھی چکرا رہا ہے مگر...... ڈونٹ وری!'' اورنگ زیب نے اٹھتے ہوئے سراج کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا پھر وہ دونوں ہی آگے پیچھے قدم اٹھاتے دفتر سے باہر آگئے۔ اورنگ زیب کے کہنے پر سراج اپنی گاڑی چھوڑ کر اسی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں ہی اپنی اپنی کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔

''اس وقت ہم کہاں جارہے ہیں؟'' سراج نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔

''کبھی کبھی بھٹکے ہوئے مسافروں کو سڑکوں پر بے معنی چکر لگانے سے بھی منزل کا نشان مل جاتا ہے۔''

سراج اس جواب پر چونکا، اسے کم از کم اورنگ زیب سے ایسے مبہم جواب کی توقع نہیں تھی۔ اب تک وہ اسے فولادی ارادوں کا مالک سمجھتا رہا تھا لیکن اس وقت وہ جواب اس کے لیے کچھ اور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ اس نے خاموشی اختیار کرلی۔

''میرا اندازہ ہے کہ تمہیں میرا جواب پسند نہیں آیا۔'' اورنگ زیب نے گہری سنجیدگی سے سراج کو مخاطب کیا۔

''ہاں...... میں انکار نہیں کروں گا۔'' سراج سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''یہ پہلا موقع ہے جب میں......''

''اسے پہلا اور آخری ہی سمجھو......''

''میں سمجھا نہیں......؟'' سراج کی بات کاٹ دی گئی تو اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''دوسری پارٹی مستقل نئے نئے کارڈ استعمال کر رہی ہے۔ اب میری باری ہے۔'' اورنگ زیب نے سر سراتے

لہجے میں جواب دیا۔ ”میں بھی ایک دونئی چال چلنے کا اختیار رکھتا ہوں۔ تم دیکھنا، بازی ایسی پلٹا کھائے گی کہ خود آکٹوپس کو بھی دن میں تارے نظر آجائیں گے۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس کو دی گئی مہلت کے اندر اندر ان مجرموں کا سراغ لگالیں گے جو موجودہ حالات کے ذمے دار ہیں؟“

”شاید......“ اورنگ زیب نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بڑا معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ”ناکامی کی صورت میں، میں آکٹوپس کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ تمہارے ڈی آئی جی صاحب بھی اس کے گواہ ہیں۔“

”لیکن ابھی تک ہم کسی نتیجے پر......“

ٹھیک اسی وقت اورنگ زیب کے موبائل نے وائبریٹ کیا تو اس نے سراج کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے موبائل اٹھا کر آن کرتے ہوئے کانوں سے لگالیا۔ ”ہیلو...... ہاں، اطمینان سے بات کرسکتے ہو...... گڈ...... کیا تمہیں یقین ہے اب تک وہ اس کے پاس...... پہنچ گیا ہوگا؟...... اوکے...... فائن، دوسرے معاملے کا کیا بنا؟...... ڈونٹ وری! میرے پاس اس کا بھی ایک توڑ موجود ہے...... ابھی نہیں، فی الحال اس کا کھل کر سامنے آنا مناسب نہیں ہوگا۔ حماقت کی باتیں مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ وہ دو ایک نہیں ہوں گے۔ نہیں، اب کوئی رسک نہ لینا...... ہاں، تم نے جو کام کردیا ہے جلاب سے کم نہیں ثابت ہوگا۔ میں کال کرلوں گا۔ اوکے!“ اورنگ زیب نے موبائل آف کرکے رکھا پھر گاڑی کو اگلے چوراہے سے بائیں جانب موڑ دیا، موبائل پر بات کرنے کے بعد وہ کسی وجہ سے خاصہ ریلیکس نظر آرہا تھا۔

”کس کا فون تھا؟“ سراج نے سرسری انداز میں دریافت کیا۔

”ہم اس وقت لوچن کے پاس چل رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سراج کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے زہریلے انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”مجھے ایک پرانی مثال یاد آگئی ہے کہ...... لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔“

”ایک بات بڑی صاف گوئی سے کہوں اگر آپ برا......“

”ڈونٹ بی سینٹی مینٹل، میں تمہیں چھوٹا بھائی کہہ چکا ہوں اس لیے تمہاری کسی بات کے برا ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”میرا اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو آپ نے کوئی خاص بات ابھی تک مجھے بھی بتانی ضروری نہیں سمجھی۔“

”یو آر۔ رائٹ۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے اعتراف کیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”پریشان مت ہو، میں اپنی شکست تسلیم کرنے کی خاطر آکٹوپس کے سامنے تنہا نہیں جاؤں گا۔ ایک ساتھی اور بھائی کی حیثیت سے تم بھی میرے ساتھ ہوگے۔“

”آپ نے اچانک لوچن سے ملنے کا ارادہ کیسے کرلیا؟“ سراج نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

”لیاقت حسین کے کیس والا زخمی کسی طرح زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ شاید لوچن اس کی زبان پر پڑے قفل کھولنے میں ضرور کامیاب ہوجائے گا۔“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ سراج کسمسایا ”لیکن...... کیا ایک گواہی آکٹوپس کے پیروں میں زنجیر ثابت ہوسکتی ہے؟“

”چوبیس گھنٹے اور انتظار کرلو۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں اپنے سارے سوالوں کا جواب مل جائے۔“ اس بار اورنگ زیب کے چہرے پر جو زہر آلود مسکراہٹ ابھری تو سراج چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کیا آپ نے آکٹوپس کے ٹرمپ کارڈز کے جواب میں کوئی غیر قانونی اقدام کا فیصلہ کرلیا ہے؟“

”ریلیکس فارٹوئنٹی فور آورس...... اس کے بعد قانون کے ماتھے پر بھی تمہیں پسینے ہی پسینے نظر آئیں گے۔“

اورنگ زیب نے سی آئی ڈی سینٹر کے احاطے میں گاڑی داخل کی تو سراج نے اس وقت مزید گفتگو مناسب نہیں سمجھی لیکن اس کا ذہن بہ دستور اس گتھی کو سلجھانے میں منہمک تھا جو اورنگ زیب کی مختلف باتوں نے جنم دی تھی۔

☆☆☆

لوچن اور اس تین فیتے والے پولیس حوالدار میں روزِ اوّل سے کشمکش جاری تھی وہ۔ صورت وشکل کے اعتبار سے بھی بڑا اذیت پسند نظر آتا تھا، وہ اچھے خاصے ڈیل ڈول اور ٹھوس جسم کا مالک تھا، اس کی آنکھوں میں ہر وقت تیرنے والی سرخیاں بھی اس بات کی غماز تھیں کہ وہ کسی مجرم کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا، چہرے پر گھنی گھنی اور بڑی لوچدار مونچھوں نے اس کی شخصیت کو اور ہیبت ناک بنا رکھا تھا لیکن...... لوچن کے معاملے میں روزِ اوّل سے بڑا بے بس تھا، اورنگ زیب کے مخصوص آرڈر کی وجہ سے وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کی کھجلی نہیں مٹا سکا تھا۔ خود لوچن بھی اس پر پوری طرح حاوی رہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے

دیتا تھا۔ جس مخصوص کمرے میں خاص خاص قیدیوں کو ٹھوس اور کھردرے فرش پر رات بھر نیند نہیں آتی تھی وہاں لوچن کی ضد پر اسے آرام کرنے کی خاطر ایک اسپرنگ میٹرس بھی فراہم کرنی پڑی تھی۔ حوالدار اور لوچن کے درمیان تیز وتند جملوں کی جنگ روز ہی ہوتی تھی۔

اس وقت بھی لوچن دن چڑھنے کے بعد اپنے بستر پر آرام سے بیٹھا بڑے سکون سے بریک فاسٹ کرنے میں مشغول تھا جب وہی جلاد نما حوالدار پورے طمطراق سے تالا کھول کے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظروں میں اس وقت بھی شعلوں کا رقص جاری تھا۔ حسب معمول دو مسلح سپاہی بھی حوالدار کے اندر داخل ہوتے ہی لوچن پر رائفلیں تان کر پوری طرح محتاط ہوگئے۔ لوچن نے اسے ایک نظر دیکھا، بے پروائی سے شانے جھٹک کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا پھر ناشتے میں مشغول ہوگیا۔

”نواب بے ملک کی ناجائز اولاد۔“ حوالدار نے بڑی حقارت سے مخاطب کیا۔ ”کب تک مفت کا توس اور مکھن زہر مار کرتے رہوگے؟“

”آج تم نے گڈ مارننگ نہیں بولا۔“ لوچن نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ”یو بلاڈی بلڈ...... تم تہذیب کا معاملہ میں بھی ایک دم ان کلچرڈ معلوم پڑتا۔“

”شٹ اپ یو نکٹا چپٹا گھٹیا مین۔“ حوالدار نے بھی اردو، انگلش مکس ٹائی زبان اختیار کی۔ ”ادھر تمہارا گرینڈ فادر تمہارا چوکھٹا دیکھنا مانگتا۔ جلدی زہر مار کرکے کم ودھ می۔ ہری اپ۔“

”گرینڈ فادر یا...... فادر ان لا۔“ لوچن نے اسے جلانے کی خاطر آنکھ مار کر سوال کیا۔

”زیادہ گٹ پٹ نہیں چلے گا لنڈے کے کٹ پیس۔ ٹین منٹس میں اسٹینڈ اپ ہوکر تیار ہوجاؤ۔“ حوالدار نے مونچھوں کو خطرناک انداز میں تاؤ دے کر رعب دار لہجے میں حکم دیا۔

”اوکے، یو شٹ...... دیٹ آؤٹ سائیڈ، ام کافی کا کوپ خالی کرکے تمہارا ریکوئسٹ پر غور کرے گا۔“

حوالدار پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔ باہر اورنگ زیب اور سراج کی موجودگی کا خیال نہ ہوتا تو وہ لوچن کے ”شٹ“ کے جواب میں آج اس کے جسم کی اتنی تیل مالش ضرور کردیتا کہ وہ آئندہ سے دوبارہ اس گندے لقب سے نوازنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔ وہ بل کھاتا ہوا لوچن کو خون آلود نظروں سے کھڑا گھورتا رہا۔ لوچن نے آرام سے کافی ختم کرکے کپ ایک طرف ڈال دیا پھر سمرسالٹ کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ حوالدار کو خون کے دو گھونٹ اور مجبوراً زہر مار کرنا پڑے۔ پھر وہ آگے پیچھے قدم اٹھاتے اس ساؤنڈ پروف کمرے میں آگئے جہاں اورنگ زیب اور سراج موجود تھے۔ لوچن نے ان دونوں کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھا پھر خاموشی سے تیسری کرسی پر بیٹھ گیا، حوالدار، اورنگ زیب کا اشارہ پاکر باہر نکل گیا۔ خودکار دروازے دوبارہ بند ہوگئے۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ اورنگ زیب نے گفتگو کی ابتدا سنجیدگی سے کی۔ ”کیا ہمارے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو؟“

”جو کچھ پہلے کہہ چکا ہوں، اس میں مزید کوئی ترمیم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔“ لوچن نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔

”ایک بار پھر اپنے جواب پر غور کرلو۔“

”ہمارا تعلق جس قبیلے سے ہے وہاں لوگ صرف ایک بار غور کرتے ہیں۔ بار بار فیصلے تبدیل نہیں کرتے۔“

”لیکن ہم...... تمہارا فیصلہ تبدیل بھی کرا سکتے ہیں۔“

”تم دونوں بھی کوشش کرکے دیکھ لو۔“ لوچن نے باری باری ان دونوں افسران کو دیکھتے ہوئے بہ دستور بے پروائی سے جواب دیا۔ وہ کسی طرح مرعوب نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

”کیا یہ تمہارا آخری جواب ہے؟“

”یس......“

اورنگ زیب نے اسے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر جیب سے ایک موبائل نکال کر اس کی طرف خاموشی سے بڑھا دیا، اس کے بعد اس نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر کسی کے نمبر پنچ کیے۔ سراج خاموش بیٹھا آنے والے لمحوں کے بارے میں غور کرتا رہا۔

”ہیلو......“ دوسری جانب سے رابطہ قائم ہونے پر اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں ایس پی اورنگ زیب اس وقت سراج کے اور لوچن کے ساتھ سی۔ آئی۔ ڈی سینٹر کے ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ لوچن ہمارے ساتھ تعاون کرنے سے بہ دستور پس وپیش کررہا ہے۔ میں نے اسے موبائل دے دیا ہے، اس کے نمبر نوٹ کرلیں۔“ اورنگ زیب نے لوچن کو دیے گئے موبائل کے نمبر دوبارہ دہراتے ہوئے کہا پھر موبائل آف کرکے لوچن کو مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میرے ساتھ کوئی گھسا پٹا گیم کھیلنے کی کوشش نہ کرنا

آفیسر، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم کسی کے ساتھ غداری کرنے پر موت کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ تم سیاہ فام حبشی کا انجام دیکھ چکے ہو۔''

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر بہ دستور دوستانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی جب لوچن کا موبائل گنگنانے لگا، لوچن نے ایک پل کے لیے اورنگ زیب کو ٹٹولتی نظروں سے پھر موبائل آن کر کے بولا۔

''لوچن بول رہا ہوں۔''

دو منٹ تک کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا، دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کے تاثرات لوچن کے چہرے پر واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ دو منٹ بعد لوچن نے کسمسا کر کہا۔ ''کیا میں یہ سوچنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ تم بھی اس وقت کسی ایجنسی کے ہاتھوں مجبور ہو؟''

لوچن کے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا اسے سن کر لوچن نے موبائل آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر وہ کسی گہری سوچ میں غرق رہا۔ اس دوران اس کی تجربہ کار نظریں اورنگ زیب اور سراج کے دماغ کا ایکسرے کرنے میں مصروف رہیں، پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''میں فوری طور پر تم دونوں کو کوئی آخری جواب نہیں دوں گا لیکن...... تم اگر مناسب سمجھو تو مطلوبہ شخص کو میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں بند کر دو اور...... اپنے ماتحتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ ہمارے کمرے سے دور رہیں ورنہ تم بھی خاطر خواہ نتائج نہیں حاصل کر سکو گے۔''

''کیا فون کال کے بعد بھی تمہیں کسی قسم کا شبہ لاحق ہے؟''

''اس کا جواب بھی تمہیں کسی نہ کسی طرح دس بارہ گھنٹوں میں مل جائے گا۔''

''او۔ کے۔'' اورنگ زیب نے سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔''

''ایک بار اور سن لو...... لوچن کی نظریں گھپ اندھیروں میں بھی بہت دور تک دیکھنے کی قوت رکھتی ہیں۔ اگر مجھے ذاتی طور پر مکمل اطمینان نہ ہوا تو تم...... میرے علاوہ اپنے دوسرے شکار سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔''

''جانتا ہوں......'' اورنگ زیب نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''اور کوئی شرط......؟''

''کامیابی کی صورت میں میرے ساتھ تمہارا گھسا پٹا قانون کیا برتاؤ کرے گا؟''

''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کسی بھی قسم کی پیچیدگی سے نجات مل جائے۔''

''اور اگر تم ناکام ہو گئے تو......؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک سال۔'' اورنگ زیب نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اونلی تھری ہنڈرڈ اینڈ سکسٹی فائیو ڈیز۔''

''کبھی کبھی انسان کا اعتماد اسے دھوکا بھی دے جاتا ہے۔'' لوچن کے جواب میں کئی سوالات پوشیدہ تھے۔

''میں اپنا کمٹمنٹ (وعدہ) پورا کرنے کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' اورنگ زیب یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم نے بعد میں اگر باہر جانا چاہا تو میں اس کا بندوبست بھی کر دوں گا...... اٹ از مائی پرامس۔''

''رائٹ...... تم بارہ گھنٹے بعد مجھ سے موبائل پر رابطہ کرنا۔ تمہیں میرا بھی آخری جواب مل جائے گا۔''

اس گفتگو کے بعد لوچن کو واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب نے لوچن کی نگرانی پر تعینات عملے کو بھی طلب کر کے واضح طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ لوچن کے کمرے سے کم از کم دس بارہ فٹ دور ہی رہیں۔ کسی ایسی جگہ طے کر کے پہرہ دیں گے جہاں لوچن یا اس کے ساتھ رہنے والے کی نظروں میں نہ آ سکیں۔

''سر، ہم آپ کے حکم کے پابند ہیں لیکن...... اگر قیدی یا قیدیوں نے کسی طور خودکشی کی حماقت کی تو اس کی ذمے داری کس پر ہو گی؟'' نگرانی پر مامور عملے کے سب انسپکٹر نے دبی زبان میں ایک امکانی خطرے کا اظہار کیا۔

''فی الحال تمام تر ذمے داری میری ہے اور...... تمام چیزیں آف دی ریکارڈ ہیں۔ خودکشی کی صورت میں بھی لاشوں کو خاموشی سے دفنا دیا جائے گا۔''

سراج خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ سنتا اور دیکھتا رہا لیکن سی آئی ڈی سینٹر کی عمارت کے باہر آنے کے بعد اس نے اورنگ زیب سے پوچھ ہی لیا۔

''آپ نے فون پر کس سے رابطہ قائم کیا تھا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے......؟''

''میڈم......''

''ہاں......'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''تم نے سیون اسٹار کے حوالے سے جو کہانی بنی تھی میں اسی وقت تمہاری مصلحت کو سمجھ گیا تھا کہ تم میڈم کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہتے تھے۔''

''لیکن آپ نے اتنی جلدی ساری پلاننگ کس طرح کر لی جبکہ میں آپ کے ساتھ ساتھ تھا؟''

''میری پلاننگ کچھ اور تھی لیکن راستے میں جب

میرے کسی مخبر نے مجھے موبائل پر ایک خاص اطلاع دی تو میں نے سیون اسٹار کے کوڈ پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی سی آئی ڈی سینٹر کا رخ کیا تھا۔''

''ایک بات اب بھی وضاحت طلب ہے۔'' سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ''جب میں نے میڈم کا حوالہ نہیں دیا تھا تو پھر صرف میرے اور آپ کے حوالے پر اس نے آپ کی مختصر بات کا مطلب اور مقصد کیسے سمجھ لیا؟''

''میں نے اپنے اور تمہارے نام کے ساتھ ہی لوچن اور سی آئی ڈی سینٹر کا حوالہ بھی خاص طور پر دیا تھا۔ اس کے علاوہ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میڈم نے میری ہی گزارش پر جگا کے آدمیوں کے ذریعے آکٹوپس کو ڈسٹرب کرنے کی خاطر شعلہ اگلتی گولیوں کی آتش بازی کرائی تھی۔''

''ون منٹ۔'' سراج نے کسمسا کر تجسس آمیز انداز میں کہا۔ ''جب میڈم نے ذاتی طور پر سیون اسٹار کے حوالے سے بات کی تو پھر لوچن کس لیے پس و پیش کا مظاہرہ کر رہا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ میڈم نے ابھی اس سے تفصیل سے بات نہیں کی ہو گی۔ صرف اتنا کہا ہو گا کہ زخمی کی زبان کھلوانے کے سلسلے میں ہم سے تعاون کرے۔'' اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ''تفصیل سے میں میڈم کو کسی وقت بات سمجھا دوں گا تاکہ لوچن کی تسلی بھی ہو جائے۔ دراصل زخمی کی زبان کھلوانے کے معاملے میں، میں نے میڈم سے سرسری بات کی تھی۔ لوچن کے حوالے سے نہیں بلکہ اس خیال کے پیشِ نظر کہ ممکن ہے جگا کا کوئی ساتھی ہمارا کام آسان کر دے۔ پولیس پر اعتماد کرنے کے بجائے ایک مجرم دوسرے مجرم کی بات زیادہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے میڈم نے تمہارے ذریعے لوچن وغیرہ کو کنٹرول کرنے والا پاس ورڈ مجھ تک پہنچایا ہو...... بہرحال، مجھے یقین ہے کہ میڈم کی طرف سے اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد اس نے کسی دباؤ کے تحت لوچن کو ہماری مدد کرنے کو نہیں کہا ہے...... لوچن ہمارے لیے کئی پہلوؤں سے بے حد کارآمد ثابت ہو گا۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ آکٹوپس کا کوئی آدمی اس کے دشمن کے کہنے پر زبان کھول دے گا؟''

''نہ سہی...... پھر بھی لوچن ہمارے لیے شطرنج کے کسی گھوڑے سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔''

دونوں میں خاصی دیر تک اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی پھر سراج نے دوبارہ دبی زبان میں شکوہ کیا۔

''ایک بات یہ بھی طے ہے کہ آپ کچھ باتیں کھل کر مجھ سے نہیں کہتے...... میں نے بھی سیون اسٹار کے حوالے پر دیدہ و دانستہ میڈم کی شخصیت کو پس پردہ رکھنے کی کوشش کی تھی پھر بھی اگر آپ کو......''

''پلیز سراج۔'' اورنگ زیب نے بڑی محبت سے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ''تم اور الماس مجھے کتنے عزیز ہو اس کا اندازہ تمہیں ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے دوبارہ تکلفات سے کام نہ لینا۔ رہا کچھ باتیں راز رکھنے کا سوال تو اس کے سلسلے میں یہ واضح کر دوں کہ کسی بات کا علم اگر اچانک ہو تو اس کا مزہ بھی زیادہ آتا ہے، تجسس ختم ہو جائے تو پھر چونک کر اچھل پڑنے والا لطف نہیں آتا۔''

''رائٹ سر......'' سراج نے خوشی سے مسکرا کر اورنگ زیب کو بیٹھے ہی بیٹھے سیلوٹ کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اب چونکنے والے لمحوں ہی کا انتظار کروں گا۔''

جواب میں اورنگ زیب بھی ہنس دیا۔

شبنم کی بے ہوشی ٹوٹی تو وہ ایک دم ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے کانوں میں گونجنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز ایک خطرناک نغمہ بکھیر رہی تھی۔ اٹھنے کے بعد اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو وہ سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ کسی بڑی پک اپ نما گاڑی میں سفر کر رہی تھی، پچھلی نشست بھی بے حد آرام دہ ہونے کے باوجود اس کے نیم بیدار ذہن کو کچوکے لگانے لگی، وہ دو آدمیوں کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی، دونوں کے ہاتھوں میں آتشیں اسلحہ تھا، اگلی نشستوں پر بھی ڈرائیور کے علاوہ ایک دراز قد آدمی بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ وہ باقی ساتھیوں کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ پک اپ نما گاڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

گولیوں کی آواز بہ دستور آ رہی تھی، اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے بلند آواز میں اپنے باقی ساتھیوں کو مخاطب کیا ''جب تک میں نہ کہوں تم میں سے کوئی جوابی کارروائی کی حماقت نہ کرے۔''

''ہمیں اور کتنا صبر کرنا پڑے گا۔'' شبنم کے سیدھے ہاتھ والا سرد لہجے میں بولا۔ ''حملہ آور قریب آ گئے تو بلٹ پروف شیشے بھی سر تال ملانے لگیں گے۔''

''فکر مت کرو۔ ہمارے دوسرے ساتھی انہیں جواب دے رہے ہوں گے۔''

''مجھے یہ تو سب کچھ ٹریپ لگتا ہے۔'' پچھلی نشست سے دوسرے نے کہا۔ ''ایجنسیوں میں بھی اب دو نمبر کے

شکاری بھرتی ہونا شروع ہوگئے ہیں، بوٹی دے کر بکرا لینے والی بات ہے۔''

''ہم نے بھی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔'' سرغنہ نے کہا پھر اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''تم اگلے موڑ سے گاڑی کا رخ فیکٹری ایریا کی طرف موڑ دو۔ وہاں ہم کھل کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرسکیں گے۔''

شبنم سہمی بیٹھی ان کی باتوں کو سن رہی تھی، گفتگو سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ دوستوں کے نہیں بلکہ دوبارہ دشمنوں کے نرغے میں پھنس چکی ہے۔ اس کا ذہن اورنگ زیب کے بارے میں الجھنے لگا۔ اس نے انجکشن لگوانے سے پیشتر یہی کہا تھا کہ اب اس کا انجام بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں ہوگا جن کے لیے وہ کام کرتی رہی تھی۔ ایس پی نے جو سوال دریافت کیا تھا اس کا جواب شبنم کے پاس نہیں تھا، اس کی یہی بے بسی اس کے آڑے آگئی، بہرحال اسے اورنگ زیب کے اس اچانک بدلے ہوئے برتاؤ اور سرد ردعمل پر تعجب ہی ہوا تھا۔ یہ خیال بھی اس کی رگوں میں سنسنی پیدا کررہا تھا کہ اگر وہ دوبارہ بگ باس کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئی ہے تو ان کا کیا رویہ ہوگا؟ افضل خان کا مسئلہ اس کے لیے عذاب بن گیا تھا، اسے اورنگ زیب کی زبانی ہی علم ہوا تھا کہ وہ ہوٹل سے غائب ہوگیا ہے یا کردیا گیا ہے۔ اس کو افضل خان کے بارے میں صحیح صورتِ حال کا علم ہوتا تو وہ اورنگ زیب سے اسے پوشیدہ بھی نہ رکھتی۔ اس کے اور سراج کی تحویل میں جانے کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن اب وہی محفوظ ہاتھ اس کے لیے پھر وبالِ جان بن گئے تھے۔

وہ اپنے خیالوں سے الجھ رہی تھی جب گاڑی کسی مقام پر پہنچ کر اچانک موڑی گئی۔ کچھ ابھی تک ذہن پر طاری انجکشن کا اثر بھی برقرار تھا جس سے وہ جھکولا کھا کر سیدھے ہاتھ والے سے ٹکرا گئی۔

''خود کو سنبھالو بے بی۔'' اس نے شبنم کو بازاری انداز میں مخاطب کیا۔ ''اتنی جلد بازی نہ کرو پیچ لڑانے کی، کسی ٹھکانے پر پہنچ کر باس سے دو دو بات ہوجائے تو شاید تم ہمیں انعام میں مل جاؤ۔ پھر سکون سے ہلا گلا بھی کرلیں گے۔''

''کیا مصیبت آگئی؟'' اگلی سیٹ والے نے پلٹ کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

''باہر گولیاں چل رہی ہیں اور یہ......'' اس نے شبنم کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ ہماری گود میں سر رکھ کر آرام کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔''

''بکواس نہیں...... ہوسکتا ہے کہ اس کی بے ہوشی ابھی تک مکمل طور پر ختم نہ ہوئی ہو۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نشیلی دوا کے اثر کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے بدن کا خمار بھی گھل مل گیا ہو۔''

سرغنہ نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا لیکن موبائل کی سریلی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبر دیکھ کر ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''یس باس......'' اس نے موبائل آن کرکے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ایک منٹ پہلے ہی ہم نے فیکٹری ایریا والی کشادہ روڈ کا انتخاب کیا ہے۔ وہاں ہم آسانی سے نمٹ لیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ''تم لڑکی کو عارضی کیمپ نمبر آٹھ لے جاکر وہاں کے عملے کے حوالے کردو، میرے دوسرے افراد صورتِ حال پوری طرح کنٹرول کرچکے ہیں۔''

''رائٹ باس......''

''لڑکی کو ڈراپ کرنے کے بعد تم گاڑی سمیت ایک ہفتے کے لیے انڈر گراؤنڈ ہی رہو گے۔ اگلا حکم بعد میں دیا جائے گا۔'' دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔ سرغنہ نے موبائل آف کرکے اوپر سے ملنے والا حکم ڈرائیور کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بھی سنا دیا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی استاد۔'' شبنم کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے شخص نے ناگوار انداز میں شکایت کی۔ ''خطرے میں ہم نے ہاتھ ڈالا اور گلچھرے دوسرے اڑائیں گے۔''

''فضول باتوں سے پرہیز کرو۔'' سرغنہ نے ہونٹ چباتے ہوئے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''باس چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی بڑی بڑی سزائیں دینے کا عادی ہے۔''

پچھلی نشست پر موجود دونوں افراد نے ہونٹ سی لیے لیکن ان کے ہاتھ آزاد تھے۔ شبنم دل پر جبر کرکے ان کی گھٹیا انداز میں کی جانے والی دست درازی برداشت کرتی رہی...... کسمساتی رہی، وہ جس سچویشن سے دوچار تھی اس میں اس سے زیادہ کچھ کرگزرنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اس پُراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

سلیم انور

جلد باز

کل کا کام آج... اور آج کا کام ابھی کرنا اگرچہ ایک خوبی سہی مگر... کبھی کبھی جلد بازی بہت سے کاموں کے لیے دیر کا سبب بن جاتی ہے... اسے بھی اپنی کچھ عادتوں پر اختیار نہ تھا لیکن جب عجلت اور غفلت یکجا ہوجائیں تو صورتِ حال ایسی ہی درپیش آتی ہے... موت تعاقب نہیں کرتی بلکہ رستہ روک لیتی ہے۔

ایک ضرورت مند کی حماقتوں کا عبرتناک خمیازہ

''تم خوش کیوں نہیں ہو؟''

''میں خوش ہوں!''

''تم خوش دکھائی تو نہیں دے رہے۔''

''یہ دیکھو!'' ریڈمین نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے اپنے چہرے کی جانب اشارہ کیا۔ ''میں بالکل خوش ہوں۔''

کلارا نے ہاتھ لہراتے ہوئے اس کی مصنوعی مسکراہٹ کو رد کردیا اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''میں تمہاری رنجیدگی کی

وجہ بہ خوبی سمجھ رہی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور تم اسی ذہنی خلفشار کا شکار ہو۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' ریڈ مین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بات کیا ہے؟'' کلارا نے کریدنے کے انداز میں پوچھا۔

''مجھے آج اپنی ملازمت سے جواب مل گیا ہے۔'' ریڈ مین نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' کلارا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''ہاں!'' ریڈ مین نے سر ہلا دیا۔

''ہوا کیا تھا؟''

''کچھ نہیں!''

''کچھ نہیں؟ کچھ نہ کچھ تو ہوا ہوگا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں صبح دفتر گیا تو رکی نے کہا کہ کام صحیح نہیں چل رہا، حالات ٹھیک نہیں رہے اس لیے وہ مجھے نوکری سے نکال رہا ہے۔'' ریڈ مین نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''تم وہاں چار سال سے کام کر رہے ہو......اور تم نے ان کے لیے کبھی کوئی پرابلم کھڑی نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں، لیکن جب سے رکی نے کمپنی کا نظم ونسق سنبھالا ہے......''

''تمہیں اپنی ملازمت واپس حاصل کرنا ہوگی۔ تم نے سوچا کہ ہیلتھ انشورنس کا کیا ہوگا؟ مکان کی قسط کہاں سے ادا کریں گے؟ کار کی قسط......؟''

''بے بی، مجھے سب معلوم ہے۔''

''اگلے ماہ الزبتھ کی سالگرہ ہے۔ ہم نے اسے ڈزنی لینڈ لے جانے کا وعدہ کیا ہے۔ اب ہم اس سے کیا کہیں گے؟'' کلارا نے بے بسی سے کہا۔

''ہم اس سے یہ کہہ دیں گے کہ ہم اس سیر پر جانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' ریڈ مین نے سادگی سے کہا۔

''ہاں، وہ دو سال کی بچی یہ بات سمجھ جائے گی نا!'' کلارا نے دھم سے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ''میری ممی نے مجھے اس بارے میں پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ تم اپنی ملازمت میں مستقل مزاجی برقرار نہیں رکھ سکتے۔''

ریڈ مین کو اپنے سینے میں درد سا محسوس ہوا۔ ''یہ میری غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''واقعی؟ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ریکارڈ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا یا ہے؟'' کلارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر ریڈ مین پیر پٹختا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ لپک کر اپنے منی ٹرک میں سوار ہوا اور انجن اسٹارٹ کر کے تیز رفتاری سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

منی ٹرک کے ریڈیو سے دلکش موسیقی ابھر رہی تھی لیکن ریڈ مین کو جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا بے ہنگم شور تھا لیکن وہ اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔

اس کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی......اپنی ملازمت کی واپسی......ملازمت کا دوبارہ حصول!

✂✂✂

ریڈ مین نے اپنا منی ٹرک نیلسن کی لیکس کار کے برابر میں روک دیا اور نیچے اتر کر نیلسن کی چھوٹی سی حویلی کا جائزہ لینے لگا۔ پھر پتھریلے ڈرائیو وے پر چلتا ہوا حویلی کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا تو چند لمحوں بعد ایک پستہ قد اسپینش لیڈی نے دروازہ کھولا جس کی عمر پچپن برس کے لگ بھگ تھی۔

ریڈ مین نے سر کی جنبش سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ ''میں مسٹر نیلسن سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔''

''اسی طرف آ جائیں۔'' اس لیڈی نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ ریڈ مین کو اپنی راہنمائی میں ایک وسیع وعریض کمرے میں لے گئی جو مسٹر نیلسن کا دفتر تھا۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

مسٹر نیلسن شاہ بلوط کی ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر ریڈ مین کی طرف دیکھا اور شفقت آمیز لہجے میں بولے۔ ''آؤ، آؤ ریڈ مین۔ کیسے ہو؟''

''مسٹر نیلسن۔ میں آپ سے اپنی ملازمت کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' ریڈ مین نے براہ راست اپنے مطلب اور اپنی آمد کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر مسٹر نیلسن نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''رکی نے مجھے بتایا کہ اس نے تمہیں ملازمت سے فارغ کر دیا ہے۔''

''ویل، اس نے مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا ہے۔ آج صبح۔'' ریڈ مین نے اپنے ڈاکرز پر اپنی ہتھیلیوں کا پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ کیوں؟''

''ویل، تمہارا ماضی ایک ایشو رہا ہے۔''

''آپ کے لیے تو نہیں رہا۔ کبھی بھی نہیں رہا۔ اسی وجہ سے میں یہاں آیا ہوں۔'' ریڈ مین نے جواب دیا۔

''لیکن اب میں کمپنی کا منتظم نہیں ہوں۔'' مسٹر نیلسن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''لیکن جب سے رکی نے منتظم کا عہدہ سنبھالا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے مانند نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔ آپ ایک اچھے انسان ہیں...... ہمدرد، رحم دل۔ اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' ریڈ مین نے اپنا چہرہ ملتے ہوئے کہا۔

مسٹر نیلسن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''مجھے یہ ملازمت واپس چاہیے۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' ریڈ مین نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میری چھوٹی بیٹی......وہ ابھی دو سال کی بھی نہیں ہوئی اور...... مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ میری بیوی حمل سے ہے۔ اسے زچگی کی رخصت لینا پڑے گی اور میری ملازمت کے بغیر یہ سب مشکل ہو جائے گا۔ ہمیں ہر شے سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں گے۔''

''فکر مت کرو۔ تمہیں دوسری نوکری مل جائے گی۔'' مسٹر نیلسن نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے صرف کاروں کی سیل کا تجربہ ہے۔'' ریڈ مین نے بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آج شہر کے ہر ڈیلر کے پاس گیا تھا۔ کوئی بھی مجھے کاروبار کے لیے رقم دینے پر راضی نہیں ہوا۔ ہر کسی نے صاف انکار کر دیا۔''

''تم ایک سنگین جرم میں سزا کاٹ چکے ہو، بیٹے۔ تمہیں یہ توقع رکھنا پڑے گی کہ لوگ تم سے کاروبار کرنے میں قدرے چوکس اور ہوشیار رہیں گے۔'' مسٹر نیلسن نے کہا۔

''لیکن آپ تو چوکنا نہیں ہوئے تھے۔ میرے جیل سے رہا ہوتے ہی آپ نے بلا کسی تردد مجھے ملازمت دے دی تھی۔'' ریڈ مین نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

مسٹر نیلسن نے ایک آہ بھری اور اپنی میز پر رکھے ہوئے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بعد بولے۔ ''میں نے تمہارے ڈیڈی کا احسان چکانے کے لیے تمہیں ملازمت دی تھی۔ انہوں نے کوریا میں جنگ کے دوران میری جان بچائی تھی۔ میں ان کا احسان مند تھا۔''

ریڈ مین کا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ایکسکیوزمی؟''

''تو کیا......اب جبکہ ان کا انتقال ہو گیا ہے تو آپ ان کا احسان فراموش کر رہے ہیں؟'' ریڈ مین نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

باب رزق

میں بندگان خدا کی چند اقسام

1۔ جس نے رزق کا حصول طلب رزق میں سمجھا اسے لازم ہے کہ حلال طیب رزق کمائے مثلاً اپنے ہاتھ کی کمائی۔

2۔ بعض ان میں وہ ہیں جو قناعت میں اپنا رزق سمجھتے ہیں۔ یہ لغت میں تقسیم الٰہی پر راضی ہونا ہے اور اہل حقیقت کی اصطلاح میں یہ ہے کہ بندے کو من بھاتی غذا نہ ملے تب بھی راضی ہو۔

3۔ بعض وہ ہیں جو توکل میں رزق کا انحصار سمجھتے ہیں۔ یعنی انہیں صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا ہوتا ہے اور خلق خدا سے بالکل مایوسی۔

4۔ بعض حضرات نے اپنا رزق مجاہدہ ومشاہدہ میں سمجھ رکھا ہے چنانچہ حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا۔ میں اپنے رب کے ہاں وقت گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اس میں مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔

اقتباس: اردو ترجمہ روح البیان از فیوض الرحمٰن

مرسلہ: غلام حسن، رحمٰن پور، لاہور

''دیکھو بیٹا، اب کاروبار رکی چلا رہا ہے۔ اس کے فیصلے حتمی ہیں۔'' مسٹر نیلسن نے دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب مزید کچھ کہنا فضول ہے۔''

ریڈ مین نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''نہیں، بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ آپ مجھے صرف اس لیے ملازمت سے برخاست نہیں کر سکتے کہ میرے ڈیڈی وفات پا چکے ہیں۔ میں یہ بات بہ خوبی سمجھتا ہوں کہ آپ نے ان کے احسان کے عوض مجھے یہ ملازمت دی تھی۔ لیکن میں نے بھی آپ کی کمپنی کے لیے خون پسینا ایک کیا ہے، چاپلوسی کبھی نہیں کی۔ میں نے اپنی محنت سے اپنا مقام بنایا تھا۔ آپ کو میری ملازمت واپس کرنا ہوگی۔''

''ریڈ مین، پلیز! مجھے ایک فنکشن اٹینڈ کرنے جانا ہے۔'' مسٹر نیلسن نے گفتگو ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ریڈ مین کھڑا ہو گیا اور دانت پیسنے لگا۔ ''سر، میں اس ملازمت کو حاصل کیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔''

مسٹر نیلسن کے لیے ریڈ مین کا لب ولہجہ ناقابل برداشت ہو گیا۔ انہوں نے تیکھی نظروں سے ریڈ مین کو گھورا اور سخت لہجے میں بولے۔ ''تم......تم اسی لمحے

میرے گھر سے نکل جاؤ۔''

''میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک آپ رکی کو یہاں طلب کر کے اسے میری ملازمت واپس کرنے کا نہیں کہہ دیتے۔'' ریڈ مین نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

مسٹر نیلسن نے آگے بڑھ کر ریڈ مین کو دیوار کی طرف دھکیل دیا۔ اس اچانک دھکیلنے پر ریڈ مین کا سانس اکھڑ سا گیا اور وہ ہانپنے لگا۔

مسٹر نیلسن نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ریڈ مین کا بایاں بازو اپنی گرفت میں لیا اور اسے دروازے کی جانب کھینچنے لگے۔ اس دوران ریڈ مین اپنی اکھڑی ہوئی سانس پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے پورا زور لگاتے ہوئے اپنے قدم فرش پر جما دیے۔ ساتھ ہی اپنا بازو مسٹر نیلسن کی گرفت سے ایک جھٹکے سے چھڑا لیا اور مسٹر نیلسن کو نیچے فرش پر دھکیل دیا۔

مسٹر نیلسن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''تم حرام زادے! تمہاری یہ جرأت کہ میرے ہی گھر میں آ کر مجھے دھکے دو۔''

''آئی ایم سوری۔'' ریڈ مین کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ''میں تو صرف اپنی ملازمت......''

''تم دوبارہ جیل جا رہے ہو جو تم جیسے اقدامی قاتلوں کا ٹھکانا ہے۔'' مسٹر نیلسن نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''آئی ایم سوری۔ سنیے، میں جا رہا ہوں۔ میں پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ پلیز، ایسا مت کیجیے۔''

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' مسٹر نیلسن نے مہاگنی ٹیبل کی جانب سرکتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی لپک کر کارڈلیس فون اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''نہیں، پلیز نہیں!'' ریڈ مین نے آگے کی جانب جھپٹا مارتے ہوئے ان سے قبل فون تک پہنچنے کی کوشش کی تو اس کا دایاں شانہ مسٹر نیلسن کی گردن کے پچھلے حصے سے ٹکرا گیا۔

یہ ٹکر اتنی اچانک اور زوردار تھی کہ مسٹر نیلسن کا سر مہاگنی ٹیبل کے کنارے سے جا ٹکرایا۔ ریڈ مین بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ وہ اپنے پورے وزن کے ساتھ مسٹر نیلسن پر گر پڑا۔ مسٹر نیلسن کا سر ابھی تک میز کے نوکدار کنارے پر تھا۔ ریڈ مین کا وزن پڑتے ہی میز کا کنارہ مسٹر نیلسن کے سر میں دھنس سا گیا۔

پھر وہ دونوں فرش پر لڑھک گئے۔

ریڈ مین نے خود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کارڈلیس فون اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

تب اس کی نگاہ مسٹر نیلسن پر پڑی تو وہ گھبرا سا گیا۔

مسٹر نیلسن کے جسم پر اینٹھن کی سی کیفیت طاری تھی اور ان کی کنپٹی کے پاس ایک زخم سے خون رس رہا تھا۔ ''مسٹر نیلسن، مسٹر نیلسن، آپ ٹھیک تو ہیں نا......''

اتنے میں ایک کان پھاڑ دینے والی چیخ نے ریڈ مین کا دل دہلا دیا۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔ دروازے کے پاس وہی اسپینش ملازمہ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے چلا رہی تھی۔ ساتھ ہی اپنے سینے پر ہتھڑ مار رہی تھی۔

ریڈ مین تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس ملازمہ کے پاس سے دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ اپنے منی ٹرک کی جانب تھا۔

✂✂✂

جب ریڈ مین نے اپنا ٹرک اپنے ڈرائیو وے میں داخل کیا تو کلارا دوڑتی ہوئی اس کے ٹرک کے پاس آ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے ٹرک کا دروازہ کھولا اور خوشی کے عالم میں چیختے ہوئے بولی۔ ''میں نے کام کر دکھایا۔ میں نے کام کر دکھایا۔''

ریڈ مین نے کلارا کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس کی نگاہیں سیدھ میں دور کہیں جمی ہوئی تھیں۔

''بے بی، اٹ از او کے!'' کلارا نے کہا۔ ''غصہ مت ہو، میں تمہاری کمپنی گئی تھی اور میں نے رکی سے بات کی ہے۔ وہ ہماری مشکلات سمجھ گیا ہے۔ وہ تمہاری ملازمت تمہیں واپس دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔'' کلارا خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

اتنے میں دور سے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی جو بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی۔

تب ریڈ مین نے گردن گھما کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

کلارا کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سے خوشی کے تاثرات کی جگہ اب الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے ریڈ مین کے ہاتھ میں دبے ہوئے کارڈلیس فون کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔ ''یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا؟''

ریڈ مین ہونقوں کے مانند کبھی اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے کارڈلیس فون کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اس پولیس موبائل کو جو سائرن بجاتی ہوئی اس کے منی ٹرک کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

کہتے ہیں کہ کسی کو دھوکا دینا انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر کبھی کبھی دایاں ہاتھ ایسا کام کر جاتا ہے کہ زندگی کے خریداروں کو اپنی سانسوں کی گنتی تک یاد نہیں رہتی۔ خواہ ان کا حساب کتاب کتنا ہی پختہ ہو... بوکھلاہٹ میں انہیں ایک اور ایک تین ہی نظر آتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان اعتماد کے احساسات کو اجاگر کرتی تحریر

''گڈ مارننگ!'' باب بینز نے کہا۔ ''میں تمہاری انشورنس کمپنی کی طرف سے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل رات تم سے کار کا کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟''

''درست ہے۔'' مسٹر ڈیل نے باب کا ملاقاتی کارڈ دیکھتے ہوئے جواب دیا جس سے اسے انشورنس کمپنی کا کلیم انسپکٹر ظاہر کیا گیا تھا۔

''میں اس حادثے کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہارا تحریری بیان لیا جا سکے۔''

''اس سلسلے میں کوئی خاص بات بیان کرنے کے قابل تو ہے نہیں جیسا کہ میں نے گزشتہ رات فون پر اپنے ایجنٹ کو بتا بھی دیا تھا۔'' مسٹر ڈیل نے کہا۔ ''ہوا یہ کہ میری کار ایک دوسری کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا گئی جو کہ سگنل کی سرخ روشنی دیکھ کر اچانک رک گئی تھی۔ بہر حال کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔''

''کیا کار کے بریک فیل ہو گئے تھے؟'' باب نے سوال کیا۔

''یہ بات نہیں تھی۔'' مسٹر ڈیل نے ایک خفت آمیز ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں ایک شبینہ مارکیٹ سے کچھ ترکاری وغیرہ خریدنے گیا تھا اور ترکاریوں کا تھیلا میرے برابر سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔ کار کے جھٹکوں سے وہ اِدھر اُدھر ہلنے لگا، چونکہ اس میں انڈے بھی رکھے ہوئے تھے اس لیے میں نے ایک لمحے کے لیے سامنے سے نظریں ہٹا کر ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور پھر جو نگاہ اٹھائی تو وہ کار سگنل کی سرخ روشنی دیکھ کر اچانک رک گئی۔ میں نے فوراً بریک دبا دیے۔ لیکن کار رکتے رکتے بھی اگلی کار سے ٹکرا گئی۔ وہ مسٹر سلیوان کی کار تھی مگر اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔''

''اور تمہاری کار پر کیا گزری؟''

''بہت ہی تھوڑا نقصان ہوا۔'' مسٹر ڈیل نے جواب دیا۔ ''ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی۔''

''تمہیں تو چوٹ نہیں آئی؟''

''نہیں۔''

''کیا تم اپنی کار میں اکیلے تھے؟''

''ہاں۔''

''اور دوسری کار میں کتنے افراد تھے؟''

''رات کا وقت تھا۔ کار میں اندھیرا تھا اس لیے میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا لیکن بعد میں جب ہم دونوں نے ایک موڑ پر اپنی کاریں روکیں اور مسٹر سلیوان اپنی کار سے اتر کر میرے پاس آئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ میں چونکہ اپنی کار سے اترا بھی نہیں تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنی کار میں اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔''

باب بینر نے مسٹر ڈیل کی کار کا معائنہ کیا۔ ان سے ضروری تفصیلات پر مبنی تحریری بیان پر دستخط کرائے اور پھر اپنی کار میں بیٹھ کر شہر کے دوسرے حصے کی طرف چل دیا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ باب اطمینان سے کار چلاتے ہوئے میکال بلوارڈ کے چوراہے تک پہنچا۔ یہ ایک کافی چوڑی شاہراہ تھی جس پر کافی ٹریفک جاری تھا۔ وہ چوراہے پر سرخ روشنی دیکھ کر رکا تو اسے اپنی کار کے بریکوں کا خیال آیا۔ بریک کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے اور باب نے انہیں جلد ہی مرمت کرانے کا فیصلہ کیا۔ جس وقت وہ ٹریفک کم ہونے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ سڑک پار کر سکے تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ سلیوان کا ریسٹورنٹ سڑک کے دوسری جانب تقریباً دو بلاک آگے واقع ہے۔ باب کار سے اتر کر ریسٹورنٹ کے آفس میں داخل ہوا تو اس نے ایک شخص کو صبح کا اخبار پڑھتے دیکھا۔

''مسٹر سلیوان؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا ہی نام ہے۔ آؤ اندر آجاؤ۔''

مسٹر سلیوان نے باب کا ملاقاتی کارڈ دیکھا اور پھر اپنی جیب سے دو کاغذ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

''آج صبح دفتر آتے ہوئے میں دو گیراجوں پر رکا تھا اور ان سے کار کی مرمت کے سلسلے میں تخمینہ طلب کیا تھا۔ یہ ان دونوں گیراجوں کے الگ الگ تخمینے ہیں۔''

دفتر میں آتے ہوئے باب بینر نے باہر ایک کار کھڑی دیکھی تھی جس کا پچھلا حصہ ٹوٹا ہوا تھا اور اندازہ لگایا تھا کہ وہ سلیوان کی کار ہی ہو سکتی ہے لیکن کوئی جواب دینے سے پہلے اس نے غور سے سلیوان کی طرف دیکھا۔ سلیوان کی عمر بیس پچیس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھا اور بہت ہوشیار بھی لگ رہا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے تھے جو حادثے کے دوسرے دن ہی صبح کو ضروری مرمت کے دو دو تخمینوں کے ساتھ کلیم انسپکٹر کا استقبال کرتے ہوں۔

باب کو اس خوب صورت نوجوان کے لیے اپنے دل میں رشک و حسد کے جذبات محسوس ہوئے۔ وہ تقریباً اس کا ہم عمر تھا لیکن اتنی چھوٹی عمر میں دو بڑے ریسٹورنٹ کا مالک بن چکا تھا۔ ایک یہ اور دوسرا شہر کے دوسرے حصے میں سپر کلب کے نام سے واقع تھا۔ اس کا لباس بھی قیمتی تھا اور بہ ظاہر وہ کافی دولت مند بھی نظر آتا تھا جس کا اندازہ اس کے دفتر کی سجاوٹ دیکھ کر بہ آسانی کیا جا سکتا تھا۔ باب نے اس کے دفتر کی تعریف بھی کی جس کے جواب میں سلیوان نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا ڈیزائن خود اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ پہلے یہ جگہ مال بردار ٹرکوں کے اسٹاپ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس نے کافی رقم خرچ کر کے یہ جگہ خریدی اور اب اسے اس ریسٹورنٹ سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔

باب نے یہ سب کچھ سن کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے سوچا کہ کچھ لوگ پیدا ہی اچھی قسمت لے کر ہوتے ہیں۔ اس نے مرمت کے دونوں تخمینوں کو اٹھا کر دیکھا۔

''اگر یہ دونوں تمہارے نزدیک کافی نہ ہوں تو میں ایک دو اور بھی حاصل کر سکتا ہوں۔'' سلیوان نے کہا۔

باب نے دونوں تخمینوں کو غور سے دیکھا۔ وہ ان تخمینوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے جو کار کے پچھلے حصے کی مرمت کے سلسلے میں اس کی نظروں سے پہلے گزر چکے تھے۔ ان میں سے کم رقم والے تخمینے کی رقم تین سو سترہ ڈالر اور تینتالیس سینٹ تھی۔

''تم نے اپنی کار کی انشورنس تو کرالی ہو گی؟'' اس نے پوچھا۔

''یقیناً اور اس میں کار سے متعلق ہر قسم کے چھوٹے بڑے حادثے کی ضمانت دی گئی ہے۔'' سلیوان نے جواب دیا اور اس کے بعد اپنی انشورنس کمپنی کا نام بھی بتا دیا۔

''کیا پولیس نے حادثے کی تحقیقات کی تھی؟'' باب نے پوچھا۔

''پولیس کو اطلاع دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔'' سلیوان نے کہا۔ ''مسٹر ڈیل اور میں نے بات کر لی تھی اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ غلطی اس کی تھی۔''

''کیا تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ آئی تھی؟''

''بالکل نہیں۔''

''کیا کار میں کچھ اور لوگ بھی تھے؟'' باب نے پوچھا۔

سلیوان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''گویا کار میں تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں تھا؟''

''نہیں۔ میں اکیلا تھا۔''

''تخمینے ٹھیک ہی معلوم ہوتے ہیں۔'' باب نے کہا۔ ''اور ہم کم رقم والا تخمینہ منظور کر لیں گے۔ اب اگر تم حادثے کے حقائق کے بارے میں اپنا ایک مختصر سا تحریری بیان لکھ کر دے دو اور یہ تصدیق کر دو کہ تمہیں کوئی چوٹ نہیں آئی اور یہ کہ تم اس وقت کار میں تنہا تھے تو میں یہ کلیم ابھی طے کر سکتا ہوں۔''

''جو تم چاہتے ہو وہ میں کر دوں گا۔''

''تمہارے نام کا پہلا جز کیا ہے؟''

''ایل۔ الفریڈ۔ ای۔''

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' باب نے پوچھا۔ سلیوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

باب نے بیان تحریر کر کے سلیوان کو دے دیا۔ سلیوان اسے پڑھ رہا تھا کہ باب نے پوچھا۔

''میں یہ دونوں تخمینے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تین سو سترہ ڈالر تینتالیس سینٹ کا چیک کل تمہیں بذریعۂ ڈاک موصول ہو جائے گا۔''

''بہت خوب۔'' سلیوان نے بیان پر اپنے دستخط کر کے باب بینر کی طرف بڑھا دیا۔ ''تم لوگ آج کل کار کے پچھلے حصوں کے حادثوں کے متعلق بہت تیزی سے کام کرنے لگے ہو۔''

''عام طور پر اس قسم کے حادثے ایسے ہوتے ہیں جن میں ہمیں ضروری مرمت کی رقم دینا ہی پڑتی ہے اس لیے ہم یہ معاملہ جلد سے جلد طے کرنا پسند کرتے ہیں۔''

''غالباً اس لیے کہ کہیں کوئی چوٹ وغیرہ پہنچنے کے سلسلے میں مقدمہ نہ دائر کر دے۔''

''جب کسی کار کو پیچھے سے ٹکر لگتی ہے تو عموماً لوگوں کے چوٹیں آجاتی ہیں اور کبھی کبھی یہ چوٹیں کافی خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔''

''ہاں میں نے بھی اس بارے میں سنا ہے کبھی کبھی کمر میں چک آجاتی ہے یا ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔'' سلیوان نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں دن رات مصروف رہنا پڑتا ہو گا۔''

''نہیں میں صرف دن میں کام کرتا ہوں۔'' باب نے جواب دیا۔ ''رات کو میں نے قانون پڑھنے کے لیے ایک کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔''

''پھر تو کافی مصروف رہنا پڑتا ہو گا؟''

باب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سلیوان نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت کا بہت ہی کم تر اظہار تھا۔ کچھ لوگ ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں اور اکثر حیران ہو کر سوچتے ہیں کہ آیا ان کی یہ مصروفیت کچھ فائدہ مند بھی ہے یا نہیں۔ ان کی بیویاں بھی کام کرتی ہیں، خود وہ بھی دن رات مصروف رہتے ہیں لیکن اخراجات ہیں کہ کسی طرح قابو میں نہیں آتے۔ نیا فرنیچر، چھت یا دیواروں کے لیے نیا پینٹ۔ مختلف قسم کے ٹیکس، مختلف گھریلو چیزوں کا ٹوٹنا اور پھر ان کی مرمت یا نیا خریدا جانا۔ آج یہ خرچ۔ کل وہ خرچ۔ اخراجات کا ایک سیلاب ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

''ہاں مصروف تو رہنا پڑتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ مصروفیت مجھے مشکلات سے بچاتی رہتی ہے۔''

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' سلیوان نے پوچھا۔

''بلاشبہ۔'' باب نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ سلیوان بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''آج صبح آنے کا شکریہ۔'' وہ بولا۔ ''کار کی مرمت ہونے کے بعد میرا ارادہ پام اسپرنگ جانے کا ہے۔ میں دو ہفتوں کی چھٹی کر رہا ہوں جس میں گولف کھیلنے کا پروگرام ہے۔''

''مجھے امید ہے تمہاری چھٹیاں خوشگوار گزریں گی۔''
باب نے جواب دیا اور کوشش کی کہ اس کے لہجے سے سلیوان کے لیے دل میں چھپی ہوئی نفرت ظاہر نہ ہو جائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص دو ہفتے تک گولف کھیلتا رہے گا اور میں دو دن کی چھٹی لے کر کسی سمندر کے ساحل تک نہیں جاسکتا۔

جس وقت باب ویگن وہیل ریسٹورنٹ کے پارکنگ پلاٹ سے اپنی کار نکال کر واپس جا رہا تھا تو اس کے جذبات وخیالات بے حد افسردہ اور مایوس کن تھے۔ سلیوان سے ملاقات کر کے اسے اپنی محرومی کا احساس کچھ اور زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ جس وقت کوئی شخص، باب جیسا، سلیوان جیسے آدمی سے اپنا مقابلہ کرتا ہے تو اسے تقدیر سے ناانصافی اور جانبداری کی شکایت ہونے لگتی ہے اور خاص طور سے آج باب کو اپنی محرومیوں کا احساس اس لیے اور بھی زیادہ ہو رہا تھا کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ آج کی چھٹی لے کر اپنی بیوی للین کو ساحل سمندر پر لے جاتا اور گھر کا کھانا کھانے کے بجائے وہ کسی ساحلی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے بجائے ہوگا یہ کہ زیادہ وہ کسی سستے سے ہوٹل میں کھانا کھالیں گے اور پھر ساتھ ساتھ کوئی پکچر وغیرہ دیکھنے چلے جائیں گے۔ بہرحال باب بینر جب اس سہ پہر کو اپنے گھر پہنچا تو اس نے شادی کی سالگرہ کی مبارکباد کا ایک پچیس سینٹ والا کارڈ خرید لیا تھا اور ساتھ ہی پھولوں کا ایک......گلدستہ بھی۔

اسے گھر پر اپنی بیوی کی کار کھڑی دیکھ کر تعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ آج وہ اپنی ملازمت سے اتنی جلدی کیسے آگئی۔ اس نے للین کو ہاؤس کوٹ پہنے بیرونی کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔
''میں تو سوچ رہی تھی کہ آج شاید تم گھر نہیں پہنچو گے۔'' وہ ناگواری سے بولی۔
''بات کیا ہے؟''
''لنچ کے فوراً بعد میرے سر میں شدید درد ہونے لگا۔'' للین نے بتایا۔ ''میں نے اسپرین کھائی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ درد اتنا زیادہ ہے کہ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔''
''تم نے ڈاکٹر کو دکھایا؟''
''نہیں، مجھے گھر آئے چند منٹ ہی گزرے ہیں۔'' للین بولی۔ ''اس کے علاوہ میرے کندھوں میں بھی درد ہو رہا ہے اور گردن تو جیسے اکڑی جا رہی ہے۔''
''اوہ......نہیں......کہیں تمہیں پولیو کا مرض تو لاحق نہیں ہو رہا ہے؟'' باب نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں۔ یہ پولیو نہیں ہے۔''
''تمہیں کیسے معلوم؟''
''دراصل میری کمر میں چک آگئی ہے۔''
''کیا؟''
''بہتر ہے، میں تمہیں بتا ہی دوں۔ کل رات کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ کسی نے کار کو پیچھے سے ٹکر مار دی تھی۔''
باب کو یاد نہیں آیا کہ اس کی بیوی نے کل رات اس سے کہیں جانے کا ذکر کیا ہو۔
''میں ابھی تمہاری کار دیکھتا ہوا آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے تو ایکسیڈنٹ کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔''
''میں اس وقت اپنی کار میں نہیں تھی۔''
باب حیرت سے اپنی بیوی کو گھورتا رہ گیا۔
''وہ آدمی ایک مدت سے میرے سر تھا کہ اس کے ساتھ باہر چلوں اور اس کے ساتھ ایک ڈرنک پیوں۔ چنانچہ گزشتہ رات میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔'' للین نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوئی۔ کل پہلا اتفاق تھا کہ میں کسی کے ساتھ باہر گئی تھی اور ہم نے کوئی ڈرنک وغیرہ بھی نہیں پی تھی، ہم ابھی چلے ہی تھے کہ یہ حادثہ ہو گیا۔''
''مگر تم نے ایسا کیوں کیا للین؟''
''کیونکہ میں اب اس بوریت کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں ہر شام گھر پر تنہا رہتے رہتے بیزار ہو گئی تھی۔''
باب نے پھولوں کا گلدستہ صوفے پر رکھ دیا۔
''اور تمہیں اس پر ناک بھوں چڑھانے کا حق اس لیے نہیں پہنچتا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم بھی کئی راتوں کو کلاس میں موجود ہونے کے بجائے کسی اور کے ساتھ جاتے رہے ہو۔'' للین نے کہا۔
یہ سچ نہیں تھا۔ باب کبھی کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں گیا تھا۔
''ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' آخر باب نے کہا۔ ''ابھی تو میں ڈاکٹر کو فون کر کے ملاقات کا وقت لیتا ہوں۔'' لیکن یہ کہنے کے ساتھ ہی اسے ڈاکٹر کے بل کا خیال آگیا۔
''کیا اس شخص نے اپنی کار کی انشورنس کرا لی تھی؟'' اس نے پوچھا۔
''مجھے یقین ہے کہ ایل نے انشورنس ضرور کرا لی ہوگی۔''
''ایل!'' باب نے پلکیں جھپکائیں۔ ''اس کے نام کا

آخری جز کیا ہے؟"

"سلیوان۔ وہ ویگن وہیل اور سپر کلب نامی دو بڑے ریسٹورنٹ کا مالک ہے۔"

"اور یہ حادثہ کیسے ہوا تھا؟"

للین نے اسے بتا دیا اور باب کو یقین ہوگیا کہ یہ وہی ایکسیڈنٹ ہے جس کی تحقیقات وہ آج صبح کر رہا تھا۔ سلیوان نے تحریری بیان دیا تھا کہ اس کے ساتھ کار میں کوئی نہیں تھا۔ لیکن اب یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔

باب فون کرنے گیا تو وہ یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ للین نے اسے کیا کچھ بتایا ہے۔ حیرت کا پہلا ردعمل اب غصے میں تبدیل ہوگیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ایک طرف وہ ملازمت کر رہا ہے، شام کو قانون پڑھنے کالج بھی جاتا ہے تاکہ بی اے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے گھریلو معیار زندگی میں خوشگوار تبدیلی لائے لیکن دوسری جانب للین نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اور معاملے کا سب سے زیادہ توہین آمیز پہلو یہ تھا کہ وہ سلیوان کے ساتھ اس شام کو گئی تھی جبکہ دوسرا دن ان کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ایک لمحے کے لیے باب کے دل میں آیا کہ وہ اپنے کمرے میں واپس جائے اور اپنے ہاتھوں سے للین کا گلا گھونٹ دے۔

لیکن اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اس معاملے میں للین کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو وہ سلیوان ہے پھر جب اسے صبح سلیوان سے اپنی گفتگو کا خیال آیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اس وقت سلیوان کس طرح اسے احمق بنا رہا تھا، تو باب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کل واپس جا کر سلیوان سے پھر بات کرے گا۔

دوسری صبح کو وہ سلیوان کے پاس پہنچا تو سلیوان نے اسے کچھ حیرت سے دیکھا۔ "مجھے تم سے دوبارہ ملاقات کرنے کی امید نہیں تھی۔" اس نے کہا۔

"للین نے مجھے حادثے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔" باب نے کہا۔ "وہ اس وقت تمہارے ساتھ کار میں تھی۔"

سلیوان چونک گیا۔ اس کی آنکھوں میں گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں ہوئے۔ "دیکھو دوست۔" وہ بولا۔ "میں نے اسے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ ان تمام راتوں کو میرے ساتھ کلب جائے۔"

سلیوان اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہتا رہا مگر غصے اور نفرت کی شدت نے باب کو اس کی پوری گفتگو نہیں سننے دی۔ تو یہ پہلا موقع نہیں تھا، للین نے بھی اس سے جھوٹ بولا تھا۔ یہ دونوں ہی اوّل درجے کے دروغ گو تھے۔

"ایمان داری کی بات یہ ہے کہ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ تم سے اس بارے میں کچھ کہے گی۔" سلیوان کہہ رہا تھا۔

بارجرم دفعتاً سلیوان سے ہٹ کر للین پر آگیا تھا۔

"اس کی کمر میں چک آگئی ہے۔" باب نے آہستگی سے کہا۔ "میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اس نے اسے چیک کرلیا ہے۔ للین کافی خوفزدہ تھی مگر وہ ٹھیک ہوجائے گی لیکن میں اس کے علاج وغیرہ کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا جبکہ تمہاری میڈیکل تنخواہ سے ڈاکٹر کا بل بہ آسانی ادا کیا جاسکتا ہے۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا۔" سلیوان نے کہا۔ "اور میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔"

اس نے جلدی جلدی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح اس نے ایک دولت مند لڑکی سے شادی کی اور کس طرح اس لڑکی نے اپنے سرمائے سے اسے دو ریسٹورنٹ کھولنے میں مدد دی۔ پھر سلیوان نے کہا کہ وہ لڑکی پہلے ہی اسے دوسری لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھ چکی تھی اور آخری بار اس نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگر آئندہ اس نے سلیوان کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا تو اسے طلاق دیدے گی۔

"چنانچہ اگر میں تمہاری بیوی کے ساتھ باہر جانے کا اعتراف کرلوں تو یہ بات یہیں ختم نہیں ہوجائے گی بلکہ آگے اور پھیلے گی کیونکہ میں تمہاری بیوی کو جانتا ہوں، وہ مجھ پر مقدمہ چلائے بغیر نہیں رہے گی اور اگر اس کی بھنک بھی میری بیوی کے کانوں تک پہنچے گی تو وہ مجھے فوراً طلاق دیدے گی اور میں یہ عیش و آرام کی زندگی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے بل وغیرہ کی ادائیگی کے چکر میں پڑنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں تم سے ابھی فیصلہ کن بات کرلوں۔ پانچ سو ڈالرز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس رقم سے علاج کے اخراجات پورے ہوجائیں گے؟"

"نہیں سلیوان پانچ سو سے کام نہیں چلے گا۔" باب نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں کم از کم دس دینا ہوں گے، دس ہزار۔"

"دس ہزار ڈالرز! کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟" سلیوان نے تیزی سے کہا۔ "تم خود ابھی کہہ چکے ہو کہ چوٹ زیادہ......"

"اور تم بھی کہہ چکے ہو کہ تم یہ عیش و آرام کی زندگی نہیں چھوڑ سکتے۔" باب نے بات کاٹی۔ "مجھے پورے دس ہزار

ڈالرز چاہئیں سلیوان۔ نقد دس ہزار اور وہ بھی آج رات تک۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

سلیوان نے کچھ دیر تک غور کیا۔ "اچھی بات ہے۔" آخر اس نے جواب دیا۔ "مجھے رقم کی فراہمی کے لیے پورے دن کی ضرورت ہے چونکہ میں یہ بات اپنی بیوی کے علم میں لانا نہیں چاہتا اس لیے مجھے مختلف ذرائع سے یہ رقم جمع کرنا پڑے گی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کرلوں گا۔ تم رات کے ٹھیک دو بجے مجھ سے اسی جگہ آکر رقم لے جانا۔"

اس رات باب کالج میں دیے جانے والے لیکچرز پر بھی خاطر خواہ توجہ نہ دے سکا۔ اسے بار بار ان دس ہزار ڈالرز کا خیال آرہا تھا جو عنقریب اسے ملنے والے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس رقم سے اس کی زندگی میں بھی کچھ آسودگی آئے گی لیکن وہ للین کو اس رقم میں سے ایک سینٹ بھی نہیں دے گا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ رقم پانے کے بعد وہ جو کچھ ترقی کرے گا اس میں للین کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ طے کرچکا تھا کہ اسے للین سے علیحدگی اختیار کرنا ہے، مگر کس طرح؟ یہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اس بارے میں کسی جلدی کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اب آئندہ سے، اپنی شادی شدہ زندگی میں پہلی بار...... وہ سچ مچ اپنے گھر کا مالک اور آقا ہوگا اور پھر یہ کہ آئندہ کے لیے بھی اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سلیوان سے اپنی زبان بند رکھنے کا مزید معاوضہ وصول کرتا رہے۔

رات کے ڈیڑھ بجے باب اس چھوٹے سے کافی ہاؤس سے باہر نکلا جہاں وہ اور اس کے کالج کے دوست اکثر، کافی پینے آجاتے تھے۔ وہ بہت آہستہ رفتار سے کار چلاتے ہوئے میکال بلوارڈ کی طرف روانہ ہوا جہاں سلیوان نے اپنے ریسٹورنٹ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ ایلن ایونیو سے گزرتے ہوئے جو کہ رات کے اس حصے میں بے حد سنسان نظر آرہی تھی، اسے ایک چوراہے پر سگنل کی سرخ بتی دیکھ کر رکنا پڑا۔ اس کی نظر یونہی بلا ارادہ اپنی کار کے عقبی شیشے پر پڑی۔ اس نے اپنی کار کے پیچھے ایک کار کو آتے دیکھا۔ اس کار کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ باب نے اظہار ناراضگی کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کتنے لوگ اپنی کاریں مختلف خرابیاں ہونے کے باوجود چلاتے رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی اس وقت ایسے ہی لوگوں کی صف میں شامل تھا کیونکہ اس کی کار کے بریک بھی خراب اور مرمت طلب تھے۔ اچانک اس نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ پیچھے آنے والی کار نے اس کے پچھلے بمپر پر ٹکر ماری تھی۔

اور کسی چھٹی حس نے باب کو خبردار کیا کہ اسے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے لیکن نہ وہ آگے جاسکتا تھا اور نہ اپنے داہنے ہاتھ کی طرف مڑ سکتا تھا۔ اس کے بائیں جانب ایک ٹرک مع ٹریلر کے آرہا تھا اور اس پر لوہے کے بھاری پائپ لدے ہوئے تھے۔ ٹرک ڈرائیور بھی مقررہ رفتار سے کہیں زیادہ تیزی سے ٹرک ڈرائیو کر رہا تھا۔

خوف سے باب کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس نے اپنی کار کو آگے بڑھتے محسوس کیا۔ اس نے دونوں پیر پوری طاقت سے بریک پر رکھ دیے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بریک لگے ہونے کے باوجود کار پھسلتی ہوئی آگے چوراہے کی طرف جا رہی تھی۔ ٹھیک اس جگہ جہاں سے ٹرک گزرنے والا تھا۔

باب نے کار کو گیئر میں ڈالتے ہوئے ایک دم ایکسی لریٹر دبا دیا۔ اس نے ٹرک کا تیز ہارن سنا اور ساتھ ہی ٹرک کی ہیڈ لائٹس کی روشنی اس کی کار پر پڑی۔ ٹرک تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔ اگرچہ سڑک پر اس کے ٹائروں کی چیخیں یہ بتا رہی تھیں کہ ٹرک ڈرائیور بھی بریک لگانے کی پوری کوشش کر رہا ہے مگر اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ رکتے رکتے بھی ٹکرانے کا پورا خطرہ موجود تھا۔

لیکن کسی نہ کسی طرح باب عین وقت پر اپنی کار کو ٹرک کے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا اور جیسے ہی وہ چوراہے سے آگے نکلا اس نے اپنے پیچھے ایک زبردست ٹکر کی آواز سنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹرک اپنے بھاری پائپوں سمیت دوسری کار میں گھستا چلا گیا۔

باب جلدی سے اپنی کار سے نکلا اور ڈگمگاتے قدموں سے تقریباً بھاگتے ہوئے چوراہے پر واپس آیا۔ ٹرک ڈرائیور بھی اس وقت اپنے ٹرک سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر خون کی ایک باریک لکیر کسی چھوٹے سے زخم کا پتا دے رہی تھی۔ اس ایک زخم کے علاوہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کچلی ہوئی کار کی طرف بڑھے اور باب ایک طویل وقفے تک خاموش کھڑا اس نئی کار کو دیکھتا رہا جسے اس نے آج صبح سلیوان کے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا دیکھا تھا وہ بلا شبہ سلیوان کی کار تھی جس کے اندر دو لاشیں موجود تھیں۔ باب نے دونوں کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ ان میں سے ایک سلیوان تھا اور دوسری لاش...... اس کی بیوی للین کی تھی۔

دلوں میں کینہ اور عداوت براجمان ہو تو رائی کو پہاڑ بنتے دیر کتنی لگتی ہے اور جن رشتوں کو محبت کا سائبان میسر نہ ہو، ان کی جڑیں دھوپ کی تمازت میں جل جاتی ہیں۔ جو لوگ جھوٹی انا کا پرچار کرتے ہیں دراصل وہ رشتوں کا بیوپار کرتے ہیں... اور بالآخر خود کو عقلِ کُل سمجھتے ہوئے بے وقوفی کا نمونہ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسا ہی بیوپاری تھا جس نے ہر رشتے کا مول تو کیا مگر قدرت کی مہربانی سے کوئی قیمت وصول نہ کرسکا۔ جب پیش منظر میں اتر کر ملک صفدر حیات نے پس منظر کو کھنگالا تو تمام حقیقتیں برعکس نکلیں... گویا اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔

پیش منظر

ملک صفدر حیات

پاکیزہ حوالوں میں بداعمالیوں کی عبرت اثر مثالیں

کسی اللہ کے بندے نے کیا خوب کہا ہے...... کہ رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے، یہ الگ بات کہ بعض اوقات پہاڑ کھودنے پر ایک چوہا برآمد ہوتا ہے اور کبھی وہ بھی نہیں۔ بہرحال، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بڑی بن جاتی ہیں۔ زیرِ نظر کہانی بھی اسی فلسفے کے گرد گھومتی ہے۔

وہ ماہِ اپریل کے وسطی ایام تھے۔ موسم گرما نے اپنے پر کھول لیے تھے۔ ابھی فضا میں وہ حدت اور شدت تو پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی بلاجھجک بڑے اعتماد سے کہا جاسکتا تھا کہ گرمیاں شروع ہوچکی تھیں۔

میں ان دنوں ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیرآباد کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں حسبِ معمول تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

''ملک صاحب، ادھر سوہدرہ میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے......!''

موضع سوہدرہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا بلکہ یہ تھانا سوہدرہ ہی سے زیادہ قریب تھا۔ میں تھانے سے نکل کر دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اطلاع لے کر آنے والے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''تجمل! تم کس کے قتل کی بات کررہے ہو؟''

''جناب! اس شخص کا نام تو عبدالغفار ہے لیکن علاقے کے لوگ اسے ''ماموں'' کہتے ہیں۔'' تجمل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''قصبے کے مین بازار میں ماموں کی تکے کباب کی دکان ہے...... آپ اسے جگت ماموں سمجھ لیں۔''

''سمجھ لیا......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اب آگے بتاؤ کہ تمہیں یہ خبر کس نے دی اور...... ماموں کا قاتل کون ہے؟''

''قاتل کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا ملک صاحب۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''ادھر جائے وقوعہ سے دو بندے آئے ہیں، اس واقعے کی اطلاع لے کر۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ آپ کا حکم ہو تو انہیں اندر بلالوں......؟''

''کسی بھی مثبت اور نیک کام کے لیے میری اجازت یا حکم کی ضرورت نہیں ہے تجمل!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ان بندوں کو فوراً میرے پاس لے آؤ۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

ایک منٹ کے بعد وہ دوبارہ میرے سامنے موجود تھا اور اس بار تجمل کے ساتھ دو افراد بھی تھے۔ میں نے ان کے نام اور کام دریافت کیے پھر پوچھ گچھ شروع کردی۔

ایک شخص کا نام مشتاق احمد تھا۔ وہ بھاری بھرکم اور پستہ قامت تھا۔ اس نے اپنے ڈیل ڈول کی مناسبت ہی سے خاصی صحت مند مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ وہ ماموں کی تکا کباب والی دکان کے ساتھ گنڈیری کی ریڑھی (ٹھیلا) لگاتا تھا جبکہ دوسرے بندے کا نام جنید خان تھا۔ وہ درمیانہ قد کاٹھ کا مالک تھا اور یہ بھی ماموں کی دکان کے قریب ہی پھل فروخت کیا کرتا تھا۔

''ہاں بھئی......'' میں نے باری باری مشتاق اور جنید کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ماموں کو کس نے

قتل کیا ہے اور کیوں......؟''

''تھانے دار صاحب! یہ تو کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ شخص کون تھا جس نے طیش میں آکر چھری سے ماموں پر حملہ کر دیا تھا۔'' جنید نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔ ''اور جہاں تک ''کیوں'' کا سوال ہے تو میں نے خود دیکھا تھا کہ اس واقعے سے پہلے ماموں اور اس شخص میں خاصی بحث و تکرار ہو رہی تھی۔''

''یہ بات تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو کہ کسی کو بھی نہیں پتا کہ قاتل کون شخص تھا؟'' میں نے ایک بار پھر سوالیہ نظر سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ''کوئی تو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا......!''

''یہی تو مسئلہ ہے تھانے دار صاحب!'' مشتاق پریشانی سے بولا۔ ''وہ سب کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اور جنید نے اسے سوہدرہ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔'' میں نے غیر مطمئن انداز میں کہا۔ ''ایک ایسا شخص جسے موضع سوہدرہ میں کوئی بھی نہیں جانتا، اس کی ماموں کباب والے سے بھلا کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''تھانے دار صاحب!'' جنید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، یہ افسوس ناک واقعہ کسی دشمنی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہاں جو کچھ پیش آیا، وہ وقتی اشتعال کے سبب تھا۔ ماموں اور اس اجنبی شخص میں کسی بات پر ''تو تو میں میں'' ہوئی اور اس شخص نے ماموں کی چھری اٹھا کر اسی پر آزما ڈالی......''

''تم لوگ چلو میرے ساتھ۔'' میں نے ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہا۔ ''جائے وقوعہ پر چل کر دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے......؟''

میں نے تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے کا پروگرام موخر کر دیا اور کانسٹیبل صفدر کو اپنے ساتھ لے کر جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا حالانکہ اس وقت مجھے بڑی شدید نوعیت کی بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن فرض کی ادائیگی آپ کی ذات اور ضروریات سے ہمیشہ زیادہ اہم ہوتی ہے۔

جس طرح گاہک اور موت کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہوتا، بالکل ویسے ہی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایمرجنسی کا کوئی اسکیجوئل طے نہیں ہوتا اور خاص طور پر تھانے دار تو چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی ہوتا ہے لیکن شرط وہی ہے، اگر وہ اپنے فرائض کو پہچانتا ہو تو، ورنہ بعض تھانے اور بعض تھانے دار تو ایسے بھی ہیں کہ ان کے لیے راوی، چناب، جہلم، ستلج اور سندھ......سب کے سب سکھ چین ہی لکھ رہے ہوتے ہیں۔

جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہاں ایک دوسری اور انتہائی مختلف صورت حال سے واسطہ پڑا۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ سوہدرہ کے مین بازار میں تکے کباب کی دکان پر ماموں تکا فروش کی لاش پڑی ہوگی اور کوئی دو درجن افراد اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہوں گے لیکن وہاں ایک نیا نقشہ دیکھنے کو ملا۔

ماموں کی دکان پر چند لوگ جمع تھے اور آپس میں بڑے گمبھیر انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ ماموں کی لاش کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے ذہنی طور پر الجھا دیا اور میں نے اپنے ساتھ آنے والوں سے پوچھا۔

''مشتاق......جنید......یہ کیا تماشا ہے۔ تم لوگوں نے بتایا تھا کہ کسی اجنبی لفنگے نے ماموں کا قتل کر دیا ہے مگر یہاں تو......؟''

''جناب! جب ہم آپ کو اطلاع دینے گئے تھے تو ماموں ادھر ہی گرا پڑا تھا۔'' جنید نے زمین کے ایک حصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔ ''پتا نہیں، اب کہاں غائب ہو گیا ہے......!''

''وہ کہیں غائب نہیں ہوا سرکار!'' وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''چند لوگ ماموں کو تانگے میں ڈال کر کلینک لے گئے ہیں۔''

''کلینک......؟'' میری حیرت دو چند ہو گئی۔ ''ایک لاش کو کلینک لے گئے ہیں......؟''

''جی ہاں۔'' وہی پختہ عمر شخص وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب مشتاق اور جنید کو ہم نے تھانے کی طرف دوڑایا تھا تو اس وقت یہی لگ رہا تھا، ماموں کا ''کام'' ہو گیا مگر ان کے جانے کے دو منٹ بعد ہی بے حس و حرکت پڑے ماموں میں اچانک حرکت پیدا ہوئی اور وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ موقع پر موجود لوگوں نے ایک تانگا لا کر اس میں ماموں کو ڈالا اور ڈاکٹر عباس کے کلینک لے گئے ہیں۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر عباس کا کلینک تھوڑی دور ادھر مین بازار ہی میں ہے۔''

وہ تحمل مزاج شخص خاصا سمجھ دار اور بردبار نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پچپن سے متجاوز تھی۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''چاچا! آپ کا نام کیا ہے؟''

''فرید بخاری!'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن لوگ صرف بخاری یا بخاری صاحب کہتے ہیں۔''

''بخاری صاحب! آپ بھی ادھر ہی رہتے ہیں؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''جی ہاں...... بالکل......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہم لوگ تین، چار پیڑھیوں سے ادھر ہی رہ رہے ہیں جی۔ میں پاک فوج میں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ریٹائر ہوا ہوں۔''

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی بخاری صاحب!'' میں نے اس سے گرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے، آپ قانون سے اپنے بھرپور تعاون کا اظہار کریں گے۔''

''آپ حکم کریں انچارج صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھ سے جو بھی ہو سکا، ضرور کروں گا۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ ماموں پر حملہ کرنے والا شخص اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتا۔'' میں نے فرید بخاری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جتنے بھی لوگوں نے اسے دیکھا، ان سب کے لیے وہ اجنبی تھا۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟''

''جی ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو اس شخص کو دیکھا نہیں مگر لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ آج سے پہلے اسے اس علاقے میں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔''

''جب اس نے ماموں پر حملہ کرنے کے بعد یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو کسی نے آگے بڑھ کر اسے روکا یا پکڑا کیوں نہیں؟'' میں نے خاصے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں......'' وہ تجزیاتی انداز میں بولا۔ ''جب اس نے اچانک ماموں پر وار کیا ہوگا اور ماموں نیچے زمین پر گر گیا ہوگا تو یہاں موجود لوگوں کی تمام تر توجہ ماموں کی جانب مبذول ہو گئی ہوگی اور کسی نے اس شخص پر دھیان نہیں دیا ہوگا لہٰذا وہ بڑی آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب رہا......''

فرید بخاری کی بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت میں عموماً عوام اسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے، جب ماموں پر حملہ ہوا، آپ یہاں موجود نہیں تھے؟''

شانِ نزول

نوح ناروی ایک بار اپنی جائداد کے جھگڑے کے سلسلے میں عدالت کے چکر میں پھنس گئے۔ مجسٹریٹ کے کسی فیصلے کی نقل آپ کو درکار تھی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے آپ کو جس مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا، اس کا اظہار بہ زبان شعر میں آپ نے یوں کیا۔

جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر
کہہ دیا دفتر سے تم کو نقل لینی چاہیے
اور دفتر سے اگر طالب ہوا میں نقل کا
تو وہ بولے اس کی بھی درخواست دینی چاہیے

قلمی تعاون، شہلا فاروقی، فیصل آباد

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''جب میں یہاں پہنچا تو یہ واقعہ پیش آ چکا تھا اور حملہ آور یہاں سے فرار ہو گیا تھا البتہ......'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

''البتہ، جنید اور مشتاق میرے سامنے ہی آپ کو اطلاع دینے تھانے کی طرف گئے تھے اور جب ماموں کے جسم میں حرکت ہوئی تو میں نے فوراً اسے دو افراد کی نگرانی میں، ایک تانگے میں ڈال کر عباس کلینک بھجوا دیا۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اور اب اس سے بھی زیادہ ایک اور اچھا کام آپ کو کرنا ہے......''

''جی وہ کیا......؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''آپ ایک ریٹائرڈ فوجی ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ آپ یہ کام بڑی آسانی سے کر لیں گے......''

''آپ حکم تو کریں تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے جوش میں بولا۔ ''میرے بس میں جو بھی ہوا، ضرور کروں گا۔''

''میں تو ابھی فوری طور پر عباس کلینک جا رہا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک میں واپس نہیں آ جاتا، یہاں کی صورت حال آپ سنبھالیں گے۔''

''جی، ضرور سنبھالوں گا۔'' وہ جلدی سے اثبات میں

گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا......؟“

”نمبر ایک...... جائے وقوعہ کی جو چیز جہاں پڑی ہے وہ وہاں سے ہلنا نہیں چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سلسلے میں میرا کانسٹیبل بھی آپ کی مدد کرے گا۔“ میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل صفدر کی جانب اشارہ کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر دو...... آپ یہاں پر موجود افراد میں سے کم از کم دس ایسے لوگوں کا چناؤ کریں گے جنہوں نے حملہ آور کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھتے ہی فوراً پہچان سکتے ہوں...... پورے دعوے کے ساتھ۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں، بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ وہ پرمعنی انداز میں بولا۔ ”آپ بے فکر ہو کر کلینک جائیں۔ یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔“

میں نے کانسٹیبل صفدر کو ضروری ہدایات دیں پھر زخمی ماموں کو دیکھنے عباس کلینک کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

عبدالغفار عرف ماموں کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ اس قابل تو نہیں تھا کہ میں اس کا بیان قلم بند کر سکتا تاہم ڈاکٹر نے اس کے خطرناک زخم پر ٹانکے لگا کر مرہم پٹی کر دی تھی اور اسے مسکن انجیکشن بھی لگا دیا تھا جس کے زیر اثر وہ اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے تنقیدی نظر سے ماموں کا جائزہ لیا پھر ڈاکٹر عباس کے پاس آ بیٹھا۔ عباس کلینک دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ابتدائی حصے میں وہ خود بیٹھ کر مریضوں کو دیکھتا تھا اور عقبی حصہ ایمرجنسی مریضوں کے لیے تھا جہاں ڈرپ والے مریضوں کو لٹایا جاتا تھا یا پھر ایسے مریضوں کو جن کی حالت بہت زیادہ خراب ہو۔ ماموں اسی حصے میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ ان دونوں حصوں کے بیچ میں ایک لمبوتری سی قبر نما ڈسپنسری بنی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عباس معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس تھا اور میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ہی مریض کو ٹریٹمنٹ دے دیا ہے......“

”آپ نے بہت اچھا کیا ڈاکٹر صاحب!“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ایک شخص کی جان بچانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں سو فیصد کامیاب بھی رہے ہیں۔ گویا...... آپ نے پوری انسانیت کو بچا لیا ہے۔“

وہ میرے آخری جملے کی گہرائی میں اتر کر اس کی معنویت کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر تو صرف کوشش ہی کرتا ہے۔ زندگی بچانے یا زندگی دینے والی تو خدا ہی کی ذات ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”انسان محض مثبت اور منفی کوشش کرتا ہے۔ زندگی اور موت دینے کا اختیار صرف اسی قادرِ مطلق کو ہے۔“

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

”ماموں کی کیا پوزیشن ہے؟“

”وہ میرے حساب سے اب بالکل ٹھیک ہے۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔“ وہ تسلی بھرے انداز میں بولا۔ ”گردن پر گہرا زخم آیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں، تیز دھار آلے کا کٹ کتنا ظالم ہوتا ہے۔ بہرحال، میں نے ٹانکے وغیرہ لگا کر زخم اچھی طرح سی دیا ہے۔ ہفتہ دس دن میں ماموں بھلا چنگا ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”ماموں کو جو لوگ یہاں لے کر آئے تھے، ان میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں؟“

”ماموں کے ساتھ دو بندے آئے تھے تھانے دار صاحب!“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”ایک کا نام سبحان ہے۔ وہ اب ماموں کی بیوی کو اس واقعے کی اطلاع دینے گیا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ ماموں کی بیوی کو ساتھ ہی لے کر آئے گا اور پھر ماموں کو کلینک سے گھر بھی وہی پہنچائے گا۔“

”اور دوسرا آدمی کون تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”سلو!“ ڈاکٹر عباس نے جواب دیا۔ ”سلامت علی عرف سلو نامی یہ نوجوان ماموں کی دکان پر ملازم ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ یہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ ادھر باہر کہیں کھڑا ہو۔ میں دیکھتا ہوں اسے......“

ڈاکٹر نے بات مکمل کرنے کے بعد اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گھونگھریالے بالوں والا ایک پستہ قامت نوجوان کلینک میں داخل ہوا۔ اس کی عمر بیس، بائیس سال رہی ہوگی۔ رنگت گندمی اور آنکھوں کے انداز میں ایک خاص قسم کی تیزی و طراری تھی۔ اس نوجوان پر نگاہ پڑتے ہی ڈاکٹر عباس نے بڑی سرعت سے کہا۔

”تھانے دار صاحب! لیں سلو بھی آ گیا......“

سلامت علی عرف سلو نے مجھے سلام کیا۔ وہ اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا لہٰذا میں اسے لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگا۔

”کیا تم اس شخص کو جانتے ہو جس نے ماموں پر حملہ کیا تھا؟“ میں نے سلو سے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب مجھے ابھی تک کہیں سے موصول نہیں ہوا تھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”میں نے اس بندے کو زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ میری ساری عمر ادھر سوہدرہ ہی میں گزری ہے جناب۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ادھر کا رہنے والا نہیں تھا۔“

”جب وہ فرار ہو رہا تھا تو تم نے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”وہ تمہارے مالک کو مار کر جا رہا تھا...... اور تم نے اسے جانے دیا......!“

”تھانے دار صاحب!“ وہ آنکھوں کو مخصوص انداز میں گھماتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ”میں نے جب ماموں کو گرتے دیکھا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر لپکا تھا۔ میں نے فوراً ماموں کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ اس شخص پر تو میرا بالکل دھیان نہیں گیا تھا، اسے پکڑنے کی کیا کوشش کرتا جی......“

”اس معاملے میں تم اکیلے نہیں ہو سلو!“ میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ”وہاں موجود کسی بھی شخص نے اسے روکنے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرحال......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس شخص کی ماموں سے ایسی کون سی دشمنی تھی جو وہ چھری سے اس پر حملہ آور ہو گیا......؟“

”جناب! دشمنی تو کوئی نہیں تھی، بس وہ بندہ بدمعاشی کر رہا تھا اور ماموں کو اس کی بے ایمانی پر غصہ آ گیا۔“ سلو نے بتایا۔ ”دونوں میں بحث ہونے لگی، پھر اس بندے نے ماموں کے سامنے رکھی چھری اٹھائی اور اس کی گردن پر وار کر دیا......“

”وہ بندہ کس قسم کی بدمعاشی کر رہا تھا۔“ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے اس کی بے ایمانی کا ذکر کیا ہے۔ ماموں سے وہ کس معاملے پر بحث کر رہا تھا؟“

”میں آپ کو بتاتا ہوں جی۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”وہ بندہ ہمارے پاس تکے کباب کھانے آیا تھا۔ اس نے پہلے ایک چکن تکا، چار سیخ کباب کا آرڈر دیا۔ میں نے اس کی مطلوبہ چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں۔ اس وقت اس بندے کے علاوہ بھی تین چار لوگ تکا بوٹی وغیرہ کھا رہے تھے اور سب پر میری نظر تھی۔ کسی کو پانی چاہیے تو کسی کو چٹنی پیاز وغیرہ کی ضرورت تھی اور کسی کے پاس روٹی ختم ہو گئی تھی۔ میں ہر گاہک کی آواز پر اس کی ضرورت پوری کر رہا تھا......“ اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس بندے نے دو روٹیاں فوراً ہی معدے میں اتار لی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس نے پچھلے دو چار دن سے کھانا نہ کھایا ہو۔ اس نے مجھ سے اور روٹیاں لانے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی ایک چکن تکا کا مزید آرڈر بھی دے دیا۔ میں نے روٹیاں تو فوراً اس کے سامنے رکھ دیں اور چکن تکا میں پانچ چھ منٹ لگ گئے ہوں گے۔ اس دوران میں وہ سیخ کباب کے ساتھ روٹی کھاتا رہا۔ بہرحال...... اس نے کھانا ختم کیا اور پیسے دینے کے لیے ماموں کے پاس پہنچ گیا۔ جب کوئی گاہک ماموں کو پیسے دینے لگتا ہے تو ماموں مجھے آواز دے کر پوچھتا ہے کہ اس شخص کا کیا حساب بنا ہے۔ ماموں میرے آرڈر پر تکے کباب اور بوٹی وغیرہ انگیٹھی پر سینکتا رہتا ہے۔ گاہکوں کا حساب رکھنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ تو جناب...... جب وہ بندہ ماموں کے پاس پہنچا تو ماموں نے مجھے پکارا۔

”ہاں بھئی سلو! کیا حساب ہے اس بندے کا؟“

”ماموں! اس بندے کے دو چکن تکا، چار سیخ کباب اور چار روٹیاں ہیں۔“ میں نے اس بندے کے کھانے کا حساب لگا کر بتا دیا۔

ماموں نے فوراً پیسے بتا دیے۔ وہ شخص ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے ماموں سے بولا۔

”چاچا! تم نے بڑا بے ایمان نوکر رکھا ہوا ہے......“

”کیا ہو گیا بھائی جی......؟“ ماموں نے چونک کر پہلے مجھے اور پھر اس بندے کی طرف دیکھا۔

”ہونا کیا ہے چاچا......“ وہ خفگی بھرے انداز میں بولا۔ ”میں نے ایک چکن تکا، چار کباب اور دو روٹیاں کھائی ہیں اور یہ تمہارا نوکر دو چکن تکے اور چار روٹیاں حساب میں لگا رہا ہے۔ یہ تو کھلی بے ایمانی ہے......!“

”سلو نے کبھی ایسا کیا تو نہیں۔ مجھے اس کے حساب پر پورا بھروسا ہے۔“ ماموں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”سلو...... ان بھائی جی کا کیا مسئلہ ہے؟“

”یہ بندہ خود ہی اپنے لیے مسئلہ ہے ماموں۔“ میں

نے تلخی بھرے انداز میں کہا۔ ''میرا حساب بالکل ٹھیک ہے جی۔ لگتا ہے، اس بندے کی نیت میں فتور آگیا ہے۔ تکّے کباب تو یہ کھا ہی چکا ہے، اب یہ ایک چکن تکّا اور دو روٹیوں کے پیسے بھی ہضم کرنا چاہتا ہے......''

''چاچا! دیکھو تو، اس لڑکے کی زبان کیسے قینچی کی طرح چل رہی ہے۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے، یہ اس دکان کا مالک اور تم نوکر ہو چاچا......؟''

''بھائی جی، آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہے۔'' ماموں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''سلو بے ایمانی نہیں کرسکتا۔ اس کا حساب ٹھیک ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں فراڈ کر رہا ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے، تم دونوں ہی آپس میں ملے ہوئے ہو۔ لوگوں کو الو بنا کر ان سے زیادہ رقم بٹورتے ہو لیکن میں ایک پیسا بھی زیادہ نہیں دوں گا۔''

''بھائی جی! اگر تمہاری جیب میں پیسے نہیں ہیں تو صاف بتا دو، میں تمہیں پیسے چھوڑ دوں گا۔'' ماموں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ الٹے سیدھے ڈرامے کیوں ڈال رہے ہو......؟''

ماموں غصے کا بہت تیز ہے۔ مجھے تو حیرت تھی کہ وہ اس بندے کی زیادتی کے باوجود بھی بڑی نرمی سے ''بھائی جی، بھائی جی'' کہہ کر اس سے بات کیوں کر رہا تھا۔ بہرحال، جب اس بندے نے اپنی غلط بات جاری رکھی تو ماموں زیادہ دیر تک خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور اس کی آواز بھی بلند ہوگئی۔ جبھی اس نے ڈراما ڈالنے والی بات کی تھی۔

''ڈراما میں نہیں، تم دونوں مل کر کر رہے ہو۔'' وہ بندہ خاصی بدتمیزی سے بولا۔ ''میری جیب میں اتنی رقم ہے کہ میں تمہاری یہ دکان کھڑے کھڑے خرید سکتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف بن کر آسانی سے لٹ جاؤں گا۔''

ماموں نے اس بندے کا یہ اسٹائل دیکھا تو سلگانے والے انداز میں کہا۔ ''سنو بھائی! انسان زندگی میں دو چیزوں کو کبھی بھول نہیں سکتا، چاہے اس کی یادداشت بھی کیوں نہ چلی جائے......''

''کون سی دو چیزیں؟'' وہ بگڑے ہوئے انداز میں بولا۔

''نمبر ایک......'' ماموں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''کسی کا کھایا ہوا مال، نمبر دو......'' لمحاتی توقف کے بعد ماموں نے اضافہ کیا۔

''کسی سے کرایا ہوا کوئی برا کام......!''

''اوئے بڈھے! تم نے مجھے گالی دی......'' وہ بندہ ماموں کی حقیقت بیانی سنتے ہی طیش میں آگیا۔ ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

بات ختم کرتے ہی اس نے ماموں کے سامنے رکھی چھری اٹھائی اور اس سے پہلے کہ ماموں اس کے ارادے کو بھانپ پاتا، اس کم بخت نے ماموں کی گردن پر چھری کا وار کردیا۔ ماموں چھری کھاتے ہی زمین پر گر گیا اور میں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں جناب......''

''ہوں......!'' سلو خاموش ہوا تو میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس کے علاوہ اگر تمہیں کوئی خاص بات پتا ہو تو بتاؤ؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں جو کچھ جانتا تھا وہ آپ کو پوری تفصیل سے بتا دیا ہے۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ بھی پتا نہیں۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سبحان، ماموں کی بیوی کو لے کر آگیا۔ ماموں کی گھر والی کا نام غفوری تھا اور وہ بھی ماموں کی طرح جگت مامی (ممانی) تھی۔ وہ سانولی رنگت کی مالک ایک پستہ قامت عورت تھی اور پچاس کے پیٹے میں دکھائی دیتی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے بارے میں ایک خاص بات جو بعد میں مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ لوگ بے اولاد تھے۔

میں نے غفوری مامی کو تسلی تشفی دی اور کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، ماموں دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ معمولی سا زخم آیا ہے گردن پر۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا ہے، یہ اپنے کمپاؤنڈر کو گھر بھیج کر ماموں کی پٹی وغیرہ کروا دیا کریں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو انجکشن وغیرہ بھی لگوا دیں گے۔ اب تم ماموں کو گھر لے جاؤ اور یہ جتنا زیادہ آرام کریں، کرنے دیں۔''

''اللہ تمہارا بھلا کرے تھانے دار پتر۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''لیکن وہ حرامی تھا کون جس نے ماموں پر چھری سے حملہ کردیا......؟''

عبدالغفار کا یہ ''ٹائٹل'' ایسا مقبول عام تھا کہ اس کی بیوی بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ''ماموں'' ہی کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''اس بندے کے بارے میں ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا لیکن مجھے امید ہے، بہت جلد میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ پھر پتا چل جائے گا، وہ سورما ہے کون......!''

''سوہدرہ کا تو بچہ بچہ ماموں کو جانتا ہے۔'' مامی غفوری نے کہا۔ ''میں مانتی ہوں، وہ غصے کا تھوڑا تیز ہے لیکن کسی کی مجال نہیں کہ چھری سے اس پر حملہ آور ہو۔ یہاں کے سب لوگ اس کے غصے سے واقف ہیں۔''

''لیکن مسئلہ یہ ہے مامی......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو وہ بندہ سوہدرہ کا رہنے والا نہیں تھا اس لیے وہ ماموں کے مزاج سے واقف نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ وہ کم بخت غصے کا خود بھی بہت تیز تھا۔ ماموں نے تو آرام ہی سے بات کرنے کی کوشش کی تھی پر وہ ماموں کے ایک جملے کو برداشت نہ کرسکا اور طیش میں آکر اس نے چھری سے ماموں پر حملہ کردیا۔''

''جب وہ ادھر کا رہنے والا نہیں تو پھر اس کی ماموں سے کیسی دشمنی؟'' مامی غفوری نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''بس، پیسوں کے لین دین پر ان میں منہ ماری ہوگئی تھی۔'' میں نے اپنی معلومات کے مطابق کہا۔ ''اس کے کھانے کا جو بل بنا تھا وہ اس سے کم دے رہا تھا......''

''میں ماموں کو پچھلے تیس سال سے جانتی ہوں۔'' مامی غفوری نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''وہ غصے کا ذرا تیز ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں اور...... بے ایمان یا دھوکے باز ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بہرحال خدا کا شکر ادا کرو کہ ماموں کی جان بچ گئی ورنہ اگر زخم ذرا اور گہرا لگ جاتا تو شہ رگ کٹنے کا بڑا قوی امکان تھا۔''

''آپ نے بتایا ہے کہ وہ بندہ سوہدرہ کا رہنے والا نہیں۔'' مامی غفوری آنکھیں سکیڑ کر سوچنے والے انداز میں بولی۔ ''اس کا مطلب ہے، وہ کوئی مہمان ہوسکتا ہے۔''

''مہمان...... کس کا مہمان؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب......'' وہ جلدی سے بولی۔ ''جب وہ یہاں کا وسنیک نہیں تو پھر کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان ہی تو ہوسکتا ہے...... کسی کا بھی مہمان......!''

غفوری مامی نے ایک اہم پہلو کی جانب توجہ مبذول کرائی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ بندہ کسی کا مہمان ہو لیکن اس صورت میں فوراً ایک سوال اٹھتا تھا کہ اگر وہ کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان تھا تو پھر اسے ماموں کی دکان پر بیٹھ کر تکّے کباب کھانے کی کیا ضرورت تھی اور اگر ضرورت پیش آ ہی گئی تھی، تو وہ اکیلا کیوں تھا، اس کے ساتھ گھر کا کوئی آدمی کیوں نہیں تھا۔ اگرچہ اس پہلو پر بہت سارے سوالات اٹھتے تھے لیکن اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غفوری مامی کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔

''میں اس حوالے سے بھی لوگوں کو چیک کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے غفوری مامی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ نامراد جو کوئی بھی ہے، بہت جلد میری گرفت میں ہوگا۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو تھانے دار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور جب وہ آپ کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کا دیدار مجھے بھی کرائیں۔ میں سانس روک کر اس کے سر میں پورے سات جوتے ماروں گی اور پوچھوں گی...... بتا، ماموں نے تیری کون سی بھانجی کو چھیڑا تھا جو تو نے اس پر چھری اٹھائی......؟''

یہ ماموں کی گھر والی ''جگت مامی غفوری'' بھی مزاج اور غصے کی کچھ سست نظر نہیں آتی تھی۔ دو چار جملوں ہی نے اس کے اسٹائل کا تعارف پیش کردیا تھا۔

''وہ شخص جب بھی میرے قابو میں آیا، میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میں کل کسی وقت اس کا بیان لینے آؤں گا۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں نے سبحان نامی اس بندے کے ہمراہ ماموں اور مامی کو عباس کلینک سے ان کے گھر کی جانب روانہ کردیا۔ سبحان کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ ماموں کا پڑوسی تھا اور سوہدرہ کے مین بازار ہی میں اس کی کریانے کی دکان تھی۔

ایک بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ جب میں اپنی کہانی میں کسی گاؤں دیہات کے ''مین بازار'' کا ذکر کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہرگز لاہور، کراچی یا راولپنڈی جیسا مین بازار نہیں ہوتا۔ گاؤں دیہات کے مین بازار کا مطلب ہے، کسی بھی مرکزی گلی میں مختلف نوعیت کی چند دکانیں!

ماموں اور مامی کو ان کے گھر بھجوانے کے بعد میں سلامت علی عرف سلو کے ساتھ جائے واردات کی جانب روانہ ہوگیا۔

٭٭٭

فرید بخاری نے کسی فیلڈ مارشل کا کردار ادا کیا تھا۔ جب میں واپس ماموں تکّا فروش کی دکان پر پہنچا تو ہر شے جوں کی توں تھی۔ میں فوری طور پر جائے وقوعہ کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔ اصولی طور پر یہ کام مجھے سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ ماموں کی ''لاش'' کو کسی کلینک بھجوایا جاچکا ہے تو میں فوراً ادھر لپک گیا

تھا۔ میں تو ماموں کے قتل کی اطلاع پا کر تھانے سے نکلا تھا اور پھر پے در پے صورت حال میں تبدیلی رونما ہوتی چلی گئی۔ اگر ماموں ایسا ہی شدید زخمی ہو چکا تھا تو پھر اسے سوہدرہ کے کسی کلینک نہیں بلکہ وزیر آباد کے سرکاری اسپتال لے جانے کی ضرورت تھی۔ یہی تشویش مجھے جائے وقوعہ سے کھینچ کر ڈاکٹر عباس کے کلینک پر لے گئی تھی۔

میں نے پندرہ بیس منٹ تک کانسٹیبل صفدر کے تعاون سے جائے واردات کا مکمل معائنہ کر ڈالا۔ وہ بنیادی طور پر ایک چھوٹی سی دکان تھی جس کے آگے ایک بڑے سے چوبی تخت پر ماموں نے اپنی دکان داری سجا رکھی تھی۔ کوئلوں والی ایک بڑی سی انگیٹھی کے برابر میں تکا اور بوٹی کباب کی سیخوں والا اسٹینڈ تھا۔ دوسری جانب ایک بڑے سے تسلا نما برتن میں ''مال'' بھرا ہوا تھا۔ تکے، بوٹی اور کباب کے اس مال کو مسالا لگا کر بالکل تیار حالت میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اب اسے سیخ میں پرو کر کوئلوں پر سینکنے کی ضرورت تھی۔

جس گدی نما سیٹ پر ماموں براجمان ہو کر تکے کباب تیار کرتا تھا وہ دراصل لکڑی کی بنی ہوئی ایک چوکی تھی جس کے زیریں حصے میں دو درازیں بھی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں ماموں اپنی بکری کی رقم رکھا کرتا تھا۔ اسی چوکی کے اوپر روئی والی گدی رکھ کر ماموں نے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا رکھی تھی۔ اسی چوکی کی دائیں جانب چٹنی اور پیاز والے دو تسلے رکھے ہوئے تھے اور ایک چھوٹے سے برتن میں گھی بھی نظر آ رہا تھا۔

چوبی تخت کے آگے ماموں نے گاہکوں کے لیے لکڑی ہی کی چار پانچ بینچیں ڈال رکھی تھیں جہاں بیٹھ کر وہ لوگ اپنے معدوں کو خوش کیا کرتے تھے۔ آج کل کے دور کی زبان میں یوں کہیں گے کہ وہ ''باربی کیو'' کے مزے اڑایا کرتے تھے۔

میں نے اس چھری کی تلاش میں بھی چاروں جانب نظر دوڑائی جو ماموں کی ملکیت بلکہ اس کی دکان داری کا ایک لازمی جزو بھی تھی اور اسی چھری کی مدد سے ایک اجنبی بدمعاش نے ماموں کو ضرب شدید پہنچائی تھی لیکن مذکورہ چھری مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ اب یہی سوچا اور کہا جا سکتا تھا کہ وہ بندہ ماموں کو زخمی کرنے کے بعد چھری اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

میں نے ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری کو دس ایسے افراد اکٹھا کرنے کی ہدایت کی تھی جو حملہ آور اجنبی کو دیکھتے ہی پہچان سکتے ہوں اور اس اللہ کے بندے نے میرے مطلوبہ پندرہ بندے جمع کر لیے تھے۔ جب ماموں اور بدمعاش حملہ آور کے بیچ بحث بازی ہو رہی تھی تو آس پاس کی دکانوں کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے گویا ایسے شاہدین کی کوئی کمی نہیں تھی جو اجنبی حملہ آور کی شناخت میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

میں نے فرید بخاری کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان لوگوں کو لے کر تھانے آ جائیں۔ پھر میں بتاتا ہوں کہ انہیں کرنا کیا ہے۔''

تھانہ، جائے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں دراصل وہاں سب کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے غلط استعمال سے بعد میں مجھے تفتیشی معاملات میں کسی رکاوٹ یا مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ دوست دشمن تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا تفتیشی معاملات میں بہت زیادہ احتیاط برتنا پڑتی ہے۔

فرید بخاری نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ملک صاحب! جو آپ کا حکم۔ آپ چلیں، ہم بھی آپ کے پیچھے ہی پہنچ رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اتنے بندوں کے لیے ہمیں کم از کم دو تانگے تو کرنا ہی ہوں گے۔''

''آپ جو بھی مناسب سمجھتے ہیں، وہ اقدام ضرور کریں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تو بس، یہ چاہتا ہوں کہ پندرہ بیس منٹ میں آپ لوگ میرے پاس تھانے میں پہنچ جائیں۔''

''پہنچ جائیں گے ملک صاحب۔'' فرید بخاری نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ مطمئن ہو کر جائیں۔''

اور میں مطمئن ہو کر صفدر کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

یہ اطمینان صرف اس حوالے سے تھا کہ ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری نے جس کام کا وعدہ کیا تھا وہ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اور بہت سارے معاملات نے مجھے اندر سے بے چین کر رکھا تھا۔

میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک امر یہ تھا کہ اس بندے کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ سوہدرہ میں بالکل نیا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا تھا اور کہاں سے وہ آیا تھا؟ اگر وہ کسی کا مہمان تھا تو یہ پتا چلنا بہت ضروری تھا کہ وہ یہاں کے کس رہائشی کے گھر میں مہمان بن کر آیا ہوا تھا۔ قصہ مختصر، جلد از جلد اس بندے کا سراغ لگنا نہایت ہی اہم تھا۔

جب میری نظر میں وہ بندہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ میں اس کا سراغ لگانے کے لیے بے چین ہو رہا تھا تو اس

کے ساتھ ہی میرے ذہن میں اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ اگر وہ کسی بری نیت سے قصبہ سوہدرہ میں وارد ہوا تھا تو پھر اسے لازماً یہاں سے جانا بھی تھا لہٰذا ان تمام راستوں کی نگرانی اور ناکا بندی بھی ضروری تھی جو سوہدرہ میں داخل ہوتے تھے یا یہاں سے باہر جاتے تھے اور اس مقصد کے لیے میرے ذہن میں سب سے اچھی جگہ سوہدرہ کا بس اسٹینڈ تھا۔

میرے تھانے سے چند گز کی دوری پر ایک بس اسٹینڈ واقع تھا۔ ''اسٹینڈ'' کا لفظ اخلاقاً شامل ہو گیا تھا ورنہ وہاں ایسی کوئی بات تھی نہیں۔ بس، بسوں کے رکنے کے لیے ایک جگہ مخصوص تھی۔ اسے آپ چند درختوں کے نیچے واقع ایک سادہ سا دیہاتی بس اڈا سمجھ لیں تو آسانی رہے گی۔ وزیر آباد سے آنے والی بسیں اور ویگنیں وہاں چند منٹ کا پڑاؤ کرتی تھیں، پھر آگے کے گاؤں دیہات کی سمت بڑھ جاتی تھیں۔ اسی ''بس اسٹینڈ'' کے پہلو میں ''تانگا اسٹینڈ'' بھی واقع تھا۔

میں نے اس ''مقام'' کی خصوصی نگرانی کا فیصلہ اس لیے بھی کیا تھا کہ سوہدرہ کی جانب آنے والوں اور یہاں سے کہیں اور جانے والوں کو اس بس اسٹینڈ یا تانگا اسٹینڈ سے باہر نکلنے کے لیے یہیں سے گزرنا پڑتا۔ کچھ بھی تھا، اس نامعقول اجنبی لفنگے کی فوری گرفتاری بہت ضروری تھی۔

میں نے تھانے پہنچ کر کانسٹیبل حیدر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حیدر علی مقامی آدمی تھا اور سوہدرہ کے بچے بچے کو صورت سے پہچانتا تھا۔ اگر اس وقت سوہدرہ کا کوئی وسنیک اس کہانی کو پڑھ رہا ہے تو اسے یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جس دور کی یہ کہانی ہے، اس زمانے میں سوہدرہ اتنا زیادہ پھیلا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا جیسا کہ آج کل نظر آتا ہے۔ اس وقت یہ اونچی سی جگہ پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں بسنے والا ہر شخص گاؤں کے دیگر رہائشیوں کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔

حیدر علی نے مجھے سلام کیا اور اٹینشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے حالیہ واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ حکم کریں۔ جو بھی کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔''

حیدر علی ایک چاق و چوبند اور ذہین کانسٹیبل تھا۔ اس کی عمر چھبیس اور ستائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ مجھے اس کی ذہانت اور پیشہ ورانہ صلاحیت پر پورا بھروسا تھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آج کی رات اور کل کا دن تمہیں اس راستے کی کڑی نگرانی کرنا ہے جو سوہدرہ سے نکل کر دوسرے مقامات کی طرف جاتا ہے۔ صرف ان لوگوں پر نظر رکھنا ہے جو سوہدرہ کو چھوڑ کر وزیر آباد کی طرف جانے کی کوشش کریں یا دوسری سمت بالائی گاؤں دیہات کا رخ کرنا چاہیں۔ مجھے یقین ہے، وہ اجنبی بدمعاش بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔''

''تو اس کا مطلب ہے، اجنبی لوگوں پر ہی خصوصی نظر رکھنا ہوگی؟'' حیدر علی نے کہا۔ ''آپ تو یہ انتظام صرف اس شخص کو گرفتار کرنے کے لیے کر رہے ہیں نا جس نے ماموں تکے والے کو چھری کے وار سے شدید زخمی کر دیا ہے۔''

''تم بالکل صحیح سمجھے ہو حیدر علی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں واقعی اس اجنبی لفنگے کو جتنی جلدی ممکن ہو، اپنی نظر کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور کس مقصد سے آیا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں آج رات ہی سے اس اجنبی بدمعاش کی تلاش کا کام شروع کر رہا ہوں۔ اگر وہ کسی بری نیت سے سوہدرہ میں موجود ہے تو میری کارروائی کے نتیجے میں وہ بوکھلا جائے گا اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ ایسے وقت میں تم اسے قابو کر کے ہتھکڑی پہنا دو گے۔ اس کام کے لیے میں تمہیں دو صحت مند اور مستعد

نوجوان بھی دوں گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اس کام کو کیسے ہینڈل کرتے ہو۔ بتاؤ، کرلو گے نا؟''

''ملک صاحب! آپ کو مجھ پر بھروسا ہے جبھی تو آپ اتنی بڑی ذمے داری مجھے سونپ رہے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہوجائیں، میں آپ کا بھروسا نہیں ٹوٹنے دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید تھی حیدر علی۔ تم اس مشن میں ہر قسم کی کارروائی کرسکتے ہو۔ اگر مطلوبہ آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے تمہیں کسی مرحلے پر حد سے گزرنا پڑے تو اجازت ہے۔ مجھے ہر قیمت پر وہ بندہ چاہیے۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں آپ کی امید پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

''اور تمہیں یہ کام سادہ لباس میں رہتے ہوئے کرنا ہوگا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بس، اب تم روانہ ہوجاؤ۔''

''آپ نے جن دو مستعد نوجوانوں کا ذکر کیا ہے۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کون لوگ ہیں اور وہ کس طرح میری معاونت کریں گے؟''

''ان دونوں کا تعلق سوہدرہ ہی سے ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم یہاں کے ایک ایک آدمی کو جانتے ہو، انہیں دیکھتے ہی پہچان لوگے۔ میں خود انہیں لے کر تمہارے پاس آؤں گا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ان سے کس طرح کام لینا ہوگا، اس کا فیصلہ تم خود ہی کروگے۔ وہ مکمل طور پر تمہارے اختیار میں ہوں گے، جیسے چاہو، انہیں استعمال میں لانا۔''

کانسٹیبل حیدر علی نے مجھے سلام کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں جو اتنی شدومد سے اس اجنبی لفنگے کی تلاش کا پروگرام سیٹ کررہا تھا، وہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کو بہت عجیب محسوس ہو لیکن مجھے ہرگز ایسا محسوس نہیں ہورہا تھا۔ اگر کسی ایسے آدمی کی بات ہوتی جو سوہدرہ کا رہنے والا ہوتو شاید میں ماموں کے ساتھ اس کے تنازع کو اتنی اہمیت نہ دیتا۔ سیدھا سیدھا اسے پکڑ کر تھانے لے آتا، لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

ایک تو اس اجنبی فتنہ پرور شخص کو کوئی جانتا نہیں تھا، دوسرے ماموں کی اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی، تیسرے وہ اس واردات کے بعد اچانک منظر سے غائب ہوگیا تھا...... بس یہی ایک نکتہ میری تشویش بلکہ میری پریشانی کا سبب تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فرید بخاری اپنی ''ٹیم'' کے ساتھ میرے پاس پہنچ گیا۔ ''ٹیم'' سے میری مراد وہ پندرہ افراد تھے جو حملہ آور اجنبی کو دوبارہ دیکھنے پر بہ آسانی پہچان سکتے تھے۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

اتنے زیادہ افراد کو ایک ساتھ بٹھانا تو ممکن نہیں تھا لہٰذا میں نے فرید بخاری کو کرسی پیش کی اور باقی سب کو اپنے سامنے کھڑا کرلیا پھر میں نے حوالدار جان محمد کو بلا کر ان سب کے نام مع ولدیت کے فہرست تیار کرنے کو کہا۔ ان سب کا تعلق چونکہ موضع سوہدرہ سے تھا لہٰذا ایڈریس وغیرہ نوٹ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ان سب کو تمام حالات وواقعات سے آگاہ کیا، انہیں اپنی سوچ کے بارے میں بتایا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''وہ جو کوئی بھی ہے وہ آپ لوگوں کے اندر ہی سوہدرہ میں موجود ہے۔ آپ میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا لیکن آپ میں سے ہر کوئی اسے دیکھتے ہی پہچان لے گا اور یہی میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اسے ڈھونڈ نکالیں۔ وہ جہاں بھی ملے، اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ اسے قابو کرنے کے لیے اگر لڑائی جھگڑا اور مار کٹائی بھی کرنا پڑے تو تم لوگوں کو میری طرف سے کھلی چھٹی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کا امکان موجود ہے اس لیے دھیان رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ وہ اجنبی کسی کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان بھی ہوسکتا ہے۔ مجھے اس بات کا تو یقین ہے کہ وہ آپ میں سے کسی کا مہمان نہیں ہوگا کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو پھر آپ میں سے کوئی نہ کوئی اسے ضرور پہچان لیتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

میرے اس سوال کے جواب میں چاروں جانب سے تائیدی آوازیں ابھریں اور انہوں نے اپنے اپنے انداز میں سر کو اثباتی جنبش بھی دی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

''لہٰذا اس نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بندے کو تلاش کرنا ہے۔ یہ گاؤں کوئی زیادہ بڑا نہیں۔ تم لوگ آپس میں سوہدرہ کے مختلف علاقوں کو بانٹ لو اور ابھی سے کام شروع کردو۔ جیسے ہی کوئی اہم بات پتا چلے، فوراً مجھے اطلاع دینا ہے اور اگر وہ مجرم کہیں نظر آجائے تو پہلے اسے قابو کرنا

ہے اس کے بعد میرے پاس آنا ہے۔ ٹھیک ہے......؟''

ایک بار پھر انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''ماموں تکا فروش سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی اس پاگل نے ماموں کو شدید زخمی کردیا۔ اس جنونی سے کسی بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ وہ کسی اور شخص کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ماموں کی تو جان بچ گئی، گاؤں کے کسی اور شخص کو وہ موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے۔ تم لوگوں کی سلامتی اور حفاظت اسی میں ہے کہ اس شخص کو جلد از جلد پکڑنے کی کوشش کرو۔''

وہ سب مجھے یقین دہانی کرانے کے بعد واپسی کے لیے روانہ ہونے لگے تو میں نے ان میں سے دو ہٹے کٹے نوجوانوں کو روک لیا اور باری باری ان کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''تم دونوں کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام اسلم ہے جی۔'' ایک نے بتایا ''محمد اسلم......''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''میں جاوید شاہ ہوں۔''

میرے محتاط اندازے کے مطابق، اسلم نامی نوجوان کی عمر بیس سال کے آس پاس تھی جبکہ جاوید اٹھارہ سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں کی صحت کو قابل رشک کہا جاسکتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ان کا انتخاب کیا تھا۔

''تم دونوں میں سے کسی کی شادی بھی ہوئی ہے یا ابھی تک کنوارے ہی گھوم پھر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میں نے یہ سوال ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا لیکن انہوں نے پتا نہیں، کیا سمجھا کہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''گھبرا کیوں گئے۔ میں تم لوگوں کی شادیاں نہیں کروانے جارہا......!''

انہوں نے یکے بعد دیگرے مجھے بتایا کہ ابھی ان میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی۔ میں نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر تو تمہارے ساتھ بیوی بچوں والا کوئی جھنجٹ نہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے گھر بتا کر آجاؤ کہ آج کی رات تمہاری تھانے میں گزرے گی۔''

''تھانے میں......!'' اسلم نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

جاوید نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''جناب! ہم نے کیا جرم کیا ہے......؟''

''ملک صاحب! آپ نے تو ان دونوں جوانوں کو ڈرا ہی دیا ہے۔'' فرید بخاری نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ان کو اصل بات بھی بتادیں ورنہ یہ بے چارے خوامخواہ پریشان ہوتے رہیں گے۔''

محمد اسلم اور جاوید شاہ کے سوا باقی تیرہ مجرم شناس افراد میرے احکام لینے کے بعد تھانے سے رخصت ہوگئے تھے۔ ان دونوں جوانوں کو میں نے کسی خاص مقصد کے لیے روکا تھا یا پھر فرید بخاری ابھی تک میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا لہٰذا اپنے تجربے کی بنا پر وہ اتنا تو بھانپ ہی گیا ہوگا کہ میں نے انہیں کسی کام ہی کے سلسلے میں روکا ہے۔ میں نے اسلم اور جاوید کی الجھن دور کرنے کے لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کسی پریشانی یا وہم میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں، میں تم لوگوں کی کسی خاص جگہ ڈیوٹی لگانا چاہتا ہوں۔''

میں نے سوچ لیا تھا کہ ان دونوں کو میں کانسٹیبل حیدر علی کے ساتھ نتھی کردوں گا جو تھوڑی دیر پہلے ایک خاص

''مشن'' پر روانہ ہو چکا تھا۔ اسلم اور جاوید بھی چونکہ مقامی تھے لہٰذا ان تینوں کی خوب نبھ جاتی اور میں ان کی جانب سے زیادہ بہتر نتائج کی توقع رکھ سکتا تھا۔

میری وضاحت سن کر ان کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا اور وہ مجھے سلام کر کے خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد فرید بخاری نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے ایک بہت اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ میں مسلسل اسی بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کون سا نکتہ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہی جناب......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جس میں آپ نے اس امکان کو ظاہر کیا ہے کہ وہ وحشی انسان کسی کے گھر میں آیا ہوا کوئی مہمان بھی ہو سکتا ہے......!''

''یہ نکتہ میں نے نہیں بلکہ ماموں کی گھر والی غفوری مامی نے اٹھایا ہے بخاری صاحب!'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جب عباس کلینک میں وہ ماموں کو لینے آئی تھی تو اس نے اجنبی بدمعاش کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اس جانب میری توجہ دلائی تھی......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس لی پھر اس سے پوچھا۔

''بخاری صاحب! آپ مسلسل اس بارے میں کیوں سوچ رہے ہیں؟''

''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ میرے پڑوس میں ایک شادی ہو رہی ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے مجھے بتانے لگا۔ ''لڑکی کا نام زرینہ عرف شرمیلی ہے۔ کل چندر کلاں نامی ایک گاؤں سے اس کی برات آنے والی ہے۔''

''لیکن کسی شرمیلی کی شادی کا موجودہ معاملے سے کیا واسطہ ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''واسطہ وہی ہے جناب، جس کی جانب تھوڑی دیر پہلے آپ نے توجہ دلائی ہے۔'' وہ بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''وہی کہ ماموں پر حملہ کرنے والا اجنبی غنڈا کسی کا مہمان بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کا اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ شادی والے گھر میں تو ادھر ادھر سے بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہوں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......''

''جی ملک صاحب! آپ میری بات کی تہ میں اتر گئے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنے پڑوس میں کئی اجنبی چہروں کو دیکھا ہے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے، یہ تمام لوگ نی... اور رفعت بی بی کے رشتے دار ہوں گے جو زرینہ کی ... میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا تعلق موضع سوہدرہ سے نہیں ہے۔

زرینہ عرف شرمیلی کے والد کا نام نیاز علی اور والد... نام رفعت بی بی تھا۔ فرید بخاری ہی کی زبانی بعد میں مجھے بھی معلوم ہوا کہ شرمیلی کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ ا... سے ایک چھوٹا بھائی الیاس بارہ سال کا تھا۔ یہ کل چار اف... کا خاندان تھا جس میں سے کل ایک فرد یعنی شرمیلی کو یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ موضع چندر کلاں، سوہدرہ سے چ... میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر سوہدر... کے اندر کھڑے ہو کر دیکھیں تو یہ گاؤں وزیر آباد کی مخالف سمت میں پڑتا تھا۔ بہرحال، ہر دو صورت میں برات کو ای... مقام سے گزرنا تھا جہاں میں نے کانسٹیبل حیدر علی کو تعینات کر دیا تھا۔ شرمیلی کی شادی چندر کلاں کے ایک نوجوان فاروق احمد سے ہو رہی تھی جس کے باپ انوار احمد کا انتقال ہو چکا تھا اور شادی کے تمام تر انتظامات اس کی ماں صادقہ بی بی ہی کر رہی تھی۔

یہ تمام تر معلومات مجھے فرید بخاری کی زبانی حاصل ہوئی تھیں۔ جب اس نے شرمیلی کی شادی اور اس کے گھر میں آنے والے مہمانوں کا تفصیلی ذکر کیا تو میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''بخاری صاحب! پھر تو آپ کے لیے بھی بہت سا کام نکل آیا ہے......!''

''آپ حکم کریں جی، میں تو ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔ ''آرام و سکون کی زندگی گزارتے ہوئے میری ہڈیوں کو پھپھوندی لگ رہی ہے۔ چلیں، اسی بہانے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کا موقع مل جائے گا۔''

''شادی والا گھر آپ کے گھر کے برابر میں واقع ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا وہاں آئے ہوئے مہمانوں پر کڑی نگاہ رکھنا آپ کی ذمے داری ہو گی۔''

''یہ تو میں کر لوں گا......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا مطلب ہے بخاری صاحب!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ مہمانوں کی نگرانی اس لیے کروانا چاہتے ہیں تا......!'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھی سے استفسار کیا۔ ''تاکہ اس آدمی کو قابو کیا جائے جس نے چھری کا وار کر کے ماموں کو شدید زخمی کر دیا ہے......؟''

''ظاہر ہے......!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن مسئلہ یہ ہے ملک صاحب کہ میں نے اس خبیث کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے پہچانوں گا کیسے؟''

''اس مسئلے کا بہت ہی آسان حل ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اگر آپ اس شخص کو صورت سے نہیں پہچانتے تو اپنے ساتھ کسی ایسے بندے کو منسلک کر لیں جس نے جائے وقوعہ پر اس بدمعاش کو یہ واردات کرتے دیکھا ہو......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ کوئی مشکل کام ہے؟''

''ہرگز نہیں ملک صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں ایسے بندے کا بندوبست کر لوں گا۔''

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک اسی نامعلوم اجنبی حملہ آور کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی پھر فرید بخاری مجھ سے بڑا گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد، تھانے سے رخصت ہو گیا۔

''ایک اجنبی شخص نے طیش کے عالم میں چھری کا وار کر کے دوسرے شخص کو شدید زخمی کیا اور موقع سے فرار ہو گیا......''

یہ اسٹیٹمنٹ بہ ظاہر بہت معمولی دکھائی دیتا ہے لیکن میرا دل اسے معمولی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اجنبی لفنگا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو بات آئی گئی ہو جاتی مگر اس کی پراسرار گمشدگی ہی میری بے چینی کا اصل سبب تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے ٹہوکا دیتی تھی کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا گڑبڑ ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں انہی پریشان کن سوچوں کے ساتھ چونکھی لڑ رہا تھا کہ مشتاق احمد اور جاوید شاہ واپس آ گئے۔ اب وہ خاصے ہشاش بشاش اور پرسکون دکھائی دیتے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں بتایا کہ میں نے سوہدرہ کی جانب آنے اور یہاں سے باہر جانے والے راستے کے ایک خاص مقام پر ناکا لگایا ہے جہاں میرے تھانے کا ایک کانسٹیبل حیدر علی موجود ہے۔ تم دونوں کو اس مشن میں حیدر علی کی مدد کرنا ہو گی۔

''آپ نے جو کچھ سمجھایا ہے، ہم اسی پر عمل کریں گے۔'' جاوید شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''شاباش!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

میں نے انہیں مزید ضروری ہدایات سے ''لیس'' کیا پھر اپنی معیت میں وہاں چھوڑ آیا جہاں کانسٹیبل حیدر علی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے بعد میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

جب ماموں کے ''قتل'' کی اطلاع مجھے ملی تھی اس وقت میں تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کر چکا تھا اور مجھے بڑی کڑاکے کی بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اب صورت حال کافی بدل چکی تھی۔ پچھلے تین گھنٹے کی بھاگ دوڑ نے مجھے اس قدر تھکا دیا تھا کہ میری بھوک غائب ہو گئی تھی۔

اصولی طور پر تو اب مجھے اور زیادہ بھوک محسوس ہونا چاہیے تھی لیکن بعض اوقات تمام اصول اور قاعدے قانون دھرے رہ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ تاہم خالی پیٹ سونا بھی عقل مندی نہیں تھی لہٰذا میں نے تھوڑا بہت کھایا، عشا کی نماز ادا کی اور کوارٹر کے صحن میں چارپائی بچھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

❀❀❀

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔

میں ناشتے سے نمٹا ہی تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر تیز دستک کی آواز سنائی دی۔ ذہن فوری طور پر اس اجنبی فتنہ پرور شخص کی طرف چلا گیا جس نے پچھلی رات تیز دھار چھری کا وار کر کے ماموں تکے والے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ایسا سوچنا ایک فطری عمل بھی تھا۔ تھانے کے عملے کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کتنے بجے اپنے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں لہٰذا کوارٹر کے دروازے پر عام حالات میں اس وقت دستک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گزشتہ رات میں نے تین چار گھنٹے جس نوعیت کی مصروفیت میں گزارے تھے، انہیں عام حالات یا نارمل سچویشن نہیں کہا جا سکتا تھا چنانچہ اجنبی غنڈے کے حوالے سے کسی اہم اطلاع کی توقع کرنے کا مجھے پورا حق تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں دروازے کی جانب بڑھا کہ یقیناً اسی بندے کے بارے میں کوئی سنسنی خیز خبر ہو گی۔

جب تک میں مختصر سے صحن کو عبور کر کے بیرونی دروازے تک رسائی حاصل کرتا، دستک کی آواز ایک مرتبہ پھر ابھری جس سے واضح تھا کہ دستک دینے والا کسی اضطراری یا اضطرابی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ بہرحال، میں

نے دروازہ کھولا تو خالد بھٹی کی صورت نظر آئی۔

خالد بھٹی ایک کانسٹیبل تھا اور آج کل شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ میری سوالیہ نظر کے جواب میں وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

‘‘ملک صاحب! آپ فوراً تھانے آجائیں......!’’

‘‘کیا ہو گیا ہے بھئی؟’’ میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

‘‘بڑا غضب ہو گیا ہے جی۔’’ وہ بہ دستور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ‘‘رفعت بی بی کی لڑکی غائب ہو گئی ہے گھر سے اور...... الزام آرہا ہے فوجی چاچا پر......’’

‘‘یہ کیا بکواس کر رہے ہو خالد......!’’ میں نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ‘‘رفعت کی لڑکی کا فوجی چاچا سے کیا تعلق......؟’’

‘‘یہ تو آپ تھانے آکر خود ہی دیکھ لیں کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے یا نہیں۔’’ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ‘‘دونوں پارٹیاں آئی بیٹھی ہیں کافی دیر سے......’’

فوجی چاچا سے اس کی مراد فرید بخاری تھی کیونکہ سوہدرہ میں اسے بخاری، بخاری صاحب کے علاوہ ‘‘فوجی چاچا’’ بھی کہا جاتا تھا۔ رفعت بی بی کی لڑکی کا مطلب تھا، شرمیلی یعنی زرینہ...... جس کی آج چندر کلاں سے برات آنے والی تھی اور خالد بھٹی مجھے یہ اطلاع دے رہا تھا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ یہ بڑی خطرناک اور سنسنی خیز اطلاع تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ‘‘ٹھیک ہے، تم انہیں بٹھاؤ آرام سے۔ میں دس منٹ میں آتا ہوں۔’’

‘‘یس سر!’’ یہ کہتے ہوئے خالد بھٹی واپس چلا گیا۔

یہ ایک نیا سلسلہ سامنے آگیا تھا جس کے حوالے سے ذہن میں پہلے سے کوئی سوچ تھی ہی نہیں۔ مجھے قوی امید تھی کہ مجھ تک جو بھی پہلی اطلاع پہنچے گی اس کا تعلق اسی نامعلوم شخص سے ہوگا جس نے پچھلی رات ماموں کو شدید زخمی کر دیا تھا۔

وردی پہنتے ہوئے میں اس نئی ہنگامی صورت حال کے بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ ذہن کے کسی گوشے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

‘‘شرمیلی کی گمشدگی میں کہیں اسی اجنبی بدمعاش کا ہاتھ تو نہیں؟’’

یہ ناممکن نہیں تھا۔ جس نوعیت کے حالات پچھلے بارہ گھنٹے سے دیکھنے میں آرہے تھے ان کی روشنی میں کچھ بھی بعید نہیں تھا، گویا آج کا دن پھر بھاگ دوڑ اور افراتفری میں گزرنے والا تھا۔

میں برآمدے سے گزر کر اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا تو وہاں نصف درجن افراد کو بیٹھے دیکھ کر چونک گیا۔ ان میں سے صرف ایک چہرہ ایسا تھا جسے میں پہچانتا تھا اور چہرہ تھا ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری کا۔ اس کے علاوہ پانچ چھ افراد اور بھی تھے جن میں ایک دو عورتیں بھی شامل تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت تیزی سے آگے بڑھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے فریادی لہجے میں کہا۔

‘‘تھانیدار صاحب! میں تو لٹ گئی۔ میری جوان بچی گھر سے غائب ہو گئی ہے۔ میں دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ تھوڑی دیر بعد تو اس کی برات آنے والی ہے......’’ لمحاتی توقف کر کے اس نے بخاری کی جانب اشارہ کیا پھر احتجاجی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

‘‘مجھے پکا شک ہے کہ اسی بندے نے میری شرمیلی کو غائب کروایا ہے......!’’

میں نے فریادی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ‘‘تم رفعت بی بی ہو نا؟’’

‘‘جی...... میں ہی شرمیلی کی بدنصیب ماں ہوں۔’’

پھر میں نے اس کے پیچھے کھڑے مرد کی جانب اشارہ کیا اور رفعت سے سوال کیا۔ ‘‘اور یہ تمہارا گھر والا نیاز علی ہے؟’’

‘‘نہیں جی، یہ تو میرا دیور افتخار علی ہے۔’’ رفعت نے جواب دیا۔ ‘‘نیاز علی کا چھوٹا بھائی۔ نیاز علی تو شرمیلی کی خبر سن کر گر گیا تھا۔ اسے اتنی زور کا چکر آیا کہ دھڑام سے زمین پر گرا اور اس کے سر میں شدید چوٹ آئی ہے۔ اس لیے میں نیاز علی کو گھر میں چھوڑ آئی ہوں اور......’’ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک عورت کی جانب انگلی اٹھائی اور بتایا۔

‘‘یہ میری چھوٹی بہن نگہت ہے اور باقی بھی ہمارے مہمان ہیں۔’’

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ان نصف درجن افراد میں زیادہ تر رفعت بی بی ہی کے حمایتی تھے۔ فرید بخاری بے چارہ اکیلا ہی نظر آتا تھا۔

برآمدے میں کھڑے کھڑے کچہری لگانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا میں نے رفعت بی بی سے کہا۔ ‘‘تم میرے کمرے میں آکر اپنا بیان لکھواؤ۔’’ اور باقی لوگوں پر میں نے واضح کر دیا۔

‘‘تم میں سے کوئی ایک فرد رفعت کے ساتھ میرے کمرے میں آسکتا ہے۔ دہاں میلا لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔’’

بات ختم کرتے ہی میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد رفعت بی بی اور افتخار علی میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے رفعت بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

‘‘دیکھو بی بی! مجھے تمہاری بچی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے۔ میں اسے جلد از جلد بازیاب کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔’’

‘‘میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جی۔’’ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ‘‘بتائیں، مجھے کیا کرنا ہوگا......؟’’

‘‘سب سے پہلے تو تم مجھے اس واقعے کی تفصیل بتاؤ!’’

‘‘اچھا جی! بتاتی ہوں......’’ یہ کہہ کر وہ شروع ہو گئی۔

رفعت بی بی کے بیان کے مطابق، گزشتہ رات گھر میں شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ خوب گہما گہمی تھی۔ گھر عزیز رشتے داروں سے بھرا ہوا تھا۔ آدھی رات سے کچھ دیر پہلے سب لوگ سو گئے۔ پھر آج صبح جب گھر کے لوگ بیدار ہوئے تو شرمیلی غائب تھی۔ شرمیلی کو گھر میں نہ پا کر ایک قیامت سی جاگ اٹھی۔ یہ انہونی سب کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ آج دن میں زرینہ عرف شرمیلی کی برات آنے والی تھی اور وہ غائب ہو گئی تھی۔ رفعت بی بی کی پریشانی یہ تھی کہ وہ لوگوں کو اور خصوصاً براتیوں کو کیا جواب دے گی۔ اس کی تکلیف اپنی جگہ درست تھی لیکن اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں لہٰذا وہ جیسے ہی اپنا بیان مکمل کر کے خاموش ہوئی، میں نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

‘‘کیا رات کو شرمیلی اکیلی سوئی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟’’

‘‘اس کے ساتھ اس کی سہیلی تھی۔’’ رفعت نے جواب دیا۔ ‘‘شاہدہ نام ہے اس کا۔’’

‘‘شاہدہ اور شرمیلی کسی کمرے میں سوئی تھیں یا......؟’’

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو رفعت جلدی سے بولی۔ ‘‘جی، وہ دونوں اندرونی کمرے میں سوئی تھیں۔ باقی سب لوگ دوسرے کمروں میں اور صحن میں سوئے ہوئے تھے۔’’

‘‘آج صبح جب تم لوگ جاگے تو شرمیلی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔’’ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ‘‘سب سے پہلے گھر کے کس فرد کو پتا چلا تھا کہ شرمیلی غائب ہو چکی ہے؟’’

‘‘شاہدہ ہی نے یہ اندوہناک خبر سب کو دی تھی۔’’ افتخار علی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بتایا۔ ‘‘اس وقت تک گھر کے بیشتر لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ اکا دکا بس سو رہے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی گھر میں ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔ پہلے شرمیلی کو ادھر ادھر تلاش کیا گیا۔ جب وہ کہیں نہ ملی تو ہم نے تھانے کا رخ کیا ہے جناب اور اب ہم آپ کے سامنے بیٹھے ہیں......’’ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔

‘‘تھانے دار صاحب! یہ جو باہر ریٹائرڈ فوجی بیٹھا ہوا ہے نا...... مجھے تو پورا شک ہے کہ شرمیلی کو اسی نے غائب کیا ہے۔’’

‘‘جی ہاں......’’ رفعت نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ‘‘مجھے بھی اس پچھل پر شک ہے جناب......!’’

‘‘آپ لوگ کس بنا پر فرید بخاری کو شرمیلی کی گمشدگی کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں؟’’ میں نے رفعت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ‘‘وہ تو برسوں سے آپ کا پڑوسی ہے۔ اس کی شرمیلی سے یا آپ لوگوں سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے......؟’’

‘‘میں مانتی ہوں کہ ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی ہے، دشمنی کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن......!’’

‘‘لیکن کیا رفعت بی بی......؟’’ وہ ذرا سا اٹکی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

‘‘بخاری صاحب نے کل رات کو جو ڈراما کیا ہے وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔’’ رفعت نے ‘‘لیکن’’ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ‘‘اسی وجہ سے میرا دھیان اس کی طرف جا رہا ہے۔ ایسا رویہ اس نے یا اس کے گھر والوں نے پہلے کبھی نہیں دکھایا تھا۔ میں تو حیران ہوں کہ رات کو اسے ہو کیا گیا تھا......؟’’

‘‘تھانے دار صاحب!’’ افتخار علی اپنی بھابی کی تائید میں بولا۔ ‘‘رفعت بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے خود بھی اس

بخاری کی حرکت بہت ناگوار گزری تھی۔"

"دیکھیں جی، اگر کسی آوارہ شخص نے ماموں تکے والے کو چھری مار کر زخمی کر دیا ہے تو اس میں ہمارا اور ہمارے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کا کیا قصور ہے۔" رفعت بی بی نے برہمی سے کہا۔

"یہ اس کی کوئی چال بھی ہوسکتی ہے تھانے دار صاحب!" افتخار علی نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "وہ اس بہانے گھر کے اندرونی ماحول کا جائزہ لے رہا تھا تاکہ اسے اپنے کام میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ میں تو کہتا ہوں جناب......" اس نے رازدارانہ انداز میں توقف کیا پھر دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تو کہتا ہوں جناب کہ آپ اس فوجی چاچا کو زیرِ تفتیش لاکر اس سے کڑی پوچھ گچھ کریں تو شرمیلی کا کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔"

"ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں!" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "شرمیلی کی گمشدگی کے حوالے سے آپ لوگ جس پر بھی اپنا شک ظاہر کریں گے، میں اس سے کڑی تفتیش کروں گا۔" میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ رات فوجی چاچا نے آپ کے گھر میں کس قسم کی سرگرمی دکھائی تھی......؟"

ان دونوں نے مل جل کر مجھے جو واقعہ سنایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ ریٹائرڈ فوجی فرید بخاری، گاؤں ہی کے ایک بندے کے ساتھ خفیہ نوعیت کی تفتیش کرتا پھر رہا تھا۔ اسے کسی ایسے اجنبی شخص کی تلاش تھی جو ماموں تکے والے کو شدید زخمی کر کے کہیں غائب ہوگیا تھا۔ فوجی چاچا کو یقین تھا کہ مذکورہ شخص سوہدرہ کا وسنیک نہیں، لہٰذا وہ کسی کے گھر آیا ہوا مہمان بھی ہوسکتا ہے۔ اس رات سب سے زیادہ مہمان چونکہ شادی والے گھر میں موجود تھے اور یہ گھر فوجی چاچا کا پڑوس بھی تھا لہٰذا اس کی تفتیش کا مرکز بھی یہی گھر بنا رہا۔ اگر اس پوچھ گچھ کا دائرہ رفعت کے گھر سے باہر ہی رہتا تو انہیں فرید بخاری کی یہ حرکت شاید اتنی ناگوار نہ گزرتی لیکن جب اس نے تفتیش کے بہانے گھر کے اندر بھی جھانکنا شروع کیا تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ بہرحال رفعت وغیرہ نے ایک دیرینہ پڑوسی ہونے کے ناتے اس کے کام میں مداخلت نہیں کی لیکن جب آج صبح زرینہ عرف شرمیلی اپنے کمرے سے غائب پائی گئی تو سب کا دھیان فوراً فوجی چاچا اور اس کی رات والی کارروائی کی طرف چلا گیا اور اب یہ فساد رفعت کے گھر سے سفر کرتے ہوئے تھانے تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے بڑی توجہ سے ان دونوں کی بات سنی اور فوراً یہ بھی محسوس کرلیا کہ رفعت بی بی کے دل میں تو فوجی چاچا کے لیے مخالفانہ جذبات اتنے زیادہ نہیں تھے لیکن افتخار علی کے بھڑکانے نے اسے خاصا گرم کر دیا تھا۔ وہ اپنی کم اور دیور کی زبان زیادہ بول رہی تھی۔ افتخار کے انداز سے یہی جھلکتا تھا کہ اسے ایک سو ایک فیصد یقین ہے، شرمیلی کی گمشدگی میں فوجی چاچا کے سوا اور کسی کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال، وہ لوگ ایک فریاد لے کر میرے پاس آئے تھے لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آپ لوگ مطمئن ہو کر گھر جائیں، تھوڑی دیر میں، میں بھی پہنچ رہا ہوں، ضروری کارروائی کے لیے۔ انشاءاللہ! میں جلد از جلد شرمیلی کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

"اور اس مچھل فوجی چاچا کا آپ کیا کریں گے!" افتخار علی نے مجھ سے استفسار کیا۔ "جو ہمارے پیچھے ہی تھانے پہنچا ہے اور اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے؟"

"اس کے خلاف میں نے آپ کی شکایت سن لی ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں فرید بخاری سے کڑی پوچھ گچھ کروں گا۔ اگر وہ اس معاملے میں ملوث پایا گیا تو اطمینان رکھیں، وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

"مجھے تو میری بچی واپس مل جائے، بس......" رفعت بی بی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے کورٹ کچہری اور مقدمے بازی کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"بھابی! آپ زیادہ پریشان نہ ہو......" افتخار علی نے رفعت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھانے دار صاحب بہت جلد شرمیلی کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اگر وہ مچھل ہماری بچی کی گمشدگی میں ملوث ہے تو پھر تھانا کچہری بھی ہوگا اور اس بدمعاش کو سخت سزا بھی ملے گی۔"

"شرمیلی برات آنے سے پہلے مل جائے گی نا تھانے دار صاحب......؟" وہ حسرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری ناک نہیں کٹنا چاہیے جناب!"

"رفعت بی بی! میری کوشش تو یہی ہے کہ تمہاری بیٹی جلد از جلد بازیاب ہوجائے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آگے اللہ کی جو مرضی۔ تم بھی شرمیلی کے ملنے کے لیے دعا کرو۔"

تھوڑی دیر بعد میں نے رفعت بی بی کو تسلی تشفی دے کر اس کے دیور کے ساتھ روانہ کر دیا اور فرید بخاری المعروف بہ مچھل فوجی چاچا کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھنے کے بعد تازہ ترین صورت حال کی وضاحت کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔

"بخاری صاحب! آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے یقیناً اس بات کا اندازہ ہے کہ رفعت بی بی کی گم شدہ لڑکی والے معاملے میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ نے جس کھلے ڈلے انداز میں اس اجنبی بدمعاش کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اسی نے ان لوگوں کو آپ پر شک ظاہر کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔"

"مجھے اپنے نشانہ بننے یا موردالزام ٹھہرائے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ملک صاحب! کیونکہ میں جانتا ہوں، شرمیلی کی گمشدگی سے میرا کوئی تعلق واسطہ ہی نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "رفعت کے گھر میں شادی کی وجہ سے اتنے زیادہ لوگ جمع تھے کہ میں گھر میں داخل ہوئے بغیر فرداً فرداً ان کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا لہٰذا مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، وہ قانون کی مدد کرنے کے لیے کیا ہے لیکن افسوس کہ ہمارا مطلوبہ بندہ تو نہ مل سکا اور یہ ایک نیا پھڈا اٹھ کھڑا ہوا......!"

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ماموں کو زخمی کر کے فرار ہونے والے شخص کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا اور یہ بھی ایک ٹھوس سچائی ہے کہ شرمیلی اپنے گھر سے غائب ہوچکی ہے۔" میں نے بخاری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تجزیاتی انداز میں کہا۔ "میری معلومات کے مطابق وہ بندہ ابھی تک سوہدرہ کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا تو میرے عملے کی نظر سے بچ نہیں سکتا تھا اور یہی بات میں زرینہ عرف شرمیلی کے لیے بھی کہوں گا......" میں نے لمحاتی توقف کر کے معنی خیز نظر سے بخاری کو دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنے گھر سے غائب ہوچکی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے یا کوئی زبردستی اسے اٹھا کر لے گیا ہے، اس بات کا فیصلہ بعد میں کیا جاسکتا ہے، سردست میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی ابھی تک موضع سوہدرہ کے اندر ہی کہیں موجود ہے۔ وہ بھی اگر سوہدرہ کو چھوڑنے کا ارادہ کرتی تو بچ کر نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے رات ہی میں نگرانی کا ایسا بندوبست کر دیا تھا کہ سوہدرہ سے باہر جانے والا کوئی شخص قانون کی نظر میں آئے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"ملک صاحب......! وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کہیں شرمیلی کی گمشدگی میں بھی اسی بدمعاش کا ہاتھ تو نہیں جس نے رات ماموں کو شدید زخمی کر دیا تھا؟"

"ایسا ہوسکتا ہے اور آپ کی طرح میرا ذہن بھی اسی انداز میں سوچ چکا ہے......" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں گھر گھر گھس کر تلاشی لینا ہوگی پھر ہی بات بن سکے گی۔"

"آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں ملک صاحب!" وہ پرخیال انداز میں بولا۔ "لیکن میرا دھیان کسی اور طرف بھی جا رہا ہے۔"

"کس طرف؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر ہم فرض کرلیں اور جیسا کہ موجودہ حالات بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ماموں کو شدید زخمی کرنے والا وہ لفنگا ہی شرمیلی کی گمشدگی کا ذمے دار ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ یہ کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا ہے۔ شرمیلی اپنی مرضی سے غائب ہوئی ہے اور وہ بھی اپنی رخصتی سے ایک رات پہلے۔ مجھے تو یہ کوئی عاشق معشوقی کا چکر نظر آرہا ہے جناب!" لمحاتی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"اگر شرمیلی کو زبردستی اغوا کیا جاتا تو شادی والے گھر میں کوئی نہ کوئی افراتفری تو یقیناً پھیلنا چاہیے تھی نا...... رات کو سب ٹھیک ٹھاک سوئے اور صبح پتا چلا کہ دلہن ہی گھر میں موجود نہیں یا تو شرمیلی خود اپنی مرضی سے کہیں گئی ہے جناب اور یا پھر گھر کے کسی فرد نے اس سلسلے میں اس کی معاونت کی ہے۔ یہ اغوا کا معاملہ ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتا!"

"بخاری صاحب! میں آپ کے تجزیے سے کافی حد تک اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ذہن نے فوری طور پر جو لائحہ عمل ترتیب دیا ہے اس کی روشنی میں ہمیں دو محاذوں پر نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک محاذ میرا ہے اور دوسرا آپ کا۔"

"یہاں تک تو سمجھ گیا ہوں جناب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آگے فرمائیں۔"

میں نے فرمایا۔ "آپ نے مجھے کل پندرہ بندے فراہم کیے تھے جن میں سے دو، اسلم اور جاوید کو میں نے اپنے ایک کانسٹیبل کے ساتھ لگا رکھا ہے۔ باقی تیرہ کی مدد سے آپ سوہدرہ کے چاروں جانب ایک گھیرا سا بنالیں گے تاکہ شرمیلی اور مطلوبہ بدمعاش میں سے کوئی یا وہ دونوں ایک ساتھ کہیں جانے کی کوشش کریں تو آپ لوگ انہیں فوراً قابو کرلیں۔ اب ہمیں ان خطوط پر بھی سوچنا ہے کہ وہ دونوں

ساتھ ہیں......'' میں نے اتنا کہہ کر تھوڑا توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''آپ چونکہ شرمیلی کے پڑوسی بھی ہیں اور آپ نے کسی عاشقی معشوقی والے معاملے کی بھی نشاندہی کی ہے اس لیے اس معاملے کی جڑ کھودنا بھی آپ ہی کے فرائض کا حصہ ہے۔ آپ اپنے گھر کی خواتین سے مدد لیں اور جلد از جلد یہ پتا چلانے کی کوشش کریں کہ شرمیلی اس شادی پر راضی بھی تھی یا اس کے گھر والے زبردستی بیاہ رہے تھے اور...... اگر وہ واقعی فاروق نامی، چندر کلاں کے اس جوان سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو پھر اس کا رجحان کس طرف تھا...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کام میں کرلوں گا۔ اب ذرا آپ اپنے مشن کے بارے میں بھی تو بتائیں؟''

''میں اپنے عملے کے دو تین افراد کے ساتھ فوراً رفعت بی بی کے گھر جا رہا ہوں۔'' میں نے بخاری کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سب سے پہلے تو جائے وقوعہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں شاہدہ نامی اس لڑکی کا کڑا انٹرویو بھی اہم ثابت ہوگا جو شرمیلی کی بڑی گہری سہیلی ہے اور وقوعہ کی رات وہ شرمیلی والے کمرے میں سوئی ہوئی تھی......'' میں نے ذرا دیر کو رک کر سانس درست کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد ہم خانہ تلاشی کا سلسلہ شروع کریں گے۔ میری خواہش اور کوشش تو یہی ہے کہ شرمیلی کی برات کی آمد سے پہلے ہی اسے برآمد کرلوں۔''

''بشرطیکہ...... وہ ابھی تک گاؤں کے اندر موجود ہو......!'' بخاری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

فرید بخاری عرف فوجی چاچا کا آخری جملہ بڑا پر معنی اور فکر انگیز تھا لیکن پتا نہیں کیوں، میرے اندر سے ایک صدا ابھر رہی تھی کہ زرینہ عرف شرمیلی سوہدرہ ہی میں سے ملے گی۔ یہ چھٹی حس کا اشارہ بھی ہوسکتا تھا، کیونکہ زرینہ عرف شرمیلی آدھی رات کے بعد ہی گھر سے نکلی تھی اور میں اس سے بہت پہلے موضوع سوہدرہ کی ناکا بندی کا تسلی بخش بندوبست کر چکا تھا۔

شرمیلی اپنی شادی سے ایک رات پہلے گھر سے غائب ہوگئی تھی تو اس کا صاف صاف مطلب یہی تھا کہ وہ اس شادی کے لیے راضی نہیں تھی۔ صحیح صورت حال کا اندازہ جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا۔

ماموں والے واقعے میں جن افراد نے حملہ آور کو قریب سے دیکھا تھا ان کے مطابق اس کا حلیہ کچھ اس طرح کا تھا۔ عمر تیس سال کے آس پاس، رنگ گورا، قد درمیانہ، مائل بہ فربہی، ہلکی ہلکی اور باریک سی مونچھیں، دائیں آنکھ کے اوپری حصے میں کسی پرانے زخم کا لگ بھگ دو انچ لمبا نشان جیسے کبھی کسی تیز دھار آلے سے اس پر وار کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں اس کی آنکھوں میں سرخی بھی تیرتی بتائی گئی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط، ایک غصیلا شخص تھا۔

یہ ایک ایسا حلیہ تھا جو سنتے ہی مجھے ذہن نشین ہوگیا تھا۔ اگر وہ شخص اچانک میرے سامنے آجاتا تو میں اسے پہچاننے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کرتا۔ ایک لحاظ سے بڑا عجیب و غریب کیس تھا۔

***

شادی والا گھر ماتم کدے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

میں لگ بھگ نو بجے شرمیلی کے گھر میں موجود تھا اور دلچسپ بلکہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ گزشتہ رات یہاں سے کہیں اور منتقل ہوچکی تھی۔ آج دن میں ہی کسی بھی وقت اس کی برات آنے والی تھی۔ چندر کلاں کا ایک نوجوان فاروق احمد، شرمیلی کو بیاہ کر اپنے ساتھ لے جانے والا تھا اور وہ اپنی رخصتی سے پہلے ہی رخصت ہوچکی تھی۔ کہاں......؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اپریل کا وسط گرمی کے لحاظ سے کچھ کم ظالم نہیں ہوتا۔ آج کل جون اور جولائی والی قیامت خیزی تو نہیں تھی پھر بھی لگ پتا رہا تھا۔ ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے اور سورج نے اپنا دیدار ایسے جلالی انداز میں کرایا تھا کہ جسم کا ایک ایک مسام پسینا اگلنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

رفعت بی بی اینڈ کمپنی کا گھر چار بڑے کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل تھا۔ دو بڑے کمرے گھر کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے برآمدہ اور پھر سامنے صحن پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے جنہیں پہلو بہ پہلو نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ ان دونوں کے بیچ میں گھر کا داخلی دروازہ واقع تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چند پھل دار اور پھول دار پودے لگے ہوئے تھے اور دوسری دیوار کے ساتھ ایک قطار میں باتھ روم اور باورچی خانہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہیں پر ایک کونے سے زینہ شروع ہوتا تھا جو باورچی خانے کی چھت کے اوپر سے ہوتے ہوئے کمروں کی چھت تک

پہنچا تا تھا۔ یہ تمام تر معلومات مجھے گھر کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد پتا چلی تھیں۔

رفعت بی بی کے دیور افتخار علی نے گھر کے دروازے پر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں انڈر بیٹھک میں لے گیا۔ یہ سامنے والے دو کمروں میں سے ایک تھا۔ رفعت بی بی بھی فوراً میرے پاس آگئی اور ایک مرتبہ پھر روہانسے انداز میں مجھ سے التماس کرنے لگی کہ میں جلد از جلد اس کی بیٹی زرینہ عرف شرمیلی کو ڈھونڈ نکالوں۔ میں نے اس کی دکھ درد بھری باتیں سماعت کیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے کسی بھی قسم کی کارروائی کا آغاز کرنے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے بغیر میں شرمیلی کی تلاش میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکوں گا۔''

''جی بتائیں...... کون سی دو چیزیں؟'' رفعت نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ایک تو میں شرمیلی کی سہیلی شاہدہ سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جو پچھلی رات شرمیلی کے ساتھ کسی کمرے میں سوئی تھی اور دوسرے مجھے وہ کمرا ابھی دکھا دو جہاں سے شرمیلی غائب ہوئی ہے......؟''

''شاہدہ تو تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے گھر گئی ہے جی!'' رفعت نے بتایا۔ ''میں ابھی کسی کو بھیج کر اسے بلا لیتی ہوں اور آپ آئیں میرے ساتھ، میں آپ کو شرمیلی والے کمرے میں لے چلتی ہوں۔''

''کیا شاہدہ کہیں قریب ہی رہتی ہے؟'' میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''جی...... ساتھ والے گھر میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایک طرف شاہدہ کا گھر ہے اور دوسری جانب اس مچھل فوجی چاچا کا جو پچھلی رات تھانیدار بن کر ہمارے گھر میں کسی اجنبی بدمعاش کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

میں نے رفعت کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے گلی میں کھڑے ہو کر مکانوں کی قطار کا ایک سرسری سا جائزہ لیا تھا۔ بخاری کے حوالے سے جس سمت رفعت نے اشارہ کیا تھا، وہ گلی کا پہلا مکان تھا۔ اس کے ساتھ رفعت بی بی کا گھر تھا اور پھر لگ بھگ بارہ چودہ مکان اور تھے گلی میں۔

میں نے رفعت بی بی کی معیت میں قدم بڑھانے سے پہلے، ساتھ آئے ہوئے دونوں کانسٹیبلو کو اشارے سے اپنے پاس آنے کو کہا پھر انہیں کمرے کے کونے میں لے جا کر دھیمے لہجے میں ضروری ہدایات دینے لگا۔ انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور اثبات میں گردنیں ہلاتے ہوئے رفعت بی بی کے گھر سے باہر نکل گئے۔

میں نے انہیں اس گلی کے دونوں کونے سنبھالنے تاکید کی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ احکام بھی دیے تھے کہ وہ ایک ایک دروازے پر نظر رکھیں اور کسی بھی قسم کی غیر معمولی بات دیکھیں تو فوراً حرکت میں آجائیں۔ وہ میرے مقصد کی تہ میں اتر کر احکام کی تعمیل کے لیے فوراً روانہ ہو گئے تھے۔

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا اور وہ یہ کہ تھانے سے روانہ ہوتے وقت میں نے تین افراد کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ ان میں دو تو یہی کانسٹیبلو تھے، تجمل حسین اور صفدر علی اور...... تیسرا شخص تھا محمد بوٹا!

محمد بوٹا کا شمار ''ساٹھا پاٹھا'' مردوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ شخص تھا۔ اس کی پیشہ وارانہ مہارت کا میں دل و جان سے قائل تھا اور گاہے بہ گاہے ضرورت پڑنے پر میں اس کی خدمات حاصل کرتا رہتا تھا۔ جی ہاں...... محمد بوٹا ایک مانا ہوا ماہر کھوجی تھا۔

صفدر اور تجمل باہر چلے گئے تو میں نے رفعت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ افتخار علی بھی میرے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب ہم لوگ بیٹھک سے نکل کر گھر کے صحن میں داخل ہوئے تو افتخار علی نے رفعت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھابی! آپ تھانیدار صاحب کو شرمیلی والا کمرا دکھاؤ، میں شاہدہ کو بلانے کسی کو اس کے گھر بھیجتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......'' رفعت اثبات میں گردن ہلا کر آگے بڑھ گئی۔

وہ چار بڑے کمروں اور ایک کشادہ صحن والا گھر تھا لیکن ان دنوں چونکہ وہ شادی والا گھر تھا اس لیے مہمانوں کی موجودگی کے باعث بہ قول شخصے، کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں رفعت بی بی کی راہنمائی میں، گھر کے عقبی کمروں میں سے ایک کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے تھانے میں ہی رفعت اور افتخار کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ اس کمرے کو لاک کر دیا جائے جہاں رات کو شرمیلی سوئی تھی۔ انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ ابھی رفعت نے میرے سامنے ہی کمرے کا تالا کھولا تھا۔

میں محمد بوٹا کے ساتھ مذکورہ کمرے میں داخل ہوا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بوٹا جی! وہ لڑکی جس کا کھرا نکالنا ہے وہ پچھلی رات اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس کمرے میں سوئی تھی۔ میں نے اس کی سہیلی کو بلا لیا ہے۔ آپ کام شروع کریں۔''

میرا اشارہ پا کر محمد بوٹا اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا اور

کمرے کے فرش کو عقابی نظر سے گھورنے لگا۔ اس دوران میں، میں رفعت بی بی سے محو گفتگو رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''رفعت بی بی! آج صبح سب سے پہلے کس کو پتا چلا تھا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہے؟''

''یہ اطلاع تو شاہدہ ہی نے دی تھی۔'' رفعت نے بتایا۔ ''وہ کمرے سے باہر نکلی اور یہ خبر سنائی کہ شرمیلی کمرے میں موجود نہیں......!''

''پھر آپ لوگوں نے کیا، کیا تھا؟''

''یہ خبر سنتے ہی ہم پریشان ہو گئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم نے شرمیلی کو پورے گھر میں تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی نہ ملی تو آس پڑوس کے گھروں سے بھی پوچھ کر دیکھ لیا مگر......''

وہ ٹوٹے ہوئے انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''رات کو شرمیلی اور شاہدہ نے کمرے کے دروازے کو بند کر لیا تھا یا کھلے ہوئے دروازے کے ساتھ ہی سوئی تھیں؟''

''انہوں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔'' رفعت نے جواب دیا۔ ''لیکن نہ تو بند کیا تھا اور نہ ہی اندر سے کنڈی لگائی تھی۔''

''جب تمہیں پتا چلا کہ شرمیلی گھر سے غائب ہو چکی ہے تو اس وقت تمہارا بیرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''میں اس وقت گھر کے صحن میں کھڑی تھی جب شاہدہ نے کمرے سے نکل کر مجھے یہ بری خبر سنائی تھی......'' رفعت بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور یہ منحوس خبر سنتے ہی میرا دھیان آپوں آپ باہر والے دروازے کی طرف گیا تھا اور میں نے دیکھا، دروازہ بند تھا۔''

''دروازہ بند تھا مطلب...... محض بھڑا ہوا تھا یا اندر سے کنڈی بھی لگی ہوئی تھی؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی......!''

رفعت بی بی کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ گھر کے داخلی دروازے کو اندر سے کنڈی لگے ہونے کا مطلب یہ تھا کہ شرمیلی اس دروازے کے راستے گھر سے باہر نہیں نکلی تھی یا پھر گھر کے کسی فرد کی مدد سے وہ غائب ہوئی تھی جس نے اس کے جانے کے بعد بیرونی دروازے کو پھر سے کنڈی بند کر دیا تھا اور...... یہ کام شاہدہ کا بھی ہو سکتا تھا۔

آخری جملہ میرے ذہن کی پیداوار تھا اور اس کے اندر بے پناہ سنسنی بھری ہوئی تھی۔ شاہدہ، شرمیلی کی رازدار سہیلی تھی۔ اگر شرمیلی نے گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا تو عین ممکن تھا، اس نے اپنی رازدار سہیلی کو بھی اپنے منصوبے سے آگاہ کر رکھا ہو تاکہ اس کی مدد سے اپنے منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کر سکے۔

اس سے پہلے کہ میں رفعت بی بی سے مزید کوئی سوال پوچھتا، افتخار علی، شاہدہ کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے لامحالہ شاہدہ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ میں نے کھوجی بابا محمد بوٹا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بوٹا جی! یہ ہے گم شدہ دلہن کی سہیلی شاہدہ جو پچھلی رات اس کمرے میں موجود تھی۔ آپ ذرا اس کے پاؤں کا کھرا ابھی چیک کر لو۔''

''اس بچی کا کھرا تو میں چیک کر لیتا ہوں کیونکہ یہ میرے سامنے موجود ہے۔'' محمد بوٹا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کڑی کی کوئی چپل یا جوتی چاہیے جسے تلاش کرنا ہے......'' وہ لمحاتی توقف کر کے کھانسا پھر سرسری انداز میں بولا۔

''میں نے اس کمرے میں لگ بھگ دس افراد کے کھرے الگ الگ پہچان لیے ہیں۔ اب یہ پتا چلانا ہے کہ غائب ہونے والی دلہن کا کھرا ان میں سے کون سا ہے......!'' پھر وہ شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''دلہن رات کو کس بستر پر سوئی تھی؟''

اس کمرے میں دو چارپائیاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں جن پر بستر بھی لگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ظاہر ہے، ان میں سے ایک چارپائی پر شرمیلی اور دوسری پر شاہدہ سوئی ہو گی۔

شاہدہ نے دیوار کی جانب والی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جی، شرمیلی رات کو اس چارپائی پر سوئی تھی۔''

''ہوں......!'' محمد بوٹا معنی خیز انداز میں ہنکارا بھر کر ایک مرتبہ پھر زمین کا جائزہ لینے لگا پھر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''لائیں جی دلہن کے پاؤں کی کوئی جوتی......!''

رفعت نے فوراً محمد بوٹا کی ''فرمائش'' پوری کر دی۔ میں نے شاہدہ کو محمد بوٹا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''بوٹا جی! آپ اس کمرے میں کھرے وغیرہ کی تحقیق مکمل کر لو۔ اتنی دیر میں، میں رفعت بی بی سے چند

باتیں کرلیتا ہوں۔‘‘

اس نے سرسری انداز میں سر ہلایا اور اپنے کام میں جت گیا۔

میں رفعت بی بی کو لے کر واپس بیٹھک میں آگیا۔ افتخار علی سایہ بن کر ہمارے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر آجا رہا تھا چنانچہ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی وہاں پہنچ گیا۔ بیٹھک میں اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے سنجیدہ نظر سے باری باری ان دونوں کو دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’رفعت بی بی! شرمیلی کے باپ کو بھی یہاں بلالو۔ میں بہت ہی اہم بات کرنے والا ہوں...... نیاز علی ابھی تک مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ ہے کہاں؟‘‘

’’تھانے دار صاحب! آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی تو میں نے بھائی صاحب کو ایک بندے کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک بھیجا ہے۔‘‘ افتخار علی جلدی سے بولا۔ ’’شرمیلی کی گمشدگی سے وہ ڈھے گئے ہیں۔ میں تو ڈاکٹر کو گھر پر بلانا چاہتا تھا لیکن بھائی جی ہی نہیں مانے۔‘‘

’’آپ کو جو بھی کہنا ہے، ہم سے کہہ لیں۔‘‘ رفعت جلدی سے بولی۔

’’ٹھیک ہے!‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ’’ابھی میں آپ لوگوں سے جو دو تین سوالات پوچھنے والا ہوں... ان کا سچا اور کھرا جواب دینا ہے ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی کیونکہ......‘‘ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر ڈرامائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

’’کیونکہ میں اس بارے میں کافی کچھ جانتا ہوں۔‘‘

یہ آخری جملہ میری طرف سے ایک نفسیاتی چال تھی حالانکہ میں کسی بھی حوالے سے قطعاً کچھ نہیں جانتا تھا۔

وہ دونوں تشویش بھری نظروں سے مجھے تکنے لگے پھر افتخار علی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ’’ایسی کیا...... بات ہے...... تھانے دار جی......؟‘‘

’’کیا شرمیلی اس شادی کے لیے دل سے راضی تھی؟‘‘

میرے سوال نے انہیں بری طرح چونکا دیا۔ انہوں نے ہڑبڑائی ہوئی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر یکے بعد دیگرے میری جانب دیکھتے ہوئے متاملانہ انداز میں بولے۔

’’جج...... جی...... کیا مطلب ہے...... آپ کا......؟‘‘

ان کی گھبراہٹ نے بڑے واضح انداز میں مجھے دیا کہ محض دال میں کچھ کالا ہی نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔ فوجی چاچا کی سمجھائی ہوئی بات اس موقعے پر بہت کام آرہی تھی۔

’’میرا مطلب وہی ہے جو آپ دونوں بڑی اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے پتا چلا ہے، شرمیلی فاروق احمد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ اسے کوئی اور لڑکا پسند تھا......؟‘‘

’’آپ کو کسی نے بہت غلط بتایا ہے تھانے دار جی۔‘‘ افتخار علی نے سچویشن کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہماری شرمیلی ایسی بچی نہیں تھی جناب!‘‘

’’وہ ایسی تھی یا نہیں، میں دو منٹ میں آپ کی نظروں کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔‘‘ میں نے خاصے سخت لہجے میں کہا۔ ’’شاہدہ، شرمیلی کی رازدار سہیلی ہے نا، یہ تو اس کے ہر چھوٹے بڑے معاملے سے اچھی طرح واقف ہوگی۔ جب میں تھانے لے جا کر اس سے تفتیش کروں گا نا، تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا...... آپ لوگ مجھے سختی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں تو اچھا ہی ہے۔‘‘

میرے ان دھمکی آمیز الفاظ نے ان دونوں کے مزاجوں پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ رفعت کی پریشانی ان لمحات میں ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔ وہ اپنے دیور کی طرف دیکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولی۔

’’افتخار...... میرا خیال ہے، تھانے دار جی کو...... سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے۔ یہ ہمارے ہمدرد ہیں اور شرمیلی کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

گویا بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ میں نے طنزیہ نظر سے افتخار علی کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’افتخار علی! تم سے کہیں زیادہ سمجھ دار تو تمہاری یہ بھابی ہے جسے دوست اور دشمن کی بہ خوبی پہچان ہے۔‘‘

’’میں نے تو جی......‘‘ وہ کھسیاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ ’’گھر کا پیٹ چھپانے کی کوشش کی تھی...... جب بھابی کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر اسی کی زبانی سن لیں آپ یہ کہانی بھی......!‘‘

’’کہانی تو میں رفعت بی بی کی زبانی سن ہی لوں گا افتخار علی......!‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’لیکن آج تم بھی میری ایک بات بڑی مضبوطی سے اپنے پلے باندھ لو۔ زندگی میں کبھی کام آئے گی......!‘‘

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’کون سی بات جناب......؟‘‘

’’یہ بات کہ......‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’تھانے دار اپنے تھانے کی حدود میں آنے والے علاقے کی دائی ہوتا ہے لہٰذا اس سے پیٹ چھپا کر کسی بھی گھر کا مسئلہ حل کرایا نہیں جاسکتا۔‘‘

میری اس پُرمغز نصیحت پر وہ شرمندہ سا ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں رفعت بی بی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اگلے تین منٹ میں رفعت بی بی کی معرفت میرے علم میں کچھ اس قسم کا اضافہ ہوچکا تھا کہ زرینہ عرف شرمیلی سوہدرہ ہی کے ایک جوان مشتاق عرف کھنڈی کی محبت میں گرفتار تھی۔ کھنڈی کے نام سے مشہور یہ لڑکا کبڈی کا ایک ستھرا کھلاڑی تھا اور اکھاڑے میں پہلوانی وغیرہ بھی کرتا تھا لیکن یہی کھنڈی شرمیلی کے والدین کو سخت ناپسند تھا کیونکہ سوہدرہ میں اس کی شہرت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ بھنگ اور چرس وغیرہ کا نشہ کرتا تھا اور ہلکی پھلکی غنڈا گردی بھی اس کے نامۂ اعمال میں رقم تھی لہٰذا نیاز علی اور رفعت بی بی کسی بھی قیمت پر شرمیلی کی شادی کھنڈی کے ساتھ کرنے کو تیار نہیں تھے......!

یہ تمام تر معلومات خاصی اہمیت کی حامل تھیں جو اس جانب اشارہ کرتی تھیں کہ شرمیلی اپنی مرضی سے کہیں نکل گئی تھی اور اس ’’کہیں‘‘ کا سیدھا سیدھا مطلب تھا...... کھنڈی!

میں نے رفعت بی بی سے سوال کیا۔ ’’جب تم ان تمام حالات سے اچھی طرح واقف ہو تو پھر تم نے شرمیلی کی گمشدگی کے بعد مشتاق عرف کھنڈی کو تو ضرور چیک کیا ہوگا؟‘‘

’’جی، سب سے پہلے ہم نے اسی کے گھر میں جھانکا تھا۔‘‘ رفعت کے بجائے افتخار علی نے جواب دیا۔ ’’اس کے گھر سے پتا چلا ہے کہ کھنڈی پچھلے دو دن سے سوہدرہ ہی میں نہیں ہے۔‘‘

’’وہ کہاں گیا ہوا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اس کی ماں نذیراں نے بتایا ہے کہ وہ اپنی خالہ بشیراں کے گھر گیا ہوا ہے۔‘‘ رفعت بی بی نے جواب دیا۔ ’’بشیراں گجرات شہر میں رہتی ہے۔ نذیراں کا کہنا ہے کہ کھنڈی تین چار دن کے بعد ہی واپس آئے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے......‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ’’میں کھنڈی، نذیراں اور بشیراں...... سب کو باری باری چیک کروں گا لیکن پہلے اس گھر میں کام مکمل ہوجائے۔‘‘

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر محمد بوٹا کی صدا ابھری۔ ’’آجائیں ملک صاحب! دلہن کا کھرا مل گیا ہے۔‘‘

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھک سے باہر نکلا۔ محمد بوٹا

چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ سیڑھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے، گم شدہ دلہن ان سیڑھیوں کے ذریعے مکان کی چھت پر پہنچی تھی اور پھر وہیں سے وہ فرار ہوئی ہے۔''

''چھت سے فرار ہوئی ہے......!'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے بوٹا جی......؟''

''سرکار! میں نے چھت پر چڑھ دلہن کے کھرے کا مکمل تعاقب کیا ہے جی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ان تیرہ چودہ مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ دلہن کا کھرا ایک چھت سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت پر سے ہوتے ہوئے سب سے آخری گھر کی چھت تک گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ......'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چیک یہ کرنا ہوگا جناب کہ فرار ہونے والی دلہن آخری مکان کے اندر اتری ہے یا گھر کی عقبی جانب کود گئی ہے۔ ان مکانوں کی قطار کے پیچھے کھلا میدان ہے۔''

میں نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس آخری گھر میں کون رہتا ہے؟''

''وہ جی رمضان اور صغریٰ کا گھر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے پانچ بچوں کے ساتھ وہاں رہتے ہیں۔''

''کیا تم نے شرمیلی کو رمضان اور صغریٰ کے گھر میں بھی دیکھا تھا؟''

''جی، وہاں بھی تلاش کیا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن ان لوگوں کو بھی شرمیلی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اگر وہ ان کے گھر میں اتری ہوتی تو وہ لوگ مجھے ضرور بتا دیتے۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ مکان کی عقبی سمت میدان میں کودی ہوگی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر محمد بوٹا کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا ''بوٹا جی، اب کھرے کا سلسلہ آخری مکان کے عقب سے شروع کیا جائے...... کیا خیال ہے؟''

''بڑا نیک خیال ہے جناب۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کیونکہ دلہن کے پاؤں کا کھرا بھی اسی بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ مکان کے پیچھے، میدان میں کودی ہوگی۔''

''تو چلیں، پھر ادھر ہی چلتے ہیں......'' میں نے دروازے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا پھر شا[illegible] کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں اضافہ کیا۔

''جب تک میں واپس نہیں آجاتا، تم ادھر ہی رہوگی۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔''

''جی......!'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

میں کھوجی محمد بوٹا کے ہمراہ رفعت بی بی کے گھر سے باہر نکلا تو اسی وقت شرمیلی کا باپ نیاز علی ڈاکٹر کو دکھا کر واپس آگیا۔ وہ ایک مسکین صورت ادھیڑ عمر شخص تھا، بیٹی کی گمشدگی نے جسے اور بھی یتیم بنا دیا تھا۔ وہ شکل ہی سے جورو کا غلام دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس سے رسمی سی علیک سلیک کی اور تسلی دینے کے بعد آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے مجھے افتخار علی کی آواز سنائی دی۔

''تھانے دار صاحب! آپ لوگ چلیں۔ میں بھائی صاحب کو اندر لٹا کر آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور محمد بوٹا کے ساتھ اپنے مطلوبہ مقام کی جانب قدم بڑھانے لگا۔

کانسٹیبلو تجمل حسین اور صفدر علی میرے حکم کے مطابق اپنی ڈیوٹی پر مستعد کھڑے نظر آ رہے تھے۔ جلد ہی ہم مکانوں کی قطار کو ''پھلانگتے'' ہوئے آخری گھر کے عقب میں پہنچ گئے۔ محمد بوٹا نے پہلے کمر کے بل جھک کر اور پھر اکڑوں بیٹھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں کچی زمین کا معائنہ فرمایا پھر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! کام بن گیا ہے......''

''کام بن گیا ہے!'' میں نے امید بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مطلب یہ کہ...... شرمیلی کا سراغ مل گیا ہے؟''

''جی ہاں...... میں یہی کہہ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ لڑکی مکان کی چھت سے کودنے کے بعد اس طرف گئی ہے۔''

محمد بوٹا نے میدان کی دوسری جانب اشارہ کیا تھا جدھر مکانوں کی ایک دو مزید قطاریں بنی ہوئی تھیں اور ایک کچا مکان ذرا ہٹ کر تھوڑے فاصلے پر تن تنہا دکھائی دے رہا تھا۔ اس مکان سے آگے وہ راستہ تھا جو میرے تھانے اور بس اسٹینڈ کی طرف جاتا تھا۔ میں محمد بوٹا کی معیت میں رفتہ رفتہ میدان عبور کرنے لگا۔ محمد بوٹا نے شرمیلی کا کھرا پکڑ رکھا تھا اور میں نے محمد بوٹا کو...... ہم ست روی سے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔

ابھی ہم نے میدان کے اندر نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے ایک گھڑسوار کو سامنے والے مکانوں کی قطار کے عقب سے نمودار ہو کر مذکورہ کچے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس گھڑسوار کو دیکھ کر میں چونک اٹھا تھا اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا تھا۔

''یہ کون ایسی تیزی سے کچے مکان کی طرف جا رہا ہے......؟''

محمد بوٹا کا دھیان چونکہ کھرا اٹھانے کی طرف لگا ہوا تھا لہٰذا میرے توجہ دلانے پر اس نے گردن اٹھا کر کچے مکان کی سمت دیکھا لیکن اس اثنا میں مذکورہ گھڑسوار کچے مکان کے عقب میں غروب ہو چکا تھا۔

''ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے ملک صاحب!'' محمد بوٹا نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''پہلے تھا...... اب نہیں ہے......'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے ان مکانوں کے پیچھے سے نکلا تھا اور کچے مکان کے پیچھے غائب ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس گھڑسوار کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''ملک صاحب! آپ نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا ہے نا، اس لیے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں، ہم اسی کچے مکان کی طرف جا رہے ہیں۔ ابھی پتا چل جائے گا، وہ گھڑسوار کون ہے......!''

''ہم کچے مکان کی طرف کیوں جا رہے ہیں بوٹا جی؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے جا رہے ہیں کہ دلہن شرمیلی کے پاؤں کا کھرا اسی سمت ہمیں لے کر جانا چاہتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میرا تجربہ بتا رہا ہے کہ اس میدان سے گزرتے ہوئے وہ لڑکی اسی کچے مکان کی طرف گئی ہے......'' بات کے اختتام پر محمد بوٹا نے متذکرہ بالا کچے مکان کی جانب اشارہ بھی کر دیا تھا۔

''کیا واقعی......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس سے پہلے کہ محمد بوٹا میرے سوال کا جواب دیتا، سوہدرہ کی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم دونوں نے چوکنا نظروں سے کچے مکان کی طرف دیکھا کیونکہ گولی چلنے کی آواز اسی جانب سے آئی تھی۔

میں نے سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھاما اور پلک جھپکتے میں کچے مکان کی سمت دوڑ لگا دی۔ جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے بھی دوڑتے ہوئے قدم مصروف عمل ہیں۔ میں نے دوڑنے کے دوران میں پلٹ کر عقب میں دیکھا تو مجھے کانسٹیبلو تجمل حسین اور صفدر علی کی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ بھی بھاگتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔

میں ابھی مذکورہ کچے مکان سے سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ اس مکان کے پیچھے سے ایک گھڑسوار برآمد ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ گھوڑا تو وہی تھا جو تھوڑی دیر پہلے میں نے اس مکان کے عقب میں غروب ہوتے دیکھا تھا لیکن اس بار گھڑسوار وہ نہیں تھا لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز اور دلچسپ بات یہ تھی کہ مذکورہ گھڑسوار کو بھی دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے...... پھر اگلے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ وہ کون ہے۔

ماموں تکے والے پر قاتلانہ حملہ کرنے والے اجنبی لفنگے کا حلیہ میرے ذہن میں نقش تھا اور یہ گھڑسوار اس حلیے پر صد فیصد فٹ بیٹھتا تھا۔ اس کے فرار ہونے کا انداز گواہی دیتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اسی نے ایک گولی فائر کی ہوگی...... یہ احساس ہوتے ہی میں نے اس گھڑسوار کو للکارا۔

''رک جاؤ...... ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔''

میرے ان دھمکی آمیز الفاظ کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے مجھ پر جوابی فائرنگ کی اور گھوڑے کو مزید تیز بھگانا شروع کر دیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے نیچے جھک کر خود کو بچا لیا۔ یہ بڑے فیصلہ کن لمحات تھے۔ میں اس بھگوڑے گھڑسوار کو ڈرانے دھمکانے میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا، پھر میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں نے کسی ماہر نشانچی کے مانند بھاگتے ہوئے گھوڑے کی ٹانگوں کا نشانہ باندھ کر یکے بعد دیگرے دو فائر کر دیے۔

میری یہ محنت رائگاں نہیں گئی۔ میرے ریوالور سے نکلنے والی گولیوں نے گھوڑے کی ٹانگوں کو بری طرح گھائل کر ڈالا تھا۔ وہ بڑے کرب ناک انداز میں بلبلایا پھر لڑکھڑا کر زمیں بوس ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تکلیف کی شدت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

گھوڑے کے گرتے ہی گھڑسوار کے بدن نے بھی میدان کی سنگ ریز زمین کو ایک زوردار بوسہ دیا، پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر کھڑا ہوتا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا، میں نے اس کے سر پر پہنچ کر اسے قابو کر لیا۔ اس کی جانب اٹھی ہوئی میرے ریوالور کی خطرناک نال نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اگر وہ ایک انچ بھی ادھر ادھر ہلا تو اس

کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ جائیں گے...... اس کا پستول زمین پر گرتے ہی ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا تھا۔

اگلے ہی لمحے صرف تجمل حسین اور صفدر علی ہی نہیں بلکہ مزید نصف درجن افراد بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ یہ فوجی چاچا کی ٹیم کے لوگ تھے جنہیں میں نے گاؤں کے گرد متعین کر رکھا تھا۔ انہی لوگوں میں فرید بخاری عرف فوجی چاچا بھی بہ نفس نفیس موجود تھا۔

میں نے اجنبی مجرم کو الٹی ہتھکڑی لگا کر صفدر علی اور تجمل حسین کے حوالے کیا اور خود بخاری صاحب کے ساتھ اس کچے مکان کی جانب بڑھ گیا جہاں سے پہلی گولی چلنے کی صدا ابھری تھی۔

وہ ایک متروک متنازع چھوٹا سا مکان تھا جہاں پچھلے سال، ڈیڑھ سال سے کوئی بھی نہیں رہ رہا تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ مذکورہ مکان کا کیس وزیر آباد کی ایک عدالت میں چل رہا تھا اور عدالت ہی کے حکم پر اس کچے مکان کو تالا بند کر دیا گیا تھا لیکن موجودہ حالات چیخ چیخ کر اس حقیقت کی گواہی دے رہے تھے کہ اس مکان کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

ہم جیسے ہی مکان کے اندر داخل ہوئے، صورت حال کھل کر سامنے آگئی۔ دو کمروں والے اس مکان کے کچے صحن میں افتخار علی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے سے ابلنے والے خون نے اسے نہلا سا دیا تھا۔ اسی لمحے مجھے یاد آگیا کہ تھوڑی دیر پہلے میں نے افتخار علی ہی کو گھوڑے پر سوار اس مکان کے پیچھے غروب ہوتے دیکھا تھا۔ دراصل مذکورہ مکان کی پشت میدان کی سمت تھی اور سامنے والا حصہ اس راستے کی جانب تھا جو تھانے کی طرف جاتا تھا۔

کمروں کی تلاشی بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ ایک کمرے میں سے شرمیلی بازیاب ہوگئی لیکن انتہائی خراب حالت میں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کمر کورسی کی مدد سے ایسا کس کر باندھا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک انچ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ اس بہیمانہ سلوک پر صدائے احتجاج بلند کرنے کے قابل نہ رہے۔

میں نے پہلی فرصت میں شرمیلی کی ساری بندشیں کاٹ ڈالیں اور اس کے منہ کو بھی فی الفور آزاد کر دیا پھر اسے ایک چارپائی پر بٹھا کر پانی پلایا۔ اس دوران میں فوجی چاچا بھاگ کر کہیں سے پانی لے آیا اور اس کے ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی پورے سوہدرہ میں پھیل گئی کہ گم شدہ دلہن زرینہ عرف شرمیلی کو بازیاب کر لیا گیا ہے۔

گاؤں والے جوق در جوق اس کچے مکان کی جانب دوڑ پڑے جہاں اس وقت میں موجود تھا۔ آپ خود ہی تصور کر لیں کہ میں نے اس صورت حال سے کیسے نمٹا ہوگا۔

❀❀❀

شرمیلی کی شادی کو ایک ماہ کے لیے مؤخر کر دیا گیا تھا۔

وہ جن حالات سے گزری تھی اس کے پیش نظر خوشی یا شادی وغیرہ کا تصور وقتی طور پر دھندلا سا گیا تھا۔ اس افسوس ناک واقعے کا اختتام جتنا ڈرامائی اور سنسنی خیز ہوا تھا، میں اس کہانی کے تین اہم کرداروں میں سے دو کے بیانات کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ پیش منظر کے ساتھ ہی اس داستان کا پس منظر بھی آپ کے ذہن میں نقش ہو جائے۔ میں نے جن دو کرداروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک تو ہے زرینہ عرف شرمیلی اور دوسرا ہے، یعقوب عرف قوبا...... جی ہاں، یہ قوبا وہی نامراد شخص ہے جس نے پچھلی رات ماموں تکے والے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔

اس کہانی کے تیسرے اہم کردار کا محض ذکر ہی کیا جا سکتا ہے کیونکہ اب وہ کسی بیان شیان کے قابل نہیں رہا تھا۔ میرا اشارہ افتخار علی کی جانب ہے......!

شرمیلی کے مطابق، اسے دن میں ایک چھوٹے بچے کے ہاتھ ایک چھٹی ملی تھی۔ اس نے تنہائی میں جب چٹھی کو کھول کر پڑھا تو پتا چلا، وہ خط اس کے محبوب مشتاق عرف کھنڈی کی جانب سے تھا اور اس نے شرمیلی سے آخری ملاقات کے لیے التجا کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس خط کے ذریعے سختی سے یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ یہ معاملہ صرف انہی دونوں کے بیچ رہے اور شرمیلی نے کھنڈی کی ہدایت پر من و عن عمل کرتے ہوئے اپنی رازدار سہیلی کو بھی اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ اگلے دن اس کی رخصتی تھی اور وہ بھی سوہدرہ چھوڑنے سے پہلے ایک بار اپنے محبوب سے اچھی طرح مل لینا چاہتی تھی۔ کھنڈی نے چٹھی میں ملاقات کے لیے شرمیلی کو باقاعدہ ایک پروگرام دیا تھا جس کے مطابق آدھی رات کے بعد، جب گھر کے تمام افراد گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہوں تو شرمیلی کو چپکے سے اپنے مکان کی چھت پر پہنچنا تھا اور پھر چھت در چھت سفر کرتے ہوئے گلی کے آخری مکان تک رسائی حاصل کرنا تھی جہاں مکان کے عقب میں اسے دیوار کے ساتھ ایک بانس کی سیڑھی لگی ہوئی ملتی۔ اسے سیڑھی کے ذریعے مکان

کی چھت سے نیچے اترنا تھا اور پھر میدان کو عبور کر کے اس کچے مکان تک پہنچنا تھا جو کافی عرصے سے کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ کھنڈی نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ مذکورہ کچے مکان کے اندر اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ خاموشی کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو کر اس تک پہنچ جائے۔ کھنڈی نے واضح کر دیا تھا کہ وہ مکان کے داخلی دروازے کو کھلا رہنے دے گا لہٰذا وہ بے دھڑک اندر آجائے۔ واپسی میں وہ شرمیلی کو اس سیڑھی تک پہنچانے ساتھ آئے گا جس کے ذریعے اسے واپس اپنی گلی کے آخری مکان کی چھت تک پہنچنا تھا۔ اس کے بعد کھنڈی وہاں سے سیڑھی ہٹا دیتا اور وہ اپنے گھر آجاتی...... اللہ اللہ، خیر سلا!

شرمیلی نے اس ملاقات والے معاملے کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے کھنڈی کی بھیجی ہوئی چٹھی کے مطابق عمل کر ڈالا اور جب اسے اپنی گلی کے آخری مکان کے پچھواڑے ایک دیوار کے ساتھ بانس کی سیڑھی لگی نظر آئی تو اسے یقین ہو گیا کہ کھنڈی اس کچے غیر آباد مکان میں ضرور اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ میدان عبور کر کے کشاں کشاں اپنے محبوب سے ملاپ کے لیے اس مکان کے اندر داخل ہوگئی۔

قوبا پہلے سے گھات لگائے وہاں بیٹھا شرمیلی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شرمیلی صورت حال کو سمجھ پاتی، قوبا نے اسے بے بس کر کے ایک چارپائی پر ڈال دیا۔ قوبا ایک جرائم پیشہ شخص تھا لہٰذا شرمیلی پر قابو پا کر اسے رسیوں میں جکڑنے کا مرحلہ اس کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ شرمیلی اس کچے مکان میں دیدار یار کے لیے گئی تھی اور ایک خطرناک مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، قوبا ایک جرائم پیشہ شخص تھا، اس کا تعلق حافظ آباد کے ایک گاؤں سے تھا۔ سوہدرہ میں کوئی اس کی صورت نہیں پہچانتا تھا اور جسے بہ قول قوبا ہی کے، افتخار علی نے ایک خاص مشن کے لیے چن لیا تھا۔ قوبا کی خدمات کا آدھا معاوضہ اس نے ایڈوانس میں وصول کیا تھا اور باقی کا آدھا کام کی تکمیل کے بعد اسے ملنا تھا۔

قوبا کے بیان کے مطابق اسے سوہدرہ کے ایک غیر آباد مکان میں بیٹھ کر کسی حسین و جمیل لڑکی کا انتظار کرنا تھا۔ افتخار علی نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس نے لڑکی کو مذکورہ مکان تک پہنچانے کا بڑا پکا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ آدھی رات کے بعد اکیلی اس مکان میں پہنچ جائے گی۔ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شرمیلی تک کھنڈی کے حوالے سے جو خط پہنچا تھا، وہ سراسر افتخار علی ہی کی کارستانی تھی۔ کھنڈی تو سوہدرہ میں موجود ہی نہیں تھا۔ افتخار علی کو چونکہ شرمیلی کی کمزوری کا پتا تھا لہٰذا اس نے یہی چال چلی تھی اور شرمیلی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی چال میں آ بھی گئی تھی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ اس کا محبوب محض اس سے ملاقات کے لیے گجرات سے واپس آگیا تھا۔ اس کی قسمت بری کہ وہ نقلی چٹھی کے فریب میں آگئی تھی۔

رات کے آخری حصے میں افتخار علی قوبا کے پاس پہنچا اور مکان کے اندر داخل ہوئے بغیر دروازے پر ہی کھڑے کھڑے پہلے لڑکی کی آمد کی تصدیق کی پھر اس نے قوبا سے سرگوشی میں کہا۔ ”بے وقوف! تمہاری حماقت نے بڑی گڑبڑ کر دی ہے......!“

”میں نے کیا حماقت کی ہے؟“ قوبا نے اس سے پوچھا۔

”تم نے تکے والے اس بڈھے سے جو جھگڑا کیا ہے نا اس کی وجہ سے تمہیں اس وقت پورے گاؤں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔“ افتخار نے پریشان لہجے میں بتایا۔ ”مجھے تو یہاں تک بھی پتا چل چکا ہے کہ پولیس نے سوہدرہ سے باہر جانے والے راستوں کی ناکا بندی...... کر دی ہے لہٰذا مجھے اپنے پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کرنا پڑے گی۔“

”کیسی تبدیلی؟“ قوبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ جس لڑکی کو تم نے باندھ کر اندر ڈال رکھا ہے نا، اسے ختم کر دو......!“

”کام تو ہو جائے گا لیکن رقم بڑھانا ہوگی۔“ قوبا نے مکاری سے کہا۔ ”میں پہلے والے معاوضے پر یہ کام نہیں کروں گا......!“

”رقم کی تم پروا نہیں کرو، میں تمہیں خوش کر دوں گا۔“ افتخار علی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اب میں کل صبح ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ کام ہو جانا چاہیے۔ میں تمہیں باقی کی رقم دے کر یہ بھی بتاؤں گا کہ تم کس محفوظ راستے کے ذریعے سوہدرہ سے باہر جا سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں ساری معلومات حاصل کر لوں گا......“

قوبا نے اسے یقین دلایا کہ اس کے کہے پر من و عن عمل کیا جائے گا۔ افتخار مطمئن ہو کر واپس چلا گیا لیکن قوبا اس کے احکام پر مطمئن نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں، وہ شرمیلی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شرمیلی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب افتخار علی صبح اس کے پاس آئے گا تو وہ اسے کوئی چکر دے کر لڑکی کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے جائے

گا۔اس کا جو بھی نتیجہ نکلتا، وہ بھگتنے کو تیار تھا۔
اگلی صبح صورت حال ہی بدل گئی۔ ایک تو میں نے رات ہی کو اجنبی بدمعاش یعنی قوبا کی تلاش کے لیے خاصی لمبی چوڑی کارروائی ڈال دی تھی پھر آج صبح کھوجی بوٹا کی مدد سے میں نے شرمیلی کو بازیاب کرنے کا جو کام شروع کیا، اس نے افتخار علی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس بات کا تو اسے بہ خوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ میری تحقیق و تفتیش بہت جلد مجھے اس کچے مکان تک پہنچا دے گی جہاں قوبا موجود تھا۔ اگر قوبا پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو افتخار علی کا کچا چٹھا کھل جانا تھا لہٰذا جیسے ہی اسے موقع ملا، وہ ایک سنگین فیصلے کے ساتھ قوبا کی جانب روانہ ہوگیا۔

قوبا نے مجھے بتایا کہ صبح ہی سے کئی بار اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ باقی کی رقم کو بھول کر شرمیلی کے ساتھ کہیں فرار ہوجائے لیکن اس کی بدمعاشانہ سوچ نے اسے اس غلطی سے باز رکھا تھا۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ اپنے کام کا پورا معاوضہ وصول کرنا چاہیے۔ اگر جیب میں نوٹ بھرے ہوں گے تو ایک سے ایک حسین لڑکی اس کے قدموں میں اپنی جوانی لٹا دے گی۔ اس موقعے پر دل نے بڑی گہری چال چلی۔ اس نے دماغ کی نصیحت کا توڑ کرنے کے لیے یہ پٹی پڑھائی...... ''افتخار علی سے رقم وصول کرو، اس کے سر میں چوٹ لگا کر اسے ادھر ہی گراؤ اور لڑکی کو لے کر جدھر جی چاہے، نکل جاؤ۔ دولت اور لڑکی دونوں ہاتھ آنا چاہئیں۔''

اس کے دل اور دماغ میں جو مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے انہوں نے قوبا کو الجھا کر رکھ دیا اور اسی سوچ بچار میں وہ افتخار علی کا انتظار کرنے لگا۔ افتخار علی ایک مختلف ذہن کے ساتھ اس کے پاس پہنچا اور مکان کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کیا۔ اس نے اپنے لہجے کو بہت دھیما رکھا تھا۔

''لڑکی کا کام کر دیا ہے نا......؟''

''رات ہی کو کر دیا تھا!'' قوبا نے جواب دیا۔ ''اب لاؤ میری باقی رقم......!''

''باقی رقم تمہیں جہنم میں پہنچ کر ملے گی۔'' یہ کہتے ہوئے افتخار علی نے پستول نکال لیا۔

قوبا بھونچکا رہ گیا۔ سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔ ''کیا مطلب......؟''

''پولیس نے لڑکی کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ دس منٹ کے بعد یہاں پہنچ جائیں گے۔'' افتخار علی نے سفاکی سے کہا۔ ''اگر تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا اس لیے میں پولیس کی آمد سے پہلے ہی تمہیں جہنم روانہ کر رہا ہوں۔''

موت کو سامنے دیکھ کر انسان دنیا کا ہر عیش آرام بھول جاتا ہے اور اسے اپنی بقا کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ ان لمحات میں قوبا بھی رقم اور لڑکی کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ وہ چیتے کے مانند افتخار علی پر جھپٹا اور اس کے گولی چلانے سے پہلے ہی اس کا پستول چھین لیا، پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس نے افتخار علی کے سینے میں گولی اتاری اور اسی کے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کا احوال آپ پچھلے صفحات پر پڑھ چکے ہیں۔

افتخار علی اب اس دنیا میں باقی نہیں تھا جو کسی تصدیق یا تردید کے لیے اس سے سوال و جواب کیے جاتے۔ اس تمام تر بکھیڑے کے اختتام پر میں نے رفعت بی بی سے صرف ایک ہی سوال کیا تھا۔

''افتخار علی کی آپ لوگوں کے ساتھ آخر ایسی کون سی دشمنی تھی کہ اس نے شادی سے ایک دن پہلے اپنی سگی بھتیجی کے ساتھ یہ سلوک کیا......؟''

''اللہ تعالیٰ شاید نیاز علی کو کوئی سبق سکھانا چاہتا تھا۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''سانپ کے بچے کو چاہے کتنا بھی دودھ پلا دو وہ ڈسنے سے باز نہیں آتا......''

اس ''فلسفے'' کے بعد رفعت بی بی نے مجھے ایک واقعہ سنایا جس کا خلاصہ چند سطروں میں کچھ یوں بنتا ہے......

''نیاز علی اور افتخار علی میں شرمیلی کے رشتے پر ان بن ہوگئی تھی۔ افتخار علی شرمیلی کو اپنی بہو بنانا چاہتا تھا لیکن رفعت نے صاف انکار کر دیا۔ لگ بھگ ایک سال تک دونوں بھائیوں میں شدید مخالفت رہی۔ اب نیاز علی ہی کی منت خوشامد کے بعد یہ تعلقات بحال ہوئے تھے۔ افتخار نے اوپری دل سے صلح تو کر لی تھی لیکن موقع ملتے ہی وہ بس گھولنے سے باز نہیں آیا تھا۔ وہ شرمیلی کو منظر سے غائب کر کے رفعت بی بی کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا تھا۔''

یہ رفعت بی بی کا نقطۂ نظر تھا۔ اگر افتخار علی زندہ ہوتا تو میں اس کا موقف بھی جان سکتا تھا چونکہ ایسا ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا مجھے رفعت بی بی اور یعقوب عرف قوبا کے بیانات پر یقین کرنا پڑا اور ان دونوں کے بیانات آپس میں لگا کھاتے تھے۔

(تحریر: حسام بٹ)

سراب پسند

کاشف زبیر

یہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے... جب زندگی رستہ دیکھے تو مسافر بھٹک جاتا ہے اور جب بند گلی میں پھنستا ہے تو اسے رستے یاد آتے ہیں اور بالخصوص جب ان رستوں کے اختتام پر کوئی محوِ انتظار بھی ہو تو جذبات کی ہلچل کسی پل چین نہیں لینے دیتی... پل پل بدلتے اس کے مزاج میں بھی جب ٹھہراؤ آیا تو وقت کے وہ سنہرے پل اس کی دسترس سے دور جا چکے تھے۔ ان تلخ حقائق کے باوجود ایک خوش گمانی اسے اپنے حصار میں قید رکھتی تھی لیکن ایک روز اچانک... محبت کی خوشبو اسے بہت قریب سے آئی تو حصولِ محبت پر اس کا یقین پختہ ہوگیا۔

سراب رستوں پر محوِ سفر چاہتوں کی آنکھ مچولی

جوناتھن کلارک سست قدموں سے چلتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے تک آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''دروازہ کھول دو۔'' فلیٹ کے مرکزی کمپیوٹر نے اس کی آواز شناخت کی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آیا، سامان کا شاپر کچن کی صاف ستھری چمکتی دمکتی میز پر رکھا۔ پھر شاپر سے چیزیں نکال کر انہیں اپنی جگہ رکھنے لگا۔ یہ کام کر کے اس نے ایک خانہ کھول کر اس میں سے گلاس نکالا کہ اچانک وہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر گرا اور فرش پر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہ بے ساختہ

جھکا اور شیشہ اٹھانا چاہا مگر اس کے انگوٹھے میں ایک ٹیس اٹھی اور خون کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ شیشے نے اس کا انگوٹھا کاٹ دیا تھا۔ اس نے سنک کا نل کھولتے ہوئے انگوٹھا پانی کی دھار تلے رکھ دیا جب خون رک گیا تو اس نے زخم پر میڈیکیٹڈ پٹی لگائی، اسی لمحے کال بیل بجی۔ اس نے کچن میں لگی اسکرین کی طرف دیکھا۔ باہر دو افراد نظر آ رہے تھے اور وہ دونوں جوناتھن کے لیے جانے پہچانے تھے۔ یہ پال ریزر اور مائیکل فوگ تھے، پال نے کہا۔ ''ہے جونی، ہم تم سے ملنے آئے ہیں۔''

وہ ہچکچایا کہ جواب دے یا نہ دے۔ اس بار مائیکل نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں تم گھر میں ہو اور یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ اس کا مطلب تھا وہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر جاری بارش سے ان کے کوٹ بھیگے ہوئے تھے۔ جوناتھن نے سرد لہجے میں کہا۔ ''ایسی کیا بات ہے جو تم اس موسم میں چلے آئے؟''

مائیکل بولا۔ ''بات بہت اہم ہے۔ تم نے ایپی فیلا کے بارے میں ضرور سنا ہوگا؟''

''میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔'' جوناتھن نے خانے سے دوسرا گلاس لیا اور اپنے لیے وہسکی نکالی۔ اس نے ان دونوں کو نہیں پوچھا تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' پال نے بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ ''آدمی جب چاہے تو اپنی ریٹائرمنٹ واپس لے سکتا ہے۔''

''اگر تم دونوں یہی کہنے آئے ہو تو میرا خیال ہے اپنا اور میرا وقت ضائع کیا ہے۔''

مائیکل نے پال کو گھورا اور بولا۔ ''جونی اس وقت ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

جوناتھن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا... ویسے بھی تمہارے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔''

''ان میں سے کوئی بھی تمہاری طرح نہیں ہے کیپٹن جوناتھن کلارک۔'' مائیکل نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ حقیقت ہی ہمیں یہاں لے کر آئی ہے۔''

جوناتھن نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''تم غلط جگہ آئے ہو۔''

''ایک منٹ۔'' پال نے مداخلت کی۔ ''تم ایڈورڈ سے ایک ملاقات کیوں نہیں کر لیتے۔ اس کے پاس تمہیں دکھانے کے لیے کچھ ہے۔ تمہارے سابق دوست جیمز رائٹ کے بارے میں۔''

جوناتھن چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''ایپی فیلا مشن کا انچارج وہی ہے۔'' پال نے یوں کہا جیسے کوئی بہت اہم انکشاف کر رہا ہو۔ ایپی فیلا ملکی وے کہکشاں کے ایک بازو میں پایا جانے والا عجیب و غریب ستارہ تھا کیونکہ وہ بعید ترین بازو میں تھا اس لیے وہاں دو سال پہلے خلائی جہاز پہنچا تھا۔ عام ستاروں کے برعکس یہ دہکتا ہوا نہیں تھا بلکہ اس کی اوپری سطح پر نیلے، سبز اور نارنجی رنگ کے انوکھے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ماہرین فلکیات نے آج تک ایسا ستارہ نہیں دیکھا تھا۔ ایک بڑا خلائی جہاز جو تحقیق کے جدید ترین آلات سے لیس تھا، ایپی فیلا کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس مشن کا کمانڈر جیمز رائٹ تھا۔ اگر جوناتھن ریٹائر نہ ہو چکا ہوتا تو وہی اس مشن کا کمانڈر ہوتا کیونکہ خلائی ایجنسی کے پاس اس سے زیادہ تجربے کار خلاباز اور کوئی نہیں تھا۔ جوناتھن نے تین سال پہلے اچانک ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور اس وقت اس کی عمر بیالیس سال تھی۔ کسی خلاباز کے لیے یہ عروج کا زمانہ ہوتا ہے۔ جوناتھن نے خاصی کم عمری میں بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔

جوناتھن سوچ میں پڑ گیا۔ جیمز کا حوالہ اہم تھا لیکن پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے اولڈ مین سے ملاقات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''پلیز جونی بوائے۔'' پال نے پھر بذلہ سنجی کا مظاہرہ کیا۔ ''اوورا ے کپ آف ٹی۔''

''اس کے علاوہ۔'' مائیکل کا لہجہ اچانک سرد ہو گیا تھا۔ ''تم سیکشن تھرٹین کے رول ای نائن سے ناواقف نہیں ہو گے۔ اولڈ مین نے اسے ابھی استعمال کرنے کا نہیں سوچا ہے۔''

''دھمکی۔'' جوناتھن نے سوچا۔ یہ حقیقت تھی خلائی ایجنسی کے سربراہ ایڈورڈ گلین کے پاس یہ ہتھیار تھا اور وہ اسے استعمال بھی کر سکتا تھا۔ اگر اس کا انکار برقرار رہتا تو وہ یقیناً ایسا ہی کرتا۔ رول ای نائن کے تحت ایجنسی کو اختیار حاصل تھا کہ وہ ریٹائر ہونے والے خلاباز کی خدمات کسی مخصوص مشن کے لیے حاصل کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک خلاباز کی تربیت پر ایک متوسط شہر کے سالانہ بجٹ جتنی رقم خرچ کرتی تھی۔ اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''گڈ!'' پال نے چہک کر کہا۔ ''وہ کل صبح آٹھ بجے دفتر میں تمہارا منتظر ہوگا۔''

وہ دونوں اس کے فلیٹ سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد جوناتھن نے گلاس خالی کر کے اسے دھو کر احتیاط سے خانے میں رکھا۔ رمیلا کو بے ترتیبی سے چڑ تھی، اسے جنون کی حد تک صفائی ستھرائی کا شوق تھا۔ جوناتھن ٹوٹے گلاس کے ٹکڑے سمیٹتے ہوئے رمیلا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس کی بیوی تھی۔ مغربی معاشرے میں ویسے تو محبت کی شادی کی جاتی ہے لیکن انہوں نے بڑی گہری محبت کے ساتھ شادی کی تھی۔ ان کے درمیان پہلی ملاقات ایک سب وے میں ہوئی تھی۔ جوناتھن کو جس اسٹیشن پر اترنا تھا، رمیلا اس سے ایک اسٹیشن پہلے ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی اور جب جوناتھن نے اسے دیکھا تو اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ رمیلا اسے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن جوناتھن محسوس کر رہا تھا وہ اس کی طرف متوجہ ہے۔ یہ احساس بہت طاقتور اور یقین کی حد تک پختہ تھا۔ ان دونوں نے سمجھ لیا تھا کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے اگرچہ جوناتھن اپنے اسٹیشن پر اتر گیا تھا اور اس نے رمیلا سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

اولڈ مین ایڈورڈ گلین اپنے سادہ سے دفتر میں اس کا منتظر تھا۔ ''جونی بوائے کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

ایڈورڈ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''ہم بڑی مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ تین مہینے بعد خلائی ایجنسی کے لیے بجٹ منظور ہونے والا ہے لیکن کئی کانگریس اراکین ایپی فیلا مشن کے بارے میں مشکوک ہیں۔''

جوناتھن اس کی پریشانی سمجھ رہا تھا۔ درحقیقت یہ ایجنسی کے ہر سربراہ کا مسئلہ ہوتا تھا، ایک بجٹ کے فوراً بعد اسے اگلے بجٹ کی فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ بڑا بجٹ لینے والے سرکاری اداروں میں خلائی ایجنسی کا بجٹ سب سے زیادہ غیر یقینی ہوتا تھا۔ حالانکہ آغاز کے دنوں میں اسے بے حساب بجٹ ملا تھا مگر وہ مقابلے کا دور تھا جس میں مخالف سے آگے نکلنے کے لیے سب جائز تھا۔ اب وہ دور نہیں رہا تھا اور ایجنسی کے بجٹ پر ہمیشہ کٹوتی کی تلوار لٹکی رہتی تھی۔ جوناتھن خاموش رہا، وہ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر اس معاملے میں دلچسپی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا ایڈورڈ کھل کر بات کرے اور اسے اپنے دفاع کے لیے کوئی نقطہ مل جائے۔ اس کی خاموشی سے مجبور ہو کر اولڈ مین نے کہنا شروع کیا۔ ''ایپی فیلا پر ہمارا مشن کچھ عجیب طرح کی مشکلات سے دوچار ہے۔ میں اس کی صحیح سے وضاحت نہیں کر سکتا لیکن جیمز رائٹ کی ایک ویڈیو آئی ہے اور اس میں اس نے اپیل کی ہے کہ تمہیں فوری طور پر ایپی فیلا مشن کے لیے روانہ کیا جائے۔''

ایڈورڈ نے اپنے سامنے رکھے کی بورڈ کا بٹن دبایا اور دائیں طرف دیوار پر ہولوگرافک اسکرین نمودار ہوگئی۔ طویل فاصلے سے آنے والے ویڈیو کا معیار اچھا نہیں تھا لیکن جیمز رائٹ واضح تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں واضح بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ ہم کس مشکل میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ یہاں کچھ پراسرار سا ہے۔ شاید یہاں کچھ ایسی طاقتیں سرگرم ہیں جن کے بارے میں ابھی ہمارے سائنس دان بھی ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے۔ ناشا ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے رکا پھر کہا۔ ''میں ایجنسی سے درخواست کرتا ہوں جوناتھن کلارک کو یہاں روانہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے وہ صورت حال کو سمجھ لے گا اور شاید مشن کو بچا لے۔ اب میں براہ راست جوناتھن سے مخاطب ہوں۔ میرے دوست مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا تمہاری زندگی پر جو المیہ گزرا اور رمیلا تم سے الگ ہوئی، میں خود کو بھی اس معاملے میں قصوروار سمجھتا ہوں۔ اگر میں اصرار کر کے مارس مشن میں تمہارا نام شامل نہ کرتا تو شاید رمیلا یوں جدا نہ ہوتی۔ تمہارا ایپی فیلا آنا بہت ضروری ہے۔ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں یہ بات تم اس وقت سمجھو گے جب تم یہاں...'' اس کے بعد ویڈیو اچانک خراب ہوگئی۔

''یہ پیغام بس یہیں تک ہے اور اس کے بعد سے ایپی فیلا مشن کی طرف ہمارے رابطے کا کوئی جواب نہیں دیا جا رہا ہے۔''

''شپ اپنی جگہ موجود ہے؟'' جوناتھن نے پہلی بار کچھ پوچھا۔

''بالکل، شپ اپنی جگہ موجود ہے اور اس کے تمام آلات بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں کیونکہ کمپیوٹر سے رابطے پر وہ فوری جواب دیتا ہے لیکن شپ میں موجود کوئی انسان ہمیں جواب نہیں دے رہا ہے۔''

جوناتھن جانتا تھا اس مشن پر کل چھ خلاباز روانہ ہوئے تھے۔ مشن کمانڈر جیمز رائٹ تھا جو تجربے کار خلاباز اور خلائی جہاز کا انجینئر تھا۔ اس کا نائب ریڈیو اور رابطے کا ماہر جیک رونالڈ تھا۔ ناشا سکاری افریقن نژاد تھی اور وہ حرکی طبعیات اور ریڈیائی توانائی کی سائنس کی ماہر تھی۔ میگرول فربی کیمیائی سائنس کا ماہر تھا۔ ریڈ شا فلکیات کا ماہر تھا جبکہ سارہ جیکسن ڈاکٹر تھی۔ ساتھ ہی وہ بایولوجی کی ماہر بھی تھی۔ اس مشن میں

چن کر تمام ماہرین کو لیا گیا تھا جنہیں ایپی فیلا پر اپنے اپنے شعبے کے حوالے سے تحقیق کرنا تھی۔ خلائی جہاز مکمل طور پر خود کار تھا۔ اس کا مرکزی کمپیوٹر نہ صرف خلائی جہاز بلکہ مشن کے بہت سارے کام سنبھالنے کا اہل بھی تھا۔ تمام کام مشینوں سے خود کار انداز میں ہوتے تھے۔ کسی شخص کو سوائے اپنے کام کے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے خلائی جہاز پر چن کر عملہ لیا گیا تھا۔

''جونی! میں چاہتا ہوں تم ایپی فیلا جاؤ اور وہاں دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو ان لوگوں کو واپس لے آؤ۔ ہمارے لیے ان چھ افراد کی زندگی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔''

جوناتھن' اولڈ مین کے لہجے سے متاثر ہوا تھا، اسے معلوم تھا مشن کی ناکامی اس کے کھاتے میں ڈالی جائے گی لیکن وہ پہلے اپنے آدمیوں کی جان بچانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ اس سے اپیل کر رہا تھا۔ ''صرف ایک مہینے کی بات ہے۔ تم ایک ہفتے میں وہاں پہنچ جاؤ گے اور ایک ہفتہ واپسی میں لگے گا۔ دو ہفتے میں تم وہاں کے معاملات سمجھ لو گے۔ تم اس سے زیادہ مدت ٹھہرنے کے پابند نہیں ہو گے۔''

''کاش یہ موقع اسے پہلے دیا گیا ہوتا۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔ وہ دو ہفتے پہلے ہی مارس سے واپس آیا تھا اور اب کم سے کم تین مہینے کی چھٹی اس کا حق تھی لیکن جیمز رائٹ کے اصرار پر اسے صرف دو ہفتے بعد دوبارہ اگلے مشن کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ ایجنسی کے پاس انتخاب کا اختیار تھا اور پھر یہ مشن صرف دس دن کا تھا اس لیے رمیلا کی ذہنی حالت کے باوجود جوناتھن جانے کے لیے تیار ہو گیا مگر مشن بعض وجوہات کی بنا پر دو ہفتے سے بڑھ کر دو مہینے پر محیط ہو گیا تھا۔ بہر حال اب اگر مشن کی مدت بڑھ بھی جاتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہاں پیچھے اس کا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اس نے ایڈورڈ سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''میری پوزیشن کیا ہے، کیا مجھے انکار کرنے کا اختیار ہے؟''

ایڈورڈ ہچکچایا لیکن پھر اس نے سچ بولا۔ ''نہیں۔''

جوناتھن گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''مجھے کب جانا ہے؟''

''جلد از جلد۔''

☆☆☆

نہ جانے کیوں جوناتھن کو یقین تھا کہ اس حسین عورت سے اس کی ملاقات ضرور ہو گی جسے اس نے سب وے میں دیکھا تھا۔ وہ تیس سال سے زیادہ کی تھی، اس کا حسن اس کی عمر نہیں چھپا رہا تھا۔ طویل قامت اور کسی قدر چھریرے جسم کی وجہ سے وہ دبلی نظر آ رہی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں نمایاں تھیں لیکن یہ کمزوری کی وجہ سے نہیں تھیں، اس کے چہرے کی ساخت ہی ایسی تھی۔ آنکھیں بڑی اور تاثر انگیز تھیں۔ اس نے سب وے میں بہت خوب صورت سرخ کوٹ پہن رکھا تھا جو شاید اس کے سراپا کے لیے ہی بنا تھا۔ اس کا ایک ایک نقش جوناتھن کے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے دوسری بار رمیلا کو بالکل بدلے ہوئے حلیے میں دیکھا تو بھی فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک ریستوران میں تھا۔ وہ ویک اینڈ پر ڈنر کے لیے نکلے تھے۔ تب جوناتھن نے رمیلا کو کاؤنٹر پر اکیلے دیکھا۔ وہ ملک شیک لے رہی تھی۔ وہ اپنے دوستوں سے معذرت کر کے اس کے پاس آ گیا۔

''ہائے۔''

رمیلا نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ''ہائے۔''

جوناتھن نے پوری بے تکلفی اور پوری سچائی سے کہا۔ ''میں گزشتہ پانچ دن سے تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''میں بھی۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''میں جوناتھن کلارک ہوں۔''

''رمیلا پارکر۔''

اس کے بعد کے مراحل آسان تھے۔ وہ رمیلا کو اپنے دوستوں میں لے آیا، ان سے تعارف کرایا اور کچھ دیر میں وہ یوں ان میں شامل ہو گئی جیسے ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہ رہی ہو۔ گروپ میں دو خواتین بھی تھیں اس لیے اسے اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ اس دوسری ملاقات کے تین دن بعد جوناتھن اپنے گھر میں اپنے بستر پر صبح جاگا تو رمیلا اس کے برابر میں بے خبر سو رہی تھی۔ جوناتھن اٹھا اور واش روم سے فارغ ہو کر اس نے ناشتا تیار کیا اور پھر رمیلا کو اٹھایا۔ اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھی اور کہا۔ ''میں ہمیشہ تمہیں روز اسی طرح اٹھانا چاہتا ہوں۔''

رمیلا نے اس پروپوزل کا جواب دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ جانتی تھی ان دونوں کے پاس وقت کم ہے۔ وہ بتیس برس کی تھی اور جوناتھن اس وقت چالیس کا ہونے والا تھا۔ جوانی کے ولولوں اور پر جوش محبت کے لیے ان کے پاس نوجوانوں جتنا وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے

وہ سب کچھ بہت جلدی چاہتے تھے۔ ان کی شادی میں ان کے تمام قریبی رشتے دار اور دوست احباب شامل ہوئے تھے۔ جوناتھن مشہور شخصیت تھا اس لیے پریس و میڈیا نے بھی اس شادی کو کوریج دی تھی۔ شادی کے فوراً بعد وہ طویل ہنی مون پر روانہ ہو گئے۔ ان کا ہنی مون دنیا کے کئی حصوں میں تھا اور انہوں نے اس سے بھرپور لطف اٹھایا تھا۔ جب وہ واپس آئے تو خوشی سے سرشار تھے۔ رمیلا کا خیال تھا کہ وہ شاید ہمہ وقت ایسے ہی ساتھ اور خوش رہیں گے اس لیے جب واپسی کے ایک ہفتے بعد ہی جوناتھن کو ایک مشن پر جانا پڑا تو یہ بات رمیلا کے لیے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی تھی۔

☆☆☆

مقررہ وقت پر خلائی شٹل کے کمپیوٹر نے جوناتھن کو جگا دیا تھا۔ بہت طویل فاصلوں کے خلائی سفر میں خلابازوں کو بوریت سے بچانے کے لیے سلا دیا جاتا تھا۔ یہ سرمائی خواب جیسی نیند ہوتی تھی جو بہت طویل ہوتی تھی اس دوران میں خلاباز کا جسم ایک بکس میں محفوظ کر دیا جاتا تھا، اسے ڈرپ کے ذریعے خوراک دی جاتی تھی اور الیکٹرانک مساج سے جسم کو ٹھیک حالت میں رکھا جاتا تھا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ روشنی کی رفتار سے کئی گناہ زیادہ رفتار پر جاگتے انسان کے ذہن پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اس لیے خلابازوں کو سلا کر ان کے مشن پر بھیجا جاتا تھا۔ تیز رفتار شٹل نے اسے ایک ہفتے میں ایپی فیلا کے پاس پہنچا دیا تھا اور پھر کمپیوٹر نے جوناتھن کو جگا دیا۔ اس نے اٹھ کر لباس پہنا اور اپنے لیے کافی تیار کر کے کنٹرول پینل کی طرف آیا۔ سامنے تین رنگوں کے لہردار بادلوں سے ڈھکا ہوا حسین ترین ستارہ ایپی فیلا تھا۔ اس کے بادلوں سے رنگوں کے حلقے قوس قزح کی طرح اٹھ رہے تھے اور بکھر رہے تھے۔ جوناتھن نے اپنی پوری خلائی سروس میں ایسا کوئی ستارہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ زمین کی مخالف سمت میں کہکشاں کے مرکز کے دوسری طرف تھا اس لیے دوربینوں سے نظر نہیں آتا تھا۔ اسے ایک سروے کرنے والے خلائی جہاز نے اتفاق سے دریافت کیا تھا۔ جوناتھن مبہوت رہ گیا تھا۔ وہ خاصی دیر تک اس ستارے کو دیکھتا رہا پھر چونکا، اسے لگا جیسے ستارہ اس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہا ہو۔

اس نے شٹل کو خود چلانا شروع کیا اور جلد اسے خلائی جہاز نظر آ گیا۔ وہ ایپی فیلا سے محفوظ فاصلے پر اس کے گرد گردش کر رہا تھا، بالکل کسی مصنوعی سیارے کی طرح اور اس کے انجن بہ ظاہر بند تھے۔ البتہ اس کے اندر باہر کی تمام روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ شٹل کو احتیاط سے پورٹ ٹنل تک لے گیا اور پھر خلائی جہاز سے اٹھنے والے بازو نما بکس نے شٹل کو خلائی جہاز سے منسلک کر لیا۔ جوناتھن نے شٹل کا انجن بند کیا اور اٹھ کر ٹنل کے دروازے تک آیا۔ جیسے ہی پریشر مکمل ہوا دروازہ خود بہ خود کھل گیا اور وہ خلائی جہاز میں داخل ہو گیا۔ یہ بڑا خوب صورت خلائی جہاز تھا جس میں زیادہ کام شیشے جیسی دھاتوں سے لیا گیا تھا اور اس لیے سوائے رہائشی کیبن اور کنٹرول روم کے تقریباً پورا خلائی جہاز نظروں کے سامنے تھا۔ اسے کہیں کوئی چیز معمول سے ہٹ کر نظر نہیں آ رہی تھی سوائے اس کے کہ اسے کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیمز، جیک، ناشا، میگرول، ریڈ اور سارہ میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

جوناتھن فولادی جالی سے بنے فرش پر چلنے لگا۔ راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ تیسرے فلور پر واقع خلائی جہاز کے کنٹرول روم تک آیا اور وہاں اسے جیک ویڈیو گیم کھیلتا دکھائی دیا۔ وہ ایلین کو مار رہا تھا لیکن ایلین مرنے پر دو ہو جاتے تھے۔ کھیلنے والے کو بہت ہوشیار رہنا پڑتا تھا، ورنہ ایلین اسے بھی اپنے جیسا بنا دیتے اور گیم اوور ہو جاتا۔ یہ مہارت اور پھرتی سے زیادہ ذہانت کا کھیل تھا۔ نوعمری میں جوناتھن دیوانگی کی حد تک اس کھیل کو پسند کرتا تھا مگر وقت کے ساتھ اس کی پسند بدل گئی تھی۔ جوناتھن دروازہ کھول کر اندر آیا تو جیک بہ دستور گیم میں مگن رہا تھا۔ وہ دبلا اور خوش باش نوجوان تھا جس کے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی بھی بھلی لگ رہی تھی۔ بالآخر اس نے جوناتھن کی آمد محسوس کر لی اور اپنا گیم پوز کر دیا۔ پھر اس نے کرسی گھمائی اور اسے دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

''کیپٹن جونی... انہوں نے تمہیں بھی بھیج دیا۔''

جوناتھن نے محسوس کیا کہ جیک کے جملے میں لفظ بھی قابل غور تھا۔ کیا وہ کسی آفت میں ڈال دیا گیا تھا؟ کم سے کم جیک کے انداز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ جوناتھن نے کنٹرول روم کا جائزہ لیا۔ بہ ظاہر وہاں سب ٹھیک تھا، تمام آلات درست کام کر رہے تھے۔ خلائی جہاز کی بیٹریاں پوری پاور دے رہی تھیں۔ اندر نمی، آکسیجن کا تناسب اور دباؤ سب نارمل تھا۔ تمام اسکرین حالات کو معمول کے مطابق دکھا رہی تھیں، ہر اسکرین پر نیلے اور ہرے رنگ کے اشارے تھے، کہیں کوئی سرخ اشارہ نہیں تھا جو خطرے کی علامت ہوتا۔ جیک بھی بہ ظاہر نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتا، جیک نے کہا۔ ''کیپٹن

تمہارے خیال میں سوچ کیا ہے؟"

جوناتھن خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جیک نے کچھ دیر بعد خود جواب دیا اور سر پر انگلی مار کر بولا۔ "ہم سوچ کو یہاں گھومنے والے الفاظ، آواز اور تصویر و ویڈیو سمجھتے ہیں... لیکن سوچ اس سے بڑھ کر کچھ ہے۔"

"جیک!" اس نے پہلی بار کچھ کہا۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟"

جیک نے اس کا سوال سنا ہی نہیں یا سنا تو نظر انداز کر دیا، وہ کہہ رہا تھا۔ "ہم سوچ کو بہت محدود سمجھتے ہیں... در حقیقت یہ اتنی محدود نہیں ہے۔"

"جیک!" اس بار جوناتھن نے بلند آواز سے کہا۔ "میں پوچھ رہا ہوں باقی لوگ کہاں ہیں؟"

جیک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "اوہ... تو تم دوسروں کے بارے میں پوچھ رہے ہو... لیکن اتنی جلدی کیا ہے تم ابھی آئے ہو ابھی یہاں کے حالات دیکھو... تمہیں ہر سوال کا جواب خود مل جائے گا۔"

"جیک، مجھے ایجنسی نے خصوصی مشن پر بھیجا ہے کیونکہ خلائی جہاز کے حالات نارمل نہیں ہیں۔ یہاں سے کوئی کسی رابطے کا جواب نہیں دے رہا ہے۔ مجھے بتاؤ کیا یہاں کوئی حادثہ پیش آیا ہے یا حالات میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی ہے؟"

"نوپ۔"

"کسی ایلین نے حملہ کیا ہے... کوئی گیس... کوئی بیکٹر یا... کوئی...؟"

"نوپ... نوپ... نوپ۔" جیک نے پر زور انداز میں کہا۔ "تم بہت فکر مند انداز میں سوچ رہے ہو... اپنی سوچ کو نارمل کرو، یہاں غیر معمولی انداز میں سوچنا ٹھیک نہیں ہے۔"

جوناتھن نے محسوس کیا کہ جیک اگر صحیح الدماغ بھی تھا تب بھی وہ کسی خاص کیفیت میں تھا اور اس وقت اس سے کسی سوال کا جواب حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ واپس شٹل میں آیا، اس نے اپنا سامان اٹھایا اور ایک خالی کیبن میں آ گیا۔ خالی کیبن کے دروازے کھلے تھے جبکہ رہائشی کیبنوں کے دروازے بند تھے۔ اس نے نوٹ کیا کہ رہائشی حصے میں چھ کیبنوں کے دروازے بند تھے گویا وہ سب استعمال میں تھے۔ اس نے اپنا سامان ترتیب سے رکھا، اپنا خلائی سوٹ اتارا اور عام کپڑے پہن لیے۔ پھر اس نے اپنے کمرے میں موجود کمپیوٹر کی طرف توجہ دی۔ وہ گزشتہ دنوں کے معمولات چیک کرنے لگا۔ یہ کمپیوٹر مرکزی کمپیوٹر سے ملا ہوا تھا اور اس میں وہ تمام معلومات موجود تھیں جو مرکزی کمپیوٹر کے پاس ہوتی ہیں۔ مخصوص کوڈز دینے پر اسے مرکزی ڈیٹا تک رسائی مل گئی تھی۔ مگر سب ٹھیک تھا، کہیں کسی گڑبڑ کا نام و نشان نہیں تھا۔ کمپیوٹر بتا رہا تھا کہ تمام کام معمول کے مطابق جاری تھے۔ نہ باہر سے کوئی مداخلت ہوئی تھی اور نہ ہی اندر کسی چیز یا مشینری میں کوئی مسئلہ سامنے آیا تھا۔ وہ ایک ہفتے تک بکس میں لیٹا رہا تھا، اگرچہ جسم کی تھراپی کی جاتی رہی تھی اس کے باوجود وہ جسم میں تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اسے شدت سے آرام کی خواہش ہو رہی تھی۔ اس نے کھانا طلب کر کے کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جب اسے نیند نہیں آئی تو اس نے اپنے بیگ سے نیند کی گولیوں کی شیشی نکالی اور اس میں سے دو گولیاں پانی کی مدد سے حلق سے اتار لیں۔ چند منٹ کے بعد وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ شادی کے بعد پہلی جاب سے واپس آیا تو رمیلا اس سے یوں ملی جیسے وہ برسوں بعد کہیں سے آیا ہو۔ جوناتھن اس کی دیوانگی پر حیران رہ گیا پھر ہنسنے لگا۔ "میں صرف دو ہفتے کے لیے تو گیا تھا۔"

"یہ دو ہفتے میں نے جیسے گزارے ہیں میں ہی جانتی ہوں۔" رمیلا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "آئندہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

جوناتھن سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے۔ اس کے آنے سے بہت خوش ہے اور اس لیے اسے شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔ مگر کچھ عرصے بعد اسے ایک طویل مشن کے لیے منتخب کیا گیا تو رمیلا نے یہ سنتے ہی نفی میں سر ہلانا شروع کر دیا کہ وہ تین مہینے کے لیے جا رہا تھا اس نے جوناتھن کا بازو تھام لیا اور بولی۔ "تم نہیں جاؤ گے۔"

ایک بار پھر اسے خیال آیا کہ رمیلا مذاق کر رہی ہے لیکن جب اس نے رمیلا کا چہرہ دیکھا تو اسے احساس ہوا وہ قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں تھی وہ سو فیصد سنجیدہ تھی۔ جوناتھن کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا، اس نے رمیلا کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "ڈیئر، یہ میری جاب کا تقاضا ہے مجھے جانا ہوتا ہے۔ آخر ساری عورتوں کے شوہر جاب پر جاتے ہیں۔"

"وہ صبح جاتے ہیں اور شام کو آ جاتے ہیں۔"

"میں اس لحاظ سے ذرا مختلف ہوں کہ میں ہفتوں اور مہینوں کے لیے جاتا ہوں اور پھر مجھے اتنی ہی لمبی چھٹی مل جاتی ہے۔"

"میں چند گھنٹوں کی دوری گوارہ کر سکتی ہوں، ہفتوں اور مہینوں کی نہیں، تم یہ جاب چھوڑ دو۔"

جوناتھن حیران رہ گیا۔ "جاب چھوڑ دوں... پھر کیا کروں؟"

"کوئی اور کام جس میں تم چند گھنٹے کے لیے جاؤ اور پھر میرے پاس واپس آ جاؤ۔"

جوناتھن نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ میں کوئی عام جاب نہیں کرتا ہوں، میں خلاباز ہوں اور میری تربیت پر ایجنسی نے بہت بڑی رقم خرچ کی ہے میں کسی عام آدمی کی طرح جاب نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو ریٹائرمنٹ لے لو۔"

"ریٹائرمنٹ لے لوں۔" جوناتھن نے اسے مزید حیرت سے دیکھا۔ "پھر کیا کروں گا؟"

"کوئی اور کام۔"

جوناتھن نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے اور کوئی کام نہیں آتا اور خلابازی میرے لیے صرف پیشہ نہیں ہے یہ میرا خواب ہے۔"

"ٹھیک ہے کوئی دوسرا کام کرنا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔"

"میرے لیے ناممکن ہے۔" جوناتھن نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ میں نے اس کام کے سوا کبھی کچھ کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ میں خلاباز کی حیثیت سے ریٹائر ہونا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں، ابھی تو اپنے کیریئر کے عروج پر ہوں مجھے یقین ہے خلاباز کی حیثیت میں بہت آگے جاؤں گا اور ممکن ہے ایک دن میں ایجنسی میں کوئی اعلیٰ عہدہ حاصل کر لوں۔"

"یہ مستقبل کی بات ہے اور میں ابھی کی بات کر رہی ہوں۔" رمیلا نے سرد لہجے میں کہا تو جوناتھن خاموش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ڈنر کرتے ہوئے آپس میں خوشگوار گفتگو کر رہے تھے لیکن دونوں ہی جانتے تھے، ان کے تعلق میں پہلی دراڑ آ چکی تھی۔

☆☆☆

جوناتھن کی آنکھ کھلی تو اسے احساس ہوا کہ وہاں بہت خاموشی تھی۔ وہ بستر سے اٹھا، اس نے منہ دھویا اور برش کیا۔ پھر اپنے لیے بلیک کافی لے کر وہ باہر نکل آیا۔ اس نے باری باری تمام بند کیبنوں پر دستک دی لیکن کہیں سے جواب نہیں آیا اور نہ ہی کسی کیبن کا دروازہ کھلا۔ کچھ سوچ کر وہ نچلے فلور کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کام کی جگہ تھی یہاں شیشے کے بجائے دھاتوں کا استعمال زیادہ تھا، اس لیے وہاں روشنی خاصی کم تھی۔ اس نے پہلے ناشا کے آفس کے دروازے پر دستک دی۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں بھی اسے جواب نہیں ملے گا لیکن فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو سیاہ فام ناشا میز کی دوسری طرف ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے جوناتھن کو دیکھ کر بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔

"ناشا یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر بولی۔ "میں نہیں جانتی... کوئی بھی نہیں جانتا۔"

"کیا تم آسان الفاظ میں وضاحت کرو گی؟" جوناتھن نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کا صبر جواب دے رہا تھا، اسے حیرت تھی۔ وہ خصوصی مشن پر یہاں آیا تھا۔ جیک اور اب ناشا اسے معمول سے بھی کم اہمیت دے رہے تھے۔

"جیمز اور میگر دل مر چکے ہیں۔"

"میرے خدا... وہ کیسے؟"

"خودکشی۔"

"ریڈ اور سارہ کہاں ہیں؟"

"سارہ غائب ہے اور ریڈ اپنے دفتر میں ہے۔"

"سارہ کیسے غائب ہے؟"

ناشا نے شانے اچکائے۔ "پتا نہیں، لیکن ایک امدادی شٹل بھی غائب ہے۔"

جوناتھن جانتا تھا کہ امدادی شٹل میں سارہ زمین پر واپس نہیں پہنچی تھی، اس کا مطلب تھا وہ خلا کی وسعتوں میں غائب ہو چکی تھی۔ "ناشا، یہاں ایسا کیا ہو رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" وہ کسی قدر غصے سے بولی۔ "میں جاننے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن بہت احتیاط کے ساتھ۔ یہاں ایک حد سے زیادہ سوچنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

جوناتھن چونکا، اس سے پہلے جیک نے بھی سوچ کا حوالہ دیا تھا اور اسے احتیاط سے سوچنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ "ایسی فیلا میں کوئی ایسا ریڈیائی عمل ہو رہا ہے جو کسی طرح اس خلائی جہاز پر اثر انداز ہو رہا ہے؟"

ناشا نے سر ہلایا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی۔"

جوناتھن، ناشا کے دفتر سے نکلا تو اس کی الجھنوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خلائی جہاز کے میڈیکل ایڈ والے حصے میں آیا۔ یہیں لاشوں کو محفوظ رکھنے کا انتظام تھا۔ دو الگ

سرد خانوں میں جیمز رائٹ اور میگرول کی لاشیں موجود تھیں۔ جیمز نے خواب آور دوا کھائی تھی جبکہ میگرول نے پولارڈ سے خود کو شوٹ کرلیا تھا۔ جیمز کو دیکھ کر جوناتھن کے وجود میں کرب کی لہر سی اٹھی تھی۔ وہ اس کے کربناک ماضی کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو اس کا دل بوجھل تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ اچانک اس کی نظر دوسرے فلور کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے بچے پر گئی۔ وہ نو دس سال کا لڑکا تھا اور اس نے فٹبال سوٹ پہن رکھا تھا۔ جوناتھن دم بہ خود رہ گیا تھا۔ وہ خلائی جہاز پر کسی ایلین سے لے کر جراثیمی دخل اندازی تک تمام امکانات ذہن میں لے کر آیا تھا لیکن خلائی جہاز پر کسی دس سالہ لڑکے کی موجودگی اس کے ذہن کے بعید ترین گوشوں میں بھی نہیں تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

''اے...... تم کون ہو؟''

لڑکا مڑا اور آگے بڑھ گیا۔ جوناتھن اسے دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور جیسے ہی سیڑھیاں آئیں وہ چڑھ کر دوسرے فلور پر آ گیا مگر یہاں لڑکا کہیں نہیں تھا۔ وہ اسے تمام ممکنہ جگہوں پر دیکھنے لگا۔ لڑکا یوں غائب تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جبکہ جوناتھن نے اسے بالکل واضح طور پر دیکھا تھا۔ وہ کنٹرول روم تک آیا جہاں جیک اپنی نشست پر بیٹھا اسکرین پر بہت پرانی بلیک اینڈ وائٹ دور کی کامیڈی ڈراما سیریز دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔ اس نے جوناتھن کو دیکھا اور اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''بہت مزے کی چیزیں بنتی تھیں پہلے، آدمی کو سوچ سے نجات دلا دیتی تھیں۔''

''جیک! میں نے ابھی یہاں ایک دس سال کا لڑکا دیکھا ہے۔''

''ہاہاہا۔'' جیک نے اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے قہقہہ مارا۔ ''کیا بات ہے دیکھو ذرا اس کریکٹر کو...؟''

''جیک!'' جوناتھن نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں نے یہاں ابھی ایک لڑکا دیکھا ہے۔ وہ دس سال کا ہے۔''

جیک یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ''دس سال کا لڑکا... اوہ ہاں، دس سال کا لڑکا... لیکن تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے اسی فلور پر۔''

جیک کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی تھی، اب وہ جوناتھن کو گھور رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی بہت بری خبر سننے کو ملی ہے۔ ''تم مجھے سوچنے پر مجبور کر رہے ہو۔''

''جیک...''

''نہیں۔'' جیک نے چیخ جیسی آواز میں کہا۔ ''تم مجھے سوچنے پر مجبور کر رہے ہو اور میں سوچنا نہیں چاہتا۔'' یہ کہتے ہی وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے آواز بھی تیز کرلی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ جوناتھن کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ جوناتھن کنٹرول روم سے باہر آ گیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ یہاں کیا ہو رہا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اب اسے احساس ہوا تھا کہ اس خلائی جہاز کے لوگوں پر کوئی بہت ہی بڑا سانحہ گزر چکا تھا۔ جو مر گئے تھے یا غائب تھے ان کے لیے تو سانحہ شدید تھا ہی لیکن زندہ بچ جانے والوں کا رویہ بھی غیر معمولی تھا۔ اس کا کام خلائی جہاز کو واپس لے جانا تھا لیکن اس سے پہلے وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے عملے پر کیا گزری تھی۔ وہ جیک اور ناشا سے مل چکا تھا، اب ریڈ سے ملنا باقی تھا۔ وہ ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں آیا تو وہاں ناشا کے ساتھ ریڈ موجود تھا۔ ریڈ دبلا پتلا اور صورت سے سائنسدان نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے جوناتھن سے ہاتھ ملایا۔

''میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں، تم آ گئے ہو۔ اب مجھے امید ہے حالات بہتر ہوں گے۔''

''کیسے حالات؟'' جوناتھن نے دلیا کھاتے ریڈ سے پوچھا۔

اس نے شانے اچکائے۔ ''یہی جو اس شپ پر چل رہے ہیں۔''

جوناتھن نے محسوس کیا، اس خلائی جہاز کے تینوں افراد کھل کر کچھ کہنے سے گریز کر رہے تھے۔ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ایک انہیں اعتماد نہیں تھا کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کر پائیں گے۔ دوسرے وہ سمجھتے تھے کہ ان کی بات پر یقین نہیں کیا جائے گا۔ ناشتے کے بعد جوناتھن دوبارہ خلائی جہاز میں گھومنے پھرنے لگا۔ وہ اس لڑکے کو تلاش کر رہا تھا لیکن یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ خلائی جہاز خاصا بڑا تھا اور اس میں بہت ساری جگہیں ایسی تھیں جہاں کوئی فرد آسانی سے روپوش ہو سکتا تھا، خاص طور سے جب وہ دس سال کا لڑکا ہو۔ تھک ہار کر جوناتھن اپنے کیبن میں لوٹ آیا اور بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ پھر اسے رمیلا کا خیال آ گیا۔

☆☆☆

طویل خلائی مشن پر جاتے ہوئے جوناتھن نے محسوس کیا کہ رمیلا اور اس کے بیچ میں آنے والی دراڑ بڑھ رہی تھی اگرچہ اس پہلی بار ڈیوٹی سے واپسی کے بعد رمیلا نے اس سے جو گفتگو کی تھی اس کے بعد ان میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر تغیر کا احساس دونوں کو تھا۔ رمیلا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد باقاعدہ حلقے سے نمودار ہو گئے

تھے۔ کئی دنوں کی لگاتار جوناتھن کی موجودگی اور قربت بھی اسے خوش نہیں کر سکی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی زبان اور انداز سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہو۔ جوناتھن جاتے وقت بہت فکرمند تھا لیکن جب ایک بار وہ خلا میں پہنچ گیا تو اس نے اپنی ساری سوچیں جھٹک دیں اور اب اس کی توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ مشن تین مہینے سے پہلے مکمل ہو گیا تھا اور وہ زمین پر واپس آ گئے۔ جوناتھن کا خیال تھا کہ پورٹ پر رمیلا اس کی منتظر ہو گی جیسے کہ دوسرے خلابازوں کی بیویاں موجود تھیں مگر رمیلا نہیں آئی تھی۔ جوناتھن ٹیکسی کر کے گھر پہنچا تو رمیلا بے خبر سو رہی تھی اور اس کے پاس ہی شراب کی خالی بوتل پڑی تھی۔ رمیلا کا حلیہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اسے کئی دنوں سے اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ اسے جوناتھن کی آمد کا کیا پتا چلتا۔ جاگنے کے بعد اس نے جوناتھن کو دیکھ کر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''تم واپس آ گئے... مجھے پتا ہی نہیں چلا۔''

''ہاں، کیونکہ تم نشے میں دھت دنیا سے بے خبر پڑی تھیں۔''

''مجھے دنیا کی خبر کا کیا کرنا ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

جوناتھن نے محسوس کیا انہیں آپس میں بات کرنے کی ضرورت تھی ورنہ یہ صورت حال زیادہ عرصے چلنے والی نہیں تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ رمیلا سے بات کرتا، اس نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھال لیا اور پہلے کی طرح پرجوش محبت کرنے والی رمیلا بن گئی۔ اس کے بعد جوناتھن کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس سے بات کرتا۔ اتفاق سے اسے طویل چھٹیاں مل گئی تھیں کوئی مشن نہیں تھا اس لیے اب وہ رمیلا کے لیے مخصوص تھا۔ اسے ہفتے میں دو تین بار چند گھنٹے کے لیے ایجنسی کے دفتر جانا پڑتا تھا اور اس کے بعد کا سارا وقت رمیلا کے لیے مخصوص تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ یہ خوشی ایک سال سے زیادہ برقرار رہی تھی۔ اس دوران میں جوناتھن بس چند دنوں کے لیے دو بار خلائی مشن پر گیا اور رمیلا کو طویل انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جیمز رائٹ مریخ پر جانے والے مشن کا انچارج تھا، جوناتھن اس کا نائب تھا۔ یہ مشن تین مہینے کے لیے تھا۔ جوناتھن انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس نے زیادہ ہی آرام کرلیا تھا۔

مشن روانہ ہوا اور تین مہینے بعد واپس آیا تو رمیلا ایک بار پھر برے حال میں دکھائی دی۔ اس بار جوناتھن کو اسے سنبھالنے میں بہت دشواری پیش آئی تھی۔ وہ کانچ کی گڑیا کی طرح بکھر گئی تھی۔ اس نے جوناتھن سے کہا نہیں تھا لیکن اس کا رواں رواں اس سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جایا کرے۔ جوناتھن بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ رمیلا کے ساتھ رہے۔ وہ اسے بہت دیر سے ملی تھی اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا مگر مریخ سے واپس آنے کے دو ہفتے بعد ہی اسے پھر مریخ پر جانے والے مشن کے لیے منتخب کرلیا گیا تھا اور وہ منع بھی نہیں کر سکا البتہ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے جاب یا رمیلا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو اس کا انتخاب رمیلا ہو گی۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ویسے بھی مشن صرف دو ہفتے کا تھا اس لیے اس کے خیال میں رمیلا خود کو سنبھال لے گی۔

☆☆☆

جوناتھن کو رمیلا کی پہلی قربت یاد آئی۔ وہ کتنی مہربان اور پرجوش تھی۔ اس سے یوں ملی جیسے برسوں کی پیاسی زمین سے بارش کا پہلا قطرہ ملتا ہے۔ جوناتھن رمیلا کو سوچتا رہا اور اسے یاد کرتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور تب اسے پتا چلا کہ وہ ابھی فیلا کے مدار میں گردش کرتے خلائی جہاز میں تھا۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا اور بہت شدت سے رمیلا کو چاہ رہا تھا۔ اچانک عقب سے ایک ہاتھ اس کی گردن میں حمائل ہوا۔ نسوانی نزاکت اور نرمی لیے اس ہاتھ کا لمس جوناتھن کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ رمیلا کا ہاتھ تھا، اس نے اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا پھر اسے نرمی سے سہلانے لگا۔ غیر محسوس انداز میں کروٹ لیتے ہوئے اس نے رمیلا کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کیے سو رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ جوناتھن اسے دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن یہ خواب ایسا تھا کہ وہ جاگنا نہیں چاہتا تھا اگر وہ ساری زندگی یہ خواب دیکھ سکتا تو دیکھتا رہتا اور کبھی جاگنے کی تمنا نہ کرتا لیکن اسے معلوم تھا، اسے جاگنا تھا۔ وہ رمیلا کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے جھٹکا لگا اور وہ آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بستر سے اتر کر واش بیسن تک آیا اور اس کے آئینے میں خود کو دیکھا، کیا وہ خواب دیکھ رہا تھا؟ اس نے سوچا اور پلٹ کر بستر کی طرف دیکھا رمیلا سو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ اس نے خود سے کہا۔

''یہ خواب ہے اگرچہ طویل ہے۔''

وہ سو گیا تھا پھر اس کی آنکھ کھلی تو رمیلا جاگ گئی۔ اس نے اپنا لباس پہن لیا تھا اور ایک طرف کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ پہلی بار جوناتھن نے جانا کہ یہ خواب نہیں تھا، وہ حقیقت میں رمیلا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

''رمیلا یہ تم ہو؟''

وہ چونک کر اس کی طرف مڑی اور مسکرائی۔ ''ہاں، یہ

میں ہوں۔''

جوناتھن اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کیسے ہے لیکن پھر اس نے پوچھنے سے گریز کیا۔ وہ سوچ رہا تھا، رمیلا کی یہاں موجودگی ناممکن تھی۔ وہ اس کے پاس آئی اور اس کے سینے سے سر ٹکا دیا۔ ''جونی... آئی لو یو۔''

''می ٹو۔'' اس نے بے دھیانی میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ کیسے ممکن ہے۔ مگر رمیلا کی موجودگی نہایت ٹھوس تھی وہ اسے چھو کر محسوس کر سکتا تھا۔ یہ بھی یقینی تھا، وہ اب خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے رمیلا کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟''

وہ خوش تھی لیکن جوناتھن کے سوال پر مشکل میں پڑ گئی۔ ''میں یہاں کیسے آئی؟'' اس نے کہا اور بے بسی سے جوناتھن کی طرف دیکھا۔ ''میں نہیں جانتی... لیکن میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''ہاں، تم میرے ساتھ ہو۔'' جوناتھن نے نرمی سے کہا۔ ''تم فکر مت کرو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے تب میرے ساتھ آؤ۔''

رمیلا بغیر سوال کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔ جوناتھن اسے خلائی جہاز کے اوپری فلور پر لایا۔ وہ دروازے کھولتے ہوئے ایک جگہ پہنچے۔ جوناتھن نے ایک دروازہ کھولا جس کے آگے ایک سرنگ تھی اس نے رمیلا کو اشارہ کیا تو وہ بلا جھجک اندر چلی گئی۔ وہ سرنگ کے آخری حصے میں واقع دروازے تک پہنچی تو وہ دروازہ بھی کھل گیا۔ جیسے ہی رمیلا اندر گئی جوناتھن نے ایک بٹن دبایا اور دروازہ بند ہو گیا۔ رمیلا چونک کر مڑی اور دروازے پر ہاتھ مارنے لگی۔ جوناتھن نے اس کی آواز سنی۔ ''جونی... یہ کیا ہے؟ پلیز دروازہ کھولو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

جوناتھن اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے نمی جھلکنے لگی۔ پھر اس نے ایک بٹن اور دبایا اور امدادی شٹل خلائی جہاز سے الگ ہو کر تیزی سے ایبی فیلا کی طرف جانے لگی اور پھر وہ اس کے لہریں لیتے اور دائرے بناتے رنگین بادلوں میں غائب ہو گئی۔ رمیلا آخری وقت تک دروازے پر ہاتھ مارتی رہی تھی۔ جوناتھن نے گہری سانس لی اور واپس مڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ شاید اب بھی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ نیچے آیا، اس کا رخ ناشا کے دفتر کی طرف تھا لیکن وہ دفتر میں نہیں تھی۔ وہ لیب میں تھی اور اپنے کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔ اس نے جوناتھن کو دیکھا اور بولی۔ ''کل رات ستارے کے مقناطیسی میدان میں زبردست تغیر آیا۔ مثبت آئن بہت بڑی مقدار میں خارج ہوئے۔''

''رمیلا یہاں کیسے آئی؟'' جوناتھن نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میرے خدا!'' ناشا نے گہری سانس لی۔ ''مجھے اسی بات کا خدشہ تھا، وہ کہاں آئی؟''

''میرے کیبن میں۔'' جوناتھن بولا۔ ''میں سو کر اٹھا تو وہ موجود تھی۔''

''اب کہاں ہے؟''

''میں نے اسے شٹل میں بند کر کے ایبی فیلا کی طرف بھیج دیا۔''

ناشا یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ ''تم رات سوتے وقت اس کے بارے میں سوچ رہے تھے؟''

جوناتھن نے سر ہلایا۔ ''بہت شدت سے۔''

ناشا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''ایبی فیلا کے مقناطیسی میدان میں ایک انوکھی توانائی موجود ہے۔ یہ توانائی انسان کی سوچ کو عملی صورت دیتی ہے۔''

''دنیا میں ایسی کوئی توانائی نہیں ہے۔''

''دنیا میں نہیں ہے لیکن یہاں ہے۔'' ناشا بولی۔ ''اور یہی اس خلائی جہاز کا مسئلہ ہے۔''

جوناتھن کا ذہن اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے، یہ توانائی سوچ کو ہولوگرافک کی طرح دکھاتی ہے۔''

''نہیں۔'' ناشا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''وہ سوچ کو مجسم حقیقت بنا کر پیش کرتی ہے۔''

''رمیلا ہولوگراف نہیں تھی؟'' جوناتھن نے بے یقینی سے کہا۔

''وہ مادی طور پر موجود تھی لیکن یہ موجودگی...''

''یہ سب بکواس ہے۔'' جوناتھن نے تند لہجے میں کہا اور لیب سے نکل آیا۔ اب اس کا رخ کنٹرول روم کی طرف تھا۔ جیک وہاں موجود تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ہمہ وقت وہیں رہتا تھا اور شاید سوتا بھی نہیں تھا۔ جیک نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''تم نے اسے بھیج دیا۔''

جوناتھن اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''تم نے دیکھا تھا۔''

جیک نے سر ہلایا۔ ''لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اصل مسئلہ یہاں ہے۔'' اس نے اپنے سر پر انگلی ماری۔ ''جب تک یہاں مسئلہ ہے باہر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

جوناتھن اب اندر سے نڈھال ہونے لگا تھا۔ وہ رمیلا کو اپنا تخیل سمجھا تھا اور اس نے اسے بے دردی سے مرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ ناشا اگر درست کہہ رہی تھی تو اس نے رمیلا کو قتل کر دیا تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ وہ اپنے کمرے میں آیا اس بستر کو دیکھا جس پر رمیلا لیٹی تھی۔ چادر میں ابھی تک سلوٹیں موجود تھیں۔ اس کے نازک بدن کا خاکہ بن رہا تھا۔ وہ سر تھام کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ روتا رہا اور رمیلا کو یاد کرتا رہا۔ ناشا نے اسے لنچ کے لیے کال کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ''میرا موڈ نہیں ہے۔''

''میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں۔'' ناشا ہمدردی سے بولی۔ ''میں تمہیں یقین دلاتی ہوں...''

جوناتھن نے انٹرکام بند کر دیا۔ وہ فی الحال ناشا یا کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر چند گھنٹے بعد وہ خود ناشا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اور ریڈ کھانے کے کمرے میں بیٹھے کسی بات پر آپس میں بحث کر رہے تھے اور ان کے موڈ خراب تھے۔ جوناتھن کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ ریڈ نے کہا۔ ''ہم یہاں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، ہمیں واپس چلے جانا چاہیے۔''

''ان سب چیزوں کے ساتھ۔'' ناشا نے سخت اور مخالفانہ لہجے میں کہا۔

''کون سی چیزیں؟'' جوناتھن نے پوچھا۔

ناشا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نہیں جانتے... یہاں ایک لڑکا ہے، ایک لڑکی ہے اور ایک بوڑھی عورت ہے۔''

جوناتھن دہل گیا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے...؟''

''لڑکا جیک کا بھائی ہے... وہ دس سال کی عمر میں اسکیٹنگ کرتے ہوئے سڑک پر ٹرک کے سامنے آگیا تھا۔ لڑکی میگرول کی جوانی کی محبوبہ ہے اس کے دل میں پیدائشی نقص تھا اسے مصنوعی دل لگایا گیا لیکن وہ اسے راس نہیں آیا اور ایک دن وہ اچانک مر گئی۔ بوڑھی عورت سارہ کی ماں ہے جس سے وہ نفرت کرتی تھی کیونکہ اس نے چھوٹی سی عمر میں سارہ کو یتیم خانے کے حوالے کر کے خود دوسری شادی رچالی تھی۔'' ناشا بے تکان بول رہی تھی۔ ''اب وہ سب یہاں موجود ہیں۔ تم خود سوچو، کیا ہم ان کو لے کر واپس جا سکتے ہیں؟''

بات کسی قدر جوناتھن کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ پھر اسے جیمز کا خیال آیا۔ ''اس نے کیوں خودکشی کی؟''

ناشا کھڑی ہو گئی۔ ''اس نے خودکشی کرنے سے پہلے اپنی تین سال کی عمر میں مر جانے والی بیٹی کو جہاز سے باہر خلا میں پھینک دیا تھا۔''

☆☆☆

مریخ کا یہ مشن اب معمول کا تھا کیونکہ خاص کام وہ پہلی بار میں کر چکے تھے، اس لیے جوناتھن سخت جھنجلا رہا تھا۔ جیمز سے اس کی اچھی دوستی تھی لیکن اس بار دونوں میں تعلقات سرد تھے۔ ایک بار ان میں تلخ کلامی بھی ہوئی تھی کہ اگر جیمز بلاوجہ اس کی شمولیت پر اصرار نہ کرتا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا یہ سب تو کوئی عام خلاباز بھی کر سکتا تھا۔ جیمز نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اس نے کہا۔ ''میں چاہتا تھا کہ کوئی غلطی نہ ہو اور اس میدان میں تمہارے جیسا ماہر اور کوئی نہیں ہے۔''

مریخ آنے کے بعد اسے ہر دو دن بعد رمیلا سے بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ ویڈیو کال ہوتی تھی اور ہائی اسپیڈ لنک میں جگہ مشکل سے ملتی تھی اس لیے ہر خلاباز کو دو دن بعد اپنے گھر والوں سے بات کرنے کے لیے دس منٹ دیے جاتے تھے۔ یہ ناکافی تھے مگر اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ جوناتھن محسوس کرتا تھا کہ رمیلا اس کا دل رکھنے کے لیے اس سے بات کرتی تھی۔ وہ ہنستی بھی تھی لیکن اندر سے وہ بجھ گئی تھی۔ جب وہ اسے کہتا کہ وہ جلد آجائے گا اور اس بار جلدی کہیں نہیں جائے گا تو وہ مسکرانے لگتی۔ جیسے جوناتھن اسے بچہ سمجھ کر بہلا رہا ہو۔ اسے معلوم تھا جوناتھن کو دوبارہ کہیں بھیج دیا جائے گا اور وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ پھر اچانک ہی مشن کا دورانیہ دو ہفتے سے بڑھا کر دو مہینے کر دیا گیا تھا۔ جب جوناتھن نے یہ بات رمیلا سے کہی تو وہ یوں بجھ گئی جیسے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ دوسرے مہینے اس نے پہلی بار کال کی تو رمیلا نے کال ریسیو نہیں کی اور سارا وقت کال ملانے کی کوشش میں گزر گیا۔ اس کا موبائل بھی بند جا رہا تھا۔ دو دن بعد اس نے دوبارہ کال کی اور حسب سابق رمیلا نے ریسیو نہیں کی۔ تب جوناتھن نے اپنے ایک دوست مارٹن کو کال کی۔ ''پلیز تم رمیلا کو چیک کرو، مجھے خدشہ ہے اس کی طبیعت نہ خراب ہو۔''

''تم فکر مت کرو میں ابھی جا کر اسے چیک کرتا ہوں۔'' مارٹن نے اسے تسلی دی۔ ایک گھنٹے بعد مارٹن کے بجائے ایڈورڈ کی کال آگئی تھی۔

''جونی بوائے۔'' ایڈورڈ نے کہا تو جوناتھن اس کے لہجے پر چوکنا ہو گیا، اسے لگا جیسے وہ اسے کوئی خاص خبر سنانے

جارہا ہے۔ ’’مجھے افسوس ہے، رمیلا اس دنیا میں نہیں ہے۔‘‘

جوناتھن کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی تھی۔ ’’یہ کیسے ہوا؟‘‘ اس نے پوچھا تو اسے اپنی آواز اپنی نہیں لگی تھی۔

’’خودکشی۔‘‘ ایڈورڈ نے نرمی سے کہا۔ ’’اس نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھالی تھی۔ جب مارٹن نے اسے دیکھا تو اسے مرے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔‘‘

دو دن بعد جوناتھن ایک خصوصی شٹل سے واپس آ گیا۔ اس وقت اس کے دوست سارے انتظامات کر چکے تھے رمیلا کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے۔ تین دن تک پڑے رہنے کی وجہ سے لاش کسی قدر خراب ہو گئی تھی لیکن ڈاکٹروں نے اسے ایک خاص سیلوفین میں پیک کر کے مزید خراب ہونے سے محفوظ کر دیا تھا۔ جوناتھن نے آخری بار اسے دیکھا اور اس کے چھوڑے ہوئے رقعے کو بار بار پڑھا۔ ’’میں تمہارے بغیر اس دنیا میں نہیں رہ سکتی اس لیے یہ دنیا ہی چھوڑ کر جارہی ہوں۔‘‘

رقعہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ پھر اس نے رقعہ رمیلا کے تابوت میں ڈال کر ہی اس کے ساتھ دفنا دیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد اس نے ایڈورڈ کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا تھا۔ ساتھ ہی واضح کر دیا کہ وہ کسی صورت اپنا استعفیٰ واپس نہیں لے گا اور اس کے بدلے قانون کا سامنا کرنے اور سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، ایڈورڈ گلین نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر اس کا استعفیٰ منظور کرتے ہوئے اس کے تمام واجبات بھی ادا کر دیئے تھے۔

☆☆☆

جوناتھن کی آنکھ کھلی تو کیبن میں خاموشی تھی۔ وہ کروٹ لے کر لیٹا ہوا تھا۔ گزشتہ دن جو ہوا تھا اس کے بعد اس میں عجیب سی تبدیلی آئی تھی۔ وہ اپنے مشن کے بارے میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کے بجائے اس کے ذہن میں دوسرے خیالات چکرا رہے تھے اور اب اسے صحیح طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ اس خلائی جہاز کے عملے پر اصل میں کیا گزری تھی۔ ناشا اور ریڈ آپس میں بحث کر رہے تھے۔ اس خلائی جہاز پر وہی تھے جو اب تک سوچ کے مجسم ہونے سے بچے ہوئے تھے۔ وہ اس معاملے کی تکنیکی اور طبعیاتی پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ ناشا کا کہنا تھا کہ ایبی فیلا سے کچھ ایسے پارٹیکلز نکل رہے ہیں جو براہ راست انسان کے ذہن سے تعلق قائم کر لیتے ہیں، وہ اس کی سوچوں سے ایسی ہم آہنگی بنا لیتے ہیں جس کے بعد آدمی جس شخص کے بارے میں شدت سے سوچتا ہے وہ مجسم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے وہ شخصیت زندہ نہ ہو۔ ناشا اور ریڈ نے اس چیز کو سائنس کی روشنی میں سمجھ لیا تھا اور وہ اسی لیے بچے ہوئے تھے۔ لیکن ان میں اس بات پر اختلاف بڑھتا جارہا تھا کہ ان لوگوں کا کیا، کیا جائے۔ ناشا کا کہنا تھا انہیں لے جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ انسان نہیں تھے وہ صرف ایک ٹھوس تخیل تھے۔ ان کی زمین پر آمد سے نہ جانے کس قسم کے مسائل جنم لیں اور یہ چیز انسانوں پر کیا اثر ڈالے۔ دوسری طرف ریڈ زمین پر فوری واپسی کا خواہش مند تھا۔ جوناتھن نے اس بحث میں حصہ نہیں لیا اور جیک کو کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ وہ خود میں مگن تھا اور اس کا سارا زور نہ سوچنے پر تھا۔ حالانکہ وہ سوچ چکا تھا اور خلائی جہاز پر اس کا چھوٹا بھائی موجود تھا۔

جوناتھن کے ذہن میں یہ سارے خیالات گردش کر رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور سیدھا ہو گیا پھر اس نے اپنے برابر میں دیکھا، وہاں رمیلا سو رہی تھی۔ جوناتھن نے سکون کی بہت طویل سانس لی تھی۔ اس نے رات کو سوچا تھا کہ جو کام ایک بار ہو سکتا تھا وہ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا تجربہ کامیاب رہا تھا۔ رمیلا دوبارہ اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس نے جیک، ناشا یا ریڈ کسی کو اپنے خیال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا اسے ان کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کچھ در بعد رمیلا جاگ گئی۔ وہ جوناتھن کو دیکھتی رہی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مسکراتی رہی۔

’’میری زندگی... میری محبت۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ جوناتھن نے یقین سے کہا۔

رمیلا اٹھ بیٹھی، اس نے آس پاس کا معائنہ کیا اور کسی قدر الجھے لہجے میں بولی۔ ’’ہم کہاں ہیں؟‘‘

’’خلا میں... زمین سے بہت دور۔‘‘

’’لیکن میں یہاں کیسے آئی؟‘‘

’’تمہیں یاد نہیں ہے؟‘‘ جوناتھن نے پوچھا تو اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ سوچ رہی تھی اور یاد کر رہی تھی۔ پھر اس نے بے بسی سے جوناتھن کی طرف دیکھا۔

’’نہیں، مجھے بالکل یاد نہیں آرہا کہ میں یہاں کیسے آئی۔‘‘

’’پھر تمہیں کیا یاد ہے؟‘‘

’’مجھے۔‘‘ رمیلا نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ’’میں بہت ڈیپریس تھی اور تمہیں یاد کر رہی تھی... تم مریخ پر گئے تھے... اس کے بعد...‘‘ وہ چپ ہو گئی۔ جوناتھن نے اس کا

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

’’تم فکر مت کرو اور ذہن پر زور مت دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’کیا کوئی مسئلہ ہے؟‘‘

’’میں نے کہا نا تم فکر مت کرو۔‘‘ جوناتھن نے کہا اور اٹھ کر لباس پہنا۔ رمیلا کے جسم پر اس بار کوئی لباس نہیں تھا۔ جوناتھن نے اس کے لیے بھی ایک لباس نکالا۔ یہ خلا بازوں کی مخصوص وردی تھی اس کے علاوہ یہاں کوئی اور لباس دستیاب نہیں تھا۔ رمیلا نے یہ لباس پہن لیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر نظر آنے والے انوکھے ستارے ایبی فیلا کی طرف دیکھا۔

’’یہ کیا ہے؟‘‘

جوناتھن اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ یہی ستارہ اصل میں اس کی یہاں موجودگی کی وجہ ہے۔ اس کے بجائے اس نے جواب دیا۔ ’’یہ ستارہ ہے۔‘‘

’’انوکھا ستارہ ہے، میں نے آج تک ایسا ستارہ نہیں دیکھا۔‘‘

’’ہاں، یہ واقعی انوکھا ہے۔‘‘

’’تم لوگ یہاں اس ستارے پر تحقیق کے لیے آئے ہو نا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ جوناتھن نے جھوٹ بولا۔

’’کیا میں اس جہاز کو دیکھ سکتی ہوں۔‘‘

جوناتھن ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ’’کیوں نہیں لیکن ابھی سب اپنے کاموں میں لگے ہیں۔‘‘

’’یہاں کا کمانڈر کون ہے؟‘‘

’’میں ہوں۔‘‘ جوناتھن نے اس بار سچ کہا کیونکہ جیمز رائٹ مر چکا تھا اور اس کے بعد سینئر وہی تھا اس لیے وہی کمانڈر تھا۔ رمیلا خاموش ہو گئی۔ وہ سوچ میں تھی۔ یہ چیز یقیناً اسے الجھا رہی تھی کہ وہ یہاں کیسے آئی اور اسے ماضی کی کوئی بات کیوں یاد نہیں ہے پھر اس نے ایک اسکرین کی طرف دیکھا۔

’’یہ تو دو ہزار نوے ہے اور آج بارہ فروری ہے۔‘‘

’’درست ہے۔‘‘

’’تب مجھے دو ہزار ستاسی کیوں یاد ہے۔‘‘ رمیلا نے کہا۔ اس نے جوناتھن کی طرف دیکھا۔ ’’کیا میں بیمار رہی ہوں... میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟‘‘

’’کچھ ایسا ہی ہے۔‘‘ جوناتھن نے کہا پھر اسے ایک خیال سوجھا۔ ’’تم نے خواب آور گولیاں کھالی تھیں اور اس کا تمہارے ذہن پر اثر ہوا تھا۔‘‘

’’کیسا اثر، کیا میں اپنی یادداشت کھو بیٹھی تھی؟‘‘

”اس سے بھی زیادہ... تم آؤٹ آف سینس ہو گئی تھیں بس ایک جاندار کی طرح زندہ تھیں۔“

”تب میری حالت میں تبدیلی کیسے آئی؟“

جوناتھن جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔ ”چند مہینے پہلے تم نے ہوش کا مظاہرہ کیا اور پھر تم کسی قدر دوسروں کو پہچاننے لگیں۔“

”تمہیں...؟“

”ہاں مجھے بھی پہچان لیا تھا۔“

رمیلا سوچ میں پڑ گئی۔ وہ جوناتھن کی بات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اس کا جھوٹ پکڑا نہ جائے۔ رمیلا بہت ذہین عورت نہیں تھی لیکن وہ اسے بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ جوناتھن کے اندر تک اتر جاتی تھی۔ وہ اس وقت بھی اسے الجھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”میں نے خودکشی کی کوشش کیوں کی؟“

”کیونکہ میں تم سے بہت دنوں کے لیے دور چلا جاتا تھا اور تم ڈیپریس ہو جاتی تھیں۔“

”اور اب...؟“

”اسی لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے میں کبھی تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

رمیلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تو جوناتھن نے سکون کا سانس لیا، وہ کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ رمیلا کو دوبارہ پانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس نے رمیلا کو وہیں رکنے کو کہا اور کیبن سے باہر آیا۔ ناشا اپنے دفتر میں تھی جبکہ ریڈ کا پتا نہیں تھا۔ جیک کنٹرول روم میں ہوگا یا پھر کھانے کے کمرے میں۔ ناشا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جوناتھن نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ واپس آگئی ہے۔“

ناشا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ واپس نہیں آئی ہے، وہ پھر آگئی ہے۔ تم جتنی بار چاہے اسے بلا سکتے ہو۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”مطلب بہت واضح ہے۔ وہ انسان نہیں ہے، وہ صرف ایک تھنکنگ کلون ہے اور تم جتنے چاہے کلون تیار کر سکتے ہو۔“

”وہ انسان ہے، میری اور تمہاری طرح جیتی جاگتی انسان۔“

”تم جو چاہے سوچ لو، حقیقت اس سے نہیں بدلے گی۔ وہ صرف تمہاری سوچ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی جتنا تم جانتے ہو۔“

”وہ جانتی ہے اسے اپنا ماضی یاد ہے۔“ جوناتھن نے اصرار کیا۔

”یہ میں مان سکتی ہوں لیکن اس سے بھی حقیقت نہیں بدلے گی۔ وہ اصل رمیلا نہیں ہے۔“

جوناتھن چپ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ناشا درست کہہ رہی ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے، لوگ اپنے مر جانے والے پیاروں کی تصویریں اور ویڈیوز بھی تو رکھتے ہیں۔ اگر وہ ایک جیتی جاگتی رمیلا اپنے ساتھ رکھ لے تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ ناشا اسے غور سے دیکھ رہی تھی اور شاید اس کی سوچ بھی پڑھ رہی تھی اس نے کہا۔ ”تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا، زمین پر اس کی کیا حیثیت ہوگی۔“

”وہی جو رمیلا کی تھی۔“

ناشا نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”دوسرے وہ ایپی فیلا کی پیداوار ہے۔ کیا وہ اس جگہ سے نکلنے کے بعد بھی اپنا وجود برقرار رکھ سکے گی؟“

جوناتھن سوچ میں پڑ گیا، اس بارے میں اس نے سوچا نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔“

”میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔“ ناشا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”یہ بہت خطرناک قدم ہوگا جس کے نتائج کے بارے میں ہم ابھی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی خطرہ ہے؟“

”خطرہ تو ہے۔ جب لوگوں کو ایپی فیلا کی اس خصوصیت کے بارے میں پتا چلے گا تو کیا وہ اپنے پیاروں کو پانے کے لیے یہاں دوڑے نہیں آئیں گے۔ تمہاری طرح بہت سے لوگ چاہتے ہوں گے کہ ان کے پیارے جو مر چکے ہیں ان کے پاس رہیں۔ ان کو ایک راستہ مل جائے گا۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا؟“

”فرق پڑے گا۔ لوگ اپنے حال اور مستقبل کو بھول کر ماضی میں الجھ جائیں گے جیسے کوئی شخص مرنے والوں کی تصویریں لے کر بیٹھا رہے۔ اس شخص کو تم کیا کہو گے۔“

”لیکن یہ تصویر نہیں ہے۔“

”تصویر ہے۔“ ناشا زور دے کر بولی۔ ”خدا کے لیے جونی! تم خود سوچو، اس کی زمین پر کیا حیثیت ہوگی؟ کیا قانون اور آئین اسے انسان مانے گا، کیا اسے انسانوں والے دوسرے حقوق حاصل ہوں گے؟ وہ ووٹ دے سکے گی، کیا اسے سوشل سیکیورٹی حاصل ہوگی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس کی حیثیت تمہارے پالتو جانور سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ اگر تم مر گئے تو اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہے کہ وہ اندر سے بھی انسان ہیں یا صرف انسانوں جیسے ہیں۔ تم جانتے ہو ان کو بھوک پیاس نہیں لگتی اسی طرح یہ دوسری انسانی احتیاجات سے بھی بے نیاز ہیں۔“

جوناتھن کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی اس چکر میں پھنس گیا ہے جس میں خلائی جہاز کے دوسرے لوگ پھنسے ہوئے تھے اور وہ انہیں نکالنے کے لیے بھیجا گیا تھا جبکہ وہ خود اس چکر میں آگیا تھا۔ وہ سوچتا رہا پھر اس نے ناشا سے پوچھا۔ ”وہ لوگ کہاں ہیں؟“

”نیچے والے فلور میں، جہاں سامان اسٹور کیا جاتا ہے۔“

”وہ اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں، انہوں نے کوئی مطالبہ کیا؟“

”نہیں، ہر ضرورت سے بے نیاز ہیں۔“

جوناتھن، ناشا کے ساتھ خلائی جہاز کے اسٹور والے حصے میں آیا اور اس نے ایک چھوٹے سے خانے میں ان تین انسانوں کو دیکھا جو خاموش بیٹھے تھے۔ لڑکا اسے گھور رہا تھا۔ لڑکی بہت حسین تھی مگر وہ نروس تھی اور بوڑھی عورت پریشان تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کون تھے اور اچانک اس جگہ کیسے آگئے۔ جوناتھن نے ناشا کی طرف دیکھا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولا۔ ”ان کا کیا کرنا ہے؟... وہی جو جیمز نے اپنی بیٹی کے ساتھ کیا تھا؟“

”شاید۔“ ناشا نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پلٹ کر چل پڑی پھر سیڑھیوں کے پاس رک کر بولی۔ ”یہ ہمیشہ کے لیے آگئے ہیں تم صرف سوچ کے ذریعے انہیں واپس نہیں بھیج سکتے۔“

جوناتھن واپس اوپر آیا۔ کیبن میں رمیلا ساکت بیٹھی تھی، اس نے جوناتھن کو دیکھ کر کہا۔ ”مجھے اور کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔“

”تم فکر مت کرو یہ کیفیت عارضی ہے۔“ جوناتھن نے اسے تسلی دی۔ ”جب ہم واپس جائیں گے تب تمہیں سب یاد آجائے گا۔“

”مجھے ایسا نہیں لگ رہا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”جونی، سچ بتاؤ کیا میں مرگئی تھی؟“

وہ ہل کر رہ گیا۔ ”یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟“

”بس میں سوچ رہی تھی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں مرگئی تھی لیکن اگر میں مرگئی تھی تو اب تمہارے پاس کیسے موجود ہوں؟“

”اس سے ثابت ہوتا ہے تمہاری سوچ غلط ہے۔ مرنے کے بعد کوئی انسان دوبارہ واپس نہیں آتا ہے۔“

”ہاں واپس تو نہیں آتا ہے۔“ رمیلا تذبذب سے بولی۔ ”لیکن...“

”سب ٹھیک ہو جائے گا رمیلا۔“ جوناتھن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم آرام کرو۔“

”مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔“

جوناتھن نے اسے نیند کی گولیاں دیں۔ ”یہ لے لو تمہیں نیند آجائے گی۔“

رمیلا گولیاں کھا کر بستر پر لیٹ گئی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ جوناتھن باہر آیا اس نے سب کو کھانے کے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اس وقت خلائی جہاز کا کمانڈر بن گیا تھا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر زمین پر واپس جانا ہے۔“

ناشا نے اختلاف کیا۔ ”ان لوگوں کا مسئلہ حل کیے بغیر ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں۔“

”یہ ایجنسی کے حکام کا مسئلہ ہیں، ہم انہیں ان کے حوالے کردیں گے۔“

”یہ ایجنسی کا نہیں ہمارا مسئلہ ہیں۔“ ناشا بولی۔ ”تم ان کے بارے کیا جانتے ہو؟“

”کچھ نہیں لیکن ایجنسی کے ماہرین جان لیں گے۔“

”شاید تب تک بہت دیر ہو جائے۔ کیپٹن، یہ یہاں سے تعلق رکھتے ہیں ان کو یہاں سے لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”میں اس میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہا۔“

”کیونکہ تم اس معاملے میں دل سے سوچ رہے ہو۔“ ناشا کے لہجے میں چیلنج آگیا۔ ”کیپٹن سوچ کر فیصلہ کرو، ایسا نہ ہو بعد میں ہمارے پاس پچھتانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ جائے۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”یہی کہ اگر یہ زمین پر گئے تب بھی تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رمیلا تمہیں نہیں ملے گی۔ وہ ایجنسی یا حکومت کے کسی تحقیقاتی ادارے کے سپرد کردی جائے گی۔“

جوناتھن نے اس لحاظ سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے فیصلے سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ اس نے ناشا سے کہا۔ ”ابھی ہمارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔ اس دوران میں ہم مزید غور و فکر کر سکتے ہیں۔“

ریڈ اس کے فیصلے سے متفق تھا اور جیک کو اس کی پروا نہیں تھی، وہ خود میں کھویا ہوا تھا۔ حد یہ کہ اس نے اپنے بھائی کے پاس جانے یا اس سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ جوناتھن اٹھنے لگا تو جیک نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم نے دیکھا صرف سوچنے سے کتنے مسئلے بن جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں انسان کی سوچ...“

جوناتھن اس کی باقی بات سنے بغیر وہاں سے نکل آیا۔
اس خلائی جہاز پر وہ اور ناشا ہوش و حواس میں تھے اور فیصلہ کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ ریڈ اپنے کام سے کام رکھتا تھا، فیصلہ سازی اس کا شعبہ نہیں تھا جبکہ جیک ذہنی طور پر منتشر تھا۔ جوناتھن نے اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے سوچا کہ کیا وہ بھی ہوش مند تھا اور پوری صحت سے فیصلے کر رہا تھا؟ اس نے محسوس کیا کہ رمیلا کی موجودگی نے اس کی قوت فیصلہ کو متاثر کیا تھا اگر وہ نہ ہوتی تو شاید وہ بہتر انداز میں فیصلہ کر سکتا تھا۔ بہر حال اب بھی وہ اپنے فیصلے سے غیر مطمئن نہیں تھا، معاملات کو ایجنسی کے ماہرین کے سپرد کرنا ہی بہتر ہوتا البتہ ناشا کی بات اسے چبھ رہی تھی کہ رمیلا سمیت یہ تمام افراد ایجنسی کی تحویل میں چلے جائیں گے اور دیکھا جائے تو انہیں آزاد چھوڑنے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی۔ وہ کیبن میں داخل ہوا تو اسے جھٹکا لگا رمیلا وہاں نہیں تھی۔ وہ تیزی سے باہر آیا۔ رمیلا کہاں جا سکتی تھی۔

پہلے اس نے کیبن والا فلور چیک کیا پھر اوپر فلور پر آیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس دوران میں ریڈ اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ وہ نچلے فلور پر آئے۔ ناشا انہیں راستے میں ملی، وہ لیب سے اپنے کیبن کی طرف جا رہی تھی۔ جوناتھن نے اسے بتایا کہ رمیلا غائب ہے، وہ بولی۔ ''اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ وہ اس خلائی جہاز سے تو کہیں نہیں جا سکتی۔''

''ہاں لیکن میں نے اسے منع کیا تھا اور میں نے اسے خواب آور گولیاں دی تھیں۔''

ناشا چلتے ہوئے رک گئی۔ ''اگر تم نے ایسا کیا تو غلط کیا ... وہ انسان نہیں ہے جس پر دوا اثر کرے۔''

''پلیز!'' جوناتھن نے بھڑک کر کہا۔ ''اپنا لیکچر بند کرو اور میری مدد کرو۔''

وہ نچلے فلور کے مختلف حصوں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔ ریڈ نے ایک کیبن میں جھانکا جہاں مختلف کنٹینروں میں چیزیں رکھی تھیں۔ رمیلا وہاں فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ ''یہ یہاں ہے۔'' اس نے پکار کر کہا۔

جوناتھن جھپٹ کر آیا۔ رمیلا پہلو کے بل گری ہوئی تھی اور اس کے پاس ایک چھوٹا سا فولادی کنٹینر خالی پڑا تھا۔ اس میں مائع آکسیجن ہوتی ہے۔ جوناتھن نے لرزتے ہاتھوں سے رمیلا کو سیدھا کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ رمیلا کے چہرے کا فرش سے لگا ہوا حصہ یوں ادھڑا ہوا تھا کہ اس کے دانت اور ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے سسکی لی۔ ''میرے خدا اس نے مائع آکسیجن پی لی ہے۔''

ناشا اور ریڈ کے چہرے ستے گئے تھے۔ منفی ڈیڑھ سو ڈگری سینٹی گریڈ کی یخ بستگی رکھنے والی مائع آکسیجن پینے کا مطلب سوائے موت کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ جوناتھن نے اسے گود میں اٹھایا اور وہ اسے میڈیکل ایڈ والی جگہ لے آئے۔ اسے ٹیبل پر لٹا کر جوناتھن نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ رمیلا مر چکی تھی۔ جوناتھن بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے ہوئے تھا ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب روئے اس نے ناشا کی طرف دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''ہمارا ایک مسئلہ تو حل ہو گیا، یہ مر چکی ہے۔''

ناشا کی نظریں رمیلا پر مرکوز تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ زندہ ہے۔''

جوناتھن نے چونک کر دیکھا۔ رمیلا کے گال کا زخم خود بہ خود مٹ رہا تھا اور کچھ دیر میں وہاں ہموار اور نازک خوب صورت کھال تھی، چہرے کی نیلگوں رنگت بھی سرخ ہو گئی تھی۔ پھر رمیلا نے گہری سانس لی اور آنکھیں کھول دیں۔ وہ سب ششدر رہ گئے تھے۔ رمیلا نے جوناتھن کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ''میں کون ہوں؟ ... میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔''

کچھ دیر بعد وہ کھانے کے کمرے میں سب کے ساتھ تھی اور ناشا نے جوناتھن کے روکنے کے باوجود رمیلا کو سب بتا دیا تھا۔ وہ سکون سے سن رہی تھی پھر اس نے جوناتھن کی طرف دیکھا۔ ''تو میں اصل میں مر چکی ہوں۔''

''ہاں لیکن تم ...''

''میں صرف ایک کلون ہوں۔''

''سنو رمیلا!'' جوناتھن کا لہجہ التجا آمیز ہو گیا۔ ''تم بالکل ویسی ہی ہو، تمہاری سوچ اور تمہارا انداز تک ویسا ہی ہے۔''

''لیکن میں اصل رمیلا نہیں ہوں میں تمہاری سوچ کی پیداوار ہوں۔''

''تم میرے لیے رمیلا ہی ہو۔''

''مگر میں اپنے لیے رمیلا نہیں ہوں۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے میں ایک کلون ہوں ...... حقیقی بھی نہیں ایک خیالی کلون ہوں لیکن میں پسند نہیں کروں گی کہ کوئی شخص مجھے کسی کی کاپی سمجھ کر چاہے۔''

جوناتھن نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سمجھ لیا وہ اس کی بات نہیں مانے گی۔ وہ اصل نہیں تھی لیکن اصل کی طرح ضدی ضرور تھی۔ جوناتھن اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

جوناتھن، ایڈورڈ گلین سمیت تین رکنی بورڈ کے سامنے اپنی رپورٹ کے حوالے سے موجود تھا۔ بورڈ کے ایک رکن ڈاکٹر شیمر نے کہا۔ ''کیپٹن، ہم نے تمہاری رپورٹ کا باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ تمہارا کہنا ہے جب تم خلائی جہاز پر پہنچے تو اس کا ہر فرد مر چکا تھا؟''

''یہ درست ہے۔ ان میں سے کوئی فرد زندہ نہیں تھا۔ خلائی جہاز مکمل طور پر زندگی سے خالی تھا۔''

''لیکن جہاز کے تمام فنکشن کام کر رہے تھے۔''

''انجن بند تھے اور جہاز ابھی فیلا کے گرد مدار میں گردش کر رہا تھا لیکن اس کے تمام آلات بالکل درست کام کر رہے تھے۔''

''مگر تمام ریکارڈنگ کے آلات صاف تھے اور کہیں کوئی سابق ریکارڈنگ موجود نہیں تھی جس سے پتا چلتا کہ اس جہاز کے باسیوں پر کیا گزری؟''

''یہ بھی درست ہے۔''

''مسٹر کلارک۔'' دوسرے رکن پروفیسر جوزف نے کہا۔ ''مرنے والوں کے جسم پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ وہ کس طرح مرے ہیں؟''

''بالکل، وہ بس مر گئے تھے ... وہ اپنے اپنے کیبنوں میں موجود تھے۔''

''باہر سے کسی مداخلت کا کوئی سراغ بھی موجود نہیں تھا۔''

''ہاں جہاز کے آمد و رفت کے تمام راستے درست حالت میں پائے گئے اور ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے پتا چلے کہ باہر سے کوئی زبردستی اندر داخل ہوا تھا۔''

''تب تم نے فیصلہ کیا کہ خلائی جہاز کو تباہ کر دو۔''

''ہاں اور یہ فیصلہ میں نے پہلے سے طے شدہ ہدایات کے مطابق کیا تھا کہ اگر میں محسوس کروں کہ اپنے خلائی جہاز کو زمین پر لانا زمین یا اس کے لوگوں کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن سکتا ہے تو میں اسے تباہ کر دوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔''

''تم نے کن حالات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا؟''

''تمام عملے کی نہایت پراسرار موت اور بہ ظاہر سب ٹھیک ہونا۔ یہ فیصلہ میں نے اپنی صوابدید پر کیا ہے اور قوانین مجھے اس کی اجازت دیتے ہیں۔''

تینوں اراکین بورڈ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں میں کچھ اشارے کیے پھر ایڈورڈ نے گلا صاف کر کے کہا۔ ''ہم تم سے بالکل متفق ہیں تم نے بالکل ٹھیک کیا ... لیکن تمہاری رپورٹ کلاسیفائیڈ کے زمرے میں آئے گی اگر تمہارے پاس اس رپورٹ کی کوئی کاپی ہے تو وہ تلف کر دو۔''

''میرے پاس کوئی کاپی نہیں ہے۔''

''تم اس بارے میں کبھی اور کسی موقع پر زبان نہیں کھولو گے۔''

''میں اس سلسلے میں تمام قوانین سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''شکریہ کیپٹن جوناتھن کلارک۔'' ایڈورڈ گلین نے کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔''

جوناتھن ایجنسی کے دفتر سے باہر آیا تو اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ مشکل ترین مرحلہ اس پر پہلے ہی گزر گیا تھا جب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اکیلا ہی واپس زمین پر جائے گا۔ اس نے تمام افراد کو برانڈی میں نیند کی دوا دی اور پھر خلائی جہاز میں نصب تباہی کا نظام ایکٹی ویٹ کر کے اپنی شٹل میں وہاں سے نکل آیا۔ اس نے بہت طویل فاصلے سے خلائی جہاز کی تباہی کا نظارہ کیا اور پھر زمین کی طرف روانہ ہو گیا۔ سونے سے پہلے اس نے رپورٹ بنا لی تھی اور زمین پر آنے کے بعد ایجنسی حکام کو یہ رپورٹ پیش کر دی۔ اس کے جھٹلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ فکر مند تھا۔ مگر اب اس کی تمام فکریں ختم ہو گئی تھیں۔ اس کی ہمیشہ کی ریٹائرمنٹ کی درخواست قبول کر لی گئی تھی۔ اب ایجنسی اسے کبھی طلب نہیں کرتی۔ اس کے دو مہینے بعد جوناتھن نے اپنا سامان اپنی گاڑی میں رکھا اور جنوب کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو دن کے طویل سفر کے بعد وہ ساحل کے ساتھ ایک خوب صورت پہاڑی پر بنے چھوٹے سے ولا میں داخل ہوا۔ اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور اپنا سامان اندر لے آیا۔ یہ ولا اس نے برسوں پہلے رمیلا کے لیے خریدا تھا وہ اس کے ساتھ ہمیشہ یہاں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے شہر والا فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ وہاں اپنا بینک اکاؤنٹ بھی ختم کر دیا تھا۔ اس نے اپنے تمام پرانے رابطے ختم کر دیئے تھے اب کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں تھا۔

یہاں موسم بڑا خوشگوار تھا اسے رات میں بھی بہت اچھی نیند آئی۔ صبح پرندوں کے چہچہانے سے آنکھ کھلی تو وہ مسکرانے لگا۔ پھر اس نے کروٹ لے کر برابر میں لیٹی رمیلا کو دیکھا اور دل میں سوچا۔ اس کی محبت اسے واپس مل گئی تھی۔ اسے یقین تھا یہاں وہ اسے سنبھال لے گا۔ ابھی فیلا کے مقناطیسی میدان کی طاقت یہاں بھی کام کر رہی تھی اور یہ راز بس اب وہی جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے اکیلے واپسی کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ خود غرضانہ اور سفاکانہ تھا لیکن وہ کیا کرتا، وہ رمیلا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

محفلِ شعروسخن

❋ سنسان دل...... جودھپور، کبیر والہ
دعائے بد نہیں دیتا، فقط اتنا سا کہتا ہوں
کہ جس سے دل لگے تیرا، وہ تجھ سا بے وفا نکلے

❋ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے تیرا نام میرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

❋ جنید احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
بام شہرت پہ تو پوچھا ہے مجھے لوگوں نے
ساتھ نہ آیا کوئی کوچۂ رسوائی تک

❋ طارق کلیرا اینڈ عامر کاکی...... نورپورتھل
دل کے درد کا اندازہ ہوتا نہیں چہرے سے
ساحل پہ کھڑا کوئی کیا جانے سمندر کتنا گہرا ہے

❋ این ایس آر مدثر...... بلدیہ ٹاؤن، کراچی
وفاتِ عشق کا اعلان ہے کچھ مشورہ ہی دو یارو
یہ ہندو تھا، نہ مسلم تھا، جلادیں یا دفن کر دیں؟

❋ شازیہ گوہر...... ضلع قصور
آج کی شام میری پھر اداس گزری ہے
آج پھر اپنے ہی خوابوں کو بکھرتے دیکھا
مجھ کو شدت سے کئی دوست بہت یاد آئے
خشک پتوں کو درختوں سے جب جھڑتے دیکھا!

❋ صوبیہ تفسیر بابر...... اوکاڑہ
دل ہجر کے پرہول سناٹے میں رہا
یہ پیار کا سودا تو بڑے گھاٹے میں رہا

❋ عون عباس بابر...... اوکاڑہ
مجھ کو معلوم ہے کیا دستِ حنائی دے گا
قرب بوئیں گے تو فصلِ جدائی دے گا
آنکھ نیلم کی بدن کانچ کا دل پتھر کا!
اپنے شاہکار کو کون اتنی صفائی دے گا؟

❋ محمد رشید سیال...... روہڑی
جل جاؤ کڑی دھوپ میں خاموشی سے لیکن
اپنوں سے کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو یارو

❋ بشیر احمد بھٹی...... فوجی بستی، بہاول پور
ہم اس لیے چوڑے گھر میں شب کو تنہا ہوتے ہیں
دیکھ کسی دن آ مل ہم سے ہم کو تجھ سے کام ہے چاند

❋ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی...... خوشاب
خوابوں کی طرح تھا، نہ خیالوں کی طرح تھا
وہ شخص ریاضی کے سوالوں کی طرح تھا
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل کے نہ پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

❋ شاہ حسین...... نورپورتھل
یوں بھی کرتا ہے کوئی بھلا چاہنے والوں پہ ستم
نہ اشارہ، نہ کنارہ، نہ عنایت، نہ سلام

❋ عبدالعزیز...... نورپورتھل
دیوانہ پن، بے ربط سی باتیں شعر وسخن
بس یہی کچھ تو ہوتا ہے انجامِ محبت

❋ نوید انجم بٹ گہیاں...... گجرات
کسی سے بات کرنا بولنا اچھا نہیں لگتا
تجھے دیکھا ہے جب سے دوسرا اچھا نہیں لگتا

❋ بابر عباس، مسز بابر عباس...... گلیانہ روڈ، کھاریاں
نہ امنگ دل میں رہی کوئی نہ ذہن میں کوئی سوال ہے
یہ جو گردشیں ہیں حیات پر میری خواہشوں کا کمال ہے

❋ حسنین عباس، کمیل عباس...... گلیانہ روڈ، کھاریاں
کرب کے شہر میں رہ کر نہیں دیکھا تو نے
کیا گزرتی رہی ہم پر، نہیں دیکھا تو نے
اے مجھے صبر کے آداب سکھانے والے
جب وہ بچھڑا تھا، وہ منظر نہیں دیکھا تو نے

❋ احسان اللہ بھٹی...... سکھیکی گاؤں
دھوپ پھیلی تو ندامت کا بھی احساس ہوا
ٹہنیاں کاٹ کے رکھی تھیں شجر کی ہم نے

❋ محمد قدرت اللہ نیازی...... حکیم ٹاؤن، خانیوال
خط کے آخر میں سبھی یوں ہی رقم کرتے ہیں
اس نے بھی ویسے ہی لکھا ہوگا تمہارا "اپنا"

❋ ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں...... گجرات
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی

❋ محمد اشفاق سیال...... شورکوٹ سٹی
خوشی کا غم ہے نہ غم کی خوشی اب تو
بہت اداس گزرتی ہے زندگی اب تو

❋ محمد رشید سیال...... سکھر
دفعتاً یہ درد کے احساس کو کیا ہو گیا
درد کی معراج ہے یا زخم اچھا ہو گیا

❋ رمضان پاشا...... گلشن اقبال
تلخ لفظوں کو لبوں تک نہیں آنے دیتا
تیر چڑھ جاتے ہیں کمانوں پہ تو جل جاتے ہیں

❋ سیف جنید خاں...... قصور
ساون کی ہیں پھواریں، جیون پہ اب تمہارے
پیاسا مرا شجر ہے، کیا ساتھ تم چلو گے

❋ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر...... نئی منڈی سکھیکی
بچھڑ گیا ہے جو اس کا ملال کیا کرنا
اب اس کی یاد میں جینا محال کیا کرنا
وہ ہجر دے گیا اور پیار کو بھلا بیٹھا
وہ بے وفا تھا اب اس کا خیال کیا کرنا

❋ رانا یاسر علی...... نواں لاہو، گوجرہ
مت پوچھ ساقی ان کے مے خانے کا پتا
شراب کیا ان کے شہر کا پانی بھی نشہ دیتا ہے

❋ راجا افتخار علی افقی...... چوآسدن شاہ (موہڑہ)
لکھنا تو تھا کہ خوش ہوں تیرے بغیر بھی
آنسو مگر قلم سے پہلے ہی گر گئے

❋ شمشیر خاور، محمد عمران...... خوشاب
وہی لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، وہی لکھنے پڑھنے کا شوق ہے
تیرا نام لکھنا کتاب پر، تیرا نام پڑھنا کتاب میں

❋ احتشام احسان...... شیخوپورہ
سبھی تعریف کرتے ہیں میری تحریر کی لیکن
کبھی کوئی نہیں سنتا میرے الفاظ کی سسکی

❋ عمران حیدر بلوچ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
جس پہ برسا تھا سدا پیار کا بادل بن کر
ہائے وہ شخص میرے خون کا پیاسا نکلا

❋ احسان سحر...... میانوالی
نرم نرم پھولوں کا رس چوس لیتی ہیں
پتھر کا دل ہوتا ہے تتلیوں کے سینے میں

❋ محمد جاوید راؤ...... بہاولنگر
شدت طلب سے مجھے چاہا مجھے اپنایا اور اپنا کر چھوڑ گیا
کتنی محنت کی اس شخص نے صرف ایک دل دکھانے کے لیے

❋ ریاض بٹ...... حسن ابدال
کہیں سے ڈھونڈ کے لا دو وفا جو مل جائے
ترس گیا ہے جہاں رسمِ دوستی کے لیے

❋ تفسیر عباس بابر...... اوکاڑہ
اب جس کے دل میں آئے وہ پائے روشنی
ہم نے جلا کے دل سرِعام رکھ دیا

❋ کنول زریں...... گلبرگ، لاہور
ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

❄ کاشف عمیر......گلشن اقبال، کراچی
دل لگانے کی سزا دو مجھ کو
حرف آخر ہوں بھلا دو مجھ کو
مدت ہوئی ہے تری چاہت میں جلتے
اپنے ہاتھوں سے زہر پلا دو مجھ کو

❄ علی ناصر......حافظ آباد
دیتا رہا جو در سے محبت ہزار بار
وہ شخص بھی خلوص کا قائل نہیں رہا

❄ شوکت علی......گلبرگ، لاہور
آؤ کچھ دیر رو ہی لیں ناصر
پھر یہ دریا اتر نہ جائے کہیں

❄ نور بخش......پاکستان اسٹیل، کراچی
زندگی کے دامنِ امید میں
تیرے وعدوں کے سوا کچھ بھی نہیں

❄ رحیمہ سرور......ساہوواڑی، لاہور
تجھ کو سوچوں تو ایسے لگتا ہے
جیسے خوشبو سے رنگ ملتے ہیں
جیسے صحرا میں آگ جلتی ہے
جیسے بارش میں پھول کھلتے ہیں

❄ محمد حسن نظامی......قبولہ شریف
وعدے کی زنجیر سے وہ بندھا کبھی نہ تھا
میں ہر طرح سے اس کا تھا وہ میرا کبھی نہ تھا

❄ محمد کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
بڑی مدت سے زمانے کا یہی شیوا ہے
تیری نظروں کا بدل جانا بڑی بات نہیں!

❄ ریاض شاہد پینٹرز......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
زمانے گزر گئے رو کر نہیں دیکھا
آنکھوں میں نیند تھی مگر سو کر نہیں دیکھا
وہ کیا جانے گا محبت کا درد بے وفا
جس نے کبھی کسی کا ہو کر نہیں دیکھا

❄ محمد اظہر......ملیر، کراچی
مری سوچوں میں کیوں تالاب کی صورت وہ ٹھہرے ہیں
ان آنکھوں سے بھی دریا بن کے بہہ جاتے تو اچھا تھا

❄ عدنان صدیقی......اسلام آباد
طوفانی موسم میں رہائی ان کو مت دینا صیاد
پروالے پنچھی بھی اس میں بے پر بنتے جاتے ہیں

❄ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
خوابوں کی رہگزر میں، جذبوں کے امتحاں میں
ہم جی رہے ہیں لوگو! اک شہر بدگماں میں

❄ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
بے نام اداسی میں دیکھے ہیں کئی چہرے
ہر چہرہ حقیقت میں پردرد کہانی ہے

❄ رانا حبیب الرحمٰن......سینٹرل جیل کوٹ لکھپت
کبھی تو بھول جاتے ہیں، کبھی کانٹا سا چبھتا ہے
تمہارا ساتھ ادھورا تھا کہ اپنی ذات ادھوری ہے

❄ یمنیٰ احمد......کراچی
ہے ابر کیوں تنا ہوا کہ بستیاں تو بہہ چکیں
کہ گر چکی ہیں بجلیاں، یہ ہجرتوں کا دور ہے

❄ مہناز قریشی......گوجرانوالہ
کیسے افکار جگاتے ہیں بدلتے موسم
جب خیالات پر چھاتے ہیں بدلتے موسم

❄ صفدر عباسی......جہلم
قیدی تو کوئی چھوٹنا چاہتا ہی نہیں ہے
کھلتا ہے مگر کیوں درِ زندانِ تمنا

❄ محمود صدیقی......بفرزون، کراچی
اس جانِ تمنا نے بلایا تو تھا لیکن
ہم تھک گئے رستے میں وہ گھر دور بہت تھا

❄ نور العین......سرگودھا
ہے کوئی دنیا میں زندگی سے تنگ
اور کوئی مست مئے راگ و رنگ

کوپن برائے شمارہ نومبر 2012	مُحفلِ شعر و سخن
	نام : ------------------------------------
	پتا : ------------------------------------

قربانی

ثمر عباس

اس کائنات میں کچھ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں اور کچھ کو دوسروں کی فکر بھی لاحق رہتی ہے... اس کا شمار دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا تھا... اور پھر دوسروں کی فکر میں مبتلا ہو کر اس نے ایک ایسا کارنامہ انجام دے ڈالا جو شاید خود اس نے بھی نہ سوچا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے دنیا کو حیران کرنے میں بہت لطف آتا ہو...

مختلف سوچوں کی سمت بدلنے والا ایک دلچسپ انداز

میرا شوہر لائبریری سے گھر واپس آتے ہوئے راستے میں سے غائب ہوگیا، میرے لیے اس سے زیادہ تشویش ناک بات کیا ہوسکتی تھی لیکن سامنے بیٹھا ہوا پولیس آفیسر مجھے پُرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عمر کے درمیانی حصے میں ایسے واقعات عموماً پیش آتے رہتے ہیں۔ بہت سے مردوں کو فرار ہونے کا کوئی بہانہ چاہیے ہوتا ہے، کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ گھر سے سگریٹ لینے جاتے ہیں اور راستے میں سے ہی غائب ہوجاتے ہیں۔ ایسے

لوگوں کی تعداد ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔

وہ مسلسل بولے جا رہا تھا۔ اس کی آواز کبھی تیز اور کبھی ہلکی ہو جاتی اور مجھے یوں لگتا کہ کوئی اسپیڈ بوٹ قریب سے گزری ہو، مجھے اس کی بے سروپا باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے انہیں سننے سے زیادہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھاری بھر کم جسامت کا حامل تھا اور میرے سامنے کاؤچ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے آرام سے بیٹھا تھا جیسے کسی معاملے کی تفتیش کرنے کے بجائے پارٹی میں آیا ہو۔ اس کی گردن خاصی موٹی تھی۔ میری نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لیتے لیتے گریبان پر آکر رک گئیں۔ اس کی قمیص کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور بنیان کے اوپری حصہ سے سینے کے بال جھانک رہے تھے۔ میں کبھی اس جانب نہ دیکھتی اگر میری نظر اس نوٹ بک پر نہ جاتی جو اس نے بنیان کے نیچے چھپائی ہوئی تھی۔ شاید وہ اس میں اپنے نوٹس لکھتا ہوگا اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے میرے شوہر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہوں گی تو ان کا خلاصہ ضرور اس ڈائری میں درج ہوگا اور وہ گفتگو کے دوران کسی وقت بھی وہ نوٹ بک نکال کر ان معلومات کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس نے اب تک کوئی کام کی بات نہیں کی تھی اور اب میں اس کی باتوں سے بے زار ہونے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا، میں اس اندیشے کو زبان پر لانے سے نہ روک سکی۔

''کہیں رینڈی مر تو نہیں گیا۔ ممکن ہے کہ کسی نے اسے قتل کر دیا ہو، کیا تم نے اس بارے میں سوچا ہے آفیسر؟''

''کیا اسکول میں ایسے لوگ ہیں جو اس کو پسند نہ کرتے ہوں۔ ایسے طالب علم جنہیں اس نے پریشان کیا ہو۔ میرا مطلب ہے فیل کر دیا ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''ہر کوئی رینڈی کو پسند کرتا تھا اور کسی کے پاس اس کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ سب بچے اس سے مطمئن تھے۔ لوگ اسے احمق سمجھتے تھے، اس کے باوجود کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ بے مقصد ہی کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا ہوگا۔''

''یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مسز رینڈی۔'' وہ اپنی ٹانگ سیدھی کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں منشیات کا کاروبار نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی جرائم پیشہ گروہ کی موجودگی کی اطلاع ملی ہے۔ لوگ رینڈی کو جانتے ہیں، لائبریرین بھی اس سے اچھی طرح واقف ہے اس نے خود اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم نے یہاں سے لائبریری کے درمیان ایک ایک انچ چھان مارا۔ سب لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں، کسی نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا۔ کہیں بھی تشدد کے آثار نہیں ملے۔ اس وقت اتنا سناٹا بھی نہیں تھا۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور کافی لوگ سڑکوں پر موجود تھے۔''

میں صوفی کے یہاں سے ساڑھے نو بجے واپس آئی تھی۔ وہاں اتنا مزہ آ رہا تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ہم نے ٹیلی وژن پر نیشنل جیوگرافک کا پروگرام دیکھا اور ان مقامات کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جہاں ہم کبھی نہیں جا سکتے تھے۔ ہماری واحد تفریح وائن کے ایک یا دو گلاس تھے۔ میں جھیل بیکال کے بارے میں بڑی پُرجوش تھی۔

میں رینڈی کو اس کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک گلاس وائن پیوں گی اور جھیل بیکال جانے کے بارے میں سوچوں گی۔

''عام طور پر لوگ اسی طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔'' جیک نے طنزیہ انداز میں کہا۔ غالباً وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ رینڈی مجھ سے تنگ آ کر کہیں چلا گیا ہے۔ ''یہ لوگ چپکے سے غائب ہو جاتے ہیں اور کسی دوسری جگہ جا کر نئی شناخت کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔''

میں رینڈی اور اس کی شناخت کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ کتابوں کا دیوانہ تھا۔ ہر ہفتے لائبریری سے کتابیں لے کر آتا اور مجھ سے ان کے بارے میں باتیں کیا کرتا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ ہم کوئی نئی بستی آباد کر سکتے ہیں یا ان کتابوں کو پڑھ کر میں کسی بڑے زرعی فارم کا انچارج بن سکتا ہوں۔''

میں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتی تو وہ کہتا۔ ''یہ کتابیں مجھے آنے والے دن کے لیے روشنی عطا کرتی ہیں۔''

◆◆◆

میں گھر واپس آنے کے بعد کافی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی پھر مایوس ہو کر اس کے بستر کی چادر سمیٹی اور اسے لپیٹ کر الماری میں رکھ دیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا لیکن وہ کہاں جا سکتا ہے۔ جہاں تک مجھے علم تھا وہ کبھی اس قصبہ سے باہر نہیں گیا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے شہر میں اس کا کوئی دوست یا جاننے والا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی کا فون آتا تھا۔ اس کی دنیا اسکول اور کتابوں تک محدود تھی۔ وہ ایک کمزور اور غیر متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کے ساتھ کس طرح گزارہ کر رہی تھی البتہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس قصبے میں اس سے بہتر اور بے ضرر شخص کوئی نہیں مل سکتا۔

میں نے رینڈی کی الماری کھولی۔ شاید وہ میرے لیے کوئی خط چھوڑ گیا ہو پھر میں نے اس کے ذاتی استعمال کی اشیا مثلاً موزوں اور انڈر ویئر کا جائزہ لیا۔ تمام چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ موزوں اور انڈر ویئر کے بغیر ہی گھر سے باہر کیسے چلا گیا اور جب میں نے یہی بات بعد میں پولیس آفیسر جیک سے کہی تو اس کا کہنا تھا کہ نئی شناخت اختیار کرنے کے لیے پرانی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

میں نے اس کی دراز کھولی۔ اس کا والٹ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں دس ڈالر اور پانچ ڈالر کے دو دو نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح ٹٹولا کہ شاید کاغذ کا کوئی ایسا پرزہ مل جائے جس پر کوئی فون نمبر لکھا ہو لیکن مجھے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا۔ البتہ اس کا کریڈٹ کارڈ اور لائبریری کارڈ دونوں موجود تھے۔

اب میری تشویش اور بڑھ گئی۔ اس کی تمام چیزیں الماری میں موجود تھیں اور وہ بے سروسامانی کے عالم میں گھر سے نکلا تھا۔ اس لیے خالی ہاتھ کسی دوسرے شہر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیا اس نے پیر کے روز بھی لائبریری سے کتابیں لی تھیں ورنہ لائبریرین کیوں کہتی کہ اس نے اسے دیکھا تھا۔ کیا اس میں کوئی ایسی کتاب بھی تھی جس کا موضوع ہو۔ ''گھر سے کیسے بھاگا جائے تاکہ تمہاری بیوی کبھی تمہیں تلاش نہ کر سکے۔'' اگر اس نے کتابیں لی تھیں تو وہ کہاں گئیں، مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں نہیں گیا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اونچے خواب دیکھا کرتا تھا۔ کسی ویٹرس یا بار گرل کی خاطر گھر چھوڑ کر کیسے چلا جاتا۔

میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور بقول جیک یہ ایک پُرامن قصبہ تھا جہاں کسی جرائم پیشہ گروہ کا وجود نہ تھا۔ پھر وہ کہاں چلا گیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی۔ میرا چہرہ گیلا ہو گیا۔ مجھے لگا کہ سانس رک گئی ہو اور میں سانس کیسے لے سکتی تھی جبکہ رینڈی اس دنیا میں نہیں رہا۔

میں نے الماری بند کی اور وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ وہاں مجھے قالین پر کاغذ کی کشتیاں نظر آئیں۔ مجھے یاد آ گیا یہ رینڈی نے بنائی تھیں اور جب میں نے اس سے وجہ پوچھی تو وہ بولا کہ اس میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرے گا اور یہ کہ مجھے بھی اس کے ساتھ جانا ہوگا۔ میں اس کی باتیں سن کر مسکرا دی۔ اس وقت وہ مجھے بالکل ایک بچہ لگ رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں معمولی زندگی گزارنے والوں کے لیے بچہ بنے رہنا ہی ٹھیک ہے۔

مجھے باتھ روم جانے کی حاجت ہو رہی تھی اس لیے وہاں سے اٹھنا پڑا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے باندھ لیا۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ بال کافی لمبے ہو گئے ہیں۔ انہیں کٹوانے کی ضرورت ہے لیکن رینڈی کو لمبے بال پسند تھے اس لیے میں اس کا دل رکھنے کی خاطر لمبے وقفے کے بعد پارلر جایا کرتی تھی۔ رینڈی کا نام ذہن میں آتے ہی میں سوچنے لگی کہ اس کا والٹ الماری میں کیسے آ گیا۔ اگر رینڈی نے لائبریری سے کتابیں لی تھیں یا اس بارے میں سوچا تھا تو والٹ اس کے پاس ہی ہونا چاہیے تھا۔

اگلے روز لائبریری گئی تو لائبریرین نے بتایا کہ رینڈی نے تین کتابیں واپس کی تھیں اور ان کی جگہ، پال اینڈرسن کا گلدستہ لی تھی اور اس کا والٹ اس کے پاس تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ گھر واپس آیا۔ بٹوا دراز میں رکھا اور کہیں چلا گیا لیکن وہ کتاب کہاں تھی؟

◆◆◆

سہ پہر میں، میں نے پورے گھر کی صفائی کی۔ رینڈی کی جدائی نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا اور میں عجیب و غریب انداز میں سوچنے لگی تھی۔ اس وقت بھی اس نیت سے صفائی کر رہی تھی کہ شاید وہ گھر کے کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا ہو اور اگر میں نے اچھی طرح تلاش کیا تو وہ مجھے مل سکتا ہے۔ میں نے اسے بیڈروم کے علاوہ گیسٹ روم، باتھ روم، کچن تہ خانے، اسٹور یہاں تک کہ میلے کپڑوں کے بکس میں بھی دیکھ لیا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ میں اسے یوں تلاش کر رہی تھی جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں بلکہ گھڑی یا انگوٹھی جیسی کوئی چیز ہو۔ پھر میں اوپر کی منزل پر گئی اور وہاں بھی اچھی جھاڑ پونچھ کی۔ پانچ بج گئے تو میں نے کچرے کی بالٹی اٹھائی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہیں بیٹھ گئی اور رینڈی کے بارے میں سوچنے لگی۔

میں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی لیکن اب احساس

ہو رہا تھا کہ وہ کن خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ انتہائی شریف، محبت کرنے والا غائب دماغ شخص تھا جس کے دل میں لمبی چوڑی خواہشیں نہیں تھیں۔

وہ ایک اچھا منیجر تھا جس کی سب لوگ عزت کرتے تھے، وہ سائنس فکشن پڑھنے کا شوقین تھا اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

میں صوفی کے یہاں سے گھر واپس آئی جو بلاک کے آخری سرے پر واقع تھا۔ ہم ہمیشہ اپنے پورچ کی لائٹ روشن رکھتے تھے کیونکہ ہمارے گیرج کے ساتھ ہی درختوں کی لمبی قطار تھی جس کے سایہ کی وجہ سے وہاں دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازے کے دونوں جانب رکھے ہوئے گملوں پر نگاہ ڈالی کہ کہیں انہیں پانی کی ضرورت تو نہیں اور دروازہ بند کر کے زور سے آواز لگائی۔ ''رینڈی، میں آ گئی۔'' پھر میں بیڈروم میں گئی۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن عموماً اس کے تکیے کے ساتھ ایک لیمپ رکھا ہوتا جس کی روشنی میں وہ کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ وہ کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا کرتا۔ ''ہائے ہنی، آج کا دن کیسا رہا؟'' لیکن اس دن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بیڈروم میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بستر پر ایک شکن تک نہ تھی۔

میں نے رینڈی کی یادوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے سر کو زور سے جھٹکا اور کھڑی ہو گئی۔ کچرے کی بالٹی اٹھائی اور گھر کے پیچھے رکھے ہوئے ڈرم میں اسے خالی کر کے واپس آ گئی پھر میں نے پولیس آفیسر جیک کو فون کیا کیونکہ میں سمجھ رہی تھی کہ اب کچھ عملی کارروائی کرنے کا وقت آ گیا ہے حالانکہ میں نے بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے پاس کچھ مزید معلومات ہوں گی کیونکہ اسی نے کہا تھا کہ لاپتا افراد کے بارے میں جاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔

◆◆◆

چھ ہفتے گزر گئے لیکن رینڈی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس قصبے میں جیک کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس پر بھروسا کر سکتی یا اس سے مدد لے سکتی اور وہ اپنی طرف سے جو کوشش کر رہا تھا، اس سے مجھے مکمل طور پر باخبر رکھتا۔ وہ ہر تیسرے چوتھے دن میرے پاس آتا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا جاتا۔ میں نے دوبارہ اپنے کام پر جانا شروع کر دیا جس سے مجھے ہمیشہ بوریت ہوتی تھی۔ دراصل مجھے محکمۂ زراعت کی سرگرمیوں سے مقامی لوگوں کو آگاہ کرنا ہوتا تھا، میں کاشت کاروں میں لٹریچر تقسیم کرتی اور انہیں بتاتی کہ فصل کو نقصان سے بچانے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ میری بوریت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سب جدی پشتی کاشت کار کھیتی باڑی کے روایتی طریقوں پر عمل کرتے آ رہے ہیں جب انہیں جدید طریقوں کے بارے میں بتاتی طنزیہ انداز میں مسکراتے اور بروشر لے کر چلے جاتے۔ اس لیے مجھے یہ کام اکتا دینے والا لگتا تھا۔

میری سہیلیوں نے بھی رینڈی کے بارے میں پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتیں لیکن منہ سے کچھ نہ کہتیں۔ کبھی کبھی کوئی پوچھ بیٹھتی۔ ''کیسی گزر رہی ہے؟'' میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔ ان احمقوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شوہر کے بغیر بیوی پر کیا گزرتی ہے۔

انہی دنوں قصبے میں ایک آئل ڈبو پر سیل لگی۔ میں وہاں چلی گئی اور ایک ڈبا خرید لیا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ شاید اس لیے کہ رینڈی بھی ہمیشہ کار کے انجن کا آئل تبدیل کیا کرتا تھا۔ مجھے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور میں سمجھتی تھی کہ اگر بروقت آئل تبدیل نہیں کیا گیا تو گاڑی اسٹارٹ نہ ہو سکے گی یا انجن کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں نے گیراج میں پہنچ کر الماری سے ایک نیا فلٹر نکالا اور اسے تبدیل کرنے کے لیے جھکی ہی تھی کہ وہاں مجھے پال اینڈرسن کی کتاب نظر آئی۔ یہ وہی کتاب تھی جو رینڈی نے آخری بار لائبریری سے لی تھی اور ہم دونوں یعنی میں اور جیک اس کے بارے میں متفکر تھے۔ میرے ہاتھ سے فلٹر چھوٹ کر کار کے نیچے جا گرا۔ وہ کتاب گرد میں اٹی ہوئی تھی اور اس کا ایک کونا پائپ میں پھنسا ہوا تھا۔

میں نے جیک کو فون کر کے بتایا تو وہ بھی اس کتاب کے بارے میں سن کر حیران رہ گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ایک شخص کے ہمراہ آیا جو مقامی لیبارٹری میں کام کرتا تھا۔ اس نے کتاب کو ہاتھ لگانے کے بجائے دور سے اس طرح دیکھا جیسے وہ ڈائنا سور کی کوئی ہڈی یا ڈھانچا ہو پھر اس نے ایک کپڑے میں اس کتاب کو لپیٹا اور اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔

تین دن بعد جیک ایک بار پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پُراعتماد لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''مسز رینڈی! تمہارے شوہر نے ہی وہ کتاب وہاں رکھی تھی۔ اس پر اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ ہم اس کا سرورق صاف کر کے لائبریری بھجوا دیں گے تاکہ تمہیں جرمانہ ادا نہ کرنا پڑے۔''

میں حیران رہ گئی۔ پولیس والے اتنے سمجھدار اور خیال رکھنے والے بھی ہو سکتے ہیں۔ واقعی اگر وہ کتاب مقررہ مدت سے زیادہ عرصہ تک میرے پاس رہتی تو مجھے جرمانہ دینا پڑتا۔

''نہیں۔'' میں نے بے یقینی کے انداز سے کہا۔ اوّل تو رینڈی گھر پہنچا ہی نہیں تھا اور اگر آیا بھی ہوگا تو اسے کتاب لے کر گیراج میں جانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر وہ اسے وہاں چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟''

جیک میرے، انہیں، کہنے پر چونک گیا اور بولا۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟''

''تم نے غور سے کتاب دیکھی تھی۔ اس میں کوئی پیغام یا کوئی ایسا اشارہ تو موجود نہیں تھا جس سے رینڈی کی گمشدگی کے بارے میں کوئی سراغ مل سکے؟''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے لوگ کتابوں پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں لیکن تمہارے شوہر نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''کیا تم کبھی لائبریری گئے ہو آفیسر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کچھ شرمندہ سا نظر آنے لگا جیسے میں نے اس کی کم علمی کا مذاق اڑایا ہو۔

''رینڈی لائبریری میں ہی کتاب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیتا تھا اور اگر وہ کتاب اسے پسند آ جاتی تو گھر لے آتا اور کسی وقفہ کے بغیر اسے پڑھتا رہتا چاہے اسے رات بھر جاگنا کیوں نہ پڑے۔''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کے مطالعہ میں مخل ہوا ہو یا کسی نے اسے تنگ کیا ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو وہ کتاب بند کرنے سے پہلے وہ صفحہ ضرور موڑ دیتا۔''

''مسز رینڈی۔ اس طرح کے کیسز، جاسوسی فلموں جیسے نہیں ہوتے، یہ محض ایک افسوسناک واقعہ ہے۔''

''ٹھیک ہے تو تم وہ کتاب مجھے واپس کر دو۔ میں خود اسے چیک کروں گی اور جرمانہ بھی دے دوں گی۔ اس طرح تمہارے بجٹ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

میں نے رات ہونے کا انتظار کیا اور کتاب لے کر میز پر بیٹھ گئی۔ گو کہ ٹیبل لیمپ کی روشنی اچھی خاصی تھی اس کے باوجود میں نے ٹارچ کی مدد سے ایک ایک صفحہ دیکھنا شروع کیا۔ میں نے دو سو بارہ صفحات دیکھ لیے لیکن مجھے کہیں کوئی پیغام نظر نہیں آیا۔ گویا میں بھی غلطی پر تھی۔ پھر یہ کتاب گیراج میں کس طرح پہنچی میں نے ایک بار پھر اپنے ذہن میں ایک نقشہ بنا کر سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ رینڈی لائبریری سے نکل کر پیدل ہی گھر کی جانب آ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر بیڈروم میں آیا اور بستر کے سرہانے رکھا ہوا لیمپ روشن کر دیا۔ اس نے اپنا پرس نکال کر الماری میں رکھ دیا۔ کتاب ابھی تک اس کے بازو میں دبی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت ایک آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے گیا۔ اس وقت بھی کتاب اس کے بازو میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھولا لیکن کیوں؟

کیونکہ اس نے ایک آواز سنی تھی ایک مخصوص آواز۔ اس نے کتاب کار میں پھینکی اور اس شیلف کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کا پستول رکھا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میرے پورے بدن میں جھرجھری سی آ گئی اور ہڈیوں میں سرد لہر دوڑ گئی۔ جب جیک نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس پستول ہے تو میں نے کہہ دیا نہیں کیونکہ اس وقت میرے ذہن میں اس پستول کا تصور تھا جو لوگ عام طور پر اپنے بستر کے ساتھ والی دراز میں رکھتے ہیں۔

جب میری ٹانگوں میں تھوڑی سی جان آئی تو میں گیراج میں گئی اور چھت پر لگی لائٹ روشن کر دی وہ پستول ایک زرد رنگ کے سوتی کپڑے میں لپیٹ کر شیلف کے اوپر رکھا جاتا تھا لیکن اس وقت وہ جگہ خالی تھی۔ سردی کے باوجود میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔

◆◆◆

اگلی صبح پولیس آفیسر جیک ہمارے گیراج میں موجود تھا۔ اس نے میری پوری بات غور سے سنی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ وہ کس قسم کی گن تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم بس اتنا جانتی ہوں کہ اس کی نال لمبی اور دستہ لکڑی کا تھا اور وہ زرد رنگ کے سوتی کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اس کا ریپر دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ وہ کون سی گن تھی۔''

''میں نہیں جانتی کہ میرے شوہر کے پاس کون سی گن تھی کیونکہ میں نے کبھی اسے ریپر سے باہر نہیں دیکھا۔ کیا تمہارے خیال میں یہ بھی کوئی جرم ہے؟''

''مانتا ہوں کہ یہ جرم نہیں ہے لیکن تم ہماری مدد نہیں کر رہی ہو۔''

''اور کیا مدد کروں۔ میں نے ہی تمہیں وہ کتاب تلاش کر کے دی تھی۔ تم اپنی نااہلی کا الزام مجھ پر مت ڈالو۔''

میں نے اپنی گاڑی کی چابی نکالی اور کار میں بیٹھ گئی۔ جیک وہیں کھڑا رہا۔ میں نے کار اس کے پاس سے گزاری لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میرے ساتھ جائے گا۔ میرے

کانوں میں اس کی آواز آئی۔

''اگر گیراج سے باہر نکلنے کے بعد کوئی مسئلہ ہو تو تم مجھے فون کر سکتی ہو۔''

میں ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور کار کا رخ محکمہ زراعت کی مقامی شاخ کی جانب موڑ دیا جہاں میں ہر ہفتہ جایا کرتی تھی۔ کار پارک کر کے دفتر کا عقبی دروازہ کھولا اور میل باکس سے ڈاک نکالی۔ آٹھ برس سے میرا یہی معمول تھا اور میں اس کام سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔ ڈاک میں دو سرکاری فائلیں، ایک بل اور ایک محکمۂ ڈاک کی جانب سے اطلاع تھی کہ وہ صبح میں کوئی باکس بھیجنے کی کوشش کریں گے۔

میں میز پر بیٹھ کر اپنی ہتھیلیوں کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ کیا وجہ تھی کہ رینڈی کو اچانک ہی گن کی ضرورت پیش آگئی اور وہ گیراج کی طرف بھاگا۔ یقیناً اسے اس بندوق سے کوئی کام لینا ہوگا جو کہ ایک خطرناک بات تھی۔ پھر وہ واپس بھی نہیں آیا۔ یہ اس سے زیادہ تشویش ناک بات تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے دلی سے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے جیک بول رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی لیکن پھر بھی اس نے اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا۔ ''شیرف ڈیپارٹمنٹ سے جیک بول رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''ہاں۔''

''تم وہیں رہنا اپنے دفتر میں۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔ ''میں وہیں آرہا ہوں۔''

میں نے فون رکھ دیا اور دوبارہ اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگیں۔ مجھے لگا جیسے کوئی چھپکلی ٹیلی فون پر رینگ رہی ہو۔ میں نے اپنی انگلیوں کو کھینچنا شروع کر دیا لیکن وہ اب بھی چھپکلی کے مانند ہی نظر آرہی تھیں۔

عقبی دروازہ کھلا اور ایک جانی پہچانی آواز نے میرا نام لے کر پکارا۔ اس نے قریب آکر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

''اسے راستے میں ہی کہیں گولی ماردی گئی تھی۔ اگر تم وقت پر گھر آجاتیں تو اس کی زندگی بچائی جاسکتی تھی۔ اس کی لاش گڑھے سے ملی ہے۔''

''تم نے وہ لاش دیکھی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ مر گیا۔'' میں خود کلامی کے عالم میں بولی۔ ''اب وہ کبھی اس کتاب کو ختم نہیں کر سکے گا اور مجھے ہر حال میں وہ کتاب لائبریری کو واپس کرنا ہوگی۔''

جیک نے دفتر کے سامنے والا دروازہ بند کیا اور پردے گرا دیے پھر وہ پیچھے مڑا اور اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھے یاد آگیا کہ ہماری شادی کے موقعے پر رینڈی کے بھائی نے اسے تحفے میں انگوٹھی دینے کے لیے اسی طرح پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ دونوں کی پتلونیں بہت تنگ تھیں۔

جیک نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ پر وہی انگوٹھی اور وہ گھڑی رکھی ہوئی تھی جو رینڈی کے ڈیڈی نے اسے دی تھی۔

''کیا اس کے پاس سے یہی کچھ ملا ہے؟''

''نہیں لیکن تم ان چیزوں کی مدد سے اسے شناخت کر سکتی ہو۔''

''نہیں۔ میں خود وہاں جاؤں گی۔''

''میں ایسا نہیں چاہتا۔''

''تم مجھے وہاں لے کر جاؤ گے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''رینڈی زخمی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس نے کسی کو مارا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا، لائبریری میں یا گھر کے راستے میں ہوا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

اس نے کار اسٹارٹ کی اور قصبہ کی طرف واپس چلا گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ رینڈی نے بندوق سے فائر کیا اور عین اسی وقت اسے دل کا دورہ یا فالج کا حملہ ہو گیا۔ اس کا پتا تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی چلے گا۔''

''تمہارے جانے کے بعد میں دوبارہ درختوں کے جھنڈ کی طرف گیا۔ وہاں میں نے جھاڑیوں میں اس بندوق کا ریپر دیکھا اور اس طرح مجھے رینڈی کی لاش اور اس کی بندوق مل گئی۔ اس سے ایک فائر ہوا تھا۔''

''خدا اس پر رحم کرے۔ اس نے یہ احمقانہ حرکت کیوں کی؟'' میں بڑبڑائی۔

ہم ایک پرانی سڑک سے گزرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ تک پہنچے۔ جیک نے گاڑی پارک کی اور ہم درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اخروٹ کا درخت نظر آگیا جس کے گرد پولیس نے زرد فیتا باندھ رکھا تھا اور اس کی شاخوں کے نیچے ایک بڑا سا نیوی بلیو رنگ کا بیگ رکھا ہوا تھا۔

''ہمیں درختوں کی اگلی قطار کے نیچے سے جو کچھ ملا، وہ سب اس بیگ میں موجود ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''رینڈی کی لاش بیگ میں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

میں کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے بیگ کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اسے کھولو۔''

''نہیں مسز رینڈی۔ یہ لاش کافی عرصے تک یہاں پڑی رہی ہے۔ تم اسے نہیں دیکھ پاؤ گی۔''

''میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کہیں یہ کوئی اور شخص تو نہیں جس نے رینڈی کی گھڑی اور انگوٹھی چرالی ہو۔''

جیک اس تھیلے کے پاس جھکتے ہوئے بولا۔ ''یہ رینڈی ہی تھا جس نے دونوں چیزیں پہن رکھی تھیں۔''

یہ کہہ کر اس نے بیگ کی زپ کھول دی۔ مجھے رینڈی کا زخمی کندھا نظر آیا۔ اس نے وہی آسمانی رنگ کی فلالین والی قمیص پہن رکھی تھی جس کا رنگ اڑ گیا تھا اور کہنیوں کے پاس سے پھٹ گئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس کے جسم کے جو حصے باقی بچ گئے تھے۔ انہیں پوری طرح ڈھک دوں لیکن میری ہمت نہیں پڑی اور میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے، بس اتنا ہی کافی ہے۔''

جیک نے سر ہلایا اور بیگ کی زپ بند کر دی۔

رینڈی نے مجھ سے دھوکا نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس کا مجھ سے کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ وہ معمول کے مطابق گھر آیا اور کتاب لے کر بیٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک مخصوص آواز سنی۔ یہ بھیڑیے کی آواز تھی۔ وہ اگر بستی میں آجاتا تو بڑی تباہی مچتی۔ لہٰذا رینڈی نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔ وہ گیراج میں گیا اور وہاں سے اپنی بندوق اٹھا کر بھیڑیے کی تلاش میں نکل گیا۔ اس نے اسی اخروٹ کے درخت پر مچان بنائی جہاں ہم اکثر جایا کرتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ بستی کی طرف جانے کے لیے بھیڑیا وہاں سے گزرے گا۔ حالانکہ اسے بندوق چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا شاید اس نے پہلے کبھی اسے استعمال بھی نہیں کیا ہوگا لیکن بستی والوں کی حفاظت کی خاطر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اس کے اندازے کے مطابق کچھ دیر بعد بھیڑیا وہاں سے گزرا تو اس نے گولی چلادی۔ اسے نشانہ بازی کی مشق نہیں تھی لیکن یہ گولی نشانے پر لگی اور بھیڑیا غراتا ہوا جنگل کی طرف چلا گیا لیکن فائر کرتے وقت جو جھٹکا اسے لگا وہ جان لیوا ثابت ہوا، اس کے ساتھ ہی وہ درخت سے نیچے آن گرا۔

ہم واپس گھر چلے آئے۔ میرا پورا جسم کانپ رہا تھا اور مجھے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ جیک نے میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور مجھے سہارا دے کر کچن کی میز پر بٹھا دیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہ لگتی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ رینڈی کے جانے کے بعد میں خود کو تنہا اور بے آسرا سمجھ رہی تھی۔

جیک نے بڑی بے تکلفی سے کچن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس نے انڈے اور فرائی پین نکالا اور کافی بنانے لگا۔ اس دوران ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ صرف تیل گرم ہونے کی آواز اور کافی کی مہک محسوس کی جاسکتی تھی۔

''میں محکمۂ زراعت کی ملازمت سے بے زار ہو چکی ہوں۔ آٹھ سال بہت ہوتے ہیں۔''

جیک نے فرائی پان میں انڈا پھینٹتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا اور بولا۔ ''ہاں۔''

''کیا شیرف کے یہاں سراغ رساں ہوتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال تو کوئی نہیں ہے۔'' اس نے پیالیوں میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا اور فریج سے کیچپ کی بوتل نکال لی۔

''کیوں؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ان کے پاس اتنا بجٹ نہیں ہے مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت ہے؟''

اس نے پلیٹ میں انڈے نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے پھر وہ بھی کافی کا مگ لے کر بیٹھ گیا۔

''کیا تم رضاکارانہ یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہو؟''

''تم اگر چاہو تو مجھے معاوضہ بھی مل سکتا ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''اس کے لیے تمہیں تربیت لینا ہوگی۔''

میں نے سر ہلایا اور انڈے کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''تم انڈے اچھے بنا لیتے ہو۔''

''تمہیں حیرت ہو رہی ہے؟''

''ہاں تھوڑی بہت۔'' میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ ''واقعی رینڈی نے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ اس نے اپنی جان دے کر ہم سب کو بچالیا اور اس کے ساتھ ہی میرے لیے تم تک پہنچنا ممکن ہو گیا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

اس کی بات رد کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ رینڈی کے جانے کے بعد میں تنہا ہو گئی تھی اور مجھے بھی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

مسافر

ناصر ملک

قسط نمبر:8

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہرادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضائوں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساسِ زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سردرویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافرِ بے نوا کی روداد حیات

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر ہیں، راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر اپنے سفر پر رواں ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے جسے لوگ پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا۔ والد صاحب کھیتوں میں مزدوری کر کے عزت کی روزی کماتے تھے کہ ایک روز جب میری عمر پانچ برس تھی ایک خونچکاں واقعے میں میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنالیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ حالانکہ وہ بھی کوئی آسودہ حال گھرانا نہیں تھا۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کر دیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آ گیا۔ گاؤں میں دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا اور سواریاں لے کر قریشی موڑ تک جاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی ڈاکٹر زیادہ عرصے گاؤں میں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص مگر کچھ قنوطی انسان تھے لیکن نڈر اور بہادر۔ میں ان سے عملی تربیت بھی

حاصل کر رہا تھا اور ساتھ ہی چھوٹے بڑے کام کر دیا کرتا اس کے علاوہ مجھے ان کے ہاں سے کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ ایک درزی مراد بخش دیوانہ دوستی تھی جو کہ شاعر بھی تھا اور اس کے درد بھرے دوہڑے کافی اثر رکھتے تھے۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپنچ تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہو گیا اور اپنی قلبی کیفیت کا مجھ سے اظہار کیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا اور اپنے عشق کی روداد سے آگاہ کرتا رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ۔

وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ مریض کو اسپتال لایا جائے جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کوئی انتقامی سازش ضرور کرے گا جو کہ شاہ جی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے کھالے سے مشورہ کیا اور ہم دونوں نے شاہ جی کی رہائش گاہ کی نگرانی کی لیکن شاہ جی بھی غافل نہیں تھا انہوں نے پیش بندی کر رکھی تھی، یہ سازش ناکام ہو گئی جس میں بخت خان معاون ثابت ہوا۔ اس کے لیے میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی میں نے سوچا کہ بخت خان سے ان کی شکایت کروں گا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیرِ نفس تھا اور وہ شاہ جی کے زیرِ علاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور جب ماسٹر جی اس کا رشتہ لے کر شاہ جی کے پاس آئے تو شاہ جی نے انہیں سخت سست سنا کر انکار کر دیا۔ پھر اس نے میرے ذریعے شاہ جی کو وہ خط دے دیا لیکن شاہ جی نے اس کا جواب نہیں دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی غلط تاثر لے لیا اور ایک بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہارِ الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھ گئی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے میرے جسم کو خنجر کے ذریعے زخمی کر دیا اور آخری وار کرنا چاہتا تھا کہ اسے میری حالت کا احساس ہوا اور وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کر رہے تھے میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا اور یہ کام سونپا کہ ہم اس کی جاسوسی کریں۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کر لیا۔۔۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اسما سے اسی دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہو گیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی، میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی وہ نور پور کے حالات سے بھی واقف تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر نور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ کھالا بھی لاپتا تھا، ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا اور قتل کا نشان مٹانے کے لیے اس کی لاش کو ڈیرے پر جلا ڈالا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ شاہ جی کے مطابق اس کے ڈانڈے میری ننھیال شاہ جمال میں تھے لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ میڈم کے اڈے پر میری ملاقات سونیا نامی لڑکی سے ہوئی جس نے مجھے میڈم کے متعلق منفی اطلاعات فراہم کیں لیکن میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔ سونیا نے بتایا کہ وہ مجھے ایک چیز دکھانا چاہتی ہے اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہاں ایک لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، وہ اسما تھی، سردار حیدر خان کی بیٹی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہو گیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ اس کے چہرے کا رخ جب واضح ہوا تو میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آ گیا۔ اسی دوران میڈم کے اظہارِ الفت سے میں سخت پریشان تھا۔ پروین ہنوز نہیں تھی لیکن میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرا لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرا دی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہِ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پپانا می ایک تجربے کار شخص تھا۔ ہم جب ڈیرے تک پہنچے تو ہمیں جھاڑی میں ایک لاش نظر آئی، اسے دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ باہر نکالنے پر وہ وحید ثابت ہوا جو زخمی حالت میں تھا اسے ابتدائی طبی امداد پہنچا کر ہم ڈیرے پر پہنچے لیکن وہاں ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہ تھی، وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دل جیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کر کے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کر کے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم بھی اصل حقائق سے بے خبر تھی، بہرحال میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نور پور سے نکال لانا چاہیے لہٰذا ہم نور پور پہنچے لیکن، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پپا کا انتظار کرنے لگا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو خالی ہاتھ تھا، اسے یوں مایوس دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مجھے اپنے ادا کیے ہوئے الفاظ بھی ناشناسا لگے۔ وہ بولا۔ ”تمہیں تفصیلی رپورٹ بعد میں دوں گا۔ اب ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکلنا ہے ورنہ ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ چلو......“

وہ میرا کندھا تھپتھپا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے شکست خوردہ انداز میں گیٹ کھولا اور سر جھٹک کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً ہی انجن اسٹارٹ کیا اور بیر کی اوٹ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لے آیا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے لینڈ کروزر کے پیچھے بریک لگائے اور بولا۔ ”تم اس گاڑی کو روڈ سائڈ پر کرو۔ میں جب گاڑی نکال لوں تو اسے ایسی پوزیشن میں کھڑی کر دینا کہ روڈ بلاک ہو جائے۔ ہری اَپ!“

میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ٹرو پر سے اُترا اور لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ جی چاہ رہا تھا سردار حیدر خان کا ستیاناس کرنے کے لیے بلوچ نگر میں اس کے محل میں پہنچ جاؤں۔ اس ظالم نے میرا ہنستا بستا گھر اُجاڑ کر میرے سینے میں کبھی نہ بجھنے والی آگ بھر دی تھی۔

میں جونہی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی اور دھند کی گہری تہ اُتر گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ گاڑی میں میری چچازاد بہنیں اور کھالا زندہ و سلامت حالت میں موجود تھے جنہیں میں یک لخت بھول گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور کچی روڈ سائڈ پر اُتار دیا۔ ہاتھ بڑھا کر سیلنگ لائٹ آن کی اور پلٹ کر فرزانہ اور شبانہ کی طرف دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دونوں سیٹ پر موجود نہیں تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے سیٹ پر پڑے ہوئے پیپر رول کو دیکھنے لگا۔

میں چیتے کی سی پھرتی سے گاڑی سے اُترا اور گھوم کر عقبی سائڈ گیٹ تک آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور گاڑی کی طرف پیٹھ کر کے تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی کماد کی اونچی فصل کو دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً میری عدم موجودگی میں ہوش میں آ گئی تھیں۔ چونکہ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ میری تحویل میں تھیں اس لیے موقعے سے فائدہ اُٹھا کر گاڑی سے نکل گئی تھیں۔ انہیں فصل میں ہی کہیں چھپا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں دونوں کا نام لے کر پکارا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری آواز پہچان کر باہر آ جائیں گی۔ ان تک میری آواز نہیں پہنچی تو میں بتدریج اپنی آواز بلند کر کے آوازیں دینے لگا۔ اسی اثنا میں پپا بھی ٹرو پر سے اُتر کر میرے پاس آن کھڑا ہوا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میری آواز پہچان لی گئی تھی تبھی شانو کی آوازرات کی پُرسکوت فضا میں اُبھری۔ ”بھائی!“

اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کھیت میں کافی اندر تک گھس گئی تھیں۔ میں نے پھر آواز دی اور کہا۔ ”ہاں! میں شہریار ہوں...... جلدی سے فرو کو لے کر باہر آ جاؤ، وقت کم ہے۔“

کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

پپا تعجب سے بولا۔ ”کیا یہ تمہاری بہنیں ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! وہ حرامزادے انہیں گھر سے اُٹھا کر گاڑی میں ڈال چکے تھے۔“

وہ بولا۔ ”کھالا کام آ گیا؟“

اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں...... وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا ہے۔ اُٹھا کر ٹرو پر میں ڈال دو۔“

اس نے سوال جواب میں ایک پل ضائع کیے بغیر لینڈ کروزر کا بیک ڈور کھولا اور ماہرانہ انداز میں کھالے کو باہر نکال کر کندھے پر ڈال لیا۔ جونہی اس نے ٹرو پر کا بیک ڈور کھولا، فرزانہ اور شبانہ کھیت سے برآمد ہوئیں۔ قریب آ کر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں اور سسکنے لگیں۔ دونوں موجو کا پوچھ رہی تھیں۔ میرے پاس ان کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ انہیں بہ مشکل خود سے علیحدہ کیا، جلدی سے ٹرو پر میں بیٹھنے کا حکم دیا اور تلاشی لینے کی غرض سے لینڈ کروزر میں آ گیا۔ ٹارچ اور چھت میں لگی دھندلی بتی کی روشنی میں، میں نے چند ہی لمحوں میں گاڑی کھنگال ڈالی۔ سوائے پیپر رول کے کوئی بھی کارآمد چیز نہیں ملی۔ میں نے بغیر کسی وجہ کے پیپر رول اُٹھایا اور پپا کے گزرنے کے بعد گاڑی کو سڑک پر ترچھا کھڑا کرنے کے بعد انجن بند کر کے اُتر گیا۔ اپنی گاڑی میں بہ مشکل گھسا ہی تھا کہ میرے کانوں میں پولیس کے ہوٹر کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ پولیس کی نفری اب نور پور میں پہنچی تھی جب چڑیاں کھیت کو چگ کر اُڑ چکی تھیں۔ میں نے پپا کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ نور پور والے پولیس کو بتا دیتے کہ میں اس جانب روانہ ہوا ہوں اور وہ اپنی گاڑیوں کا رُخ اس جانب کر لیتے۔

اس نے ہیڈ لائٹس آن کرلیں۔ میں نے چھت والی بتی روشن کی اور گردن موڑ کر چچازاد بہنوں کی طرف دیکھا۔ خوشی کی ایک توانا لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ ان دونوں کی جھولی میں موجو لیٹا ہوا تھا جسے وہ دیوانہ وار چوم رہی تھیں اور ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھیں۔

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں پیا سے کہا۔ ''اسے تم اُٹھالائے تھے؟''

وہ بولا۔ ''ہاں تو...... کیا وہیں چھوڑ آتا؟ اس کے کپڑے مٹی کے تیل میں لتھڑے ہوئے تھے، اگر مجھے تھوڑی سی دیر ہوجاتی تو اسے آگ لگ جاتی۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سرہلایا اور پھر گردن موڑ کر تینوں کو ایک نظر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جب میں ٹرو پر میں بیٹھا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی ورنہ موجو نظر آجاتا۔

پیا بولا۔ ''خیال رکھنا کہ ہم بھٹک کر کسی اور جانب نہ نکل جائیں۔''

میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے دیکھا اور کہا۔ ''اس میں سے کوئی سڑک نہیں نکلتی۔ سیدھا چلتے جاؤ۔ کچھ ہی آگے جاکر یہ پکی سڑک ختم ہوجائے گی، سولنگ شروع ہو جائے گا۔ وہ بھی ڈیڑھ دو میل کے بعد کچے اور اونچے نیچے راستے میں تبدیل ہوجائے گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کھالے کو کیا ہوا ہے؟''

''کوئی زخم تو ہے نہیں...... ہوش میں آئے گا تو بتائے گا کہ اس پر کیا گزری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم نے چاچا اور چاچی کو نہیں دیکھا وہاں؟''

وہ بولا۔ ''دیکھا تھا مگر......''

آج دل کی دنیا زیر وزبر ہونے کا دن قیامت ڈھا رہا تھا۔ دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''کیا مگر...... کیا ہوا؟''

اس نے تاسف سے سرہلایا، بیک مرر میں لڑکیوں کو دیکھا، وہ بہ دستور موجو کی طرف متوجہ تھیں، دھیرے سے بولا۔ ''ان حرام زادوں نے انہیں باندھ کر اوپر نیچے رکھی ہوئی چارپائیوں پر لحافوں کے پیچھے پھینک دیا تھا۔ انہیں تلاش کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ جب میں ان تک پہنچا، وہ دونوں زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ میں انہیں کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا کہ ایک حرامزادے نے لائٹر جلا دیا۔ میں دھوکے میں مارا گیا تھا۔ میں نے اسے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس خبیث انسان میں زندگی کی کوئی پلید رمق ابھی باقی تھی۔''

''پھر؟'' میرے لبوں سے لرزتا ہوا لفظ برآمد ہوا۔

''پھر کیا؟ میں بہ مشکل آگ سے بچ کر باہر نکلا۔ آگ تو ایسے بھڑکی تھی جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ میں نے دو دوسرے کمرے دیکھے۔ کوئی نظر نہ آیا تو صحن میں پڑے ہوئے بچے کو اُٹھا کر گھر سے نکل آیا۔ اسی وقت مسجد میں اعلان ہونے لگا۔ میں اگر کچھ دیر اور وہاں رُکتا تو لوگ مجھے گھیرے میں لے کر ماردیتے۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ میری حالت بڑی عجیب ہورہی تھی۔ میں موجو، فرزانہ اور شانو کے زندہ بچنے پر اطمینان کی سانس پھیپھڑوں میں اُتارتا یا چاچے چراغ اور چاچی کی بے بسی کی موت کا ماتم کرتا رہا۔

پیا نے ہاتھ اٹھا کر بتی آف کردی اور سپاٹ لہجے میں بتانے لگا۔ ''میں نے گاڑی بڑی حویلی کے قریب روک کر کچھ دیر تمہارا انتظار کیا۔ تم نہیں آئے تو میں سمجھ گیا کہ تم پھنس گئے ہو یا...... شوں ہوگئے ہو...... اور کھالا بھی غش ہوگیا ہے۔ اور پھر وہاں بے مقصد ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے گاؤں سے نکل آیا۔''

میں نے دونوں ہاتھ ڈیش بورڈ پر رکھے اور اپنا چکراتا ہوا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ اس غیر متوقع طور پر در پیش آنے والی صورت حال نے میرا ذہن بھک سے اُڑا دیا تھا۔ دونوں بہنیں موجو کو ہوش میں لے آئی تھیں اور خوشی اور شکر کا اظہار کررہی تھیں۔ ابھی انہیں ٹوٹ پڑنے والی قیامت کا علم نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر، ان کو دکھ سہنے کے لیے تیار کرنے کے بعد یہ اندوہ ناک خبر سناؤں گا۔ انہیں ابھی پتا چل جاتا تو وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتیں۔ شانو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا اور خوشی سے بولی۔ ''موجو ہوش میں آگیا ہے بھائی!''

میں نے بہ مشکل اپنے اُمڈنے والے آنسوؤں کو روکا، دونوں سیٹوں کے درمیان رکھی ہوئی پانی کی بوتل اسے تھمائی اور کہا۔ ''اسے پانی پلاؤ، خود بھی پی لو۔''

وہ بولی۔ ''بھائی! تم کب پہنچے تھے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے، ابھی جو کہا ہے، وہی کرو۔''

فرزانہ نے پوچھا۔ ''امی ابا کدھر ہیں؟ نظر نہیں آرہے...... کیا گھر میں ہیں؟''

''ہاں......'' میں اس دوران خود پر قابو پانے میں قدرے کامیاب ہوچکا تھا۔

''ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ انہیں بھی کل لے آؤں گا۔''

''کہاں؟ کیا ہم......'' شانو بے چینی سے بولی۔ ''کیا ہم گھر کے بجائے کسی اور جگہ جارہے ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔ یہاں رہنا اب مناسب نہیں رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں بھائی؟ کچھ تو بتاؤ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''میرے گھر......'' میں نے کہا۔ ''تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں جو ہوں۔''

''تم ہمیں کہیں لے کر نہ جاؤ، واپس نور پور پہنچادو۔ امی ابا کے پاس۔''

''یہاں ہم سب کی جانوں کو خطرہ لاحق ہے۔''

فرزانہ بولی۔ ''بھائی! یہ کون لوگ تھے؟ ہماری جان کو کیوں خطرہ ہے، ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں ہے۔''

مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کن حالات سے گزری تھیں، انہیں حالات کی نزاکت کا کس حد تک علم تھا، اس لیے انہیں کچھ بتانے سے پہلے ان واقعات کے بارے میں جاننا ضروری تھا جو ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوچکے تھے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو اور نیند کے عالم میں ہی بے ہوش کردی گئی ہوں۔

''کہا تو ہے، آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' میں نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔

پیا نے انگریزی میں کہا۔ ''تم انہیں راستے میں نہیں بتاؤ گے کہ ان کے ماں باپ مرچکے ہیں ورنہ ہمارے لیے بہت مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''فکر نہ کرو، میں سمجھتا ہوں۔''

پکی سڑک ختم ہوگئی تھی۔ سولنگ کی اونچی نیچی اینٹوں پر گاڑی اچھلنے لگی تو پیا نے رفتار کم کرلی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سولنگ بھی ختم ہوگیا اور گاڑی کو بڑے جمپ لگنے لگے۔ فصلوں اور سیم زدہ خالی رقبوں کے درمیان اس سڑک پر دن میں خاصی چہل پہل ہوتی تھی۔ رات کو یہ علاقہ لمبی تان کر سوتا تھا۔ کہیں کہیں کتوں، گیدڑوں اور ناہروں (بھیڑیوں) کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں نے گاڑی میں لگی ہوئی ڈیجیٹل واچ پر ٹائم دیکھا۔ چونک گیا۔ ہمیں دو بجے سردار انصر کے ڈیرے پر پہنچنا تھا۔ سوا تین بج چکے تھے۔ بھٹہ پور اور مظفر گڑھ کا چکر کاٹ کر بصیرہ تک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹے کا سفر حائل تھا۔ تب تک صبح کی سپیدی نمودار ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے نئی الجھنیں سر اُٹھانے لگیں گی۔ میں نے اپنے خدشات کا اظہار دبے لفظوں میں پیا سے کیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ ''تو کیوں نہ ہم بصیرہ جانے کے بجائے ملتان کا رُخ کریں۔''

میں نے کہا۔ ''بات تو ایک ہی ہے، صبح ہوجائے گی۔''

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا، بولا۔ ''صبح تو ہوکر ہی رہتی ہے پیارے...... ہم ایسا کرتے ہیں کہ بجائے مظفر گڑھ شہر میں سے گزرنے کے، شارٹ کٹ راستہ اختیار کرکے ملتان چلے جاتے ہیں۔ ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''کیا تم نے وہ گل گشت والی کوٹھی دیکھ رکھی ہے؟''

''نہیں...... مگر میرو شاہ نے اس کا پتا سمجھا دیا تھا۔ اگر ضرورت پڑی تو ملتان پہنچ کر اس سے فون پر رابطہ کرلوں گا۔'' وہ بولا۔

اس نے اپنا موبائل فون نکالا۔ بٹن دبا کر اسکرین روشن کی پھر نفی میں سرہلا کر بولا۔ ''یہاں بھی سگنل نہیں ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے، ہمارے یہاں ابھی موبائل کا نیٹ ورک مکمل نہیں ہوا۔''

ہم اس دوران لال پیر والا ریلوے کا کچا پھاٹک عبور کرچکے تھے۔ یہ بس نام کا پھاٹک مشہور تھا۔ عملی طور پر یہاں پھاٹک نہیں تھا، بس ریہڑیوں اور کاروں وغیرہ کے لیے ازخود ریلوے لائن کراس کرنے کی جگہ بنادی گئی تھی۔ میں نے ایک دوراہے پر اسے دائیں ہاتھ ٹرن لینے کا کہا۔ یہ راستہ کوٹلہ لغاری کے مقام پر جاکر مین روڈ پر چڑھتا تھا۔ چونکہ لال پیر موڑ کے قریب ہی پولیس کی چوکی بنی ہوئی تھی، اس لیے میں نے مناسب جانا کہ پولیس کی ممکنہ چیکنگ کے نتیجے میں ہونے والی تاخیر سے بچنے کے لیے نسبتاً لمبا راستہ لے لیا جائے۔

یہ راستہ مین روڈ تک کچا تھا اور ناہموار تھا۔ ایک بڑے جمپ پر گاڑی کے عقبی حصے سے کھالے کی کراہ برآمد ہوئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ دونوں لڑکیاں اور موجو آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ وہ یقیناً سوئے ہوئے نہیں تھے مگر میری موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ کھالے کی دوسری کراہ نسبتاً بلند تھی۔ لڑکیاں چونک کر عقب میں دیکھنے لگیں۔

شانو نے گھبرا کر پوچھا۔ ''بھائی! یہ پیچھے کون لیٹا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کھالا ہے، بے چارہ گر گیا تھا۔''

پیا نے گاڑی روک کر کہا۔ ''شہر یار! تم پیچھے چلے جاؤ

اور کھالے کو سنبھالو۔“

میں عقبی حصے میں آ گیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی دو سیٹیں موجود تھیں۔ میں نے ایک پر بیٹھ کر بیک ڈور بند کر دیا۔ گاڑی چل پڑی تو میں کھالے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا مگر اس کے منہ سے مسلسل کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض خاصی سست تھی مگر خطرے کی بات نہیں تھی۔ اسے تھوڑا ہلایا جلایا، آوازیں دیں اور چہرہ تھپتھپا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ شانو نے مجھے پانی والی بوتل تھما دی۔ میں نے چلو میں پانی لے کر اس کے منہ پر چند چھینٹے مارے تو اس نے جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں مجھے گھورتا رہا، پھر پہچان کر بولا۔ ”شہرے! میں کہاں ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”اپنی ٹروپر میں ہو اور کہاں ہونا چاہیے تھا تمہیں۔ چلو اُٹھو، سیٹ پر بیٹھو۔“

اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے درد ناک کراہ نکل گئی، وہ بولا۔ ”نہیں شہرے...... میں نہیں اُٹھ سکتا۔“

”کیوں؟ کیا ہوا تجھے؟“ میں متفکر ہوا۔ ”کوئی چوٹ لگی ہے کیا؟“

اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ بولنا چاہا مگر کچھ کہا نہیں۔ میں نے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی تو اس نے زوردار انداز میں سر اِدھر اُدھر پٹخا، بولا۔ ”نہیں شہرے...... مجھے مت ہلاؤ۔ درد ہوتا ہے۔ جب کم ہوگا، تب خود اُٹھ بیٹھوں گا۔“

میں نے اسے بہ احتیاط دیکھا تھا۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیا تو تعجب سے پوچھا۔ ”کہاں درد ہوتا ہے؟“

وہ نقاہت سے بولا۔ ”میکوں چھوڑ، ڈسا بھیناں کوں گھن آیا ہیں؟“

(مجھے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ بہنوں کو لے آئے ہو؟)

اس کا اشارہ فرزانہ اور شانو کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم ان کی فکر نہ کرو، وہ ہمارے ساتھ ہیں اور بالکل ٹھیک ہیں۔ موجو اور باقی سب لوگ بھی اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہیں۔“

اس نے سر اُٹھایا، میری آنکھوں میں جھانکا پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ وہ نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے نہایت دقت کے ساتھ پہلو بدلا، ہاتھ پاؤں ہلائے اور گھسٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کے حلق سے متواتر کراہیں خارج ہوتی رہیں، بولا۔ ”کم بختوں نے مار مار کر میرا ابھر کس نکال دیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے تمہاری خوفناک چیخ سنی تھی، ساتھ میں فائر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ سمجھا، شاید تمہیں گولی لگ گئی ہے۔“

اس نے میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل پکڑ کر منہ سے لگائی۔ کچھ پانی حلق میں، کچھ منہ سے باہر بہہ نکلا۔ اس نے چند گھونٹ لیے اور بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! میں ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ جب ان کی نظر میں آیا، تب قریب میں کوئی آڑ لینے یا چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ ایک آدمی نے گن سیدھی کی اور مجھ پر فائر کر دیا۔ شکر ہوا کہ گولی میرے کان کے قریب سے گزری اور میں بچ گیا۔ یہ کان......“ اس نے بے اختیار اپنے دائیں کان کو چھوا، سسکی لی اور بولا۔ ”کان جل گیا ہے شاید...... میں نے زوردار چیخ ماری، زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ پھر ساکت ہو کر ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریب نہیں آئے۔ میں چونکہ زیادہ دیر بھی اسی حالت میں پڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔ ایک جیپ کے قریب موجود تھا، دوسرا غائب تھا۔ میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میں اس پر حاوی تھا مگر اس کا ساتھی بھی کہیں سے نکل کر پہنچ گیا۔“

بولنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔ تبھی رُک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میں نے دونوں لڑکیوں کو گاڑی میں دیکھ لیا تھا اور لڑائی میں کوئی غلطی نہیں کی تھی مگر ایک کا داؤ چل گیا اور اس نے گن کا بٹ پوری قوت سے میرے سر میں دے مارا۔ میں چکرا کر گرا تو پھر دونوں نے مجھے اُٹھنے نہیں دیا۔ اب کیا بتاؤں، کیا کیا، کہاں کہاں مارا ان مردودوں نے...... آہ! ہوش آیا تو تجھے اپنے سامنے پایا......“

اس نے کوشش کی کہ اُٹھ کر سیٹ پر بیٹھ جائے مگر کامیاب نہ ہو پایا اور فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ پیا نے کہا۔ ”اگر کھالا بہتر حالت میں ہے تو فرنٹ سیٹ پر آ جاؤ۔“

میں نے اسے بتایا کہ کھالا بیٹھا ہوا ہے اور خطرے سے باہر ہے۔ اس نے گاڑی روک دی۔ میں پھر فرنٹ سیٹ پر چلا گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کوئی فائر شائر تو نہیں لگا اسے؟“

میں نے بتایا۔ ”نہیں بلکہ زخم بھی نہیں ہے۔ ہڈیاں بھی سلامت ہیں البتہ میرے بازو میں جلن ہو رہی ہے۔ ایک گولی چھو کر گزری تھی۔“

کوٹلہ لغاری کے قریب سے ہم مین روڈ پر چڑھے۔

یہ سڑک دائیں جانب مظفر گڑھ اور بائیں ہاتھ پر محمود کوٹ جاتی تھی۔ اس سڑک پر بہت بڑا تھرمل پاور اسٹیشن موجود تھا جو تمام علاقے کو بجلی بنا کر سپلائی کرتا تھا۔ محمود کوٹ میں آئل ڈپو تھا جس کی وجہ سے دن رات بڑے بڑے آئل ٹینکر سیکڑوں کی تعداد میں نہ صرف تھرمل اسٹیشن کے اطراف میں موجود رہا کرتے تھے بلکہ دن رات آئل ٹینکروں کی مکمل طور پر اس سڑک پر اجارہ داری قائم رہتی تھی۔ یہ سڑک ریلوے پھاٹک کے قریب جھنگ روڈ پر جا چڑھتی تھی۔ جونہی پیا جی نے مظفر گڑھ میں داخل ہونے کے بعد پھاٹک اور جھنگ روڈ کو دیکھا تو جھٹ سے پوچھا۔ ”کیا ہمیں ملتان جانا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تم بہتر سمجھتے ہو۔“

”ہمارا مشن مکمل ہو چکا ہے؟“

میں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ ”ہاں!“

”تو پھر ہمیں بصیرہ جا کر ایک دن چھپے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ اس نے کہا اور جھنگ روڈ پر چڑھتے ہی بائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ میں نے تشویش آمیز انداز میں جھٹ سے کہا۔ ”یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ یہ سڑک ملتان نہیں، جھنگ اور میانوالی کی طرف جاتی ہے۔“

اس سڑک پر کافی زیادہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ وہ اپنی توجہ کراسنگ پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں، اب مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔“

میں خاموش ہو گیا۔ ٹروپر کے اندر کی فضا عجیب سوگوار تھی۔ سبھی اپنی اپنی دنیاؤں میں سمٹے ہوئے تھے۔ دونوں لڑکیاں، موجو اور کھالا...... سبھی خاموش تھے۔ پیا جی خان پور موڑ سے جھنگ روڈ پر کوئی ایک کلومیٹر تک گیا، پھر دائیں ہاتھ نکلتی ہوئی لنک روڈ پر اُتر گیا۔ میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ لنک روڈ پر موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لنک روڈ سے اُتر کر دریائی سپر بند پر چڑھ گیا۔ بند کے اوپر بنی ہوئی ناپختہ سڑک میں جا بہ جا کھڈے بنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے گاڑی بے طرح اچھل رہی تھی۔ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”یہ تو بڑا گندا راستہ چنا ہے تم نے پیا جی! پسلیاں بجنے لگی ہیں اب تو۔“

اس نے کہا۔ ”شہر میں اس وقت دو تین جگہوں پر پولیس نے ناکہ لگا رکھا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے چوک قریشی کے تھانے سے شہر میں وائرلیس پر ہماری آمد کی خبر نشر کر دی گئی ہو۔ ویسے بھی شہر سے نکلتے نکلتے پون گھنٹا لگ جاتا ہے۔ اب ہم پندرہ منٹ میں چناب کے پل کے قریب جا نکلیں گے۔“

ہیڈ لائٹ کے ساتھ ساتھ دل بھی اُچھل پُتھل ہو رہا تھا۔ چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دریائی بند سے اُتر کر ایک اور خستہ حال لنک روڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ہم بہ مشکل پندرہ منٹ میں پون گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد محمود ٹیکسٹائل ملز کے قریب ملتان روڈ پر چڑھ گئے۔ مظفر گڑھ شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے موبائل فون نکالا اور میر و شاہ کا نمبر ملایا تو فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔

پیا مختصر اُرپورٹ دینے کے بعد بولا۔ ”اب ہم چناب پل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیا حکم ہے؟ ہم گل گشت کالونی والے مکان کی طرف جائیں یا میڈم کی کوٹھی کی طرف؟“

میر و شاہ کی بات سن کر بولا۔ ”شاہ جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہمارے لیے بصیرہ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تبھی میں نے منصوبے میں تبدیلی......“

اس کی بات میر و شاہ نے کاٹ دی اور نئی ہدایات دینے لگا۔ پیا غور سے سنتا رہا، پھر ’یس سر‘ کہہ کر فون بند کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”ہم گل گشت کالونی والی کوٹھی پر جا رہے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس میں فرنیچر وغیرہ نہیں ہو گا۔ رات کا بقیہ حصہ تم لوگوں کو فرش پر گزارنا پڑے گا۔“

میں نے متفکر ہو کر پوچھا۔ ”کیا وہاں کوئی موجود ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ اگر وہاں کوئی موجود نہیں ہے تو پھر تالا لگا ہوگا اور ہمارے پاس چابیاں بھی نہیں ہیں۔“

”میر و شاہ نے کہا ہے کہ جب ہم نو نمبر چنگی پر پہنچیں، اسے مسڈ کال دے دیں۔ وہ وہاں پہنچ جائے گا۔“ اس نے یہ بتایا تو مجھے تسلی ہوئی کہ میر و شاہ نہ صرف مکان کھول دے گا بلکہ وہ ہمارے لیے سونے کا بندوبست بھی کر دے گا۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ اس نے پہلے سے ہی تمام بندوبست کر رکھا ہو۔

کھالے کے کھانسنے اور موجو کے خراٹوں کی آوازیں گاڑی میں گونجنے لگیں۔ اس وقت ہم چناب کا پل عبور کر رہے تھے۔ بھاری گاڑیوں کی دو طرفہ لائن ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دو ٹرکوں کے بیچ میں ہم چیونٹی کی سی رفتار سے ملتان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ شیر شاہ بائی پاس تک ہمیں اسی صورتِ حال سے نبرد آزما رہنا تھا۔ وہاں جا کر ٹریفک دو راستوں میں بٹ جاتی تھی۔ سیدھی سڑک لاری اڈا کی طرف جبکہ بائیں ہاتھ نکلنے والی شاہراہ مظفر آباد اور کینٹ سے ہو کر ڈیرا اڈا پہنچتی تھی۔ ہمیں اسی سڑک پر جانا تھا۔ اس طرف بھاری ٹریفک کی آمد و رفت نسبتاً کم ہوا کرتی تھی۔

میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور درپیش آنے والے غیر متوقع حالات کی بھٹی میں جل رہا تھا مجھے رہ رہ کر چاچا اور چاچی کی بے بسی اور بے گناہی کی موت کا خیال آنے لگتا تو اور یکبارگی میرا دل دھڑکنا بند کر دیتا تھا۔ میرے ماں باپ کا پیار میرے بچپن کی دھند میں گم ہوا تھا۔ چاچی اور چاچے کے پیار کی بیساکھی پر زندگی رواں دواں تھی۔ وہ اس جنگ کا ایندھن بن گئے تھے جو پروین کے اغوا سے شروع ہوئی تھی اور میری بغاوت پر بھڑک کر قیامت کا روپ دھار گئی تھی۔ میں سبھی کو نور پور سے نکال کر محفوظ کرنے کے ارادے سے ملتان سے نکلا تھا اور آدھی کامیابی، آدھی ناکامی ماتھے پر سجائے لوٹا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی کہا کرتا تھا کہ زندگی سمسٹر سسٹم کے تحت چلتی ہے۔ ایک سمسٹر میں چند مضمون، چند باب ایک ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ سمسٹر ختم، سمسٹر کا نصاب ختم...... نیا شروع...... کیا میری زندگی کا ایک سمسٹر ختم ہو گیا تھا؟ کیا نور پور سے میں ہمیشہ کے لیے کٹ چکا تھا؟...... ابھی ایک آس، ایک وجود، ایک بندھن باقی تھا۔ وہ غزالہ کا وجود تھا جو اب بھی نور پور میں تھی۔ میں نے نور پور پہنچنے سے پہلے سوچا تھا کہ ان دونوں ماں بیٹی کو بھی ساتھ لاؤں گا۔ نور پور کے حالات اتنے غیر متوقع اور جوالا مکھی کی طرح تیز رو تھے کہ مجھے ان کا خیال تک نہیں رہا تھا۔

میں شدید خواہش کے باوجود نہ تو مراد بخش دیوانے سے مل سکا، نہ ڈاکٹر شاہ جی سے اور نہ ہی کھالا اپنے گھر کا چکر لگا سکا۔ میرے حلق سے ایک آہ خارج ہوئی اور میں نے سر پیچھے ٹکاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ”یا مالک تیری مرضی! میں تیرے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ اگر مجھے نور پور پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کی معمولی سی تاخیر بھی ہو جاتی تو اس وقت میرے ہاتھ بالکل خالی ہوتے۔ چاچے چراغ دین اور چاچی کے ساتھ ساتھ موجو بھی راکھ کے ڈھیر میں دب جاتا اور میری دونوں چچا زاد بہنیں پروین کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان کے غیاب کا تو مجھے پتا بھی نہ چلتا...... یا مالک! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اپنے خاندان کو محفوظ کر سکوں......“

بڑے خان کے چاروں خونخوار غنڈے ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے لیکن ان لوگوں کا حیدر خان سے خون کا ناتا نہیں تھا کہ اس کے دل پر چوٹ لگتی، اس کی آنکھیں خون کے آنسو روتیں اور اس کے گھر سے بین کی آوازیں اُٹھتیں جبکہ مرنے والی دو بوڑھی جانوں سے ہمارا خون کا ناتا تھا۔ محبت اور ممتا کا اٹوٹ بندھن تھا جو بکھر چکا تھا۔ سردار حیدر خان نے دوسری مرتبہ میرے آنگن میں بین اور دل دہلا دینے والی چیخ و پکار اُتار دی تھی۔

وہ خانزادہ تھا، اپنی معمولی سی حکم عدولی پر برانگیختہ ہو کر آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ یہاں تو اسے پے در پے شکست اور بیٹی کے اغوا جیسی غیرت پاش صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس کا یوں مشتعل ہو کر قتل و غارت اور کھلی بربریت پر اُتر آنا میرے لیے حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس کی سرشت ہی ایسی تھی۔

رات کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ اندھیرا اپنی بساط سمیٹنے کو تھا جب ہم ایک چھوٹی سی کوٹھی کے گیٹ پر رُکے۔ گیٹ کا بغلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہارن بجایا۔ چند لمحوں کے بعد ایک اجنبی چہرے نے دروازے سے جھانکا۔ پیا نے گاڑی سے اُتر کر پوچھا۔ ”میرو شاہ اندر ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”ہاں! تم لوگ اندر آ جاؤ، گاڑی یہیں کھڑی رہنے دو۔“

ہم سب نیچے اُترے۔ میں نے سوئے ہوئے موجو کو اُٹھایا جبکہ پیا نے کھالے کو سہارا دے کر چلایا اور ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھی صاف ستھری اور جدید وضع کی تعمیر کا شاہکار تھی۔ فرزانہ اور شبانہ میرے پہلو سے جڑ کر چل رہی تھیں۔ جونہی پارکنگ عبور کر کے ہم بڑے سے چوبی دروازے کے سامنے پہنچے، مجھے احساس ہوا کہ موجو اور دونوں لڑکیاں ننگے پیر تھیں۔ فوری طور پر ان کی برہنہ پائی کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ انہیں بستروں میں ہی بے ہوش کر کے اُٹھا لیا گیا تھا۔ موجو کو میں نے بستر سے نکالا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ دو کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ گھر مکمل طور پر فرنیچر سے آراستہ تھا۔ پیا کا خدشہ کہ ہمیں فرش پر سونا پڑے گا، تحلیل ہو گیا۔

ایک بارہ ضرب چودہ کے خوب صورت کمرے میں داخل ہوئے تو میرو شاہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ قدرے بیزار اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”اڑے او غنچے! عرصے بعد ماڑے کو مجے (مزے) کی نیند آوے تھی...... آ...... ہا!“

اس نے لمبی جماہی لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ پھر سبھی لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بولا۔ ”ماڑے کو ابھی یہ بتا دے کہ فیملی کے نگ پورے ہووت ہیں؟“

میں نے اسے شکست خوردہ انداز میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اوئے گھوڑے...... نجر (نظر) سے نکرے اُتر جاویں نیند کے تورانیوں کو، اس ننھے راجے کو دوجے کمرے کی شکل دکھا دیوے۔“

میں موجو کو اُٹھائے، شبانہ اور فرزانہ کو ساتھ لیے دوسرے کمرے میں آیا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا تھا۔ جہازی سائز کے بیڈ، صوفے، ڈریسنگ ٹیبل سمیت تمام فرنیچر غیر استعمال شدہ تھا۔ عیاں تھا کہ آج ہی خرید کر یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ میں نے موجو کو بیڈ پر لٹا دیا۔ پانچ بلانکٹ بیگ بیڈ کے ساتھ فرش پر پڑے تھے۔ میں نے شانو سے کہا۔ ”یہ کمبل نکال لو اور آرام سے سو جاؤ۔ صبح ہو گئی ہے۔ دو تین گھنٹے کی نیند لے لو۔“

دونوں بہنیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔ شانو نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”بھائی! یہ تمہارا گھر ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! اب یہ ہم سب لوگوں کا گھر ہے۔“

وہ ایک جاں گسل رات کے خونیں کھیل سے گزر کر یہاں پہنچی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک خوف اور دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ میں نے دونوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا، دلاسا دیا اور کہا۔ ”تم اپنے دلوں سے ہر خوف کو نکال پھینکو۔ یہاں کوئی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھنے والا نہیں ہے۔“

فرزانہ نے تشکیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ بولی۔ ”ابا کہاں ہے؟ کیا اماں اور ابا یہاں نہیں آئیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں انہیں جا کر لے آؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

میرو شاہ کی تیز آواز سنائی دی۔ ”اڑے غنچے! او لاڈے! جلدی سے آوے ناں...... ماڑے کو یہاں سے جانا بھی ہووت......“

میں نے دونوں کو خود سے علیحدہ کیا اور میرو شاہ کے پاس آ گیا۔ پیا اور کھالا بیڈ پر بیٹھے تھے جبکہ میرو شاہ صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”ماڑے لاڈے کو اپنا گھر پسند آوت ہے کہ نہیں؟“

میں نے آزردہ لہجے میں ’ہاں‘ کہا تو وہ یک ٹک مجھے دیکھنے لگا، بولا۔ ”غنچہ کملایا ہووت ہے پیا! خیر نہیں لاگت پر خیر! ساری رپورٹ راستے میں تم دیوے گا۔“ پھر میری جانب رُخ کر کے بولا۔ ”غنچے! کتنے پیسے مٹھی میں ہوویں تیری؟“

میرے پاس میڈم کی دی ہوئی جو رقم تھی، وہ آدھی کمرے میں رکھی تھی جو چاچا اور چاچی کے ساتھ جل چکی تھی جبکہ آدھی سی ٹو میں میڈم کے ریٹائرنگ روم میں پڑی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور تفصیل بتا دی، وہ بولا۔ ”کوئی بات نہ ہووت غنچے! دل چھوٹا کیوں کرت ہے...... ادھر کو آوے، تھامے...... نوٹ ہی نوٹ...... ننھے محل میں جس شئے کی بھی جرورت (ضرورت) ہووے، خرید لیوے ہے۔“

اس نے چغہ نما قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سرخ نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”غنچے! دکھ بندے کو مجبوط (مضبوط) کرنے کے لیے آوت ہے، جو ڈر جاوے، وہ مر جاوے...... سمجھے ناں؟ تیرا چہرہ بولت ہے کہ فیملی کے نگ شارٹ ہودیں...... ہیں؟...... جانے والوں کا غم لاجم (لازم) ہووے پر بچ جانے والوں کی حفاجت (حفاظت) اس سے بھی جیادہ (زیادہ) جروری ہووے ہے غنچے......“

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں جہاں آج تک میں نے شرارت اور ذہانت ہی دیکھی تھی، اس وقت گہری سنجیدگی اور کرب کی لہریں موجزن تھیں۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر بولا۔ ”یہ گھوڑا...... فوجی اختر...... ایک دم تھارو برید گھوڑا ہووے کیونکہ یہ فوج سے بگٹٹ بھاگ کر میرے پاس آوت تھا۔ اب یہ ماڑے غنچے کا نوکر بھی ہے اور اس گھر کا راکھا بھی...... چل اب ماڑے کو اجاجت (اجازت) دیوے ہے لاڈے میاں...... چل بے پیا...... چل بے کالے ٹیٹ بدمعاش...... لاڈے میاں کو اللہ بیلی بولے ہیں۔“

کھالے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، پیا نے کہا۔ ”تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں کوئی ٹیکا ویکا لگواتا ہوں۔“

میرو شاہ دونوں کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔ میرو شاہ کے گھوڑے نے مین گیٹ بند کیا۔ واپس آ کر مؤدبانہ انداز میں پیپر رول میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی نے دیا ہے، گاڑی میں رہ گیا تھا۔ آپ کے لیے چائے لاؤں؟“

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ دونوں جاگ رہی تھیں۔ میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر فوجی اختر عرف گھوڑے کو چائے کے تین کپ اور بسکٹ لانے کا حکم دیا اور پیپر رول الماری میں رکھ کر بیڈ پر سرافگندہ بیٹھ گیا۔ فوجی نے دس منٹ بعد چائے اور بسکٹ لا تھمائے اور کہا۔ ”کیا اب میں جاؤں؟“

میں نے پوچھا۔ ''کہاں جاؤ گے اس وقت؟''

وہ بولا۔ ''میرا کمرا اوپر ہے۔ آپ آرام کریں۔ جب ناشتا کرنا ہو، مجھے بلا لیجیے گا۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے بعد ہم تینوں باتیں کرنے لگے۔ میں خوابیدہ موج دین عرف موجو کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چائے پیتا رہا اور ان کی باتوں کے گول مول جواب دیتا رہا۔ وہ دونوں میرا گھر دیکھ کر حیران تھیں۔ انہوں نے سردار بخت خان کی کوٹھی کے اُجلے اُجلے کمرے دیکھے تھے، سردار حیات خان کی حویلی دیکھی تھی مگر انہوں نے کبھی خواب میں بھی ایسے صاف ستھرے کمروں پر مشتمل اپنا گھر نہیں دیکھا تھا۔

چائے پی لینے کے بعد میں نے انہیں سو جانے کا حکم دیا اور اس کمرے میں آ گیا جس میں کچھ دیر پہلے میر وشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کیا، بیڈ تک آیا اور دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول کر اوندھے منہ گر گیا۔ میرا دل ضبط کے مرحلوں سے نبرد آزمائی کی پاداش میں پھٹنے کو آ گیا تھا۔ شانو اور فرزانہ کی موجودگی میں بہنے والا میرا ایک آنسو دکھ کی ساری داستان کو عیاں کر سکتا تھا۔

میں اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا اور تنہائی پاتے ہی مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور دل کھول کر رویا...... اتنا، جتنا زندگی بھر نہیں رویا تھا۔ اپنا غبارِ دل اچھی طرح نکال دینا چاہتا تھا اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ کافی دیر گزر گئی مگر آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور پھر ایسے ہی وقت میں جب میں دیواروں سے ٹکریں مارنا چاہتا تھا، مجھ پر قدرت مہربان ہو گئی اور نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خدا معلوم یہ نیند تھی، نقاہت یا بے ہوشی تھی...... مجھے زندہ رکھنے کا توانا سبب بن گئی ورنہ میرا دل خون کے آنسو رونے میں پگھلنے لگا تھا۔

مجھے شانو نے تین بجے کے قریب ہلا جلا کر جگایا۔ اسے کافی حد تک بہتر حالت میں دیکھ کر میرے دل کو گھونسا لگا۔ مجھے علم تھا کہ میں جونہی انہیں نور پور میں کھیلی جانے والی ہولناک جنگ اور اس کے بھیانک انجام کے بارے میں بتاؤں گا، ان کا تمام تر سنبھلاؤ ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔

میں نے تینوں کو غسل کرنے کا حکم دیا۔ فوجی اختر قریبی ہوٹل سے کھانا خرید لایا تھا۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا اور پھر گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لیا۔ ایسے میں فوجی اختر نے ہاتھ میں نوٹ پیڈ اور پنسل پکڑ لی اور ضروری سامان کی خریداری کی فہرست مرتب کرنے لگا۔ شانو اور فرزانہ نے اس کام میں ہماری معاونت کی۔

یہ چار مرلہ اراضی پر مشتمل چھوٹا سا مگر جدید طرزِ تعمیر کا ماڈل بنگلا تھا۔ اس میں نیچے ایک ڈرائنگ روم، دو بیڈ روم، چھوٹا سا کچن اور آٹھ ضرب دس کا ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا۔ سبھی کمرے اٹیچڈ باتھ تھے۔ ریلنگ والی چار فٹ چوڑی سیڑھیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر دو کمرے اور ایک نسبتاً بڑا کچن بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں فوجی اختر رہائش پذیر تھا جبکہ دوسرا خالی تھا۔ اس نے فہرست میں اپنا مطلوبہ سامان بھی شامل کر لیا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ مرتب لسٹ کے مطابق سامان کی خریداری پر کم و بیش تیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ میں نے اسے میر وشاہ سے رابطہ کرنے کو کہا تو اس نے اپنے موبائل فون پر اسے کال کی۔ ریسیو ہونے پر اس نے مؤدبانہ لہجے میں میر وشاہ سے مجھے اٹینڈ کرنے کو کہا اور فون مجھے تھما دیا۔ میں نے 'ہیلو' کہا تو میر وشاہ کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں ماڑے لاڈے! کیا بات ہووے ہے؟''

میں نے اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا، وہ بولا۔ ''اڑے پھوکٹ میں فکر مند ہووت ہے؟ چٹکی بجاؤ، معاملہ ختم ہووت...... بس...... ابھی پیا تیرے پاس پہنچ جاوت ہے، رو کڑا بھی...... جو جی میں آئے، خریدو...... لوٹو...... یہ ماڑی میڈم کے سوہنے سوہنے ہاتھوں کا میل ہووت ہے...... کوئی سونا چاندی ناں ہووت......''

اس کی برق رفتار زبان چل پڑی تھی۔ ''او ہاں بھئی غنچے! ایک موبیل فون اور دو چار نمبر بھی خرید لیوے...... سمجھے؟''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں پیا کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فوجی اختر کو مخاطب کیا۔ ''کچن کا سامان بھی فہرست میں شامل کر لیا ہے ناں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی مرتب کردہ فہرست کو بہ غور پڑھنے لگا۔ مبادا کوئی شے کم ہو۔ چار بجے پیا پہنچ گیا۔ وہ چائنا ٹرک لے کر آیا تھا۔ اس قسم کے منی ٹرک کو ہم دیہاتیوں نے یہ نام دے رکھا تھا۔ یہ ہائی لکس ڈالے سے کچھ ہی بڑا تھا۔ شکل جاپانی ٹرکوں کے جیسی تھی۔

میں اور فوجی اختر منی ٹرک کے کیبن میں پیا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہماری شاپنگ کا آغاز حسین آگاہی روڈ سے ہونا تھا۔ جب ہم آٹھ بجے کے لگ بھگ لوٹے تو منی ٹرک آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس سامان کو اتارنا اور گھر میں سیٹ کرنا بذات

خود ایک اہم کام تھا جس کی... انجام دہی میں گیارہ بج گئے۔ کھانا حسبِ سابق ہوٹل سے منگوایا، کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میری دانست میں اب یہ مکان بھرے پرے اور مکمل گھر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں، موجو اور دونوں لڑکیوں کی ضرورت کا تمام سامان بھی خرید لایا تھا۔ چونکہ میڈم کھلے دل کی مالک تھی اور اس کا قائم مقام میر وشاہ بھی کسی طور کم نہیں تھا اس لیے تیس چالیس ہزار روپے کی شاپنگ پھیل کر ستر بہتر ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پیا کے پاس اب بھی تگڑی رقم موجود تھی۔ میر وشاہ مجھے دس ہزار روپے دے کر گیا تھا، وہ ابھی تک بالکل محفوظ تھے۔

بارہ کے قریب، جب مجھے یقین ہو گیا کہ موجو اور دونوں لڑکیاں سو گئی ہیں، میں نے فوجی اختر سے میر وشاہ سے لیے ہوئے نمبر پر اپنے نئے خرید کردہ موبائل فون سے رابطہ کیا۔ میر وشاہ کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ابے کون ہووت ہے اس سمے...... کیا دنیا کو جگانے پر قدرت نے تیری ڈوٹی (ڈیوٹی) لگا چھوڑت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں شہریار بول رہا ہوں۔ کچھ باتیں کرنا تھیں، اس لیے تکلیف دی۔''

اس کی بیزاری ہوا ہو گئی، بولا۔ ''تو یوں بولے ہے ناں کہ تم میر وشاہ کے لاڈے ہووت...... کیا بات ہووے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''پیا نے مشن کی رپورٹ دے دی ہے؟''

''ہاں تو......''

''پھر اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میری بہن ابھی تک نہیں ملی۔ نور پور کے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں کیونکہ میں وہاں کسی آدمی سے نہ تو مل سکا ہوں اور نہ ہی اس کے رابطے کی کوئی سبیل نکال پایا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''ابھی تیرے کو سکون سے سو جانا ہووت...... ماڑا کوئی کارندہ کل نور پور جاوے گا اور خبر شبر لے آوے گا۔ کل شام کو مل بیٹھک کرت اور آگے کی پلاننگ کرت ہیں ہم...... اب ماڑا لاڈا، ماڑا غنچہ لمبی تان کے سو جاوے......''

اس نے مجھے پچکارا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر پیا سے رابطہ کیا۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر باتیں کیں پھر کھالے کو فون تھما دیا، میں نے پوچھا۔ ''کھالے! طبیعت کیسی ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کیا تم نے انہیں بتا دیا ہے؟''

اس کا اشارہ موجو اور لڑکیوں کی طرف تھا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں کھالے! ابھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ انہیں اتنی بڑی خبر دینے کے بعد انہیں سنبھال بھی لوں۔''

''آخر بتانا تو پڑے گا ہی۔'' وہ بولا۔ ''پیا سے کہہ دو، وہ مجھے کل تمہارے پاس پہنچا دے۔ مل کر کوئی صورت نکالیں گے۔''

''ٹھیک ہے، اسے فون دو۔''

میں نے اسے کھالے کو یہاں پہنچانے کی درخواست کی۔ وہ بولا۔ ''حکم کی تعمیل ہو گی۔ ابھی ہم ایک نیوز چینل پر تمہاری کارگزاری کے بارے میں سن رہے ہیں۔ تم تو یار بڑے خوفناک مجرم ہو۔ اپنے چار ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر، اپنے چاچا اور چاچی کو قتل کر کے نور پور سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ پولیس والے تمہارے سر پر سہرا سجانے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا، حیرت سے بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

اس نے کہا۔ ''صبح کا اخبار منگوا کر پڑھنا اور ہاں...... کسی الیکٹریشن کو بلوا کر ٹی وی اور کیبل کا کنکشن چالو کروا لینا۔ آدمی کا جنرل نالج بہتر ہو جاتا ہے۔ او کے، ناؤ گڈ نائٹ ڈیئر!''

فون بند کر کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک تو میرے چاچا چاچی کو قتل کر دیا گیا تھا، مستزاد یہ کہ ان کے قتل کا الزام مجھ پر ہی عائد کیا جا چکا تھا۔ میرے خونیں دشمنوں کو میرا ہی ساتھی قرار دے کر مجھے اشتہاری مجرم بنایا جا رہا تھا اور میں سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے میڈم کی عدم موجودگی کا قلق ہوا۔ اگر وہ اس وقت یہاں موجود ہوتی تو شاید ایسا نہ ہونے دیتی اور کوئی نہ کوئی توڑ کر دیتی۔

میں چشمِ تصور میں ٹی وی کی اسکرین روشن کیے لیٹ گیا۔ ٹی وی اینگر کی پُرہیجان رپورٹنگ، ایس ایچ او، ڈی پی او اور وہ حرام زادہ سردار حیدر خان...... کیسے بن بن کر جھوٹ بول رہے ہوں گے، میرا دماغ پھٹنے کو آ گیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

ڈاکٹر شاہ جی ٹھیک کہتا تھا کہ یہ دنیا دولت والوں کی ہے، طاقت والوں کی ہے...... سچ کو جھوٹ...... جھوٹ کو سچ...... رات کو دن اور دن کو رات بنانے والے کمزوروں اور غریبوں کی قسمتوں سے کھیلتے ہیں اور ان کے خون سے شراب کشید کر کے اپنے بھیڑیے جیسے منہ میں انڈیل لیتے

ہیں۔ رہ رہ کر چاچا اور چاچی کی یاد نے دل کا گھیراؤ کیا۔ شاید ایسے ہی میرے والدین بھی کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہوں۔

رات ڈھل گئی، صبح ہوگئی۔ پیا نے کہا تھا کہ صبح ہو کر ہی رہتی ہے۔ صبح کی دہلیز پر جا کر انسان ہی ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں بیدار ہو کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ دونوں لڑکیوں نے جاگ کر کچن اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ چونکہ نور پور میں سوئی گیس نہیں تھی اور دونوں کے لیے نئی چیز تھی، اس لیے دونوں غیر معمولی انہماک سے فوجی اختر سے چولھا اور مینٹل جلانا سیکھ رہی تھیں۔ میں دروازے میں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان دونوں نے لباس تبدیل کرلیا تھا۔ پیروں میں چپلیں بھی پہن رکھی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”ناشتا بازار سے منگوالیتیں؟“

شانو بولی۔ ”نہیں بھائی! مجھے بازاری کھانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی اب یہیں رہنا ہے، آج نہیں تو کل کام کرنا ہی ہے۔“

میں چونکا۔ اس کا لہجہ غم ناک تھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

فوجی اختر انڈے لینے کے لیے چلا گیا تو میں نے شانو سے پوچھا۔ ”کیا تم روتی رہی ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ الماری کے سامنے کھڑی فرزانہ نے پلٹ کر رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ہاں! ہم دونوں ساری رات روتے رہے ہیں۔“

”مگر کیوں؟ کیا نور پور کی یاد آرہی تھی؟“

”نہیں...... نور پور کو نہیں، ہم اپنے نصیبوں کو روتی رہی ہیں۔“

”کیا ہوا تمہارے نصیبوں کو؟“ میں نے جلدی سے کہا تو وہ جلدی سے میرے روبرو آن کھڑی ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”سچ سچ بتاؤ بھائی! میری اماں اور ابا کہاں ہیں؟“

اس نے ایسے اچانک مجھ سے سوال کیا تھا کہ میں گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کی تپش کی تاب نہ لا کر شانو کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزانہ نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بھائی! تم لاکھ چھپاؤ پر ہمارا دل بجھ گیا ہے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نہیں رہے......“

وہ بہ مشکل یہی کہہ پائی اور مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگی۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ شانو آٹا گوندھ رہی تھی، اس کے ہاتھ تھم گئے اور اس نے وہیں گھٹنوں پر سر ڈال دیا۔ میں نے فرزانہ کو بانہوں میں بھینچ لیا، ایسے میں مجھے خود پر اختیار نہیں رہا اور میری آنکھیں بھی ابل پڑیں۔ فرزانہ کا یوں کٹ کٹ کر رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر میرے پاس دلاسے کو ایک لفظ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ جس دکھ سے نبرد آزما تھی، میں خود اس کے حصار سے ابھی تک نکل نہیں پایا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ تمام رات روتی رہی تھی مگر آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ میرے کندھے سے چہرہ ٹکائے پھر رو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”فرو! مجھے تھوڑی سی دیر ہوگئی تھی۔“

شانو نے سر اُٹھایا، بڑی بڑی ڈھلی ہوئی آنکھوں کا تاثر بڑا عجیب تھا، بولی۔ ”تم ہمیں چھوڑ کر گئے ہی کیوں تھے؟“

”میں پروین کو ڈھونڈنے نکلا تھا، وہ بھی نہیں ملی، سر کی چھت بھی اُڑ گئی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔“ میں نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

میں جس خبر کو ان کے گوش گزار نے کے طریقے ڈھونڈ رہا تھا، کسی مناسب وقت کی تلاش میں اپنے آپ سے آنکھیں چُرا رہا تھا، وہ آیوں آپ ہی ان کے دلوں تک پہنچ گئی تھی۔ فرزانہ مجھ سے علیحدہ ہو کر زمین پر دوزانو بیٹھ گئی، رانیں پیٹ کر پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔ ”مجھے ماں کا آخری منہ ہی دکھا دیتے، مجھے بابا کو دیکھ لینے دیتے...... یہ سب کیا ہو گیا بھائی! ہم تو جیتے جی مر گئے۔ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔“

میں الٹے قدموں کچن سے نکل آیا۔ ان سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ وہ اس وقت دکھ کی اس نہج پر کھڑی تھیں جہاں کوئی صدا کانوں میں نہیں پڑتی، کوئی سمجھاوا یا بہلاوا ذہن کی پرتوں پر نہیں ٹھہرتا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے باہر رکھے مٹی کے بڑے بڑے گملوں میں سر اُٹھائے صبح کو خوش آمدید کہتے ہوئے پودوں میں خود کو الجھایا۔ پودے روشنی کو اپنی منزل بنا کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ ایسے ہی انسان زندگی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ کچھ دیر تک کچن سے رونے کی آوازیں پھوٹتی رہیں پھر شاید انہیں قرار آگیا یا آنسوؤں کی دولت نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ایک عرصہ کے بعد میں نے اپنی چچا زاد بہنوں کے ہاتھ کا پکا ہوا پراٹھا کھایا۔ ذائقہ پہلے سا نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ نہ وہ گندم، نہ دیسی گھی اور نہ ہی لکڑیوں کی آگ کی سینک...... ہاتھ ذائقہ نہیں، اپنایت کا احساس چھوڑتے ہیں۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد موجو کو ایک کھلونے میں الجھا کر میں دونوں کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ تینوں بیڈ پر بیٹھ گئے۔ شانو نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ سبھی پچھلے کئی دنوں سے میرے لیے بہت پریشان تھے۔ چاچے چراغ نے اردگرد سے، جہاں تک اس کی رسائی تھی، مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اسے ڈیرے پر راکھ کے ڈھیر میں پڑا ہوا سائیں دل جیت کا ہڈیوں کا اَدھ جلا ڈھانچا بھی مل گیا تھا۔ اس پر یا مجھ پر قتل نہ پڑ جائے، اس ڈر سے اس نے ہڈیوں کو سمیٹ کر ایک گہرے کھڈے میں دبا دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ ایک طرف پروین کا معاملہ جوں کا توں لٹکا ہوا تھا تو دوسری طرف سردار حیات خان نے اس پر اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا واحد سہارا میں تھا، میں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ گھر میں کہتا رہتا تھا کہ شہرے کے ساتھ بخشو لوہار کا پتر بھی ہے۔ جہاں بھی گئے ہیں، دونوں اکٹھے گئے ہیں۔

وہ رات کو کھانا کھا کر بڑی دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے پھر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ نصف شب کا عمل تھا جب صحن میں کھٹکا ہوا۔ وہ جاگی، لالٹین کی مدھم روشنی میں بابا کی چارپائی دیکھی، خالی تھی۔ شاید پانی پینے یا رفع حاجت کے لیے باہر نکلا تھا، یہ سوچ کر پھر لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر چارپائی پر اُٹھ بیٹھی۔ آنے والا بابا نہیں تھا، کوئی اور تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دکھائی دیا۔ وہ ڈر کے مارے چیخنا ہی چاہتی تھی کہ پہلے داخل ہونے والے شخص نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی چیخ سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

دوسرے آدمی نے ٹارچ روشن کی۔ سبھی چارپائیوں پر گیا۔ پھر ’چرر‘ کی آواز سنائی دی۔ اس نے اماں کے منہ پر ٹیپ چپکائی تھی۔ پھر اس کے سر میں کوئی شے ماری، وہ تڑپی اور ساکت ہوگئی۔ اس نے اماں کو اُٹھایا اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا اور اس نے یہی عمل فرزانہ کے ساتھ کیا۔ جب اس نے موجو کو بے ہوش کیا، تب پتا چلا کہ وہ ایک بڑے سے خنجر کا دستہ کنپٹی کے قریب کسی خاص جگہ پر مارتا تھا۔ شانو دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ خونیں منظر دیکھتی رہی۔ اس نے دو افراد کو ہی دیکھا تھا۔

اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے والے نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ”میں ہاتھ ہٹانے لگا ہوں، اگر تم نے کوئی آواز نکالی تو تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔“

شانو نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کے ہاتھ کو دیکھا جس میں بڑا سا چمکدار خنجر دبا ہوا تھا۔ اس کی گھگی بندھ گئی اور وہ روایتی انداز میں خدا اور رسولؐ کے واسطے دے کر منت سماجت کرنے لگی۔ وہ جھڑک کر بولا۔ ”خاموش رہو ورنہ......“

وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق یہ وہی شخص تھا جسے میں نے لینڈ کروزر کے فرنٹ ویل کے پاس چھپا ہوا دیکھا تھا اور اس کی کھوپڑی میں اپنے خاموش پستول کی گولی اُتاری تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس شخص نے اس سے میرے بارے میں، پھر پروین کے بارے میں پوچھا تھا۔ چونکہ شانو کو علم نہیں تھا۔ اس لیے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس کے منہ پر زوردار تھپڑ پڑا۔ وہ ایک طرف الٹ گئی۔ تھپڑ مارنے والے نے یہی سوال بارہا گھما پھرا کر کیا۔ وہ کچھ نہ بتا سکی تو اس کے منہ پر بھی وہی ٹیپ چپکا دی گئی۔ اس خبیث نے اس کا اوپر والا دھڑ اپنی جھولی میں بڑے عجیب انداز میں رکھ لیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا جبکہ بایاں ہاتھ بڑے مکروہ انداز میں اس سے کھیلنے لگا۔ شانو نے چیخنا چاہا مگر ٹیپ کی غیر معمولی چپک نے اس کی آواز برآمد نہیں ہونے دی۔ تڑپ کر اس کی گود سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تو اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہوگیا۔

اس کا ساتھی کچھ دیر کے لیے باہر گیا۔ لوٹا تو شانو کو قابو کیے بیٹھے شخص نے پوچھا۔ ”بڈھے نے انگوٹھے لگا دیے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں! اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اب وہ دونوں کو باندھ کر تیل چھڑک رہے ہیں۔“

شانو کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے خود کو اس جسیم شخص کی گرفت سے آزاد کرانے اور منہ پر لگی ہوئی ٹیپ کو اتارنے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو پائی۔ اس کمینے کا ساتھی باہر سے ایک بڑا سا کین اُٹھا لایا، ہنس کر بولا۔ ”ایک فلم ختم ہوگئی ہے۔ دوسری فلم کو بھی ختم کرتے ہیں۔ تم اس چڑیا کے ساتھ تھوڑا اور کھیل لو، میں اس دوران کمرے میں تیل چھڑک لوں۔“

”اس لونڈے کو بھی آخری غسل دے دو۔ لڑکی پر تیل نہ ڈالنا۔“

شانو کے حواس نے بس یہیں تک اس کا ساتھ دیا تھا۔ پھر ذہن تاریک ہو گیا۔ وہ فرزانہ کو پہلے ہی یہ کہانی تفصیل سے سنا چکی تھی۔ وہ سسک کر بولی۔ ”میں نے جب

گاڑی میں موجو کو اپنی گود میں لیا تھا، اس کے کپڑوں سے تیل کی بو آ رہی تھی۔ تمہارا چہرہ دیکھا تو سمجھ گئی تھی کہ اماں اور ابا دُنیا میں نہیں رہے۔ اگر تم ہم تینوں کو اُٹھا کر وہاں سے نکال سکتے ہو تو انہیں کیوں نہیں......"

میں نے افسردہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا، کہا۔ "وہ میرے پہنچنے سے قبل اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ہم نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی، نہیں ملے۔ جب مردہ حالت میں ملے، تب وقت نہیں تھا۔ اگر انہیں نکالنے کی کوشش میں مصروف رہتے تو پھر تم لوگوں تک نہ تو پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی تمہیں بچا سکتے تھے۔"

فرزانہ نے بیڈ شیٹ پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے پوچھا۔ "پروین کہاں ہے؟ نہیں ملی؟"

میں نے ضروری خیال کیا کہ اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ان کے گوش گزار دوں تاکہ ان کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ وہ سنتی رہیں پھر ایک دوسرے کے گلے لگ کر سسکنے لگیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ انہوں نے ٹوٹ پڑنے والی سنگین قیامت کو پوری حقیقت سمیت ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ رہی رونے والی بات تو یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ ویسا ہی، جیسا میرے والدین کے اندوہناک قتل نے تمام عمر کے لیے لہو کے اشک بہانا میری قسمت کر دیا تھا۔

دونوں دُنیا شناس نہیں تھی۔ ان کی عقل کی بساط مختصر تھی، تبھی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر شانو کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "بھائی! اب کیا ہوگا؟ کیا پروین مل جائے گی؟"

میرے پاس اس کے دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا مگر اسے دلاسا دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دونوں اسکول میں داخلہ لوگی، پڑھوگی، موجو بھی...... اب یہی ہماری دنیا ہے۔ رہی بات پروین کی، تو مجھے یقین ہے کہ میں اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

فرزانہ نے پوچھا۔ "بھائی! تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کیا تم نے کوئی نوکری کر لی ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کی حیرانی بجا تھی۔ ہم نے زندگی میں کبھی اتنے پیسے نہیں دیکھے تھے جتنے گزشتہ مختصر سے دورانیے میں ہم نے خرچ کر دیے تھے۔ دونوں بہنوں کو جہاں ماں باپ کی ناوقت اور غیر متوقع موت کا دکھ لاحق تھا، وہاں یہ قلق بھی ان کا خون چوس رہا تھا کہ جوان اولاد کے ہوتے ہوئے ان کے والدین بے کفن دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ پتا نہیں ان کی نماز جنازہ اور تدفین کی گئی تھی یا کمرے میں بھڑک اٹھنے والی آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔

ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ غزالہ اور پھوپی کبریٰ کس حال میں ہوں گی، کیا ان پر کوئی افتاد تو نہیں آن پڑی تھی؟...... ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ موجو دوڑتا ہوا کمرے میں آن گھسا اور ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ موجو کو یہ گھر بڑا پسند آیا تھا اور اس نے ماحول کی تبدیلی کا منفی اثر نہیں لیا تھا۔ خدا جانے شانو اور فرزانہ نے اسے کس طرح مطمئن کیا تھا، ماں باپ کی موت کے بارے میں آگاہ کیا تھا یا نہیں بہرحال وہ اپنی طفلانہ مستی میں پوری طرح گم تھا۔

میں نے فون پر میرو شاہ سے رابطہ کیا۔ سجاول کے بیٹے وحید کا حال دریافت کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک کارندہ وحید کو لاری اڈے پر بس میں بٹھا کر کنڈیکٹر کے ذمے لگا آیا تھا کہ اسے چوک قریشی اُتار دے۔ اس نے یہ احتیاط بروئے کار رکھی تھی کہ وحید کوٹھی کی لوکیشن اور راستوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔

کھالے اور پیا کو آنا تھا مگر کسی بنا پر نہیں آئے۔ فوجی اختر میری ہدایت پر اخبار لے آیا تھا۔ لڑکیاں اپنے کام میں مشغول ہو گئیں تو میں نے ایک مرتبہ پھر فوجی اختر کو بازار روانہ کیا۔ اسے الیکٹریشن کو پکڑ لانے اور کیبل کنکشن چالو کروانے کا ٹاسک دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اخبار اپنے سامنے بیڈ پر پھیلا دیا۔ کافی عرصے بعد اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے جس خبر کی تلاش تھی، وہ بیک پیج پر مل گئی۔ چار کالمی خبر کا متن بعینہٖ وہی تھا۔ نور پور گاؤں پر ڈاکوؤں کا حملہ...... جائداد کے تنازعہ میں بھتیجے نے اپنے بدنام زمانہ اشتہاری ساتھیوں کی مدد سے حقیقی چچا اور چچی کو آگ لگا کر زندہ جلا دیا۔ دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کو اغوا کر لیا۔ نور پور کے باسیوں اور پولیس نے مل کر انہیں پکڑنا چاہا تو ڈاکوؤں نے فائر کھول دیا۔ فائرنگ کے تبادلے میں چار انتہائی مطلوب اشتہاری ڈاکو ہلاک جبکہ ان کا سرغنہ مغویان کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

خبر کے 'بقیہ' میں اسی بات کو موڑ توڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اتاری اور اخبار لپیٹ دیا۔ شکر تھا کہ اخبار والوں کو میری کوئی تصویر دستیاب نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ بھی چھپ چکی ہوتی اور میرے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ میرے تمام تر ڈاکومنٹس اسی کمرے میں

تھے جس میں قیامت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ میرے فوٹو البم بھی جل چکے ہوں گے۔ اگر کچھ بچا بھی تھا تو اس راکھ کے ڈھیر میں سے تلاش کر کے نکال لینا ہر کس و ناقص کے لیے ممکن نہیں تھا۔

پولیس نے جائداد کے تنازعے کی نہایت فضول اور بے ہودہ کہانی گھڑی تھی۔ میری اور پروین کی وراثت ایک کھنڈر نما مکان تھا جس میں سوائے پرانے سامان اور سوراخ والے بھڑولے کے کچھ بھی نہیں تھا۔ زرعی اراضی نہیں تھی۔ میرا باپ اپنی موت سے چھ سات سال قبل فریدن خان نامی شخص کے ہاتھ اپنی جائداد فروخت کر چکا تھا۔ اسی زمین کو بعد میں ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتا رہا تھا۔ میرے باپ، سوہنے بلوچ کے مرنے کے بعد زمین پر اس کے مالک فریدن نے کسی اور کو مزارعہ بٹھا دیا تھا۔ چاچے چراغ دین کی جائداد سے میرا اور پروین کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ چاچے کا وارث موجود تھا، اس کی دو بیٹیاں فرزانہ اور شبانہ تھیں جو ابھی زندہ اور سلامت تھے۔

کیبل نیٹ ورک کمپنی کے الیکٹریشن نے آ کر کیبل کنکشن لگا دیا اور ٹی وی کی گونا گوں اسکرین روشن ہو گئی۔ میں کچھ دیر تک مقامی نیوز چینل چلا کر بیٹھا رہا مگر شاید میری مطلوبہ خبر اَب پرانی ہو جانے کی وجہ سے پس منظر میں چلی گئی تھی۔ سہ پہر کو موجو کو ساتھ لے کر گل گشت کی آدارہ گردی پر نکلا۔ میں اس علاقے سے اجنبی نہیں تھا۔ اس کالونی سے ملحقہ شہر کے ایک معروف کالج میں پڑھتا رہا تھا۔ ان دنوں ہاسٹل سے نکل کر اسی کالونی میں گھومنے پھرنے کے لیے شام کو نکلنا میرے معمول کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ یہ ایجوکیشنل ایریا تھا۔ یہاں نہ صرف بہت سے اسکول اور کالج واقع تھے بلکہ تعلیمی بورڈ اور بڑے بڑے بک سینٹر بھی موجود تھے۔ یہاں رہائش پذیر لوگوں کی اکثریت شعبہ تعلیم سے وابستہ تھی۔

میں نے گلی اور محلے کا ازسرنو جائزہ لیا۔ یہ خاصی کشادہ گلی تھی۔ پوری گلی میں کوئی خالی پلاٹ موجود نہیں تھا۔ مین روڈ جسے عرف عام میں بوسن روڈ کا نام دیا جاتا تھا، یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سو ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر گول چوک تھا جہاں ضروریات زندگی کی تمام دکانیں موجود تھیں۔ میں بڑے عرصہ بعد اس چوک اور اس سے ملحقہ دیوان باغ کو دیکھ رہا تھا۔ موجو نے دنیا کی یہ گہما گہمی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ بڑا ایکسائٹڈ ہو رہا تھا۔ میں نے فراغت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک بک سینٹر

سرائے اور بھٹیاری

اگلے وقتوں میں، بڑے شہروں میں بھی آج کل کی طرح شاندار اور پرتکلف ہوٹل موجود نہ تھے، چنانچہ مسافروں کو سرائے میں قیام کرنا پڑتا تھا جہاں ان کا سابقہ اکثر کسی "چھبیلی بھٹیارن" سے پڑ جاتا تھا۔ اس زمانے کی ایک "سچویشن" یہاں ملاحظہ ہو۔

سرائے میں ایک کوٹھری کے پاس ایک صاحب لحیم شحیم، فربہ جسم جیسے ہی چارپائی پر بیٹھنے لگے، پٹی ٹوٹ گئی اور حضرت غڑاپ سے جھلنگے میں ہو رہے۔ بسد خرابی بسیار حضرت کو نکالا گیا۔ جھلنگے سے باہر آئے تو نہایت خفیف، پہلے تو بھٹیاری سے جھڑپ ہوئی۔ "واہ اچھی چارپائی دی جو میرا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتا تو کیسی ہوتی؟"

"اے واہ میاں! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، ایک تو چھپر کھٹ چکنا چور کر ڈالا، پٹی کے بہتر ٹکڑے ہو گئے، دیں گے ٹکا اور چھ گنڈے پر پانی پھیر دیا۔"

(پنڈت رتن ناتھ سرشار)

مرسلہ: ذیشان منہاس، گلشن اقبال کراچی

***

عورتوں کی فلمی پسند

ہماری فلمی دنیا کے کرتا دھرتا کہتے ہیں جو فلم عورتوں کو پسند آجائے، سمجھو کامیاب ہو گئی۔ آنسو بہانا عورتوں کا دلچسپ مشغلہ ہے اور فلم والے عورتوں کی تفریح طبع کے لیے بہت سے غمگین مناظر رکھتے ہیں تاکہ عورتیں انہیں دیکھیں، بلک بلک کر روئیں اور پھر اپنی پڑوسنوں اور جاننے والیوں سے فلم کی تعریف کریں کہ ایسی لاجواب فلم ہے کہ بہن خدا کی قسم میری تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنکھیں سوج گئیں اور گلا خشک ہو گیا، وہ تو تمہارے دلہا بھائی نے ایک روپے کی "کالا کولا" کی بوتل پلائی تو جا کے کہیں گلا تر ہوا۔

مرسلہ: سرور اکرام، گولڈن ٹاؤن لاہور

سے کچھ کتابیں خریدیں اور اس سے قریب ترین واقع اسکولوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلیں۔

مین روڈ پر جا کر کچھ دیر اس عظیم الشان کالج کی درختوں میں چھپی ہوئی عمارت کو عجیب یاس آمیز نظروں سے دیکھتا رہا جہاں میں زیر تعلیم رہا تھا۔ یہاں سے وہ ہوسٹل دکھائی نہیں دیتا تھا کہ جس میں عرفان مرزا کی سلطنت قائم تھی۔ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی تک یہیں مقیم ہو کیونکہ اس کا مقصد تعلیم کا حصول نہیں تھا بلکہ اس کی ترجیحات قطعی مختلف اور منفی تھیں۔

یہ شاہراہ بڑی مصروف تھی۔ ہر قسم کی ٹریفک رواں دواں رہتی تھی۔ صبح اور دوپہر کو اسکول ٹائمز پر تورش میں بے تحاشا اضافہ ہوجاتا تھا۔ مجھے اس علاقے کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا کیونکہ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ کوئی واضح اور غیر معمولی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔

توقع سے زیادہ تاخیر ہوگئی تھی اور شام ڈھلنے لگی تھی۔ گھر پہنچا تو پارکنگ میں سوزوکی ایف ایکس کھڑی دیکھی۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ موجو کو گھر میں بھیج کر میں ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ پیا جی کو صوفے پر بیٹھا دیکھا۔ اس کے پہلو میں سرخ رنگ کی لمبی ڈاڑھی والا پٹھان خاصا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ پیا جی کے ساتھ اس کی آمد میرے لیے حیرانی کا باعث تھی۔

وہ حلیے سے الیکٹرونکس کا دو نمبر گھریلو سامان بیچنے والا لگ رہا تھا۔ یہ لوگ گلی گلی گاؤں گاؤں گھوم پھر کر اشیا بیچتے تھے۔ اس کی دو جزوی موبائل دکان فرش پر ڈھیر تھی۔ میں نے تعجب سے اُسے دیکھا، خیال آیا کہ شاید لڑکیوں کو کچھ خریدنا ہو اور پیسے نہ ہونے کے سبب پٹھان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہو یا پیا کو کچھ خریدنا ہو اور اسے یہاں گھیر لایا ہو۔

میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”اوئے خوچے کا بچہ...... ادھر آؤ......“

مخصوص ٹوپی اور اس میں باہر نکلی ہوئی سرخ لٹیں، سرخ ڈاڑھی مونچھیں اور ڈھیلا ڈھالا افغانی لباس جس پر آٹھ گز کی چنوں والی پگڑی چھائی ہوئی تھی...... پٹھانوں کا روایتی ٹوٹا پھوٹا لہجہ...... مگر اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں پلٹا اور اس کے قریب آ گیا۔ جیسے اس کی آواز مجھے آشنا لگی تھی، ایسے ہی اس کی شکل بھی آشنا محسوس ہوئی۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ افغانی گیٹ اَپ میں کھالا تھا جو ایک آنکھ مخصوص انداز میں دبا کر مسکرا رہا تھا۔ وہ سوانگ بھرنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ اس کے بہروپ نے مجھ جیسے قریبی شخص کی نظر بھی دھوکا دے دیا تھا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”ابے بخشو لو کے پتر! یہ تم کیا بنے بیٹھے ہو؟“

وہ بولا۔ ”نور پور میں سارا دن اسی حلیے میں گزار کر آیا ہوں۔ کوئی مائی کا لال پہچان نہیں پایا۔“

اس نے سچ کہا تھا۔ میں نے توصیفی نظروں سے اُسے پھر پیا جی کو دیکھا اور کہا۔ ”یہ پیا کا کمال ہوگا، ہیں؟“

پیا مسکرایا۔ ”ہاں! اس جیسے اور بھی کئی ہنر میں نے سیکھ رکھے ہیں۔ میر دشاہ نے تمہاری ٹریننگ بھی میرے ذمے لگا رکھی ہے۔ گھر کے بکھیڑوں سے نکلو گے تو میری شاگردی میں آؤ گے۔ ایک دم فرسٹ کلاس ماسٹر بنا دوں گا تمہیں، فکر نہ کرو۔“

اسی دوران فوجی اختر نے دونوں کے لیے چائے سرد کردی۔ پیا جی سے کچھ تبادلۂ احوال کیا پھر ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ میں حیرانی سے بار ہا کھالے کو دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس کا رنگ گورا نہیں تھا، وہ پٹھان ہی لگ رہا تھا۔ ڈاڑھی بالکل اصلی معلوم ہو رہی تھی۔

کھالا بولا۔ ”اب کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“

میں فرطِ استعجاب سے بولا۔ ”یار تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آرہا......“

”جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔“

وہ تمام دن نور پور میں گزار کر آیا تھا۔ مجھے یہ بہروپ غیر ضروری محسوس ہوا کیونکہ وہ تو بلا روک ٹوک نور پور جا سکتا تھا۔ اسے کسی نے نہ تو دیکھا تھا اور نہ اس پر کسی نے اس رات کی واردات میں شمولیت کا الزام عائد کیا تھا۔ میں نے اپنے اس استعجاب کا اظہار کیا تو کھالے نے کہا۔ ”واہ شہرے خان! تو بھی ہمیشہ آدھی بات سوچتا ہے۔ بھلے آدمی! تمہارے اور میرے تعلق کو کون نہیں جانتا؟ نور پور تو رہا ایک طرف، پورے وسیب کو ہماری یاری کا علم ہے۔ ہم نے ٹی وی چینل پر پولیس کی کارروائی دیکھی تھی۔ تمہیں نامزد کیا جاچکا ہے اور خطرناک قاتل کے روپ میں میڈیا کے سامنے پیش کیا جاچکا ہے۔ مجھے نور پور میں دیکھتے ہی جھٹ سے دھر لیا جاتا، حیات خان اور دریام خان پکڑ کر میری دستی آتھر پریڈ (فوری مرمت) کردیتے کہ بتا! وہ خطرناک قاتل شہریار عرف شہرا کہاں ہے، پھر؟“

میں نے لمبی سانس لی اور کہا۔ ”اچھا! معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ خیر! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم بتاؤ، تمہارا دورہ کیسا رہا؟“

اس نے سگریٹ نکالی، سلگائی اور لمبا کش لے کر بولا۔ ”میں صبح نو بجے کے لگ بھگ نور پور میں پہنچ چکا تھا اور......“

اس نے تفصیل سے اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کردی۔ اسے عقیل نے نور پور والی پلی پر کار سے اُتار کر واپسی کی راہ پکڑلی تھی۔ میر دشاہ کسی اور کو بھی بھیج سکتا تھا مگر جو معلومات کھالا مجتمع کرسکتا تھا، کوئی اور نہیں کرسکتا تھا کیونکہ کھالا گھر کا بھیدی تھا اور بڑی آسانی سے لنکا ڈھا سکتا تھا۔ اس نے پٹھانوں کے سے انداز میں گلیوں کا راؤنڈ لگایا پھر مراد بخش دیوانے کے ’گھر دندے‘ میں اپنا سامان فرش پر رکھ کر پڑاؤ کیا۔ وہ بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح کھالے کو پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔ کھالے نے تنہائی میں اس پر اپنا بھید آشکار کیا اور تسلی سے نور پور کے حالات پر گفتگو کی۔ پھر وہ سامان بیچتے ہوئے اپنے گھر گیا۔ وہاں سے بھی اسے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ اپنے گھر والوں کو اس نے سبق رٹایا جو انہیں نور پور کے لوگوں کے سامنے بار ہا پڑھنا تھا۔ کھالے کو اپنے گھر کے بعد بھی کئی جگہوں پر جانا تھا، گیا اور اپنا کام نمٹا کر لوٹ آیا۔

اس سے حاصل ہونے والی معلومات نے جہاں مجھے گہری سوچوں میں غرق کردیا، وہاں کچھ حوصلہ افزا کلیو بھی دیے۔ نور پور کے لوگ مجھے مظلوم سمجھتے تھے۔ تقریباً سبھی کو علم ہوچکا تھا کہ میرے گھر پر حملہ کرنے والے وہی چاروں اشتہاری ڈاکو تھے جن میں سے دو کی لاشیں مزار کے احاطے سے ملی تھیں جبکہ دو کے جلے ہوئے ڈھانچے کمرے میں سے پولیس کو دستیاب ہوئے تھے۔ لوگوں نے ازخود یہ اندازہ قائم کرلیا تھا کہ میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا اور اپنی بہنوں اور بھائی کو نکال کرلے گیا تھا۔ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ میرے ساتھ کھالا بھی جیپ میں موجود تھا جب میں نے کالے بزدار کو بلا کر راستہ چھوڑنے کا کہا تھا مگر کسی نے بھی یہ بات پولیس کے کانوں میں نہیں پہنچائی تھی۔ چونکہ سردار حیات خان اور دریام خان پولیس پارٹی کے ساتھ ساتھ تھے اس لیے چند خاص لوگوں کے سوا کسی کو بھی پولیس تک رسائی نہیں لینے دیتے تھے۔ بخت خان نے اس تمام کارروائی میں کوئی دخل نہیں دیا تھا۔ سردار حیات خان کے دارے پر دو پولیس کانسٹیبل تمام دن موجود رہتے تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ شہریار نظر آئے تو وہ اسے دبوچ لیں۔

چچا کی جائداد حاصل کرنے کے لیے دو افراد کے قتل اور تین افراد کے اغوا کا مقدمہ تھانہ چوک قریشی میں درج کیا گیا تھا اور مجھے اس میں نامزد مجرم ٹھہرایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسی تھانے کی سفارش پر مجھے اشتہاری مجرم قرار دیا جانا تھا جبکہ قانون پولیس فائل پڑھنے کے بعد یک طرفہ طور پر میرے سر کی قیمت مقرر کردیتا۔

یہ خبر بھی ملی تھی کہ شیخو پورہ سے سائیں دل جیت کا خاص مرید نورن آغا مزار پر آ گیا تھا اور اس نے سائیں دل جیت کے حکم سے گدی سنبھال لی تھی۔ ایک نیا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس نے آتے ہی مشہور کردیا تھا کہ سائیں کو شیخو پورہ کے چند مریدوں نے جوج کی سعادت حاصل کرنے گئے تھے، حرمین شریفین میں مناسک حج کی ادائیگی میں مشغول دیکھا تھا۔ انہوں نے وہاں سائیں دل جیت کی قدم بوسی کی تھی اور یہ پیغام لائے تھے کہ سائیں جی طویل عرصہ کے بعد وطن لوٹیں گے۔ تب تک نورن آغا اس کی گدی سنبھالے گا۔ کھالے کے منہ سے یہ کہانی سن کر میرے لبوں پر نفریں مسکراہٹ تیر گئی۔ معصوم دیہاتیوں کے معتقدانہ مزاج سے کھیلنے والے بہت چالاک اور زیرک لوگ تھے جنہوں نے یہ عجیب شوشا چھوڑا تھا۔ سادہ لوح اس جھوٹی کہانی پر ایمان لا کر مزار پر جانے لگے تھے اور مزار کی آمدنی میں پہلے سے بھی اضافہ ہوگیا تھا۔

بخت خان آتش زدگی کے اگلے دن ہی غزالہ اور اس کی ماں کو اپنی حویلی میں لے گیا تھا۔ اس کے خیال میں ان کا اب اس گھر میں رہنا کسی نئی لرزہ خیز واردات کا سبب بن سکتا تھا۔ بخت خان ملنے جلنے والوں سے بے دھڑک کہتا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا سردار حیدر خان کے گرگوں کا ہے۔ اس کی یہ طرف داری محض زبانی کلامی تھی۔ عملی طور پر اس نے میری عدم موجودگی میں نہ تو مجھے قانونی طور پر کوئی تحفظ فراہم کیا اور نہ ہی میری کوئی ٹھوس اعانت کی تھی۔

یہ خبر افسوس ناک تھی کہ ڈاکٹر شاہ جی کا نور پور سے کسی اور سینٹر میں تبادلہ ہوچکا تھا۔ اس کی جگہ پر ابھی کوئی میڈیکل آفیسر نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کی کوٹھی خالی پڑی تھی۔ دیوانے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی نے اپنا تبادلہ خود کروایا تھا اور اس کا تبادلہ انٹر ڈسٹرکٹ ہوا تھا۔ وہ اب کسی اور ضلعے میں تھا۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ جاننا کوئی مشکل نہیں تھا۔ مظفر گڑھ کے ڈی ایچ او آفس کے کسی اہلکار کو چار نوٹ دے کر پوچھا جاسکتا تھا کہ اب وہ کس ضلع کے کس بنیادی مرکز صحت میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔

اس نے وہاں سے نکلنا کیوں بہتر خیال کیا؟ اس پر محض قیاس آرائیاں ہی کی جاسکتی تھیں۔ غالب اندازہ یہی تھا کہ اس نے نور پور میں پیش آنے والے حالات کو دیکھ کر یہاں سے رخصت ہوجانے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی۔

امیر نواز ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ سردار حیات خان سمیت پورے گاؤں نے اپنے تئیں یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اور پروین دونوں ملی بھگت سے گاؤں سے فرار ہوئے تھے اور انہوں نے شہر جا کر شادی کرلی تھی۔ اب والدین کے ڈر سے دونوں نے واپس نہ آنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ حیات خان کو اپنی ویگن کے لیے ڈرائیور مل گیا تھا مگر شہریار تک پہنچنے کے لیے اسے کھالے کی تلاش تھی۔ اس نے بخشو لوہار سے سختی سے کھالے کے بارے میں پوچھا تھا مگر بخشو نے نیاں (حلف) دے کر گلو خلاصی کروالی تھی۔

ایک اور خانزادہ، سردار یارن خان بھی نور پور پہنچ گیا تھا۔ وہ اس مرتبہ تین ماہ تک گاؤں میں رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔ حسبِ معمول اس کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں آیا تھا۔ دو گن مین اور ایک خدمت گار اس کے ساتھ تھے۔ ہر مرتبہ یہی لوگ ہوتے تھے جو یہاں موجود دو نوکروں کے ساتھ مل کر اپنے خان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ کھالے نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ پہلے کی طرح چاق چوبند اور پرکشش تھا۔ اس پر ماہ و سال کی گرد نہیں پڑی تھی۔ یہ امر کھالے کے لیے باعث حیرت تھا۔

کھالے نے بڑی محنت کی تھی۔ خطرہ مول لے کر بہت کارآمد معلومات اکٹھی کی تھیں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ”دیوانے نے میرے بارے پوچھا تھا؟“

”تو کیا وہ تمہیں بھول سکتا ہے؟ جونہی اس نے مجھے پہچانا، سب سے پہلا سوال ہی یہی کیا تھا اس نے۔“ کھالے نے کہا۔ ”وہ بڑا دکھی ہو رہا تھا۔ اس نے جمعہ کے دن ملتان آنے کا وعدہ کیا تو میں نے اسے قلعہ کہنہ پر تین بجے کا ٹائم دیا۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ شہرے کو بولنا، میری یا میرے خون کی ضرورت ہو تو بتانا، جان ہتھیلی پر رکھ کر آؤں گا اور یار کے قدموں میں نچوڑ کر رکھ دوں گا۔“

میری چھاتی پھیل گئی۔ دل کو عجیب طمانیت اور احساسِ تفاخر ہوا۔ میں نے کہا۔ ”اللہ اسے سلامت رکھے۔ میری قسمت میں تو اب شاید نور پور میں رہنا لکھا ہی نہیں، دانہ پانی وہاں سے اُٹھ گیا مگر کھالے! میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔“

اس نے میرے کندھے پر عادتاً ہاتھ مارا، بولا۔ ”مرد کبھی ایسی مشکلوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں ملنے والا دکھ بہت بڑا ہے، مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ رونے اور افسوس کرنے سے حالات نہیں بدلتے۔ کیوں پیا جی؟“

”ہاں بھئی! سچ ہے کہ یہاں تو رات کے پنجے سے دن کا اجالا چھیننا پڑتا ہے۔“

کھانا تیار ہونے کی اطلاع فوجی اختر نے دے دی تھی۔ ہم نے کھانا سیر ہو کر کھایا۔ کھالے نے شانو اور فرزانہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اسے گھر میں لے جا کر تینوں سے ملوایا۔ کھالے نے انہیں تسلی دی۔

شانو نے پوچھا۔ ”اماں اور بابا کی نماز جنازہ ہوئی تھی؟“

کھالے کی آنکھیں بھر آئیں، بولا۔ ”ہاں میڈی بھین! ہڈیاں کوں دھوایا وِی ہا اُتے دفنایا وِی ہا...... ہن تساں کلام پڑھ تے انہاں تے ختم درود کیتا کرو جو ہور کوئی واہ نہیں......“

(ہاں میری بہن! ان کی ہڈیوں کو غسل بھی دیا گیا اور دفن بھی کردیا گیا۔ اب تم لوگ کلام پڑھ کر ان کی روح کو ایصال کیا کرو کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں)

دونوں اشک بہاتی رہیں۔ انہوں نے غزالہ اور پھوپی کبریٰ کے بارے بھی پوچھا۔ پھر اپنی سہیلیوں کی خیریت دریافت کی اور فرمائش کی کہ جب دوبارہ نور پور جانا ہو تو ان سب کو سلام دینا۔ رات کے نو بج چکے تھے جب دونوں نے رخصت چاہی۔

پیا نے جاتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ”جب مناسب سمجھنا، فون کر کے مجھے بلا لینا۔ میں تمہیں لینے کے لیے آجاؤں گا۔ کچھ سیکھ لوگے تو زندگی بھر کام آئے گا۔ اور ہاں...... میرو شاہ کا حکم ہے کہ اپنی حفاظت کیا کرو۔ اس کے کہنے پر میں تمہارے لیے 'ٹھاکے شاکے' لے آیا ہوں، کسی وقت بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اور اس گھر کو دشمن کی نظر سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہم جیسے لوگوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا کیونکہ گھر بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے، کمزوری پر دشمن ہاتھ ڈالنے کو بے تاب رہتا ہے۔ اگر خدا گھر سے نواز دے تو خون دے کر اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ سمجھے؟“

میرے جبڑے بھنچ گئے۔ زندگی میں دو نشیمن اجڑتے دیکھے تھے، تیسرے کو جلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر آنے والے وقت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میرا

دھیان پہلے ایک مرتبہ اس طرف گیا تھا مگر میرے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ سوچا تھا کہ میرو شاہ سے رابطہ ہونے پر کہوں گا مگر پھر یاد نہیں رہا تھا۔ پیا نے ایف ایکس کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے ایک شارٹ گن، ایک ولایتی ریوالور اور کافی تعداد میں گولیاں نکال کر میرے حوالے کردیں۔ شارٹ گن کی مزل (Muzzle) پر سائیلنسر کی مخصوص فٹنگ دکھائی دے رہی تھی۔

گھر کے ماحول پر مسلط موت کی سنگینی میں کافی حد تک کمی واقع ہوچکی تھی مگر ابھی تک فضا بڑی سوگوار تھی۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے اور وہ زیادہ وقت جائے نماز پر گزارتی تھیں۔ ممکن تھا کہ ان کے دلوں میں ابھی تک خوف بھی جاگزیں ہو اور ماحول سے ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ بھی درپیش ہو کیونکہ اتنے قلیل وقت میں نہ تو وہ کوئی دوست بنا سکی تھیں اور نہ ہی کسی ہمسائے گھر سے رسم و راہ پیدا کرسکی تھیں۔

رات...... رات کی طویل اور خنک خاموشی...... اور سوچوں کے مہیب تانے بانے جن کا نہ تو کوئی انت تھا اور نہ ہی کوئی نصب العین...... میں ہموار چھت پر نظریں جمائے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور و خوض کرتا رہا۔ چونکہ میں ابھی تک نہ تو خود مختار تھا اور نہ ہی میری کوئی حیثیت تھی، اس لیے ازخود کچھ بھی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر مجھے میرو شاہ اور میڈم کا ساتھ میسر نہ ہوتا تو اب تک میں یا تو بے دردی سے قتل کردیا گیا ہوتا یا جیل کی سنگلاخیوں کا شکار ہوچکا ہوتا۔ میں سردار حیدر خان اور اس کے غنڈوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں تو سردار حیات خان اور وریام خان کا سامنا بھی نہیں کرسکتا تھا، حیدر خان تو پھر بہت بڑا فرعون تھا جو انسانی زندگیوں کی ڈوریوں سے کھیلنے کا عادی تھا اور جو سوچتا، کر گزرتا تھا۔

نور پور میں میرا سب سے بڑا ہمدرد اور مخلص دوست ڈاکٹر منور علی شاہ تھا جو وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔ میرے اور کھالے کی عدم موجودگی میں، نور پور کے بدلتے ہوئے حالات نے شاید اُسے مایوس کردیا تھا اور یہ انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، ایسی ہی ایک کوٹھی اور عملہ میرا منتظر ہوگا۔ کبھی نہ تو تنخواہ میں کمی ہوگی اور نہ ہی عہدے میں تنزلی ہوگی۔ وہ درست کہتا تھا۔ اگر یہی بات ہر آفیسر دل سے مان لے تو اسے کوئی بھی جھکانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور اس کے ایمان کی بولی لگانے کی جرأت کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

شب و روز پر ایک عجیب سا جمود طاری ہوگیا۔ میرو شاہ کسی بڑی سپلائی میں مصروف تھا۔ میڈم دبئی میں تھی۔ ان دونوں کی عدم موجودگی میں، میں سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پیا ازخود کسی بھی مشن پر کام کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ وہ اور میڈم کے گینگ کا ہر فرد میڈم کے بعد میرو شاہ کے حکم کا غلام تھا۔

میرے ہاتھ میں ڈور کا کوئی سرا نہیں تھا۔ میرو شاہ سے رابطہ کیا تو اس نے دو ہفتے انتظار کا حکم دیا تو فراغت کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے پیا کی شاگردی اختیار کرلی۔

ملتان کے نواح میں، بند بوسن کے پار، میڈم کا ایک بڑا فارم ہاؤس تھا۔ اس فارم ہاؤس کے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ عام گزرگاہ بھی نہیں تھی۔ میں ہر صبح کالج اسٹاپ پر کھڑا ہوجاتا۔ پیا اپنی ایف ایکس کار میں بٹھا کر فارم ہاؤس پر لے جاتا، جہاں میں تمام دن کسرت کرتا۔ وہ گینگ کا اہم رکن تھا اور میں نے اسے بہت دلیر اور مشاق پایا تھا مگر فارم ہاؤس میں اس کے جوہر کھل کر میرے سامنے آئے۔ وہ نہ صرف ہرفن مولا شخص تھا بلکہ پڑھا لکھا اور نہایت ذہین آدمی تھا۔ فارم ہاؤس پر چند نوکر چاکر رہتے تھے جو نہ صرف فارم ہاؤس کی ملحقہ گیارہ ایکڑ زمین کاشت کرتے تھے بلکہ مرکزی عمارت جو خاصی وسیع تھی، کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔

پیا کی تفویض کردہ مخصوص مشقوں نے میرے جسم کو مختصر وقت میں فولادی بنادیا تھا۔ دوڑ، مختلف نوع کے اسلحے کا استعمال اور نشانہ بازی، گھڑ سواری، لڑائی بھڑائی بالخصوص چاقو زنی اور چھوٹے چھوٹے کئی ہنر اس نے بڑی مہارت سے میری ذات میں بھر دیے۔ وہ لڑائی بھڑائی میں بہت ماہر تھا۔ اس نے ایک بات کئی موقعوں پر مجھے ازبر کرائی کہ زندگی کی ہر بساط پر فیصلہ کن ہتھیار سرعتِ فیصلہ قرار پاتا ہے۔ ایک موقع پر جب اس نے اچانک مجھے فارم ہاؤس کی دو منزلہ عمارت سے چھلانگ لگانے کا حکم دیا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا تو اس نے مجھے سمجھایا۔ ”شہریار! انسان کو کڑے سے کڑا وقت دو آپشنز دیتا ہے۔ زندگی یا موت۔ فوراً فیصلہ کرنے والا پہلے آپشن کا چناؤ کرلیتا ہے۔ تذبذب کا شکار ہونے والا دوسری طرف لڑھک جاتا ہے۔“

”ذرا کھل کر بتاؤ پیا جی! میں سمجھا نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک ذرا مسکرایا، مجھے بازو سے پکڑ کر منڈیر تک

لے گیا اور بولا۔ ''تصور کرو کہ اس عمارت کو خوفناک آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے یا دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر تمہارا دشمن گن تانے کھڑا ہے۔ وہ تمہیں گولی مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ موت اس کی انگلی کے دباؤ کے فاصلے پر کھڑی تمہیں دیکھ رہی ہے اور تم یہاں منڈیر پر کھڑے ہو۔ یہ کڑا وقت ہے۔ اس نے تمہارے سامنے دو آپشن رکھ دیے ہیں۔ کون سے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''زندگی یا موت......''

وہ مسکرایا۔ ''ہاں...... زندگی بہت پیاری ہوتی ہے جبکہ موت بڑی کریہہ اور ڈراؤنی ہوتی ہے...... ایسا ہی ہے ناں؟...... پہلا آپشن زندگی کا ہے۔ اگر تم فی الفور اپنے بچاؤ کا فیصلہ کر لیتے ہو اور یہ طے کر لیتے ہو کہ تمہارے پاس صرف منڈیر سے نیچے چھلانگ لگانے کی مہلت ہے۔ فیصلہ کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایک لمحہ ہے۔ چھلانگ لگانے کی صورت میں دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم بجلی کے کسی تار پر، کسی گہرے گڑھے میں یا کسی بھی ناہموار جگہ پر گر کر ہلاک ہو سکتے ہو۔ دوسری یہ کہ تمہیں ہلکی پھلکی چوٹ آئے گی اور تم اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ گے۔ یعنی تمہارے پاس منڈیر پر سے کودنے کے بعد زندہ رہنے کے پچاس فیصد چانس ہوں گے۔ کڑا وقت تمہیں دوسرا آپشن بھی دیتا ہے۔ کیا؟...... اگر تم متذبذب ہو کر وہیں کھڑے رہو گے، کشمکش میں فیصلہ نہیں کر پاؤ گے تو دشمن تم پر فائر کر دے گا۔ گولی تمہارے سینے یا سر میں لگے گی اور تم مر جاؤ گے۔''

اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے فارم ہاؤس کے باہر ایک نوکر کو چارے کی گٹھڑی اُٹھا کر مویشیوں کی طرف اشارہ کیا، بولا۔ ''شہریار! یہ شخص مرنے والا ہے، آج، کل، کسی بھی آنے والے دن...... مہینے...... یا کسی بھی سال...... میں، تم، میروشاہ اور میڈم...... سبھی نے ایک دن مر جانا ہے۔ اسکول سے نکلنے والا معصوم بچہ تیز رفتار کار کے نیچے آ سکتا ہے۔ تیس سال واپڈا کی نوکری کرنے والے ماہر لائن مین کو کسی لمحے کرنٹ لگ سکتا ہے۔ موت قصور نہیں دیکھتی۔ موت کوتاہی کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتی ہے۔ جس سے ایک پل کی کوتاہی سرزد ہوئی، وہ موت کا ہدف بن گیا۔''

اس نے ایک ذرا توقف کیا۔ ''تمہارے چاچا چاچی مر گئے۔ ہمارے ہاتھوں چار قاتل بھی جہنم واصل ہو گئے۔ بیلے میں کسی اکیلے شخص نے چار شہ زوروں کی سانسوں کی مالائیں توڑ دی تھیں۔ یاد ہے نا؟ ہاں شہریار! سچ کہتا ہوں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کی بانہوں میں رقص کیا جا سکتا ہے۔ موت...... جس نے جلد یا بدیر آنا ہے، اس کی آمد پر خوف زدہ ہونا خود کو قبل از وقت مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔''

وہ بہت قوی الاعصاب شخص تھا۔ اس کی سوچ پختہ اور نظریہ اٹل تھا۔ میں نے اس کی سربراہی میں دو مشن سرانجام دیے تھے۔ دونوں مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے سینے میں دل نہیں، پتھر دھڑکتا تھا۔ جذبات اور احساسِ ہمدردی اسے چھو کر نہیں گزرے تھے۔ اس نے مجھے بھی یہی برین بریفنگ دی تھی۔ ''شہریار! سرجن کے سامنے آپریشن ٹیبل پر ایک زندہ شخص لٹایا جاتا ہے اور اسے ٹارگٹ دیا جاتا ہے کہ اس کی چھوٹی آنت کا متاثرہ حصہ کاٹ کر پھینک دو۔ وہ نشتر اُٹھاتا ہے تو ہمدردی اور ترس جیسے جذبات کو ٹرے میں رکھ دیتا ہے۔ پھر بڑی بے دردی سے جلد کی تہیں کاٹنے لگتا ہے۔ خون اس کی نظروں کو سرخی نہیں دیتا اور نہ ہی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اگر اس کے دل میں خوف اور ترس جیسے جذبات اُمڈ آئیں تو اس کا تختۂ مشق سانسوں کی بازی ہار جائے، مر جائے۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''اگر میڈم یا میروشاہ مجھے ٹارگٹ دیں کہ فلاں شخص کا صبح کے سورج سے ناتا ختم کر دو تو میرے دل میں پیدا ہونے والا ہمدردی کا بادہ یا موت اور قانون کا ڈر مجھے کمزور کر دے گا۔ میں اسے قتل نہیں کر پاؤں گا۔ میں محاذ پر ہلاک کر دیا جاؤں گا یا ٹارگٹ دینے والے کی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

پیا نے مجھے میک اپ کی تربیت دینے کے بعد جیب تراشی کے فن میں بھی طاق کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے دھندے میں اس کام کی اہمیت بنیادی ہے۔ جیب کاٹنے کی ضرورت کسی بھی وقت پیش آ سکتی ہے۔

پیا کا اصل نام سراج الدین تھا۔ چھ فٹ کے قریب قد، کسرتی اور گٹھا ہوا بدن، بہ یک وقت نہایت مزاحیہ اور سرد مزاج...... اور بے تحاشا پھرتی اس کی شخصیت کا امتیازی خاصہ تھے۔ اس کے بقول، اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا جبکہ وہ میڈم اور میروشاہ کا معتمدِ خاص تھا۔

ایک دن مجھے کھالے کا خیال آیا تو میں نے پیا سے کہا۔ ''پیا جی! کھالے کو بھی ساتھ میں لے آیا کرو، وہ بھی کچھ سیکھ لے گا، کچھ گپ شپ بھی ہو جایا کرے گی۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''مجھے حکم دیا گیا کہ شہریار کی تربیت کرو، میں نے حکم کی تعمیل کر دی، جب میڈم یا شاہ جی کہیں گے کہ اس منہ زور مشکی گھوڑے کو بھی سدھا دو تو اسے بھی پکڑ کر یہاں لے آؤں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔''

''مگر میرا خیال ہے کہ میروشاہ اس میں انٹرسٹڈ نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں چونکا۔

''میروشاہ سے پوچھ لینا۔ وہی کچھ بتا سکے گا۔''

''کیا تم اپنے طور پر......''

''نہیں دوست! جس شخص کو گینگ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے، یہاں صرف اسے لایا جاتا ہے۔''

''کیا میں گینگ کا باقاعدہ ممبر بن گیا ہوں؟''

''ہاں! اب تمہارا جینا مرنا ہمارے ساتھ ہے۔''

''اور کھالا؟''

''ظاہر ہے، وہ ممبر نہیں ہے۔ جب بنے گا، تب دیکھا جائے گا۔''

''اگر میں گینگ میں نہ رہنا چاہوں تو؟''

''یہاں آنے کا راستہ مل جاتا ہے، جانے کا نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم جو بھی چاہو گے، تمہیں یہاں مل جائے گا۔ میڈم کا دل بڑا کشادہ ہے۔ لاکھ مانگو تو دو دیتی ہے۔ دو مانگو تو چار دیتی ہے۔ اگر کچھ عرصہ انڈر گراؤنڈ رہنے کو جی چاہے تو چھٹیاں دیتی ہے۔ ملک سے باہر بھیج دیتی ہے۔ سیر و سیاحت پر روانہ کر دیتی ہے مگر گروپ چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دیتی۔''

''تم نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو دھوکا دے گیا ہو؟''

''ایک آدمی کو دیکھا تھا...... مگر دھوکا دینے سے پہلے...... بعد میں کبھی نظر نہیں آیا کیونکہ اس کے فوری قتل کے احکامات میروشاہ نے جاری کر دیے تھے۔''

''کیا تمہیں اپنے کسی ساتھی کو قتل کرنے کا حکم ملا؟''

وہ مسکرایا۔ ''ابھی تک تو نہیں ملا۔''

''اگر تمہیں مجھ کو مارنے کا حکم ملے تو کیا کرو گے؟''

''کرنا کیا ہے؟ ایک ٹھاکا...... اور بس!'' اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو پستول بنا کر ہوا میں لہرایا اور مڑی ہوئی انگلی کا ٹریگر دبا دیا۔ میری گردن پر چیونٹی رینگی اور جھرجھری سی آ گئی۔

وہ بولا۔ ''شہریار! کبھی میڈم یا میروشاہ کو دھوکا مت

دینا۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔"

شاید اس دنیا کا یہی رواج تھا۔ میں چونکہ اس دنیا کا آدمی نہیں تھا اس لیے مجھے پیاجی کی باتیں بڑی عجیب لگیں۔

دل نے کہا۔ "نہیں شہریار! تم نے اپنی آنکھوں سے میڈم کو دیکھ رکھا ہے۔ وہ اتنی ظالم اور سفاک نہیں ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ محبت کرنے والے کبھی خون نہیں کرتے۔"

دماغ نے ٹہوکا دیا۔ "ارے واہ! اگر وہ اتنی ہی نرم خو ہوتی تو اتنا بڑا نیٹ ورک کیسے سنبھالتی۔ اتنی دولت کیسے اکٹھی کر لیتی۔ وہ جیسی دکھائی دیتی ہے، ویسی ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ پیا کہہ رہا ہے، یہی سچ ہے۔"

مجھے اسی کی زبانی پتا چلا کہ اسے بھی میری طرح میرد شاہ نے دریافت کیا تھا اور گینگ کے ایک ماسٹر مائنڈ نصر حیات نے اس کی تربیت کی تھی۔ نصر حیات پچھلے ماہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا ورنہ پیاجی کی جگہ پر وہ فارم ہاؤس کا انچارج ہوتا اور مجھے تربیت دے رہا ہوتا۔ چونکہ وہ گینگ کا اہم ستون تھا اور آدھے سے زیادہ ارکان کا استاد تھا اور بہت سے فنون میں یکتا تھا، اس لیے اس کے بیوی بچوں کی کفالت کی ذمے داری میڈم نے ازخود لے لی تھی۔

میرد شاہ نے مجھے دو ہفتے کا فری ٹائم دیا تھا۔ بیس دن گزرنے کو آ گئے تھے مگر اس نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی تھی۔ میں نے جب بھی اسے کال کی، اس نے کال 'بزی' کر دی۔ بعض اوقات تو میں اس کی بے رُخی پر جھنجلا جاتا اور پیا سے شکوہ کرتا۔ وہ کندھے اُچکا کر بڑی معصومیت سے جواب دیتا۔ "میں میرد شاہ سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ تم کر سکتے ہو تو ملنے پر کر لینا۔"

پیا نے ایک دن مجھے بتایا کہ میڈم شکیلہ دبئی سے واپس آ گئی ہیں۔ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کی عدم موجودگی میں اداس ہو گیا تھا بلکہ میں اتنے دنوں تک سوائے الٹی سیدھی ورزشوں کے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا اور اب شدید نوعیت کی بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے پروین کی تلاش میں نکلنا تھا۔ دنیا بہت بڑی تھی، میں کسی کلیو کے بغیر اس تک پہنچنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میڈم میری مدد کر کے مجھے اس تک پہنچا سکتی تھی اور اس سے ملنے کی بے تابی کے پیچھے یہی حقیقت تھی۔ میں چونکہ اس کی کوٹھی سے نکل آیا تھا اس لیے اب اس کے بلانے پر ہی وہاں جا سکتا تھا۔ وہ کب مجھ سے ملنا چاہے گی، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میرد شاہ مجھے اس سے ملوا سکتا تھا مگر ان دنوں تو خود میرد شاہ سے ملنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میڈم کی سرگرمیوں، شخصیت اور خاندان کے بارے میں کئی سوال کیے مگر پیا نے مجھے ٹال دیا۔ ایک مرتبہ جب میں نے میڈم کے پس منظر کے بارے میں اس سے استفسار کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔ "شہریار! ہماری میڈم جتنی خوب صورت ہیں، یقیناً ان کا بیک گراؤنڈ بھی اتنا ہی دل کش ہو گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

***

مجھے زندگی نے بیٹھے بٹھائے سب کچھ دے دیا تھا۔ خوب صورت گھر، ڈھیر سارا پیسا اور طاقت ...... مگر میں کسی بھی تعیش کے لمحے سے حظ کشید نہیں کر پایا تھا۔ تب پتا چلا کہ ائر کنڈیشنڈ کمرے میں، مخملیں بستر پر، جوانی کی رات کی آنکھوں میں نیند نہیں اُترتی اگر دل میں مسلسل کوئی کسک جاگتی رہے۔ والدین کے اندوہ ناک قتل کی چبھن پہلو میں کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی پروین کی عدم موجودگی اور چچا چچی کی اندوہ ناک موت مجھے کھلتی تھی۔ کبھی مجھے اپنی طاقت بھری جوانی پر ندامت محسوس ہوتی، کبھی اپنی بے بسی پر رونا آتا اور کبھی جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں اپنا ہوش بھی چھن جائے مگر جب میں شانو، فرد اور موجو کی طرف دیکھتا تو بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیتا اور سوچتا کہ ان کا اَب دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں رہا۔ وہ تینوں مجھ پر انحصار کرنے پر مجبور تھے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے ماضی میں پروین اور میں ان لوگوں کے دستِ نگر ہو کر رہ گئے تھے۔ میرا کوئی غلط اقدام ان کی زندگیوں کو چاٹ سکتا تھا۔

ایک دن میں فارم ہاؤس نہیں گیا تھا۔ تینوں کو لے کر شہر کی سیر پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاپنگ کرانے اور گھمانے پھرانے میں آدھا دن صرف کر کے جب ہم شام کو گھر پہنچے تو ڈرائنگ روم میں میرد شاہ کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بہت دنوں بعد مجھے ملا تھا۔

میں نے اسے رابطہ توڑ لینے کا شکوہ کیا تو وہ ہنس کر بولا "اڑے غنچے! کیا بولے ہے ملتے سمے؟ ماڑی جندگی (زندگی) ہی ایسی ہووت ہے کہ نہ رات کی خبر، نہ دن کا پتا...... بس چل سو چل......"

میں نے کہا "مگر تمہیں علم ہے کہ میں تمہاری عدم موجودگی میں بہت کمزوری اور بے چینی محسوس کرتا ہوں۔"

وہ بولا "نہیں غنچے! غلط بولے ہے تم...... مرد کا بچہ کمجور (کمزور) نہیں ہووت ہے۔ لوہے کے مافق ایک دم سخت...... کوئی پریشانی ہووے تو بولے، ابھی چٹکی بجانے میں حل ہووے ہے۔"

"نہیں...... پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی۔"

"اس حرام جادے پیاجی نے ماڑے غنچے پر کچھ محنت کی ہووت ہے کہ نہیں؟"

"ہاں! اس نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔"

"تم اپنا آگے کا پروگرام بتا دے مجھے۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "میں کیا بتاؤں، تم بتاؤ۔"

اس نے کہا۔ "وہ سالا حیدر خان...... چڑی کا بچہ...... بڑا جاگیردار بنت ہے سالا...... ایک دم بھڑک اُٹھے ہے۔ اپنی چنریا مانگت ہے، آگ لگانے کی دھمکیاں دیوت ہے اور اوپر سے ماڑی میڈم پر پریشر ڈالے ہووت پر وہ سالا نہیں جانت کہ میڈم نے جندگی (زندگی) میں کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہودیں......"

میں مداخلت کیے بغیر ہمہ تن گوش رہا وہ بولا۔ "اڑے غنچے! سالی دو کروڑ میں بکے ہے...... وہ سردار حیدر خان کی چنریا ہووت ہے...... ہاں! کوئی معمولی چھوکری تو نہ ہووت ہے بابا۔"

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ "دو کروڑ؟...... یعنی دو سو لاکھ روپے؟"

وہ بولا۔ "تو کیا پچاس رُپے میں رکھ دیویں کسی لاڈے کی تلی (ہتھیلی) پر...... اور تو اور...... جو سالا حیدر خان کو پارٹی کا ٹکٹ دیوے ہے ناں، ہر الیکشن میں...... وہی دو کروڑ لگا دے ہے۔ بولے کہ تھوڑے ہودیں تو اور بولے...... اور بولے...... پر چھوکریا کی بندیا پر میرا نام لکھ دیوت ہے میڈم جی!"

"کیا تم دلبر حسین کی بات کر رہے ہو؟"

"ہاں تو...... وہی سالا دلبر حسین...... حیدر خان بولے کہ وہ میرا دلبر یار ہووے، میرا جانی سجن ہووے...... اور دیکھت ہے کہ اس کا جانی سجن ہی اس کی جان کی قیمت لگا دے ہے......"

میں حیرت کے مارے گنگ بیٹھا تھا۔ دلبر حسین لاہور کے نواحی علاقے کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ پارٹی کے بڑوں کا خاص آدمی تھا اور ہمارے علاقے میں تمام پارٹی ٹکٹ وہی فروخت کیا کرتا تھا۔ حیدر خان کی یاری کا دم بھرتا تھا اور بارہا حویلی میں آ کے مہمان ٹھہرا تھا۔ سونے کی اینٹوں پر پیر رکھتا تھا، سونے کے برتنوں سے نوالا اٹھا کر منہ میں ڈالتا تھا بھی کروڑوں کی بولی لگاتا تھا۔ حیدر خان اس کا چمچہ تھا۔ اس کے لیے سیاسی راگ الاپتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ "کیا حیدر خان کو اس بات کا علم ہے؟"

وہ بولا۔ "نہیں...... لیکن ایک نہ ایک دن تو اس کے کانوں میں یہ بات پڑ جاوت ہے ناں پر پھر کیا کر لیوت ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ کپڑا ایک بار پہن لیا جاوے، سیب چکھ لیا جاوے یا چھوکری کے انگ انگ کو چھو لیا جاوے...... قیمت ایک دم ختم...... وہ سالا دلبر، حیدر خان سے بھی بڑا حرام جادہ (حرام زادہ) ہووے۔ اس جیسے کئی پلے اس جالم (ظالم) کے ڈیرے پر بھونکنے کی ورجش (ورزش) کرت ہیں۔"

بڑوں کی دنیا کا چلن میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ دلبر حسین بہ ظاہر تو حیدر خان کا یار تھا مگر اس کا باطن شیطان کی آماجگاہ تھا۔ پہلو گرم کرنے کے لیے وہ اس نمک کو بھی حرام کرنے میں عار نہیں سمجھتا تھا جو اس نے حیدر خان کی حویلی میں آ کر کئی مرتبہ چاٹا تھا۔

مجھے کھالے کا خیال آیا۔ جب اسے علم ہو گا کہ اس کی 'بی بی جی' کو میڈم نے کسی مستانے طلب گار کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، تو اس کا ردِعمل بڑا خوف ناک ہو گا۔ وہ بلاشبہ خان زادی اسما پر جان چھڑکتا تھا۔ شاید اس کی سلامتی کی خاطر ہی وہ اب تک خاموشی سے میرد شاہ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے کھالے کے بارے میں اپنے خیالات کو میرد شاہ کے ساتھ شیئر کیا تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر ایک دم ہنس پڑا، بولا۔ "اڑے غنچے! تم کو اس کالے ٹیٹ کا فکر نہ ہووت ہے...... سالا چڑی مار کا بچہ...... ایک دم پاگل ہووت ہے۔ اگر اس لونڈیا کے عشق میں وہ کوئی ہیکی پھیکی مارت ہے تو پھر اس کا دیجا (دیزا) لگ جاوت ہے...... اوپر کا......"

"وہ میرا دوست ہے شاہ جی......" میں نے ہونٹ کاٹے۔

"تو پھر اُس کو بول دیوت ہے کہ ماڑے رستے میں کبھی نہ آوت ہے۔ ٹھیک؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا، دل ہی دل میں سبھی پر چار چار حرف بھیجے اور میرد شاہ سے دریافت کیا۔ "شاہ جی! ان باتوں کو چھوڑ دو، یہ بتاؤ کہ میری بہن کا کیا ہوا؟ کیا تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی؟"

وہ بولا۔ "ماڑے لاڈے! ماڑے مخبروں نے بول دیوت ہے کہ تمہاری بہنا حیدر خان کے پاس نہ ہووت ہے...... وہ سالا خود بھی آگ بھبھوکا ہو کے چھوکری کو کھوجت ہے پر......" اس نے نفی میں سر ہلایا، پھر کہا۔ "ماڑی سمجھ میں نہیں آوے ہے کہ اس کو جمین (زمین) نگل

جاوت ہے کہ آسمان اٹھالیوت ہے۔ ملکہ رانی سے بھی میں نے بول دیوت ہے کہ یہ کام میرو شاہ کے بس کا نہ ہووت ہے، اگر تم تلاش کر لیوے تو کر لیوے......"

"پھر؟" میں نے آس بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ "پھر کیا کہا میڈم نے؟"

"مہارانی نے کچھ نہ بول کر دیوت ہے ماڑے کو...... بلکہ ماڑے غنچے! تم آج کی رات فارم ہاؤس میں جا کر سووت ہے، میڈم نے یہ حکم دیوت ہے......"

"مگر کیوں؟" میں نے اچنبھے سے کہا۔

"یہ تو ماڑے کو علم نہ ہووت ہے، یہ ضرور جانت ہے کہ ملکہ رانی کوئی بھی حکم ایسے ہی نہ دیوت ہے۔"

مجھ پر مایوسی کا حملہ ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ میری اب تک کی تمام ریاضت اکارت چلی گئی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "شاہ جی! اگر مجھے میری بہن نہ ملی تو میں کسی کام نہیں رہوں گا۔"

وہ جھٹ سے بولا۔ "نہیں ماڑے غنچے! اگر تم کسی کام کا نہ رہوے تو پھر بہنا بھی کبھی ملنے کی نہ ہووے ہے۔ یہ اپنے بھیجے میں سنبھال رکھ، میری نصیحت۔"

میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور سر جھکا لیا۔ جی چاہا کہ اڑ کر حیدر خان تک پہنچوں اور اس فرعون کا گلا دبا دوں۔ اس کی بے غیرتی نے جگ ہنسائی اور دوسری یتیمی کا بوجھ میرے کندھوں پر لادا تھا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میں حیدر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عیاری سے بولا۔ "اگر تم ایسے ہی جذباتی ہووت...... تو پھر یاد رکھ لیوت کہ وہ تمہارے کو زندہ نہیں چھوڑت ہے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں کچھ دیر تک میرا ذہن ٹھنڈا کرتا رہا، اونچ نیچ سمجھاتا رہا، پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔ "دیکھ ماڑے غنچے! تیاری کر لیوے، عقیل، وہ حرام جادہ بے جبان (بے زبان) مینڈھا، تمہیں لینے کو آ جاوے ہے، گھنٹا بھر کے بعد...... فارم ہاؤس پر لے جانے کو۔ تم گھر کی فکر نہ کرت، یہاں ماڑا گھوڑا فوجی رات کو دھیان کرت ہے گھر کا...... ٹھیک ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے گیٹ پر جا کر رخصت کر دیا۔ وہ پیدل تھا تبھی اسے مین روڈ پر جا کر رکشا پکڑنا تھا۔

عقیل مجھے نو بجے کے قریب فارم ہاؤس کی بیرونی پارکنگ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ فارم ہاؤس پر کئی نوکر کام کرتے تھے اور پیا جی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ان میں سے صرف دو ملازم یہاں مستقل رہائش پذیر تھے۔ وہ نہ صرف اس عمارت کی دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ فارم کی ملحقہ زرعی زمین پر کام بھی کرتے تھے۔

میں چونکہ گزشتہ کئی دنوں سے یہاں متواتر آ رہا تھا اور تمام دن یہیں گزارتا تھا اس لیے وہ مجھ سے بخوبی شناسا تھے۔ انہوں نے مجھے فارم ہاؤس کے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا جہاں میری شب بسری کا اہتمام پہلے سے کر دیا گیا تھا۔ ایک دیہاتی طرز کی بڑی چارپائی، روئی کا گدا اور بھاری لحاف دیکھ کر مجھے نور پور یاد آ گیا جہاں رات گزارنے کا صدیوں سے یہی انتظام کیا جاتا تھا۔ اس غیر معمولی بڑے کمرے میں سوائے اس ایک چارپائی کے کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ دیوار گیر الماریاں بھی خالی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں اڑھائی فٹ چوڑائی والا چوبی دروازہ اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک دبلا پتلا مگر طویل قامت نوکر میرے لیے چائے کا بڑا پیالہ تیار کر لایا۔ نہ اُس نے کوئی بات کی، نہ ہی میں نے کچھ کہا۔ جب وہ پیالہ اُٹھانے کے لیے دوبارہ کمرے میں آیا تو مودبانہ لہجے میں بولا۔ "بابو جی! اگر کسی چیز کی لوڑ (ضرور) ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔ میں اسی قطار کے آخری کمرے میں سوتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی، سرخ رنگ کا نائٹ بلب آن کیا اور لیٹ گیا۔ ذہن عجیب مخمصے میں الجھا ہوا تھا۔ اپنے یہاں بلائے جانے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ قریب ترین قیاس یہی تھا کہ میڈم کسی وقت یہاں آ کر مجھ سے ملنے کی خواہاں تھی۔ پھر خیال آیا کہ مجھ سے ملاقات کے لیے اُسے اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی؟ وہ مجھے اپنی کوٹھی میں بھی بلوا سکتی تھی۔ چاہتی تو میرے گھر میں بھی آ سکتی تھی۔ شہر سے دور، ویرانے میں مجھے شب بھر انتظار کرانے اور اسے تکلیف اُٹھانے کی بہ ظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی مگر میرو شاہ شاید ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس کی باتوں کو سمجھنے کے لیے اس کے جیسے شیطانی دماغ کا کھوپڑی میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔

"اچھا بھئی...... جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ فضول میں دماغ کھپانا خود کو تھکانے کا سبب ہے۔" میں بڑبڑایا اور لحاف میں دبک گیا۔ اچانک مجھے ایک غلطی کے سرزد ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے کوئی ہتھیار نہیں لیا تھا۔ گن نہ سہی، میں پستول تو اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔

یہاں شہر کی نسبت زیادہ سردی تھی۔ ہوا خاصی خنک تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ مجھے نیند نے آن دبوچا اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ جب سے میں پیا کی عملداری میں آیا تھا، بھرپور نیند لینے لگا تھا۔ وہ مجھے دن بھر میں اتنا تھکا دیتا کہ بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جایا کرتی تھیں۔

نجانے کیا وقت ہوا تھا، رات کس پہر میں تھی جب اچانک میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور بے ساختہ چارپائی پر اُٹھنے کی کوشش کی مگر مجھ سے اُٹھا نہ جا سکا۔ فوری طور پر مجھے احساس ہو گیا کہ میرے منہ پر کوئی ہاتھ جما ہوا تھا جس کی گرفت غیر معمولی حد تک مضبوط تھی۔ میں نے اپنا سر ادھر اُدھر مارنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نائٹ بلب آن کر کے سویا تھا۔ اب وہ بجھا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔

مجھ پر اپنا وزن ڈالنے والا جو کوئی بھی تھا، قوی الاعصاب تھا۔ میں نے اسے گھٹنوں کی ضرب پہنچانا چاہی تو لحاف آڑے آیا۔ میں نے بے ساختہ اپنے منہ پر جمے ہوئے ہاتھ کو ہٹانا چاہا۔ حملہ آور کی کلائی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا ہاتھ میرے منہ سے ہٹ گیا مگر اس کی دوسری کہنی پوری قوت سے میری پیشانی سے ٹکرائی۔ یہ ضرب بہت شدید تھی۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ دوسری ضرب اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اس کی کلائی میری گرفت سے چھوٹ گئی اور میرے منہ سے درد کے مارے آہ خارج ہو گئی۔

حملہ آور کا محض سایہ سا دکھائی دے رہا تھا جس سے اس کی پوزیشن اور جسامت کا علم نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاس مہلت کم تھی اس لیے اپنی تمام تر توانائیاں مجتمع کیں اور اس کی ٹانگوں کے بیچ ہاتھ ڈال کر اپنے اوپر سے دوسری جانب دھکیل دیا۔ اپنی کوشش کو بارآور کرنے کے لیے میں نے پوری قوت سے کروٹ بھی بدلی۔ وہ میری توقع کے عین مطابق میرے اوپر سے ہوتا ہوا دیوار کی جانب زمین پر جا گرا۔ مجھے سنبھلنے اور لحاف سے نکلنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔

چارپائی کے دونوں اطراف میں ہم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنا ایک پاؤں چارپائی کی بانہہ پر رکھا اور مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے وار سے بچنا چاہا مگر اس کے دونوں پیر کسی پتھر کی طرح میری چھاتی پر پڑے۔ میں چیخ کر کمر کے بل فرش پر جا گرا۔ وہ بھی گرا تھا مگر فوراً ہی سنبھل گیا اور اُٹھ کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ اس کے پیروں میں سخت قسم کے جوتے تھے جن کی ٹھوکریں میری پسلیوں میں آہنی راڈ کی طرح پڑیں۔ میں اپنی چیخوں پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ پے در پے ٹھوکروں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

اچانک میں نے اس کی ایک پنڈلی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ شاید پہلے سے تیار تھا کیونکہ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسری ٹانگ بھی ہوا میں بلند کی اور آن واحد میں اپنے پورے وزن کے ساتھ مجھ پر آن گرا۔ میرا پیٹ بری طرح پچک کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے سارا کھایا پیا حلق میں آ گیا ہو۔ میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی اور اس کی گردن پکڑ کر بھینچنے کی کوشش کی مگر وہ اسپرنگ کی طرح اُچھلا اور اس کی ایک کہنی میرے پیٹ اور چھاتی کے درمیان جبکہ دوسری میری ناف پر لگی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور میں حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا اور چالاک واقع ہوا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اپنے بائیں ہاتھ کا مکا اس کے سر کے عقبی حصے میں مارا۔ میرا ہاتھ نشانے پر لگا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے سر کے پیچھے کوئی حفاظتی پیڈ باندھ رکھا تھا کیونکہ میرے ہاتھ کو ہڈی کی سختی کے بجائے کسی نرم سی شے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ایک دم دونوں ہاتھوں اور پیروں کے بل ہوا میں اُچھلا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس پر بہ وقت نظریں مرتکز کیں اور ایک دم ساکت ہو کر اس کے وار کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسپرنگ کی طرح ہوا میں اُچھلا۔ مجھے ایک لمحے میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل مجھ پر گرنا چاہتا تھا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے کروٹ بدل گیا مگر پوری طرح اس کے وار سے محفوظ نہ ہو سکا۔ اس کا ایک گھٹنا میری کوکھ پر، ایک کہنی میرے کندھے پر جبکہ دوسرا گھٹنا اور کہنی فرش پر لگیں اور اس کے حلق سے مدھم سی آہ خارج ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر ہم بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

زندگی اور موت کا کھیل یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی بازی...... یہ تعین کرنا محال تھا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے سوتے میں خنجر یا پستول سے ہلاک کر سکتا تھا۔ کسی رسی کی مدد سے میرا گلا گھونٹ سکتا تھا۔ مگر شاید مجھے قتل کرنا اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ مجھے شکست دے کر اغوا کرنا چاہتا تھا یا زندہ رکھ کر کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی حالت میں اس کے ارادے نیک نہیں تھے اور مجھ پر اپنا بچاؤ لازم تھا۔ میں نے سر جھٹکا،

اس پر اپنی نظریں مرکوز کیں اور سوچ بچار کا عمل کسی فارغ وقت پر اُٹھار کھا۔

میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ناف پر لگنے والی کہنی کی چوٹ شدید تھی مگر یہ وقت درد کے احاطے کا نہیں تھا۔ وہ ایک ذرا پیچھے ہٹا اور ایک پیر پر گھوم کر مجھے زوردار لات رسید کی جو میرے بازو پر لگی۔ عین اسی جگہ پر سائیں دل جیت کے مزار کے احاطے میں ایک گولی ماس کو چھو کر گزری تھی۔ زخم ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس میں درد باقی تھا جو اس وقت ٹھوکر سے جاگ گیا تھا۔ میں نے مستعدی سے اس کا پاؤں پکڑا اور مروڑنا چاہا۔ میں اس کے وار کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے میں نے جونہی اس کا پیر پکڑا، وہ ہتھیلیوں کے بل نیچے گرا اور مرغ بسمل کی طرح تڑپا۔ اس کی موونگ کک میرے کان کے نیچے گردن پر لگی۔ اچانک جیسے سو والٹ کا بلب میری آنکھوں کے عین سامنے جل اُٹھا ہو اور میں تیورا کر نیچے گرا مگر میں نے یہ دھیان رکھ لیا تھا کہ اس کا پاؤں میری گرفت سے نکل نہ پائے۔ میرے جسم تلے اس کی ٹانگ کا مڑا ہوا گھٹنا دب گیا۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی تیز آواز نکلی اور اس کا اوپر والا دھڑ فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ بری طرح میرے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔

وہ دبلے پتلے اور نہایت لچکدار جسم کا مالک تھا۔ اس کا لباس خاصا موٹا اور چست تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ پہلو کے بل کمان کی طرح مڑا اور اس کا دو ہتھڑ میری کمر پر لگا۔ اس کے وار میں زیادہ جان نہیں تھی تبھی میری گرفت کمزور نہیں ہوئی۔ میں نے دانت پیس کر اس کی ٹانگ پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ تڑپا اور اس نے اپنے جسم کو گیلی شاخ کی طرح میری جانب جھکا دیا۔ میں فی الفور سمجھ نہیں پایا اور خطا کھائی۔ اس نے میرے سر کے بال اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیے۔ میرے منہ سے تیز سسکاری نکلی اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اس کی ٹانگ سے کھسک کر اس کی پشت پر جا گرا۔ میرے نیچے دبے ہونے کے باوجود اس نے پلٹا کھایا اور مجھے اپنے برابر میں فرش پر پٹخ دیا۔ میرا سر فرش سے ٹکرایا اور یوں لگا جیسے میرے ذہن نے یکبارگی کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ میں نے دو تین مرتبہ سر جھٹکا۔ کچھ اوسان بحال ہوئے مگر تب تک وہ میری پشت پر سوار ہو کر میری تھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا چکا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے دونوں ہاتھوں پر چمڑے یا سخت کپڑے کے دستانے چڑھا رکھے تھے۔ اس نے مخصوص انداز میں مجھے پیچھے کی طرف کھینچا، تب مجھے خطرے کا جانکاہ احساس ہوا۔ کسی بھی لمحے میری ریڑھ کی ہڈی کا کوئی مہرہ کھسک سکتا تھا یا 'کٹاک' کی خوف ناک آواز کے ساتھ ٹوٹ سکتا تھا۔ میں اور کھالا نور پور میں یہی داؤ خونخوار کتوں پر آزما کر ان کی ہڈی توڑ دیا کرتے تھے۔

میں نے سانپ کی طرح اپنی ٹانگوں کو لہرایا اور دونوں گھٹنے جوڑ کر اس کی کمر پر دے مارے وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے منہ کے بل گرا۔ اس کی چھاتی میرے سر سے ٹکرائی۔ ایسے ہی وقت میں، میں بجلی کی سی تیزی سے گھٹنوں کے بل اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر کے بل زمین پر گرا اور قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں کھینچ لیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر زمین پر گرا۔ اگر اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر بروقت ٹکا نہ لی ہوتیں تو اس کا چہرہ فرش سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتا۔ میں نے اسے اپنی جانب کھینچنا چاہا مگر اس نے کچھ اتنی پھرتی سے بل کھا کر مجھے چارپائی کی طرف گرا دیا کہ میں سنبھل ہی نہ پایا۔ میرا کندھا چارپائی کے موٹے سے پائے سے ٹکرایا۔ چوٹ خاصی شدید تھا۔ جلدی سے اُٹھنا چاہا مگر ڈگمگا گیا۔ دوسری کوشش میں پیروں پر کھڑا ہوا تو اس کی فلائنگ کک میرے دوسرے کندھے پر پڑی اور میں چارپائی پر سے ہوتا ہوا دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ شکر ہوا کہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا تھا ورنہ یہ وار فیصلہ کن ہوتا۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ اس ویرانے میں میرے حلق سے نکلنے والی کراہیں، چیخیں اور ہمارے لڑنے بھڑنے کی آوازیں بہت دور تک جا رہی تھیں مگر کوئی بھی میری مدد کو نہیں پہنچا تھا۔ شاید اس حملہ آور نے پہلے ان دونوں نوکروں کا کام تمام کیا تھا جو فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے، پھر میری جانب آیا تھا۔

میں دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے بیٹھنے کے سے انداز میں گرا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میری داہنی آنکھ پر کوئی دبیز چادر سی گری۔ میں نے آنکھ پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ بے اختیار کھسکتا ہوا پیشانی تک گیا۔ انگلیاں چپچپا گئیں۔ میری پیشانی سے خون بہہ رہا تھا جو آنکھوں کے آگے آ کر اندھیرا کرنے لگا تھا۔ میں نے بازو رگڑ کر بہتا ہوا خون صاف کیا تو میرے دشمن کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ شاید دا کمرے سے نکل بھاگنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ دیوار تک گیا، پھر دوڑتے ہوئے میری طرف

بڑھا۔ میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے کیونکہ میرے اور اس کے بیچ چارپائی حائل تھی اور وہ مجھ تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر ہوا میں جست لگائی اور دونوں ٹانگیں جوڑ کر چارپائی کی بانہہ پر فلائنگ کک جڑی۔ فرش پر چارپائی گولی کی سی تیزی سے پھسل کر دیوار کی طرف آئی اور میں بری طرح پس کر رہ گیا۔ چارپائی کی چوبی بانہہ میری چھاتی سے ٹکرائی تھی۔ ایک لمحے کو شاید میرا دل رک گیا تھا یا پھٹنے کو آ گیا تھا اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئیں۔ حلق سے آواز تک نہ نکل سکی اور میں ایک طرف ڈھلک گیا۔ چارپائی میرے وزن سے پیچھے کھسکی اور میں فرش پر بے جان انداز میں گر گیا۔ زیرک دشمن نے میری جان لینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی مگر شاید زندگی نے ابھی مجھے مہلت دے رکھی تھی اور میں بچ گیا تھا۔

وہ خود بھی کمر کے بل فرش پر گرا تھا اور شاید اسے بھی کوئی چوٹ آ گئی تھی کیونکہ کافی دیر بعد مجھے چارپائی پر پڑے ہوئے لحاف کے اوپر سے اُس کا سر دکھائی دیا تھا۔ تب تک میں لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتار کر، سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اور سینے کو سہلا کر خود کو ازحد سنبھال چکا تھا۔ مجھے باور ہو گیا تھا کہ میرا پالا کسی خطرناک لڑاکے سے پڑا تھا جو کسی بھی وقت میرا زندگی سے ناتا توڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر ہمت یکجا کی اور چارپائی کی بانہہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور بار بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔

اس نے شاید میری کمزوری بھانپ لی تھی، اس لیے الٹے قدموں عقبی دیوار کی طرف پہلے سے انداز میں گیا اور دوڑ کر میری طرف آیا۔ جونہی اس نے اپنے جسم کو ہوا میں اچھالا، میں نے چارپائی کو پوری قوت سے اس کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے دونوں پیروں کے بالائی حصے چارپائی سے ٹکرائے اور وہ منہ کے بل لحاف پر آن گرا۔ مجھ پر جھنجلاہٹ اور وحشت سوار تھی اس لیے میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اسے بانہوں میں بھر کر اس طرح ہوا میں بلند کر لیا کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوا میں لہرانے لگیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھ پر پہلی مرتبہ یہ راز منکشف ہوا کہ انتہائی سفاک اور خون ریز نبرد آزما وجود کسی مرد کا نہیں بلکہ وہ کوئی عورت تھی جو سرتاپا ترپال جیسے کھردرے اور سخت کپڑے میں ملفوف تھی۔

میں نے اپنی بانہوں کو کسنے میں پوری قوت صرف کر دی۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ منہ سے عجیب سی خرخراہٹ برآمد ہوئی اور اس نے اپنی ٹانگیں ہوا میں لہرا کر مجھے ضرب لگانی چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ میں نے اپنا سر بڑی ہوشیاری سے اس کی رانوں کے بیچ گھسیڑ دیا تھا۔ میں نے بانہوں کو ایک جھٹکا دیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''کون ہو تم؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر جھٹکا دیا۔ اس کا جسم یکبارگی تڑپا اور اچانک ساکت ہو گیا۔ وہ غالباً بے ہوش ہو چکی تھی۔ چند لمحے انتظار کے بعد میں نے اپنی بانہیں کھول دیں۔ وہ لحاف پر سر کے بل گری اور فرش پر لڑھک گئی۔ تب میں چارپائی کا چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچا اور چاہا کہ اس کے دل کی دھڑکن چیک کروں، اچانک میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کم بخت کا فولادی مکا میری ناک پر پڑا تھا اور میں کمر کے بل فرش پر گر کر چت ہو چکا تھا۔ میں اس کے چکر میں آ گیا تھا۔

میری ناک سے خون بہہ نکلا تھا جس کا مجھے اس وقت ادراک نہیں ہوا تھا۔ بارہا سر جھٹکا، خود کو سنبھال کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر سر چکرا گیا۔ اسے سنبھلنے کے لیے مہلت مل چکی تھی۔ تبھی اس نے مجھے اٹھنے سے پیشتر ہی پے در پے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہارڈ سول شوز کی ہر ضرب پر میں جھنجھنا اُٹھتا اور میرے حلق سے چیخ نکل جاتی۔ میں نے اس کا پیر گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا وہ مجھ پر غالب آ چکی تھی۔

میں نے ایک دھوکا کھایا تھا اور بھیانک سزا پائی تھی۔ اپنی بقا کی فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کرتے ہوئے اپنی بچی کھچی ہمت مجتمع کی اور اچانک کھڑا ہو گیا اور کسی دیوانے کی طرح اس پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ غافل نہیں تھی جس کی وجہ سے اس نے نہایت معقول جواب دیتے ہوئے میری کنپٹی پر زوردار پنچ مارا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں نے اسے مکوں، تھپڑوں اور برہنہ پیروں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اسے شاید اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی یا اس نوع کی دیہاتی لڑائی سے اُس کا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ چند ہی لمحوں میں پسپائی اختیار کرتے ہوئے دیوار سے جا لگی اور گھسٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے مدافعانہ انداز میں اپنا چہرہ اور سر بانہوں میں چھپا لیا تھا۔

مجھے ایک مرتبہ پھر محسوس ہوا کہ اس کی مزاحمت دم توڑ چکی ہے مگر میں کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑیں اور پوری قوت سے مروڑ دیں۔ وہ تڑپ کر آگے ہوئی تو میں نے اسے گھمایا اور مڑی

ہوئی باہیں اس کی کمر سے لگا کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ اس خطرناک داؤ سے نہ تو نکل سکتی تھی اور نہ ہی کوشش کر سکتی تھی کیونکہ اس کی معمولی سی حرکت سے اس کے کندھوں کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل کر ناکارہ ہو جاتے۔

اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور ہار کر تھم گئی۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ آہنی شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ میں نے مخصوص انداز میں کلائیوں کو تھوڑا اور مروڑا تو اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ میں نے کئی مرتبہ یہی حرکت کی اور سنگدلانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ تم نے نہیں بتایا تھا۔ اب تم بتانا چاہو گی مگر میں پوچھوں گا نہیں......''

وہ بہت ڈھیٹ تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی بلکہ اپنے طور پر میرے 'ڈیڈ لاک' سے نکلنے کی کوشش کرتی رہی۔ ناکام ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے ہی وقت میں، میں نے پھر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اس کے حلق سے سسکاری نکلی اور وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ ''مجھے چھوڑ دو ورنہ میرے بازو ٹوٹ جائیں گے۔''

میں اسے جکڑے ہوئے، اندازے کے مطابق دیوار پر سوئچ بورڈ تک گیا۔ ٹٹول کر ایک ہی لائن میں لگے ہوئے کئی بٹن پش کر دیے۔ نائٹ بلب، ٹیوب لائٹ اور سیلنگ فین آن ہو گئے۔ جلدی سے سیلنگ فین کا بٹن آف کیا۔ اس دوران میں نے اس پر سے ایک لمحے کو بھی اپنی توجہ نہیں ہٹائی تھی۔ وہ بہت چالاک تھی اور موقع سے فائدہ اٹھانے کے ہنر پر دسترس رکھتی تھی۔ کمرا روشن ہو گیا لیکن کئی ثانیوں تک آنکھیں چندھیائی رہیں جس کے باعث مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جب منظر کھلا تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ وہ گہرے سیاہ رنگ کے موٹے اور چست لباس میں پوری طرح سرتاپا چھپی ہوئی تھی۔ لباس ایسا تھا کہ آنکھوں کے علاوہ سارا بدن چھپا ہوا تھا۔ اس نے پاؤں میں سخت سول والے سیاہ لانگ شوز پہن رکھے تھے۔ روشنی میں اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز چیخ چیخ کر اس کے پُرشباب اور بڑی بھرپور عورت ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

میں اسے دھکیلتا ہوا چارپائی تک لے گیا اور نہایت سرد لہجے میں بولا۔ ''اگر زندگی درکار ہے تو کوئی مستی نہ کرنا ورنہ اپنا ہاتھ تب تک نہیں روکوں گا جب تک تمہاری سانس چلتی رہے گی۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دھکا دے کر لحاف پر اوندھے منہ گرا دیا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے مگر اس نے ہاتھ سیدھے نہیں کیے بلکہ کمر پر رکھے بے حرکت ہو گئی۔

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میری قمیص خون سے تر ہو چکی تھی۔ پیشانی اور ناک سے بہنے والا خون شاید رُک گیا تھا مگر تکلیف کا شدید احساس رگ و پے پر مسلط تھا۔ دیوار پر نظر دوڑائی۔ کہیں آئینہ نظر نہیں آیا۔ باتھ روم میں جا کر آئینہ دیکھنے اور منہ ہاتھ دھونے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ حرافہ ہوش و حواس میں تھی اور میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر پھر بھوکی بلی کی طرح مجھ پر حملہ کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی ناک اور پیشانی کو قمیص کے پلو سے صاف کر دیا۔

اس کا نہایت اسمارٹ وجود سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ شاید ہار مان چکی تھی یا اس وقت کو غنیمت جان کر خود کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔ میں چارپائی کی بانہہ سے گھٹنے ٹکا کر اس پر جھک گیا۔ لباس میں آنکھوں کی جگہ پر موجود دو گول سوراخوں میں جھانکا تو پتا چلا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کے سر کے عقبی حصے میں دکھائی دینے والے ابھار کو پکڑا۔ اس نے بالوں کو اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں یہیں باندھ رکھا تھا۔ میں نے جوڑے کو مٹھی میں لے کر اس کا سر اُٹھایا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔ آنکھیں بہ دستور بند رہیں۔ میں نے اس کے لباس کا جوڑ دیکھنے کی کوشش کی تاکہ اس کا چہرہ ننگا کر سکوں مگر کامیاب نہیں ہوا۔ یہ عجیب الوضع لباس میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے اس میں گھسی کس طرح تھی...... میں نے اُسے سیدھا کیا۔ ٹٹول کر دیکھا تب پتا چلا کہ ایک زِپ ناف سے شروع ہو کر نرخرے تک چلی گئی تھی، پھر دائیں ہاتھ مڑ کر گردن کا چکر کاٹتی ہوئی عقب میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بکل کو کھینچ کر زِپ کو نرخرے تک کھول دیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ گردن پر رکھ دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غیر معمولی حد تک شفاف تھیں۔ ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں اُتری۔ ''بس کرو ناں......''

میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا، ذہن بھک سے اُڑتا ہوا محسوس ہوا اور میرے ہاتھ جہاں کے تہاں تھم گئے۔ مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا تو میں نے دانت پیس کر اس کے سر سے کنٹوپ نما کیپ کھینچ لی۔ موٹے سیاہ لباس میں کوئی اور نہیں، میڈم شکیلہ تھی جو اس وقت ستائشی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

''میڈم! آپ؟''

میری حالت غیر ہوگئی۔ یوں لگا جیسے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

وہ تھوڑا سا پرے کھسکی اور کنٹوپ کو سر کے پیچھے دھکیل کر بولی۔ ''ویل ڈن! آئی فیل میکنگ لو ٹو یو شہریار!''

میں بے ساختہ چارپائی سے اُترا اور دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہوگیا۔ میری حیران آنکھیں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور میں سوچ میں غلطاں تھا کہ یہ اس نے کیا حرکت کی تھی؟ کیا اس نے محض میرا امتحان لیا تھا یا...... وہ کچھ اور چاہتی تھی؟

میں نے آہستگی سے کہا۔ ''میڈم! آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اگر آپ کو کوئی چوٹ لگ جاتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔''

وہ اپنے بازو سہلانے لگی۔ ایسے میں وقتاً فوقتاً وارفتگیٔ شوق سے کن انکھیوں سے مجھے بھی دیکھ لیتی پھر ایک دم اُچھل کر چارپائی سے اُتری اور میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ میرے بازوؤں کو پکڑا، تھوڑا دبایا اور سہلانے کے سے انداز میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوری وسعت میں دیوار کے ساتھ پھیلا دیے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ مجھ سے چپک سی گئی تھی۔ اس کا سیاہ لباس میں پوشیدہ بدن مجھ پر اپنا پورا وزن ڈال چکا تو اس کی آواز میرے کانوں میں اُتری۔ ''پیانے سونے کو کندن بنا دیا ہے۔''

میں بے جان انداز میں دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا اور وہ سرسراتی ہوا کی طرح مجھ سے اٹکھیلیاں کرنے میں مشغول تھی۔ اس کے قرب نے میری سانسوں کو غیر معتدل کردیا۔ میں نے کہا۔ ''میرے کپڑوں پر خون لگا ہے، آپ کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں......''

وہ بولی۔ ''کوئی بات نہیں۔ مجھے ایسے ہی پرجوش اور توانا خون کی ضرورت ہے۔''

''آپ کچھ دیر آرام کرلیں، میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔''

اس نے مجھے آزاد کردیا اور گھوم گئی، بولی۔ ''جاؤ! منہ ہاتھ دھولو۔''

میں باتھ روم میں گیا۔ واش بیسن کے اوپر دیوار میں نصب بڑے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میڈم کی دی ہوئی چوٹوں نے میری ڈرائنگ خاصی بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ ماتھے پر دو بڑے بڑے گومڑ دکھائی دیے۔ ایک جگہ جلد پھٹ گئی تھی۔ جہاں سے خون رس رہا تھا۔ میری مونچھیں اور آدھا چہرہ ناک سے بہنے والے خون سے سرخ ہوگیا تھا۔ ناک سوج کر موٹی ہوگئی تھی جس کے باعث شکل عجیب مضحکہ خیز انداز اختیار کرگئی تھی۔ ایک کان بھی سرخ تھا۔ کان پر اس پنج گرز کی طرح لگا تھا۔ خون تو نہیں نکلا تھا مگر کان کی رنگت بتا رہی تھی کہ بدن کا شاید آدھا خون کان میں اکٹھا ہوگیا تھا۔

میں نے خون میں بھیگی ہوئی قمیص اُتار دی۔ شکر کیا کہ بنیان صاف تھی۔ ہاتھ منہ دھوئے، بازو صاف کیا اور شلوار کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ کمرے کا فرش گرد آلود نہیں تھا ورنہ شلوار کا بھی ستیاناس ہو چکا ہوتا۔ بالوں میں کنگھی پھیری تو ہر بال کی جڑ دکھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی بے رحمی سے میرے بالوں کو نوچا تھا۔ اپنی ممکنہ حد تک نوک پلک سنوار کر جب میں کمرے میں آیا تو اسے کمرے کی عقبی کھڑکی میں کھڑے دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے اندھیرے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

میں نے سونے سے پیشتر چارپائی کے ساتھ جوتے اُتارے تھے جو اس وقت مختلف پوزیشنز میں مختلف جگہوں پر پڑے تھے۔ جوتے پہن کر اس کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''شہریار! زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟''

میں بولا۔ ''نہیں...... ہاں...... آئی تو ہیں مگر سیریس نہیں ہیں۔''

وہ بولی۔ ''کیا ایک اور فائٹ ہوجائے؟''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں میڈم!''

''کیوں؟'' وہ شوخی سے بولی۔ ''کیا ڈر گئے ہو؟''

''جی! مجھے اگر اندازہ بھی ہوجاتا کہ یہ آپ ہیں تو میں آپ پر ہاتھ نہ اُٹھاتا۔''

''وہ کیوں؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔

میں نے جواباً کچھ نہیں کہا تو وہ پلٹ کر میرے قریب آئی، شوخ انداز میں بولی۔ ''زپ کھولنا چاہتے تھے ناں؟ لو...... اب کھول دو......''

اس نے سیاہ لباس کے نیچے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ جونہی مجھے اس کے حکم اور اپنی خواہش کے انجام کا اندازہ ہوا، بری طرح نروس ہوکر بولا ''وہ...... جی وہ تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مجھ پر اتنی رات گئے کس نے حملہ کیا ہے......''

''اب تو دیکھ لیا ہے...... اور دیکھ لو......''

اس نے جونہی زپ کا بکل پکڑا، میں ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ وہ پس پشت ہوکر اوجھل ہوگئی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی تھیں؟''

''ہاں! میں اسے باہر سے کھول سکتی ہوں۔''

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟ نقصان بھی تو ہوسکتا تھا۔''

''کیا تم مجھے مار ڈالتے؟''

''نہیں...... میں آپ کے ہاتھوں مر سکتا تھا۔''

''تو کیا ہوا؟ کیا تم دنیا کے پہلے انسان ہوتے جو قتل ہوتا؟''

''نن...... نہیں مگر......'' میں گڑبڑا گیا۔

''تم نے بڑی مہارت سے اپنا دفاع کیا ہے، میں خوش ہوئی ہوں۔'' اس کا لہجہ توصیف سے لبریز تھا۔ ''تم نے ایک غلطی کی تھی۔ کسی بھی حالت میں تمہیں اسلحے کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہماری دنیا کا ایک عام اصول یہ بھی ہے کہ کسی بھی شخص پر، خواہ وہ کتنا ہی ہمدرد اور بہی خواہ کیوں نہ ہو، اعتماد نہ کیا جائے۔ آئندہ ایسی کوتاہی نہ کرنا ورنہ بہت بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔''

''میڈم! کیا آپ واقعی میرا امتحان لے رہی تھیں؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! دیکھ رہی تھی کہ تمہارے خوب صورت بدن میں کتنی بجلی بھری ہوئی ہے۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ پیانے تم پر کتنی محنت کی۔''

''وہ تو آپ نے تب بھی دیکھ لیا تھا جب میں اور کھالا دست و گریباں ہوئے تھے۔''

''ہاں مگر وہ کوئی فائٹر تو نہیں تھا۔ عام سا لڑاکا تھا۔'' وہ میرے عقب میں آگئی اور اس نے میرے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر مجھے بانہوں کے شکنجے میں لے لیا۔ میرے شانے پر چہرہ ٹکا کر سرگوشی کرنے لگی۔ ''میں جوانی سمیت دنیا کی ہر شے خرید سکتی ہوں۔ مگر آج تک ایسا دوست ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہی ہوں جس کا وجود پھول سی نرمی اور گداز رکھتا ہو، آگ کی تپش اور گولی کی سی تیزی بھی رکھتا ہو، وہ شہ سورما ہو مگر باوفا بھی ہو...... جان لینا اور دینا جانتا ہو...... وہ سب کچھ ہو...... مجھے جو ملتا تھا وہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جو سب کچھ ہوتا تھا وہ میری دسترس میں نہیں آتا تھا۔''

میں کان لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم کیسے ہو؟ کیا تم بالکل ویسے ہو، جیسے کی مجھے تلاش ہے یا مختلف ہو؟ ......یہ امتحان اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔''

اس کا جسم مجھے چھو نہیں رہا تھا۔ ترپال جیسے مضبوط اور موٹے کپڑے کی تہ ہمارے بدنوں کے بیچ میں حائل تھی مگر میرا احساس اس کے لمس سے مل کر جسم کو دہکانے لگا تھا۔ دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے؟' میں نے سوچا اور گھبرا کر اس کے ملفوف ہاتھوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں ناں......''

وہ، خالدہ عرف بلو نہیں تھی جسے میں بے دردی سے جھٹک دیتا اور وہ سہم کر پرے ہٹ جاتی۔ وہ غزالہ نہیں تھی جس سے لپٹ جاتا اور وہ دامن چھڑا کر بھاگ جاتی۔ وہ میڈم تھی، وہ مالکن تھی جبکہ میں عمومی نوعیت کا ایک زیرِ بار شخص...... وہ چاہتی تو مجھے تمام رات ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کا حکم دے سکتی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کرتا...... میں نے کہا۔ ''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے میڈم! اگر آپ مجھے تھوڑا......''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''جھوٹ نہ بولو۔''

میں چپ ہوگیا۔ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا مگر مجھ میں تردید کی تاب نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا نوکروں کو آپ نے کہیں بھیج دیا ہے؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' وہ چونکی۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی ذہنی رو بدل دی تھی۔

''انہوں نے ہماری چیخوں پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، تبھی حیرت ہو رہی تھی۔''

''وہ میرے حکم پر خاموش ہیں۔'' وہ بولی۔ ''تالی بجاؤں گی تو دروازے پر آجائیں گے۔ کیا انہیں بلاؤں؟''

میں نے 'جی' کہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھولے، تالی بجائی مگر آواز برآمد نہیں ہوئی۔ اس کے ہاتھ عجیب وضع کے لباس میں چھپے ہونے کی وجہ سے بس 'دھپ، دھپ' کی مدھم سی آواز پیدا ہوئی۔ وہ ہنسی اور اپنی جلترنگ کے بیچ بولی۔ ''مجھے خیال ہی نہیں رہا...... اچھا! تم تالی بجاؤ۔''

میں نے تالی بجائی۔ چند لمحوں بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میڈم نے اپنا وزن سنبھال کر مجھے آزاد کردیا۔ میں دروازے تک گیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں میڈم کی اجازت حاصل کی اور چٹخنی اُتار دی۔ دروازے پر طویل قامت نوکر کھڑا تھا۔ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''میڈم جی کتھاں نے؟''

(میڈم کہاں ہیں؟)

میں نے ہاتھ کا اشارہ میڈم کی طرف کیا۔ میڈم تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''شہریار کے لیے نیا لباس اور چائے لاؤ اور میرے لیے کافی۔''

وہ پلٹ کر اوجھل ہوگیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے

ایک ڈارک بلیو کلر کی جینز کا ٹراؤزر اور اسکائی بلیو ٹی شرٹ لا کر چارپائی پر رکھ دی۔ میڈم سے دریافت کناں ہوا۔ ”میڈم جی! آپ کا لباس بھی لے آؤں؟“

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے حکم کی تعمیل کردی۔ میڈم نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ باہر آئی تو سراپا قیامت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا سفید چمکدار پستول بھی نظر آیا جو اس نے گریبان میں ڈال لیا۔ اس پر اورنج کلر کی کڑھائی دار تنگ قمیص، میچنگ ریڈ پاجامہ اور دوپٹا، پاؤں میں سلم ٹو لیدر بوٹ...... لباس دیدہ زیب تھا یا اُس پر آ کر جچ گیا تھا، میں یہ طے نہ کر پایا۔ نرم و گداز ہاتھوں پر تحیر آلود نگاہ ڈالی۔ دیکھنے میں گلابوں سی نزاکت رکھنے والے ہاتھوں کی حشر سامانیاں کچھ دیر قبل دیکھ چکا تھا۔ اگر اس فائٹ کے پیچھے کم و بیش بیس دنوں کی پیاجی کی مشاقانہ تربیت نہ ہوتی تو میں اس وقت اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ سرتاپا، سراپا حیرت تھی۔ اگر ایک زمانہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا تھا تو یہ اُسی کا کمال تھا۔

وہ میری غیر معمولی محویت پر فاخرانہ انداز میں مسکرائی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے باتھ روم کی راہ دکھائی۔ میں شرمسار ہو کر باتھ روم میں گھس گیا۔ لباس دیکھنے میں نیا تھا۔ ٹراؤزر اور ٹی شرٹ مجھ پر فٹ آئے۔ اس دوران میں نوکر کمرے میں آیا اور ایک عموی نوعیت کی کرسی کمرے میں رکھ گیا کیونکہ جب میں باتھ روم سے نکلا، میڈم اپنے کرو فر کے ساتھ کرسی پر براجمان تھی۔ اس نے عام سے انداز میں مجھے دیکھا اور آنکھوں سے 'او کے' کا سگنل دے دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملازم ٹرے میں دو بڑے سائز کے مگ رکھ کر لے آیا۔ ایک میں چائے تھی، دوسرے میں میڈم کی فرمائش کے مطابق بلیک کافی تھی۔

میں نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور ادب سے کہا۔ ”میڈم! مجھے آپ کی عدم موجودگی بہت فیل ہوئی۔“

وہ مسکرائی۔ ”کیوں؟“

”ویسے ہی۔“

”تم اپنی بہن کے لیے پریشان ہوگے، ہے نا؟“

”جی میڈم! مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

وہ تمکنت سے بولی۔ ”میرو شاہ نے مجھے رپورٹ دے دی ہے۔ ہم بھی پریشان ہیں کہ اسے کون کہاں لے کر غائب ہو گیا ہے۔“

مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ میڈم جادوئی انداز میں ہاتھ ہلائے گی اور اس کے کارندے آن کی آن میں پروین کو میرے سامنے لا کھڑا کردیں گے۔ اس نے میرے چہرے پر ہویدا ہونے والے تاثرات کو بھانپ لیا اور بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ حیات خان کے بیٹے کا داؤ چل گیا تھا اور وہ تمہاری بہن اور عشرت کو لے کر کہیں رفو چکر ہو گیا۔ کیا تم اس کے دوستوں کے بارے میں جانتے ہو؟ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ کوئی ایسا دوست جس کے ہاں پہنچ کر وہ خود کو بالکل محفوظ خیال کرے؟“

میں نے اپنا ذہن دوڑایا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولی۔ ”عشرت کا کوئی دیوانہ......؟“

میں نے کہا۔ ”ایک فوجی ہے...... مظفر گڑھ کے ایس پی کا بیٹا...... شاہد سلیم۔ عشرت اس میں دلچسپی لیتی ہے۔“

”سلیم شہزاد کا بیٹا؟“ وہ تعجب سے بولی۔

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! آپ اسے جانتی ہیں؟“

اس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”مگر وہ اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ خان کی بیلے والی حویلی تک پہنچنا ہی بڑا دل گردے کا کام ہے۔“

وہ ایک ذرا مسکرائی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”تم کہتے ہو کہ وہ عشرت کا دیوانہ ہے۔ وہ اگر عشق کرتا ہے تو پھر بیلے اور بندوق سے کہاں ڈرتا ہوگا۔“ کچھ دیر تک متوقف رہی، پھر گویا ہوئی۔ ”ہاں شہریار! اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ ہے...... وہ خود آرمی آفیسر ہے...... جوان ہے اور سب سے بڑی بات کہ بقول تمہارے، عشرت اس میں دلچسپی لیتی ہے...... تو پھر وہ یقیناً اس اوکھلی میں سر دے سکتا ہے۔“

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، کہا۔ ”آپ سلیم شہزاد کو جانتی ہیں، بہ آسانی تسلی کر سکتی ہیں۔“

وہ حتمی انداز میں بولی۔ ”نہیں...... یہ کام تمہی کو کرنا ہوگا۔“

اس نے درست کہا تھا۔ وہ بہت مصروف زندگی گزار رہی تھی اور اپنے معاملات کو بخوبی سمجھتی تھی۔ وہ بولی۔ ”دیکھو ڈیئر! اب تم میری ٹیم کا حصہ ہو۔ میری ٹیم میری حفاظت کرتی ہے نہ کہ میں اپنے کارکنوں کی باڈی گارڈ بن کر محدود ہو جاؤں۔ جس طرح دوسرے لوگ میرے حکم پر دنیا کو تہس نہس کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اسی طرح تمہیں بھی میرے حکم کا انتظار کرنا ہوگا اور ہاں! گھر پسند آیا؟“

میں نے متشکرانہ انداز میں کہا۔ ”جی میڈم! میں آپ کا احسان مند ہوں۔“

”یہ خاصا محفوظ مکان ہے۔ یہاں تمہارا خاندان شاد آباد رہے گا۔ کسی چیز کی کمی محسوس کرو تو میرو شاہ سے کہہ دینا۔ وہ تمہاری بہت فیور کرتا ہے۔ رہا معاملہ تمہاری بہن والا...... تو تم اب خود طاقتور ہو۔ شہ زور ہو۔ جسے چاہو، اپنے ساتھ ملا لو اور اُسے تلاش کرو۔ میں پیسا، اسلحہ اور بازو تمہارے حوالے کر سکتی ہوں...... بیک بون ڈیفنس بھی...... او کے؟“

میں نے کہا۔ ”او کے میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔“

”یو مین آئی ایم نائس لیڈی؟“

”یس میڈم!“

وہ ایک ذرا مسکرائی، موتیوں جیسے خوب صورت دانتوں کو نچلے ہونٹ پر دائیں بائیں رگڑا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا کر بولی۔ ”اِف آئی ایم نائس، دین کس می ڈیئر...... کم آن!“

اب تک میری جھجک خاصی کم ہو چکی تھی۔ میں نے قدم بڑھایا، قریب پہنچ کر جھکا اور ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ عقیدت کا بوسہ نسبتاً طویل ہو گیا۔ اس نے بھی ہاتھ نہیں کھینچا۔ میں نے سر اُٹھایا مگر اس کا گداز ہاتھ نہیں چھوڑا اور اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ بھانپ لیا کہ اس نے میری گستاخی کا بُرا نہیں منایا تھا۔ میں نے پھر ہاتھ چوم لیا۔ اس کی مترنم ہنسی کمرے میں گھنٹیوں کی طرح بج اُٹھی۔

میں جونہی ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹا، وہ بولی۔ ”انسان کمپیوٹر نہیں ہوتا۔ یہ وہ آؤٹ پٹ بھی دیتا ہے جو اسے ان پٹ کی صورت میں نہیں ملی ہوتی۔ تم نے ایک بوسہ میرے حکم کی تعمیل میں لیا، دوسرا بوسہ اپنے ہونٹوں کی طلب پر...... کیا میں نے درست کہا ہے؟“

میں نے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ ”جی میڈم! مجھے اندیشہ تھا کہ تاخیر کو گستاخی شمار نہ کیا جائے ورنہ سر اُٹھانے کی تاب نہیں رہی تھی۔“

وہ منہ سے کچھ نہ بولی مگر اس کی آنکھوں نے سمجھا دیا کہ اس نے میری جسارت کو قبول کر لیا تھا۔

وہ بولی۔ ”اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو جا کر سو جاؤ۔ مجھے بھی واپس جانا ہے۔“

”اس وقت؟“ میرے منہ سے تعجب بھرا کلمہ نکلا۔

”ہاں...... ابھی تو بہ مشکل ایک بجا ہوگا۔ خیر! کسی کو بلاؤ۔“

میں دروازے تک گیا۔ برآمدے میں جھانکا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نوکر کو آواز دی۔ وہ فوراً کمرے سے نکل کر

میری طرف آیا اور دروازے پر رُک گیا۔ سینے پر مخصوص انداز میں ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”جی سائیں! میڈے لائق کوئی خدمت ہووے تاں ڈساوو......“

وہ میرے عین مقابل کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں، برآمدے کی روشنی کے پار گھپ اندھیرے میں، کوئی سوفٹ کے فاصلے پر ایک شعلہ سا چمکا۔ عین اُسی لمحے میرے سامنے کھڑا ہوا نوکر لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرایا اور رات کے سناٹے کا راج فائر کی خوف ناک آواز نے توڑ دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہیں ہوئی کہ شعلہ کسی گن کی نال نے گولی کے ساتھ اگلا تھا اور گولی مجھ سے ٹکرانے والے ملازم کی پشت میں گھس گئی تھی۔ اسے چیخنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کی پشت پر عین دل کے مقام پر خون کا فوارہ سا اُبل کر کپڑوں کو تر کرنے لگا تھا۔

برآمدے کے کچھ باہر تک روشنی تھی۔ اس کے پار گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے گولی چلانے والا دکھائی نہیں دیا تھا، نہ ہی وہ دکھائی دے سکتا تھا۔ میڈم اس دوران اُٹھ کر میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ تیز لہجے میں بولی۔ ”اسے چھوڑو، اپنی فکر کرو۔ گولی کس طرف سے آئی ہے؟“

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”لان کے پار سے، غالباً چار دیواری کے اوپر سے چلائی گئی ہے۔“

وہ ’کم آن‘ کہہ کر چھلاوے کی طرح اُچھلی، عقبی کھڑکی میں جا کر ایک لمحے کو رُکی پھر باہر کود گئی۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ کھڑکی کے باہر فارم ہاؤس کا پچھواڑا تھا۔ دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر پانچ چھ فٹ بلند دیوار تھی۔ کمرے اور دیوار کے بیچ اونچی نیچی، گھاس والی سخت زمین تھی۔ ایسے ہی وقت میں دوسرا فائر ہوا۔ ایک تیز چیخ فضا میں بلند ہوئی اور کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی میڈم رُک گئی۔ مدھم مگر تحکمانہ آواز میں بولی۔ ”دیوار کے پار چلو...... اس طرف خطرہ ہے۔“

میں نے جست بھری اور چار دیواری کی طرف بڑھا۔ وہ میرے عقب میں تھی۔ دیوار پر سے چھلانگ لگانے کے بعد ہم دونوں دیوار کی جڑ میں دبک گئے۔ رات کے اس سناٹے میں بھاگتے قدموں اور نہ سمجھ میں آنے والی آوازوں نے اپنا تسلط جما لیا۔ تیسرے فائر کی آواز نسبتاً قریب سے سنائی دی۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”یہ کون ہوسکتے ہیں؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ہمہ تن گوش بیٹھی رہی۔ میں نے پنجوں کے بل اُٹھ کر بڑی احتیاط سے دیوار کی منڈیر سے کھلی کھڑکی والے کمرے میں دیکھا۔ مجھے ایک شخص عین کھڑکی میں کھڑا دکھائی دیا۔ چونکہ ٹیوب لائٹ اس کے عقب میں روشن تھی، اس لیے اس کا چہرہ تاریک تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی گن نظر آگئی۔ میں چونکہ اندھیرے میں تھا اس لیے میرا اُبھرتا ہوا سر اُسے دکھائی نہیں دیا تھا ورنہ وہ مجھے بہ آسانی شوٹ کرسکتا تھا۔

پھر اس کے عقب میں ایک اور شخص نمودار ہوا۔ دونوں کھڑکی میں رُک کر باہر جھانکنے لگے۔ میں نے اپنے تئیں نتیجہ اخذ کیا کہ ان پر ہمارا اس طرف سے کود نکلنا باور ہو چکا تھا۔ میں جھکا اور میڈم کو ہاتھ کا اشارہ کرکے دیوار کے ساتھ ساتھ مغربی جانب بڑھا۔ اس نے میری تقلید کی۔ کوئی سوفٹ کے فاصلے پر مویشیوں کا بھانہ تھا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے بھانے تک آئے۔ بڑی سی برآمدہ نما عمارت میں گائیں اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں جو اس وقت اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں ان کے محض ہیولے سے دکھائی دیتے تھے۔

فارم ہاؤس کے اطراف سے بخوبی واقف تھا۔ بھانے کے عقب میں ایک بلند کمرا تعمیر کیا گیا تھا جس میں بھوسا اسٹاک کیا جاتا تھا۔ میری منزل وہی ٹاور نما کمرا تھا جس کے عین نصف میں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کے ذریعے بھوسا کمرے میں ڈالا جاتا تھا۔ میڈم نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا، بولی۔ ”ہم کہاں جارہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”بھوسے والے کمرے میں......“

اسی لمحے ہمارے عقب میں ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق آنے والے کم و بیش چار پانچ آدمی تھے۔ وہ بھانے اور فارم ہاؤس کی سانجھی دیوار کے اس پار کھڑے تھے۔ میں اور میڈم بھینسوں کے بیچ سے گزر کر دیوار تک گئے اور پھر اس کے ساتھ چمٹ کر چلتے ہوئے آخری سرے تک چلے گئے۔ جونہی ہم چکر کاٹ کر بھانے سے نکلے، بھوسے والا کمرا ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے اس کے اوپر سے چکر کاٹا تو کھڑکی سے لگی ہوئی دیسی طرز کی چوبی سیڑھی دکھائی دی جو اس وقت اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہورہی تھی۔ میں نے میڈم کو اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ جب اس کے پیچھے پیچھے میں کھڑکی عبور کرکے کمرے میں پہنچا، اس کو بھوسے پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ بھوسے پر چلنا مشکل ہوتا ہے مگر میں رکے بغیر کمرے

کی مخالف دیوار تک چلا گیا۔

پیا جی نے فارم ہاؤس میں مختلف جگہوں پر اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ یہ اس کی احتیاط پسندی تھی جو اس وقت میرے کام آسکتی تھی۔ میں نے اندازے کے مطابق جگہ کا انتخاب کیا اور برق رفتاری سے ہاتھوں سے بھوسے کو ہٹایا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے مطلوبہ ہدف حاصل ہوگیا۔ مجھے وہاں چھپی ہوئی آٹو میٹک گن مل گئی جس کے ساتھ ایک اضافی میگزین بھی موجود تھا۔ میں نے گن اور میگزین کو جھاڑا اور سرگوشی کی۔ ”میڈم! ادھر آئیں۔“

وہ میرے عقب میں ہی کھڑی تھی، بولی۔ ”کیا ہے؟“

میں نے اسے دیوار کی مخصوص انداز میں نکلی ہوئی اینٹوں کی سیڑھی تک پہنچایا اور کہا۔ ”اوپر چھت پر چلیں، میں آپ کے پیچھے آرہا ہوں۔“

کھڑکی تک بھوسے سے بھرے ہوئے اس مخصوص ساختہ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھی کی نشاندہی کرنا ضروری تھا۔ چند ثانیے انتظار کے بعد میں نے بھی اینٹوں پر پیر رکھ دیا۔ سیڑھیاں سات آٹھ فٹ کے بعد چھت میں واقع ایک چوکور سوراخ پر جا کر ختم ہوجاتی تھیں۔ اس سوراخ سے نکل کر جب میں چھت پر پہنچا تو میڈم کو کہنیوں کے بل لیٹے پایا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا منڈیر تک آگیا۔ جھانک کر نیچے دیکھا، سوائے اندھیرے اور دو کمروں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

میڈم دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ میرے بہت قریب چلی آئی تھی۔ اس کی سانسوں کی مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے یہاں خود کو محفوظ تصور کیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے گن کی نال منڈیر کے اوپر رکھ کر لاک پن ہٹا دی۔ اب میں یہاں سے کسی بھی نظر آنے والے دشمن کا بہ آسانی نشانہ لے سکتا تھا۔

میڈم نے سرگوشی کی۔ ”گن ایک ہی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جی میڈم! آپ فکر نہ کیجیے، میں کسی کو یہاں تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ ویسے آپ اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے سکتی ہیں۔“

میری آنکھیں کسی شکاری جانور کی طرح اندھیرے کے سینے میں پیوست تھیں۔ حملہ آور فارم ہاؤس کے اندر تھے اور ان میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ پانچ سات منٹ گزر گئے تو مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں میڈم کو یہاں ٹھہرا کر نیچے اُترنے اور فارم ہاؤس میں جانے کا ارادہ کررہا تھا، مجھے اس کمرے کی کھڑکی میں ایک ہیولا دکھائی دیا جس سے کچھ دیر پہلے ہم کود کر باہر آئے تھے۔ میں نے گن سیدھی کی، نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

فضا میں فائر اور چیخ کی تیز آواز گونجی اور پرسکوت ماحول میں یک لخت ہلچل پیدا ہوگئی۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے شخص کو گرتے نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ گولی کھا کر ناکارہ ہوچکا تھا اور کھڑکی خالی ہوگئی تھی۔ کوئی اور ہیولا دکھائی نہیں دیا۔

میڈم بولی۔ ”ویل ڈن...... نہ صرف یہ مورچہ بڑا کارآمد ہے بلکہ تم بھی اچھے نشانچی بن چکے ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کسی اور دشمن کو تاڑنے لگا۔ میری چلائی ہوئی گولی اعلان جنگ ثابت ہوئی تھی کیونکہ دوڑتے قدموں کی آوازیں معدوم ہوگئیں اور ایک دم ہی ماحول پر خطرناک خاموشی طاری ہوگئی۔ حملہ آوروں نے سمجھ لیا تھا کہ ہم سنبھل چکے ہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پوزیشن لے چکے ہیں، اس لیے وہ پوری طرح محتاط ہوچکے تھے۔

چونکہ ہم پر جوابی فائر نہیں داغا گیا تھا اس لیے مجھے اطمینان ہوا کہ ان لوگوں کو ہماری لوکیشن کا پتا نہیں چلا تھا۔ میں نے زیر استعمال گن جیسی ایک گن پیا کی زیر نگرانی استعمال کر رکھی تھی، اس لیے میں اس کے تمام فنکشنز کے بارے میں جانتا تھا۔ یہ دو فٹ لمبی جرمن ساختہ دور مار گن بہت خطرناک اور ڈیول سسٹم تھی۔ اس کے میگزین میں ستائیں گولیوں کی گنجائش تھی جنہیں سنگل فائر اور برسٹ فائر دونوں صورتوں میں نال سے نکالا جاسکتا تھا اور چار سو میٹر تک بہ آسانی ٹارگٹ کلنگ کی جاسکتی تھی۔ اس کی مزل پر سائلنسر فٹ کیا جاسکتا تھا۔

اچانک میں چونکا۔ فارم ہاؤس کی چار دیواری کے اندر انتہائی بائیں ہاتھ پر میں نے ناہموار زمین پر روشنی کا وائرہ متحرک دیکھا۔ کوشش کے باوجود مجھے روشنی کا منبع دکھائی نہیں دیا۔ کوئی چھپا ہوا شخص ٹارچ کی مدد سے ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ میرے پاس سوائے انتظار کے کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ جونہی روشن دائرہ دیوار کی سمت بڑھا، مجھے پتا چل گیا کہ ٹارچ بردار شخص کمرے کی نکڑ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ جب تک اس کا وجود نکڑ سے باہر نہیں نکل آتا، میں اس کا نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔

میرا انتظار بے سود گیا۔ وہ نمودار نہیں ہوا بلکہ روشنی کا

ہالہ بھی اوجھل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے عین سامنے فارم ہاؤس کی چھت پر ٹارچ روشن ہو گئی۔ ٹارچ بردار میری نظروں میں آچکا تھا۔ وہ نکڑ والے کمرے کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور بڑے محتاط انداز سے چار دیواری کے باہر ہمیں کھوج رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی حرکت سے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگایا اور نشانہ لے لیا۔ میں نے ٹارچ سے ایک فٹ اوپر اور اتنا ہی دائیں جانب فائر کیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار "شاوا بھئی" نکلا کیونکہ دردناک اور کٹیلی چیخ نے میری کامیابی کا اعلان کر دیا تھا۔

بھوسے والے ٹاور نما کمرے کی منڈیر کی ساخت جدید طرز کے بنکر جیسی تھی۔ شاید اسی ممکنہ ضرورت کے تحت اسے اتنا مضبوط کیا گیا تھا۔ میرے نشانے کی داد دینے والے ٹارچ بردار کی ٹارچ چھت پر گر گئی تھی اور اس سے نکلنے والی روشنی نے چھت کے مخصوص حصے کو روشن کر دیا تھا مگر مجھے کوشش کے باوجود بھی ٹارچ بردار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک میرے برابر میں لیٹی ہوئی میڈم نے تیز سرگوشی کی "ادھر...... وہ رہا ایک...... دائیں طرف دیکھو ناں!"

میں نے دائیں جانب غور سے دیکھا۔ ایک سایہ سا لپکا تھا جس کا میں نے نشانہ لینا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ بھانے کے پختہ ستون کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور آنکھیں شکاریوں کی طرح ارد گرد لپک رہی تھیں۔ ایسے میں میرے بائیں ہاتھ پر چارے کے کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے پہلو بدلا، گن سیدھی کی مگر مجھے وہ جگہ دکھائی نہیں دی جہاں سے سرسراہٹ کی آواز ابھری تھی۔ اچانک روشنی کے سفید دائرے نے چارے کا وہ حصہ روشن کر دیا جہاں کوئی چھپا ہوا تھا۔ میں ابھی صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ فضا تڑتڑاہٹ کی خوف ناک آواز سے گونج اُٹھی۔ چونکہ میں فصل کے گول روشن حصے پر نظریں مرتکز کیے بیٹھا تھا، اس لیے مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ کسی نے عین اسی جگہ پر برسٹ مارا تھا جہاں کسی کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔

میڈم کی تیز مگر دبی دبی آواز سنائی دی۔ "ادھر دیکھو...... وہ چھت پر......"

میں نے فارم ہاؤس کی چھت پر دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ کچھ دیر پہلے جس دشمن کو ناک آؤٹ کیا تھا، وہی ٹارچ لیے چارے کے کھیت کو روشن کر رہا تھا۔ مجھے دھوکا ہوا تھا۔ وہ یا تو میرے فائر پر معمولی زخمی ہوا تھا یا اس نے چیخ کر مجھے دھوکا دیا تھا۔

میڈم بولی۔ "برسٹ ادھر سے مارا گیا ہے......"

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ٹارچ بردار کو نشانے پر لے چکا تھا، میڈم بولی۔ "نہیں...... ڈونٹ فائر...... ہم پوائنٹ آؤٹ ہو جائیں گے...... ابھی کچھ نہ کرو۔"

طاقت ور ٹارچ کی تیز روشنی ابھی تک چارے پر اسی جگہ مرکوز تھی جہاں برسٹ مارا گیا تھا۔ وہاں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک برسٹ اور مارا گیا۔ اب مجھے پتا چل گیا کہ فارم ہاؤس کے بالکل میرے مقابل والے کمرے کی چھت پر کوئی گن بردار لیٹا ہوا تھا جو ٹارچ کی رہنمائی میں فائر کر رہا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر کہا۔ "میڈم! کیا اس پر فائر کروں؟"

وہ بولی۔ "ابھی نہیں......"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ مجھ میں حکم عدولی کی تاب نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ ان معاملات میں مجھ سے کہیں زیادہ طاق اور مشاق تھی۔ ٹارچ بردار نے اب اس جگہ کی احاطہ بندی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے وہ ارد گرد روشنی پھینکنے لگا تھا۔ فارم ہاؤس کی چار دیواری سے کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر متوازی کچا کھال تھا جس پر گھنے درختوں کی قطار تھی۔ اسے شاید ان درختوں پر ہماری موجودگی کا شبہ ہو گیا تھا اس لیے ٹارچ کا رُخ درختوں کی طرف ہو گیا۔ پھر اس نے ٹارچ کو بھانے کی طرف گھمایا، دو مرتبہ آف اور آن کیا اور اپنے کسی ساتھی کو درختوں کی طرف ٹارچ کا اشارہ کیا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے فارم ہاؤس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ دائیں سے بائیں نکل کر جاتا ہوا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ جھکے جھکے انداز میں تیزی سے مشرقی سمت میں بڑھ رہا تھا اس لیے اندھیرے میں وہ انسان کے بجائے کوئی بچھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے نشانے پر تھا مگر میڈم کی ہدایت کے پیش نظر میں نے اس پر فائر نہیں کیا۔ وہ ٹارچ بردار کے عین نیچے پہنچ کر مڑا اور دو فٹ بلند چارے میں گھس کر غائب ہو گیا۔ شاید کرولنگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، اس لیے میری نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ یا تو برسٹ والی جگہ پر جا رہا تھا یا درختوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ عین اُس جگہ پر دکھائی دیا جہاں کچھ دیر پہلے برسٹ مارا گیا تھا۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کر لی اور وہ جگہ کنگھالی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی آوارہ کتا یا سیہہ وغیرہ ہو گی جو کسی بل میں گھس گئی ہو گی۔ اس نے ٹارچ آف کر دی اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کمرے پر کھڑے شخص نے ٹارچ کی مدد سے ہمیں کھوجنے کا سلسلہ جاری رکھا مگر وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ اس کے ساتھی پر روشنی نہ پڑے اور کوئی ہماری نظروں میں نہ آنے پائے۔

چارے میں چھپ کر تلاش کرنے والا درختوں کی قطار تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک مجھے کھال میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سامنے والی منڈیر چھوڑ دی اور چھت کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے اس کا نشانہ لیا، میڈم گھٹنوں کے بل اُٹھ کر گن کی نال پر جھک گئی، بولی۔ "فائر......"

میں نے لبلبی دبا دی۔ میرا نشانہ خطا گیا تھا یا وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ میں نے اندازے کے مطابق کھال میں چند فٹ آگے دو درختوں کے موٹے تنوں کے بیچ کھال میں دوسرا فائر کر دیا۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دیا تھا مگر گن سے نکلنے والی اندھی گولی نے اسے چاٹ لیا تھا۔ وہ اچانک ہوا میں بلند ہوا اور کھال کے باہر لڑھک کر نکلا۔ اُٹھ کر چند قدم دوڑا پھر گر گیا۔ اس پر ٹارچ بردار نے روشنی کا گولا پھینکا۔ وہ زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر چارے کی مخصوص انداز کی حرکت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔

میڈم کی سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نال کے دہانے کا اس طرح گھیراؤ کر کے بیٹھی تھی کہ نال سے نکلنے والے مخصوص بارودی شعلے کو فارم ہاؤس کی جانب سے دیکھا نہ جا سکے۔ اس کی یہ پالیسی کامیاب رہی تھی، ہم پر کوئی فائر نہیں کیا گیا بلکہ درختوں پر یکے بعد دیگرے تین برسٹ مارے گئے جو یقیناً اکارت گئے تھے۔ البتہ ان تیز اور ڈراؤنی آوازوں نے بھانے میں کھلبلی مچا دی تھی۔ مویشی جاگ کر اچھلنے کودنے، رسیاں تڑانے اور شور مچانے لگے تھے۔

بھانے میں چھپا ہوا دشمن ہماری تلاش میں درختوں تک پہنچ کر مردہ یا زخمی ہو چکا تھا۔ اس سے سردست گلوخلاصی پانے کے بعد ہم بہ عجلت پہلے والی پوزیشن پر آ گئے۔ نکڑ والے کمرے کی چھت پر ٹارچ بہ دستور روشن تھی۔ میں نے کہا۔ "بہت ڈھیٹ انسان ہے یہ تو...... میڈم! برسٹ فائر کروں؟"

وہ بولی۔ "کتنی گولیاں ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے کہا۔ "دو میگزین ہیں...... لوڈڈ۔"

وہ بولی۔ "صرف دو...... نہیں! تم برسٹ مارنے کی سنگین غلطی نہیں کرو گے ورنہ ہم نہتے ہو جائیں گے۔"

میں نے جذباتی رو میں بہہ کر یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اندھیرے میں میڈم کے ہیولے کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا اور اپنے کینوس پر آنکھیں جما دیں۔ میرے کینوس، یعنی فارم ہاؤس کے پچھواڑے کی وسعت بہ مشکل تیس میٹر اور بلندی تین چار میٹر تھی۔ ماسوائے ٹارچ، چار عدد کھڑکیوں اور اتنے ہی روشن دانوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چار دیواری، نکڑ اور چھت کا تعین دن کے اجالے میں دیکھے ہوئے منظر کو چشم تصور میں سجا کر کیا جا سکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کینوس پر نقل و حمل کا احساس ہوا۔ دائیں جانب والے آخری کمرے، جس میں فارم ہاؤس کے نوکر رہائش پذیر تھے، کی چھت پر مجھے فائر کرنے والے شخص کی پوزیشن کا علم ہو گیا۔ وہ کرولنگ کرتا ہوا دوسرے کمرے کی چھت پر آ رہا تھا۔ میں نے اسے نشانے پر لیا اور فائر کر دیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر گئی تھی کیونکہ اس کے اچھلنے اور پھر چھت پر گرنے کا انداز چغلی کھا گیا تھا۔

میں ایک اور دشمن کو داغنے میں کامیاب تو ہو گیا مگر فضا تڑتڑاہٹ کی مخصوص آواز سے لرز اُٹھی۔ اگر ہم فوراً چھت پر لیٹ نہ گئے ہوتے تو شاید کوئی گولی ہمارا کام تمام کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ کئی گولیاں منڈیر پر لگیں اور اینٹوں اور سیمنٹ کے ننھے ننھے ٹکڑے اڑ کر ہم پر گرے۔

میڈم نے ڈانٹا۔ "تم نے غلطی کر ہی لی ناں......"

مجھے خفت ہوئی۔ برسٹ کے بعد اکا دکا گولیاں منڈیر کو توڑنے لگیں۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں فائرنگ بلا تخصیص ساری منڈیر پر ہو رہی تھی۔ اب ہم پہلی سی آزادی کے ساتھ فارم ہاؤس میں چھپے ہوئے دشمنوں کو تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر منڈیر کے اوپر سے دیکھنا چاہا تو میڈم نے میرا سر نیچے کر دیا، بولی۔ "پاگل ہوئے ہو کیا؟ خاموشی سے لیٹے رہو۔"

میں نے زِچ ہو کر کہا۔ "کب تک میڈم؟"

وہ بولی۔ "ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو......"

میں نے بے بسی سے سر ڈال دیا۔ ایسے ہی وقت میں دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا۔ ایک کارگر ترکیب سوجھ گئی جس سے میں فائرنگ کرنے والوں کو نہ صرف دھوکا دے سکتا تھا بلکہ انہیں ان کی مچانوں سے نکالنے میں کامیاب بھی

ہوسکتا تھا۔ میں نے گن میڈم کو تھمائی اور کچھ بتائے بغیر اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہنیوں کے بل تیزی سے کھسکتا ہوا چھت کے چوکور سوراخ تک آیا اور نچلے دھڑ کے بل سوراخ میں اتر کر لٹک گیا۔ میں نے اینٹوں کی سیڑھی کے ذریعے اترنے کے بجائے کودنا مناسب جانا کیونکہ بھوسے کی وجہ سے چوٹ لگنے کا احتمال نہیں تھا۔

میں نے دن کے وقت یہاں بہت سے پولی تھین کے بیگ پڑے دیکھے تھے۔ دیہاتی زبان میں، عرف عام میں انہیں گٹو کہا جاتا تھا۔ ان میں کھاد اور کھل وغیرہ لائی جاتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر دو گٹو تلاش کر لیے۔ جلدی جلدی ان میں بھوسا بھرا۔ اس جیسے تمام زمیندارانہ کاموں پر مجھے مہارت حاصل تھی، اس لیے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ان گٹوؤں کے دھاگوں سے ان کے منہ باندھے اور باری باری چھت پر منتقل کیا۔ میڈم ہنوز چھت پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔

فائرنگ رُک چکی تھی۔ میں نے گٹوؤں کو اندازے سے چھت کے اس حصے تک دھکیلا جہاں کمرے کے پیچھے بڑا سا گڑھا موجود تھا۔ میرے اس منصوبے کا دارومدار اَب قسمت پر تھا۔

میں نے میڈم سے گن لی اور مودبانہ انداز میں کہا۔ ”آپ ایسے ہی لیٹی رہیں میڈم!“

اس نے تیزی سے پوچھا۔ ”کیا کرنے لگے ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گن سر سے بلند کر کے پہلو کے بل کروٹیں لیتا ہوا بھوسے بھرے گٹوؤں کے پاس پہنچا۔ محتاط انداز میں ٹارچ والے کو دیکھا۔ ٹارچ ابھی تک روشن تھی اور اس کی تیز روشنی ہماری منڈیر پر پڑ رہی تھی۔ میں نے گن کی نال منڈیر سے باہر نکالی اور اپنی پوری مہارت بروئے کار لا کر ٹارچ پر فائر کر دیا۔ اتنی دور سے ٹارچ کا صحیح نشانہ لینا آسان کام نہیں تھا مگر میری پہلی کوشش ہی کامیاب ہو گئی۔ ٹارچ بجھ گئی۔ میں نے ہاتھ کو حرکت دی اور سر نیچے کر کے دو تین فائر فارم ہاؤس کی چھت پر مختلف جگہوں پر کر دیے۔ بجلی کی سی تیزی سے میں نے گٹو کو ہوا میں بلند کیا۔ میرا منصوبہ کامیاب ہوا اور گٹو پر گولیوں کا برسٹ مارا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک ہی وقت میں دو مختلف سمتوں سے گٹو پر فائرنگ کی گئی تھی۔ میں نے حلق سے تیز چیخ نکالی اور گٹو کو منڈیر پر سے نیچے دھکیل دیا۔ ایک بار پھر تڑتڑاہٹ کی تیز آواز نے فضا کا سینہ چیر کر رکھ دیا۔ کسی گولی نے منڈیر کو نہیں چھوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زیرک دشمن نے اندھیرے میں گرتے ہوئے گٹو کو ہدف سمجھ کر اس پر اندھا دھند گولیاں چلا دی تھیں۔

اسی اثنا میں مجھے اپنے جسم پر میڈم کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا، ساتھ ہی اس کی متفکر آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”شہر یار...... شہر...... کیا تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟“

میں نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا، وہ اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہو رہی تھی، کہا۔ ”جی میڈم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجیے۔“

وہ بولی۔ ”یہ چیخ تمہاری تھی ناں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں مگر مجھے کوئی گولی نہیں لگی۔“

اس کے حلق سے لمبی سانس برآمد ہوئی اور بولی۔ ”تھینکس گاڈ...... میں غلط سمجھی تھی۔“

میرے اندازے کے مطابق گٹو بھوسے والے کمرے کی بنیاد میں کھدے ہوئے گڑھے میں جا گرا تھا۔ اگر کوئی اس پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنا چاہتا تو آسانی سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں چند قدم اور آگے گھسٹا۔ پوزیشن بدلی اور میڈم کو اپنی جانب بلایا۔ وہ بولی۔ ”تم کر کیا رہے ہو؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔“

میں نے سر نکالے بغیر دو تین فائر کیے اور دوسرے گٹو کو منڈیر سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اب آپ بلند آواز میں چیخیں گی۔“

میری توقع بر آئی۔ جونہی گٹو منڈیر سے باہر نکلا، ان گنت گولیاں اس میں پیوست ہو گئیں۔ میڈم کے حلق سے تیز اور دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے میری ہدایت پر اپنا بھرپور کردار ادا کر دیا تھا۔ میں نے گٹو کو دھکا دیا اور منڈیر پر سے نیچے گرا دیا۔ اس کے ساتھ بھی پہلا سا سلوک کیا گیا۔ زمین پر گرنے تک گٹو میں اور بھی کئی گولیاں گھس گئی ہوں گی۔

تب تک میڈم میرا منصوبہ سمجھ کر فرطِ مسرت سے مجھ پر لد چکی تھی۔ بولی۔ ”ویل ڈن مسٹر شہر یار...... آئی واز جسٹ تھنکنگ اباؤٹ دِس ڈارلنگ......“

میری چھاتی فخر سے پھیل گئی۔ اس کا بالائی نصف وجود میری پشت پر لد کر روح کو راحت افزا انداز میں گدگدا رہا تھا اور کانوں کے پاس ہی اس کی سانسوں کی مالا کھنک رہی تھی۔ اتنا قرب اور لمس پا کر میں سن ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ابھی میرا کام مکمل نہیں ہوا، پلیز نیچے اُتریں اور مجھے پوزیشن لینے دیں۔“

اس نے اُترنے میں دیر نہیں کی۔ میں نے کھسک کر

منڈیر پر تنی اور مختلف پوزیشن سنبھال لی۔ فارم ہاؤس کی چھت پر ایک ہیولا دکھائی دیا۔ چاردیواری کی دیوار کے پاس ایک گن بردار کھڑا دکھائی دیا جو بھوسے والے ٹاورنما کمرے کی بنیاد پر ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم پر حملہ کرنے والوں کی تعداد کتنی تھی۔ کتنے ناکارہ ہو چکے تھے اور کتنے ابھی باقی تھے۔ ہمارے پاس ایک لیڈیز پستول اور گن تھی۔ میڈم کے پستول کی رینج کم تھی، اس لیے اس سے فائدہ اُٹھایا نہیں جاسکتا تھا۔ گن سے ایک وقت میں ایک نشانہ ہی لیا جاسکتا تھا۔

میں نے فی الفور فیصلہ کیا اور چھت پر کھڑے شخص پر اوپر تلے تین فائر کیے۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ چھت پر گر گیا۔ میں نے گن کی نال کا رُخ نیچے کیا۔ چاردیواری کے ساتھ کھڑا ہوا شخص جھک کر بھانے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میرا ایک فائر خطا گیا جبکہ دوسرا اس کے بدن کو چھونے میں کامیاب رہا۔ وہ زمین پر گر گیا اور اس نے اندھا دھند جوابی برسٹ فائر کیا۔ اسے میری لوکیشن کا علم نہیں تھا اس لیے اس کی گن سے تواتر کے ساتھ نکلنے والی گولیاں بھوسے والے کمرے کی دیوار پر لگیں۔ فضا خوف ناک آوازوں سے گونج اُٹھی۔ میری گن سے نکلنے والی اوپر تلے کی پانچ سات گولیوں میں سے کسی نے کام دکھا دیا تھا اور اس کی گن خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں محض جانوروں کے ڈکرانے اور ان کے اچھلنے کودنے کے سبب پیدا ہونے والی آہنی زنجیروں اور کنڈوں کی کھنک دار آوازیں رہ گئیں۔ میں نے مشاق نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم پر یلغار کرنے والے سبھی مارے گئے تھے۔

میں شدید اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔ جونہی کچھ اطمینان ملا، میں نے گن چھت پر رکھ کر اس پر ماتھا ٹکا دیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میڈم گھٹنوں کے بل میرے پاس آئی۔ میرے بال مٹھی میں بھر کر اوپر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''یو آر وِنر آف دِس ڈیتھ فائٹ...... آئی لو یو......''

میں گھٹنوں کے بل اُٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر ہیولائے ہوئے بدن کے محل وقوع نے سمجھا دیا کہ وہ میرے بہت قریب ہو چکی تھی۔ اس نے میرے بال چھوڑ دیے، میرے رخساروں پر ہاتھ رکھے اور سرگوشی کی۔ ''آئی سے...... آئی لو یو......''

میں خاموش رہا، وہ پھر بولی۔ ''کہو ناں...... آئی لو یو ٹو......''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میڈم! میں اس قابل نہیں ہوں۔''

اس نے پھر سرگوشی کی۔ ''تم اس قابل یقیناً ہو کہ مجھے کچھ کہہ سکو۔''

''میڈم! ابھی خطرہ موجود ہے، آپ یہاں رہیں، میں نیچے جاتا ہوں اور فارم ہاؤس کی خبر لیتا ہوں۔ کوئی بچ گیا ہے تو اسے تلاش کرتا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''ٹھیک ہے...... مگر ہم دونوں چلتے ہیں۔''

میں اسے ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھا مگر وہ بضد تھی۔ ہم دونوں اسی راستے سے نیچے اُترے۔ بھوسے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر اُس نے کہا۔ ''شکر کرو کہ بھوسے کو آگ نہیں لگی ورنہ ہمیں اتنی بلند چھت سے چھلانگ لگانا پڑتی۔''

اس نے درست کہا تھا۔ بھوسے کا ڈھیر پیٹرول کی طرح آگ پکڑ سکتا تھا۔ میں نے زمین سے کم و بیش دس بارہ فٹ بلند کھڑکی میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ جھانک کر کسی غیر متوقع خطرے کو بھانپنے کی کوشش کی مگر اندھیرا مطلق خاموش تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چوبی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ میرے پیچھے پیچھے میڈم بھی نیچے اُتر آئی۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور مشاقانہ انداز میں بولٹ کھینچ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے بھانے کے عقب میں آئے۔ راستہ بدل کر فارم ہاؤس کے مغربی پچھواڑے کی سمت آگے کی طرف بڑھے۔

اس نے سرگوشی کی۔ ''لگتا ہے کہ میدان صاف ہے۔''

مجھے اس کی بات سے اختلاف نہیں تھا مگر میرے نزدیک احتیاط لازم تھی۔ ہم کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے چاردیواری کے ساتھ ساتھ ستر اَسی فٹ تک بڑھنے کے بعد اس نے میری ٹی شرٹ پکڑ کر رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا تو اس نے کہا۔ ''ہم یہاں سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوں گے۔''

وہاں دیوار کا دس بارہ فٹ لمبا حصہ قدرے کم بلند تھا اور کسی دقت کے بغیر دیوار کو عبور کیا جاسکتا تھا۔ میں نے گن کندھے پر لٹکائی اور ہاتھوں کے بل ہوا میں بلند ہو کر دیوار پھلانگ لی۔ چند لمحوں بعد میڈم بھی اندر تھی۔

اس کی رہنمائی میں ہم چند قدم واپس شمال کی جانب آئے، ایک کھڑکی کے قریب رک کر سن گن لی اور پھر میڈم

نے مخصوص انداز میں انگلیوں کو حرکت دے کر بند کھڑکی کھول دی۔ محتاط انداز میں اندر جھانکا پھر اُچھل کر کھڑکی کے راستے اندر اُتر گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی اور گن کو فائر پوزیشن میں لے کر اسے کور فراہم کر دیا۔

کمرے میں تین چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر فارم ہاؤس کا چوڑے چکلے سینے والا سیاہ فام ملازم چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر پڑنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کے مردہ ہونے کی خبر دے رہی تھی۔ اس کا لحاف چارپائی سے نیچے فرش پر گرا ہوا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اس کے دل میں گولی لگی تھی۔ چھاتی اور اردگرد تمام بستر خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی کیونکہ جما ہوا خون اپنی رنگت تبدیل کر چکا تھا۔

میڈم کے ہونٹ سکڑے، پیشانی پر برہمی کی غماز لکیروں کا جال سا تنا اور پھر وہ کندھے اُچکا کر، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے پستول والا ہاتھ نکالا اور محتاط انداز میں باہر جھانکا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہم نے آنے والے چند منٹوں میں سبھی کمرے دیکھ لیے۔ کھلی کھڑکی والے کمرے میں، جہاں میں سونے کے لیے لیٹا تھا، کھڑکی کے قریب فرش پر ایک جسیم شخص آڑے ترچھے انداز میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ میڈم نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس کا معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے نرخرے میں گولی لگی تھی جو گردن کے پار گزر گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور موت کی وحشت سے پھٹنے کو آئی ہوئی تھیں۔

وہ چھ فٹ قامت والا خاصا تگڑا شخص تھا جس میں اس وقت زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ شکل سے چھٹا ہوا بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، بڑھی ہوئی شیو اور اُلجھے اُلجھے بال...... اس سے چند فٹ کے فاصلے پر گن اور ٹارچ پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دیسی ساخت کی کاربین اب بھی دبی ہوئی تھی جسے شاید چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کی نبض یا دھڑکن محسوس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ گردن سے پار ہونے والی گولی نے اسے دوسری سانس کی مہلت تک نہیں دی ہوگی۔ گردن کے عقب میں نظام زندگی کو رواں دواں رکھنے والا حرام مغز اُڑ چکا تھا اور آدھے کمرے میں اس کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے اس کے مرنے کی اطلاع نشر کی۔ اس دوران میڈم باتھ روم کا جائزہ لے کر کمرے کے وسط میں آ چکی تھی۔ نفرت بھرے انداز میں اس پر نگاہ ڈال کر بولی۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید میروشاہ اسے پہچانتا ہو۔''

آخری کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک الماری سے اپنا موبائل فون نکالا۔ نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر بولی۔ ''میروشاہ! اپنے چند لوگوں کو لے کر فارم ہاؤس پر فوراً پہنچ جاؤ۔ میں رات کو فارم ہاؤس پر تھی اور کسی گروہ نے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر حملہ کر دیا۔ اب ان کی لاشیں یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

میروشاہ کی خمار آلود آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے کچھ کہا، جو میرے پلے نہیں پڑا۔ میڈم بولی۔ ''نہیں...... میرے ساتھ شہریار ہے۔ میں اسے لے کر یہاں سے ابھی نکل رہی ہوں۔ راستے میں ملاقات ہوگی۔''

دوسری جانب کی بات سن کر بولی۔ ''بکواس مت کرو۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو اور آ کر دیکھو کہ مجھ پر کن لوگوں نے چڑھائی کرنے کی کوشش کی ہے اور پولیس کے آنے سے پہلے یہاں کے معاملات اپنے ہاتھ میں کر لو۔''

میں نے دیکھا تھا کہ اس کا چہرہ میروشاہ کی کسی بات پر سرخ ہو گیا تھا۔ فون بند کر کے میری طرف مڑی اور ایک ننھی سی ٹارچ مجھے تھماتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں یہاں سے ابھی نکلنا ہے۔''

میں کمرے سے نکلا۔ کھلے صحن کا بلب پہلے ہی میڈم نے برآمدے میں نصب سوئچ بورڈ پر سے آن کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں رُکی، میں دوڑ کر سیڑھیوں تک گیا۔ دو دو زینے پھلانگ کر چھت پر پہنچا۔ سیڑھیوں کے بالکل قریب ہی ایک شخص کو اوندھے منہ لیٹے پایا۔ میں نے نکڑ والے کمرے پر روشنی پھینکی۔ ایک وجود وہاں بھی ڈھیر تھا۔ میں نے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔ ایک مر چکا تھا۔ اس کی پیشانی میں گولی لگی تھی جبکہ آخری کمرے کی چھت پر پڑا ہوا ٹارچ بردار پیٹ پر ہاتھ رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا، کوئی جواب نہ پا کر پھر پکارا مگر وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ پتا چلا کہ وہ مرنے والا تھا۔

اس سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر اگلی منڈیر کے پاس کوئی فٹ بھر لمبی ٹارچ پڑی تھی۔ اس کے پاس ایک ماؤزر تھا جو چند قدم دور گرا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے دانت پیسے اور اس کی گردن پر پیر رکھ کر سر کو ایک جانب مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ 'کٹاک' کی زوردار آواز میرے کانوں میں پڑی اور اس نے حلق سے 'اوغ' کی آواز نکال کر گردن ایک جانب ڈال دی۔ زندگی سے اس کا ناتا کٹ گیا تھا۔

فارم ہاؤس کی وسیع و عریض چھت پر کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر نیچے اُترا۔ میڈم کو برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ انگلیوں میں کی رنگ گھماتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''ہاں! کیا رہا؟''

میں نے رپورٹ دی۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، اب ہمیں یہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ اچھلی اور کھلے صحن کے پار مین گیٹ کی طرف دوڑی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ بڑے گیٹ کے بغلی دروازے سے ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں باہر جھانکا۔ باہر دو گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ میں نے کہا۔ ''دونوں خالی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ایک میری ہے جبکہ دوسری حملہ آوروں کی ہے۔''

''آپ کی گاڑی کون سی ہے؟''

''وہ والی، ٹویوٹا سیلون......''

میں نے اس کے ٹائروں پر نگاہ ڈالی۔ پھر حملہ آوروں کی پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر کا سرسری جائزہ لیا۔ مبادا کوئی اس میں چھپا ہو۔ ازراہ احتیاط میڈم کو وہیں ٹھہرا کر میں لینڈ کروزر کے پاس گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کے اندر بہ غور جھانکا، خالی پا کر میڈم کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گیٹ سے نکل کر اپنی ٹویوٹا سیلون کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''اوکے! ہیرو، وی گو ناؤ......''

اس نے چابی کی مدد سے گیٹ کھولا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میرے لیے اگلا دروازہ ان لاک کیا۔ میرے بیٹھنے تک وہ انجن کو اسٹارٹ کر چکی تھی۔

گاڑی نئی نہیں تھی مگر بہت اچھی حالت میں تھی۔ انجن کی آواز بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ستائش بھرے انداز میں بولی۔ ''آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت کارآمد انسان ہو۔''

میرا سینہ تفاخر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ میں نے قدرے اعتماد سے پوچھا۔ ''آپ کا اشارہ پہلی فائٹ کی طرف ہے یا دوسری کی طرف؟''

وہ مسکرائی۔ ''میں نے دونوں جھڑپوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔''

اس دوران وہ یوٹرن لے کر گاڑی کو بڑی سڑک کی طرف جانے والے کچے راستے پر ڈال چکی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اچانک کوئی نہایت سرد چیز میری گردن پر آن ٹکی۔ میں چونکا، گردن موڑ کر عقب میں دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ بھاری اور سرد آواز گاڑی میں گونج اُٹھی۔ ''خبردار! تم دونوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میری گردن کو چھونے والی سرد شے کسی گن یا پستول کی نال تھی۔ میرے اور میری میڈم کے لیے کار موت کا پنجرہ بن گئی تھی اور ہمیں اپنی کار کی عقبی سیٹ کی طرف نہ دیکھنے کی بھیانک سزا مل چکی تھی۔

میں نے کن اَکھیوں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بیک مرر میں دیکھ رہی تھی جبکہ اس کا نچلا ہونٹ اوپر والے پر چڑھ کر ساکت ہو چکا تھا۔ میں اس ناگہانی صورت حال میں بُری طرح نروس ہو گیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ میڈم کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جیسے یہ اس کے لیے معمول کی ہی کوئی کارروائی ہو۔

میں نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور پوچھا۔ ''تم کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

وہی بھاری آواز گونجی۔ ''ہم کون ہیں، تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔ فی الحال یہی چاہتے ہیں کہ بغیر کوئی چالاکی دکھائے خاموش بیٹھے رہو۔''

ایک اور کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''شہزادی! دائیں طرف نہیں، بائیں طرف گاڑی موڑ لو......''

میڈم نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا اور بے بسی سے اسٹیئرنگ ویل بائیں جانب گھما دیا۔ گاڑی پختہ سڑک پر چڑھ کر شہر کی مخالف سمت میں کسی انجان منزل کی طرف رواں ہو گئی۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

364 دن

مختار آزاد

بچے والدین کے درمیان محبت کی زنجیر تصور کیے جاتے ہیں مگر جب اس زنجیر کی کوئی کڑی ٹوٹ جائے تو بچے بھی ٹوٹی مالا کی طرح بکھر جاتے ہیں... اسے بھی معاشرے میں اپنی بے وقعتی کا احساس مارے جا رہا تھا کہ اچانک اس نے عجب انداز سے خود کو منوانے کا فیصلہ کر لیا مگر... رستے کے انتخاب میں اس سے ذرا سی چوک ہو گئی۔

نفرتوں کے الاؤ میں جلنے والے بچوں کی اذیتوں کی ترجمان کہانی

تصویر دھندلی پڑنے لگی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ پیپر پر بنی اس پوسٹ کارڈ تصویر کے کنارے مڑ رہے تھے۔ چکنائی کے ہاتھ لگنے کے باعث اس کے کناروں پر انگلیوں کے نشانات چھپ گئے تھے۔ دس سالہ ٹی جے رینالڈ دونوں رانوں کے بیچ اس تصویر کو زور سے دبائے بیٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے تصویر کے مڑے کنارے سیدھے ہو جائیں گے۔ وہ تصویر اس کے نزدیک بہت قیمتی تھی۔ وہ تصویر اس کے باپ کی تھی جسے اس سے دور کر دیا

گیا تھا۔ اب وہ تصویر اس کے لیے باپ کی قربت کا نعم البدل تھی۔ اسے اپنے ڈیڈی سے بہت محبت تھی مگر لاکھ چاہنے کے باوجود سال کے تین سو پینسٹھ دن رات میں سے صرف ایک دن اس کے لیے باپ سے ملاقات کا تھا۔ وہ دن گزر چکا تھا اور اب اسے مزید تین سو چونسٹھ روز تک اس تصویر کے ساتھ گزارنے تھے۔ وہ اس تصویر کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرتا تھا۔

کافی دیر بعد رینالڈ نے تصویر صوفے پر رکھی اور میز کی طرف بڑھا جہاں اس کا ایکس باکس گیم رکھا ہوا تھا۔ وہ پلٹا اور صوفے پر بیٹھ کر اس میں بیٹری لگائی اور گیم کی اسکرین روشن ہوگئی۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ ''سزا... تین آدمیوں کی زندگیاں تلف کردو۔''

اسی دوران کچن سے اس کی ماں نے پکارا۔ ''مارٹی آٹھ بجے تک پہنچ رہا ہے۔ تم اپنے کمرے میں رہنا۔ وہ فلم دیکھے گا یہاں پر...'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ ''اوکے؟'' اس نے سوالیہ لہجے میں تصدیق چاہی۔

رینالڈ نے ماں کی بات سنی تو سہی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مما کی بات کا مطلب کیا ہے اور مارٹی کے آنے اور اس کے جانے تک، اسے کیا کرنا ہوگا۔ اس کی نظریں بہ دستور گیم اسکرین پر جمی تھی۔ ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک دشمن نشانے پر آیا۔ اس نے بٹن دبایا۔ دشمن پر زوردار لات پڑی اور وہ کسی غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ رینالڈ کو ایک دشمن ٹھکانے لگانے کے عوض پچاس پوائنٹس مل گئے تھے۔

''کچھ سنا، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' ایک بار پھر وہ کچن سے چلائی۔

اس نے ایک اور بٹن دبایا۔ دوسرے دشمن کو لات پڑی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے گردن موڑ کر کچن کی سمت منہ کر کے چلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔'' وہ پھر چلائی۔

دیوار پر لگی گھڑی میں رات کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ ماں کی بات سن کر اس نے گیم کھیلنا بند کیا۔ باکس صوفے پر رکھا اور اس کی بات کا کوئی جواب دیے بنا اٹھا، دروازہ کھولا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔ وہ لیونگ روم میں بیٹھ کر اُن کے قہقہے نہیں سننا چاہتا تھا۔ اسے ان قہقہوں سے وحشت ہوتی تھی اور یہ وحشت اس وقت اور بڑھ جاتی جب ان کے درمیان طویل خاموشی چھا جاتی تھی۔ دس سالہ رینالڈ کا ننھا ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ مارٹی اور اس کی ماں کے قہقہے کیوں بند ہوجاتے ہیں اور اس دوران طویل خاموشی میں وہ کیا کرتے تھے۔ مارٹی اس کی ماں کا دوست تھا اور اکثر رات کو اُن کے گھر آتا اور پھر ڈنر کے بعد وہ دونوں گھنٹوں لیونگ روم میں گزارتے۔ اس دوران رینالڈ کو کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ اُس وقت بھی جب ماں نے اسے مارٹی کے پہنچنے کی اطلاع دی اور کمرے میں بند رہنے کا حکم سنایا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس کا دلچسپ مشغلہ لوہے کی چھوٹی سی پتلی سلاخ کے ساتھ پہیا دوڑانا تھا۔ پہیہ اس کی دادی نے کافی عرصے پہلے اسے خرید کر دیا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے گیٹ کے برابر رکھا پہیا اور سلاخ اٹھائی اور اونچے نیچے راستے پر دوڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ یہ اس کا پسندیدہ کھیل تھا مگر رات کے اس وقت دھول بھرے کچے راستے پر پہیا دوڑانا اسے اتنا ہی ناپسند تھا جتنا کہ ہر صبح اسکول جاتے ہوئے لیون لینڈیز کا منہ دیکھنا... مگر مجبوری تھی۔ مارٹی کے ہوتے ہوئے اسے اپنے ہی گھر پر رہنا منظور نہ تھا۔ وہ گھر سے نکل کر سیدھا آگے بڑھا اور پھر کارنر سے مڑا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤ کے آثار تھے۔ وہ وحشت زدہ انداز میں دوڑ رہا تھا۔ وہ اسے نہ دیکھ سکا یا پھر اس نے دیکھنے کی کوشش نہ کی مگر لیون لینڈیز نے نہ صرف اسے دیکھ لیا تھا بلکہ اس کی چال سے بہت کچھ سمجھ بھی چکی تھی۔ وہ اس کی ہم جماعت تھی مگر اب وہ اس سے سخت نفرت کرتی تھی اور اپنی نفرت کو ہر بار نئے انداز سے پیش کرنے کے لیے اس کے ہر عمل پہ نظر رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی کوشش میں تھی۔

لینڈیز فیملی قصبے کی مرکزی سڑک ریڈل روڈ کے کارنر پر بنے گھر میں رہائش پذیر تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی قصبے سے نکل کر زیریں حصے کی طرف جانا چاہے اور لینڈیز فیملی کے گھر والے نکڑ سے گزرے بنا نکل جائے۔

رینالڈ سیاہ فام تھا لیکن اس کی رنگت کم سانولی تھی۔ وہ خاصا صحت مند اور دراز قد تھا۔ اپنے قد کاٹھ کی بدولت پوری کلاس میں تمام ہم جماعتوں سے بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا باپ موٹر ساز فیکٹری میں کار اسمبلی لائن پر بہ طور فٹر کام کرتا تھا۔ ''اکثر امیر لوگ آرڈر پر اپنی کاریں تیار کرواتے تھے۔'' جب وہ کام سے گھر لوٹتا تو رینالڈ کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس طرح کی باتیں کرتا تھا۔ رینالڈ کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ جیسے ہی وہ کام سے لوٹتا، وہ باپ کے گرد منڈلانے لگتا۔ وہ بھی بیٹے سے بہت محبت کرتا تھا۔ باپ بیٹے کی محبت اب بھی ویسی ہی تھی لیکن اب وہ ہر روز نہیں ملتے

تھے۔ رینالڈ کو بھی باپ سے ملاقات کے لیے پورے سال کے صرف ایک دن کا انتظار رہتا تھا اور یہ سلسلہ پچھلے تین سال سے جاری تھا۔

رینالڈ پختہ سڑک پر پہیا دوڑاتا ہوا مڑا تو اچانک لیون کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ اگرچہ وہ اس سے سخت نفرت کرنے لگی تھی لیکن سادہ دل رینالڈ اسے اب بھی اپنا دوست سمجھتا تھا۔ ویسے بھی وہ اس کی ہم جماعت تھی۔ وہ ڈرائیو وے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے پہیا دیوار سے ٹکایا اور سامنے کا دروازہ کھولا۔ وہ لیون کا کمرا تھا، جس کی ایک کھڑکی باہر کی طرف اس راستے پر کھلتی تھی جس سے گزر کر وہ اپنے گھر آیا جایا کرتا تھا۔ اسی کھڑکی سے کچھ دیر پہلے لیون نے اسے دیکھا تھا۔ کمرا اکثر اس کے ہم عمر بچوں سے بھرا ہوتا تھا مگر اُس وقت وہاں صرف دو ہی موجود تھے، لیون اور اس کی بہن۔

''تم کہاں جانے کے لیے نکل پڑے ہو؟'' لیون نے گیند پھینکی اور اس کی طرف بڑھی۔ وہ ڈرائیو وے میں کھلے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

''جے اسٹور کے لیے۔'' رینالڈ نے بنا کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا۔

''تمہارے ڈیڈی کیسے ہیں؟'' اس نے باہر نکل کر چھوٹتے ہی پوچھا۔

رینالڈ نے کچھ جواب نہ دیا۔ خاموشی سے پہیا ہاتھ میں اٹھایا اور واپس چل دیا۔

''تم گیریسن جا رہے ہو اپنے بدمعاش باپ سے ملنے۔''

رینالڈ نے یہ سن کر سر ہلایا اور نگاہیں اوپر کر کے اسے دیکھا۔ اگرچہ رینالڈ جسامت میں اپنے ہم عمروں سے کافی بڑا تھا لیکن لیون قد میں اس سے اونچی تھی۔ وہ اس سے کم و بیش تین، ساڑھے تین انچ لمبی تھی۔

''تم ان کے پاس سال میں صرف ایک بار ہی کیوں جاتے ہو؟'' اسے خاموش پا کر لیون نے پوچھا۔

رینالڈ خاموش رہا۔ گیریسن اس کے لیے اجنبی جگہ تھی۔ ویسے بھی گیریسن میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر لگتا تھا کہ لیون کو اس بارے میں کافی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ اسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ دونوں بہ دستور ٹھہرے ہوئے تھے۔ کافی دیر بعد اس نے سر اوپر اٹھا کر اس سے نظریں ملائیں اور بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''مما مجھے وہاں ساتھ لے کر نہیں جاتی ہیں۔''

''کیا تمہیں وہاں جانے سے ڈر بھی لگتا ہے؟''

''تھوڑا بہت۔'' رینالڈ نے گول مول جواب دیا۔

''میں جانتی تھی۔'' لیون نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی نظر آرہی تھی۔ ''تم اپنے ڈیڈی سے اس لیے نفرت کرتے ہو کہ وہ گھر نہیں آتے اور وہ لوگ انہیں باہر نکلنے نہیں دیتے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور رینالڈ کو دیکھا۔

وہ بہ دستور خاموش تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر البتہ منہ اترا ہوا تھا۔

''تمہیں پتا ہے میرے پاپا کو نئی نوکری مل گئی ہے۔'' اس نے اچانک بات اپنی طرف پلٹ لی۔ ''میرے پاپا کہہ رہے تھے کہ انہیں اچھی تنخواہ ملے گی۔ اب وہ مجھے نئی سائیکل بھی دلائیں گے، ایک سو ڈالر کی ہے وہ۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

''پھر تو تم بہت خوش ہوجاؤ گی۔''

''ارے...'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''یہ قمیص تم نے کہاں سے لی۔ یہ تو تمہارے سائز سے کافی چھوٹی لگ رہی ہے۔'' اسے رینالڈ کی ہر بات میں کیڑے نکالنے کی عادت تھی۔

''مما ڈزنی لینڈ لے گئی تھیں، وہیں سے خرید کر دی تھی۔'' رینالڈ نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے یہ اچھی لگی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ اسے چھوٹی شرٹ والی بات بری لگی تھی مگر وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس نے شرٹ اچھی لگنے کا جواز اپنے دفاع میں دیا تھا یا اس کی بات جھٹلانے کے لیے۔

لیون تو وہیں رک گئی تھی مگر رینالڈ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ننھے سے ذہن میں لیون کے الفاظ بازگشت کے مانند گونج رہے تھے۔ 'تم اس لیے اپنے باپ سے ملنے نہیں جاتے کہ تمہیں ان سے ڈر لگتا ہے۔ وہ گھر نہیں آتے، اس بات پر تم ان سے ناراض ہو...' اچانک اس نے زور سے سر جھٹکا اور پہیے کو تیز تیز چلاتا ہوا خود بھی اس کے ساتھ دوڑنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پہیے پر لوہے کی سلاخ کو زور زور سے مار کر اپنے اندر کے غصے کو پہیے پر نکال رہا تھا۔

☆☆☆

قصبے کے جنوبی حصے میں صرف ایک ٹریفک سگنل تھا۔ ٹاؤن ہال کے سامنے قائم پارکنگ کا فرش کچی زمین پر مشتمل تھا اور کونے پر بنے ڈاک خانے میں صرف تین ملازمین تھے۔ جے کنٹری اسٹور کے سامنے لگا ٹریفک سگنل روشن تھا۔ اس کے برابر گوشت مارکیٹ تھی جہاں سے گوشت اور خون کی بساند فضا میں پھیل رہی تھی۔ اسٹور کے مرکزی

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر بڑے بڑے فریج رکھے تھے، جن میں انواع و اقسام کی آس کریم، ڈبوں میں بند کھانے، دودھ، دہی اور مکھن وغیرہ سجے تھے۔ شیشے کے دروازے والے فریج سے اندر رکھی ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ فریج کی مخالف سمت میں تیار پیزا، سینڈوچز، برگر، ڈبل روٹی اور بسکٹ سمیت بیس بال سے لے کر سائیکل تک، طرح طرح کی چیزیں گاہکوں کو خریداری پر اکسا رہی تھیں۔ وہیں ایک بڑا سا شوکیس چابی اور بیٹری سے چلنے والے کھلونوں سے بھرا پڑا تھا۔

رینالڈ نے شیشے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میٹ پر اپنے گرد آلود جوتوں کے تلے صاف کیے۔ اندر نظر ڈالی۔ اسٹور کا پالش شدہ لکڑی کا فرش چمچما رہا تھا۔ اس نے اپنے جوتوں پر نظر ڈالی اور باری باری دونوں پاؤں جھٹک کے اُن کی دھول اڑائی اور ایک بار پھر جوتے صاف کرتے ہوئے بائیں طرف دیکھا۔ گوشت مارکیٹ کا واحد دکان دار جے گوشت کاٹ رہا تھا۔ اس کے سامنے مسز ٹورٹیلا کھڑی تھیں۔ رینالڈ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا اور مسز ٹورٹیلا اس کی کلاس ٹیچر تھیں۔

قصاب جے کی بیوی کیرولینا شوہر کا اسٹور چلاتی تھی۔ اس وقت وہ کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ رینالڈ نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو اُس کی نظر پڑ گئی۔ وہ مسکرائی اور جے نے اپنی بیس بال کو چھو کر اس کی مسکراہٹ کا دوستانہ جواب دیا اور اندر داخل ہو گیا۔

''ہیلو رینالڈ... کیسے ہو بچے؟'' کیرولینا نے مسکرا کر احوال پوچھا مگر اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا اور اسٹور کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں ریکس پر کئی طرح کی خوبصورت اور چمکدار رنگوں والی بی ایم ایکس سائیکلیں سجی ہوئی تھیں۔ رینالڈ کھڑا ہو کر ایک سائیکل کو دیکھنے لگا۔

''یہ چھوٹے بچوں کے لیے نہیں ہے۔''

رینالڈ گردن موڑے کیرولینا کی بات سنتا رہا۔ وہ خاموش ہوئی تو اس نے سرخ اور سیاہ رنگ میں رنگی اُس سائیکل کو چھو کر دیکھا۔

آگے بڑھ کر اس پر لگا پرائس ٹیگ سیدھا کیا۔ ''صرف 219 ڈالر۔''

''یہ سپر ماریو کی پہاڑی چڑھائی پر چڑھنے کے لیے بہترین ہے کیا تم بھی چلاؤ گے۔''

''نہیں۔'' رینالڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے سے افسردگی جھلک رہی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو رینالڈ؟'' کیرولینا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے استفساریہ لہجے میں کہا۔

''بالکل ٹھیک۔'' اس نے کیرولینا کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اے بات سنو...'' جب کیرولینا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر تشویش بھرے لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''سنو...'' اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتا کیرولینا نے پکارا۔ ''اندھیرا ہو چکا ہے میں جے سے کہتی ہوں، وہ تمہیں اپنی موٹر سائیکل پر گھر چھوڑ آئے۔''

''شکریہ۔'' رینالڈ نے دروازہ کھولا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔

''مسٹر جے... ذرا جلدی بنا دو، ابھی جا کر مجھے کباب بھی بنانے ہیں ڈنر کے لیے۔'' مسز ٹورٹیلا کہہ رہی تھیں۔

''بس! دو منٹ رک جاؤ۔'' جے قیمہ بناتے بناتے رکا۔ ''کباب کا قیمہ ہے، ذرا باریک بنانا پڑتا ہے۔''

''کباب...'' رینالڈ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دوپہر سے بھوکا تھا۔ اسے کباب بہت پسند تھے۔ کباب کا نام سنتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

''اے سنو...'' کیرولینا دروازے کی طرف بڑھی مگر رینالڈ پہیہ گھماتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی مگر وہ دوڑتا ہوا ٹریفک سگنل سے آگے نکل کر اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح رینالڈ بھرے پُرے جمنازیم میں کھڑا تھا۔ سبز جمپنگ سوٹ میں ملبوس افراد باسکٹ بال میدان کے ایک طرف قطار بنائے کھڑے تھے۔ وہ ان کے دوسری جانب کھڑے لوگوں میں شامل تھا۔ بیچ میں باسکٹ بال گراؤنڈ کا پختہ فرش تھا۔ دونوں طرف کھڑے لوگوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔ اسی دوران ایک شخص نیٹ باسکٹ کے عین نیچے رکھے ڈائس پر آیا۔ رینالڈ کی نظریں اٹھیں اور اس شخص پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا ہوا تھا۔ ''ہینک رینالڈ۔'' اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے پہلا نام پکارا۔ سبز جمپنگ سوٹ میں ملبوس ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھتا ہوا سیدھا رینالڈ کی طرف آیا۔ آتے ہی اس نے نہایت گرمجوشی سے رینالڈ کو اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ بے آستین شرٹ کی وجہ سے اس کے مضبوط بازوؤں پر بینگنی رنگ کا

ایک ٹیٹو بنا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔ یہ باریک سا سانپ تھا۔

ڈیڈی سے گلے ملتے ہی رینالڈ کے پورے سال بھر کے گلے شکوے دور ہو گئے۔ وہ اس جگہ سے نفرت کرتا تھا۔ اسے یہاں آنا قطعاً ناپسند تھا چاہے وہ سال کے تین سو پینسٹھ میں سے صرف ایک دن ہی کیوں نہ ہو مگر یہ اُس کی مجبوری تھی۔ یہاں اس کا باپ رہتا تھا۔

وہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں لوہے کے مضبوط گیٹ سے گزر کر دوسری طرف جانا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے سیکیورٹی گارڈ نے اُن کی میٹل ڈی ٹیکٹر سے تلاشی لی۔ جب اس کی ماں کی تلاشی لی تو ڈی ٹیکٹر کی بیپ بج اٹھی۔ اس کے وینٹی بیگ سے چھوٹا سا چاقو نکلا تھا جسے گارڈ نے رکھ لیا اور اس کی دل کھول کر سرزنش کی۔ وہ یہ چاقو اپنے ساتھ رات کو نکلتے وقت خود حفاظتی کے خیال سے رکھتی تھی، جو یہاں آتے ہوئے غلطی سے وینٹی بیگ میں رہ گیا تھا۔ اس نے گارڈ سے بھی یہی کہا تھا مگر وہ اس کی بات کو سچ ماننے پر تیار ہی نہ تھا۔ رینالڈ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ جگہ ویسے ہی ناپسند تھی۔ اب سپاٹ چہرے والے گارڈ کا رویہ دیکھ کر اسے مزید نفرت ہو چکی تھی۔

جب رینالڈ اپنے باپ سے مل رہا ہوتا تھا تو ہولسٹر میں لگے پستول پر ہاتھ رکھے اُن کے گرد کوئی نہ کوئی گارڈ منڈلاتا رہتا تھا۔ اسے ان محافظوں سے بھی نفرت تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے خونخوار اور درشت چہرے والوں کے درمیان شاید اس کا باپ محفوظ نہیں تھا۔ اس کی وجہ وہ جانتا تھا۔ اُس کا باپ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ کوئی پنگا لینے کی کوشش کرتا تو وہ معاملے کو فوراً اپنے ہاتھ میں لے کر انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی لیے وہ سیکیورٹی عملے کو دیکھ کر سوچتا تھا کہ اگر کبھی کوئی اس کے باپ سے الجھا تو صورتِ حال سنگین بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال، بات کچھ بھی ہو، اسے اپنے باپ سے بہت محبت تھی اور وہ بہر صورت اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا تا کہ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہے، خواہ یہ ملاقات سال میں صرف ایک دن ہی کی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے یہ ایک دن بھی غنیمت تھا۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹا تو سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی سے ملنے کے بعد جب وہ لیون سے ملے گا تو خاصی شرمندگی محسوس کرے گا۔

''جب میں یہاں سے باہر آؤں گا، تب ہم ڈزنی لینڈ گھومنے چلیں گے۔'' چلتے چلتے ہینک نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم میلے میں بھی جائیں گے اور خوب مزے کریں گے۔''

''جانتا ہوں، ہم بہت مزے کریں گے۔'' رینالڈ نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

''وعدہ... ضرور چلیں گے۔'' ہینک نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر پُرامید لہجے میں کہا۔ یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''ڈیڈی آپ رو رہے ہیں؟''

''نہیں بیٹا...'' اس نے بہ دستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ آپ کبھی رو بھی سکتے ہیں۔'' رینالڈ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ باپ کے ہاتھ پر اس کی گرفت مزید سخت ہو چکی تھی۔

''اور تم سناؤ...'' اس نے چند لمحے بعد اپنی نم پلکیں صاف کر کے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''اسکول میں کیا کرتے رہتے ہو؟'' وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر خوش ہونے کا تاثر دے رہا تھا۔

''بس...'' اس نے سر ہلایا۔ ''اسکول کا کام اور کچھ نہیں۔''

''خیر تم کچھ نہ کہو مگر میں سمجھتا ہوں۔'' ہینک نے گہری سانس لے کر بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جیل میں زندگی بسر کرنے والے باپ کے کمسن بیٹے کو ساتھیوں کی طرف سے کس طرح کے منفی ردِعمل کا سامنا ہوتا ہوگا۔

''تمہارے ہم جماعت تو تم سے ٹھیک برتاؤ کرتے ہیں؟'' اس نے بیٹے سے پوچھا۔ ''خیر... کوئی بھی بات ہو، تمہیں ان سے نہیں الجھنا چاہیے۔''

رینالڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کی نظریں اس کے پاؤں پر جمی تھیں۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور باپ کو ایسے دیکھا جیسے اس کے تاثرات جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''میری بات سنو بیٹے۔'' اس نے بڑے پیار سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''کوئی کچھ کہے، کوئی تمہارے ساتھ جیسا چاہے رویہ رکھے مگر تمہیں تحمل کا ثبوت دینا ہے۔ تم عزت دار اور بہادر ہو۔ اپنے رویے سے عزت اور بہادری کا ثبوت دو۔''

''مگر ڈیڈی...'' رینالڈ نے ہچکچاتے ہوئے بات شروع کی۔ ''میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں مگر...'' وہ کہتے کہتے رکا اور کچھ توقف کے بعد دوبارہ بات شروع کی۔ ''آپ میرے ساتھ نہ ہوں

تو مجھے بہت غصہ آتا ہے، بُرا لگتا ہے سب کچھ۔'' اس نے شکایتی لہجے میں بات مکمل کی۔

''مجھے بھی تمہارے بنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' ہینک نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ''میری بھی خواہش ہے کہ تمہارے ساتھ رہوں، تمہارے ساتھ کھیلوں۔ ہم سب مل کر پکنک پر جائیں۔ موج مستیاں کریں مگر...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم سمجھتے ہوگے کہ کیا مجبوری ہے جو میں ایسا نہیں کرسکتا۔ تمہیں مجھ سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ زندگی میں تمام تر پریشانیوں کے باوجود بھی ایسا کچھ کرنے سے گریز کرو جس کی وجہ سے تمہیں یہاں زندگی گزارنا پڑے۔ جیل آزادی ہی نہیں اور بہت کچھ بھی چھین لیتی ہے ہم سے۔'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''تم سمجھدار بچے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کا یہ بدترین تجربہ تمہیں آنے والے وقت میں زندگی گزارنے کا سبق دے گا۔''

رینالڈ خاموشی سے باپ کی بات سن رہا تھا۔ اس کی ماں کافی فاصلے پر درخت تلے بچھی بینچ پر بیٹھی تھی۔ جیل قواعد کے مطابق قیدی اپنے بچوں کے ساتھ سال میں ایک پورا دن گزار سکتے تھے۔ اس روز انہیں جیل کے مخصوص احاطے میں وقت گزارنے، بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کی اجازت ہوتی تھی۔ آج وہی دن تھا۔ ہینک کی اپنے بیٹے سے سالانہ ملاقات کا دن۔ بیوی تو ہفتہ دس دن بعد ہینک سے ملنے آتی رہتی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمسن رینالڈ باپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھے۔ اس لیے وہ سال میں صرف ایک بار مخصوص دن پر ہی اسے ملانے لاتی تھی۔ باقی کے سارے دن وہ باپ کی تصویر کے ساتھ گزارتا تھا۔

''آؤ... بیس بال کھیلیں۔'' ہینک بیٹے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔ ریک میں سے ایک بال اٹھائی اور بچے کے ساتھ بچہ بن کر کھیلنے لگا۔

''ڈیڈی...'' کھیلتے کھیلتے رینالڈ چلایا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بیس بال پھینک کر بیٹے کی طرف بڑھا۔

''ٹاؤن میں میری ایک دوست ہے۔ لیون نام ہے اس کا۔'' رینالڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جانتی ہے کہ تم یہاں کیوں ہو۔ اسی لیے یہاں آنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

ہینک نے بیٹے کو بڑے پیار سے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بینچ پر بٹھایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''دیکھو بیٹا...'' اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ ''یہاں کوئی بھی ڈرانے والی چیز نہیں۔ لیون نے تم سے سچ نہیں کہا ہوگا۔'' ''تم خوامخواہ پریشان مت ہو اور ہاں... یہاں آنے سے خوف زدہ مت ہونا۔ تمہیں خوف زدہ کرنے والی کوئی چیز یہاں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''جب میں ساتھ ہوں تو تمہیں کسی چیز سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ شفیق باپ کی طرح بیٹے کو تسلی دے رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لیون نے ضرور اس سے الٹی سیدھی باتیں کی ہوں گی، تبھی وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے کچھ سہما سا لگ رہا تھا۔

رینالڈ نے باپ کی بات سن کر کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بیٹا... کچھ امیر والدین کے بگڑے بچے تمہیں پریشان کرنے کی کوشش کریں گے، کرتے بھی ہوں گے مگر تم ان کی کبھی پروا مت کرنا... سمجھے۔''

رینالڈ نے ایک بار پھر ہاں میں سر ہلایا۔ ''ویسے لیون کو میرا سیاہ فام ہونا بھی پسند نہیں۔'' رینالڈ نے بھولپن سے کہا۔

بیٹے کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور پھر چند منٹ کی خاموشی کے بعد اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''سیاہ فام ہونا بری بات نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر لمحہ بھر کا توقف کیا۔ ''اس طرح کے لوگ تمہیں پوری زندگی ملتے رہیں گے۔ تمہیں احساس دلائیں گے کہ تم سیاہ فام اور غلاموں کی اولاد ہو مگر ان کی پروا مت کرنا۔ ہمارے پاس کچھ نہیں مگر پھر بھی اُن کے مقابلے میں ہمارے پاس وہ بہت کچھ ہے جو اُن کے پاس نہیں۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس طرح کے لوگوں سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے۔'' رینالڈ غور سے باپ کی نصیحت آموز گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ اس کے پلّے پڑ رہا تھا، کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا مگر پھر بھی وہ پوری توجہ سے بات سن رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب اگر وہ تمہیں تنگ کرے یا سیاہ فام کہہ کر تمہارا مذاق اڑائے تو کہہ دینا کہ کالے ہیں تو کیا ہوا مگر ہم بھی کسی سے کم نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ہینک کا لہجہ مضبوط اور پُرعزم تھا۔

☆☆☆

اتوار کی صبح اسکول سے چھٹی تھی۔ رینالڈ ناشتے کے بعد گھر سے نکلا۔ وہ مرکزی سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بازار شروع ہوگیا۔ بازار سے پہلے وہ لیٹنگن بار کے قریب سے گزرا۔ چند روز پہلے ہی جو رات کو اچانک بھڑکنے والی آگ کے باعث راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔

ملبے کے سامنے قصبے کے بچوں کے لیے بنایا گیا باسکٹ بال رِنگ تھا۔ سرخ اور نیلی شرٹس میں اس کے ہم عمر چھ لڑکے لڑکیاں تین تین کی ٹیم بنا کر کھیل رہے تھے۔ ایک باسکٹ کا نیٹ ٹوٹا ہوا تھا اور دونوں ٹیمیں ایک ہی نیٹ پر کھیل کر کامیاب ہونے کی کوشش کررہی تھیں۔ وہ انہماک سے اپنے ہم عمروں کو کھیلتے دیکھ رہا تھا۔

''تم تو گیریسن گئے تھے نا، کیسا رہا؟''

سامنے لیون کھڑی تھی۔ وہ باسکٹ بال کھیل رہی تھی مگر اسے دیکھ کر کھیل چھوڑ کر اس کے قریب آگئی۔ رینالڈ نے جواب دینا چاہا مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا اور اس پر گہری نظر ڈالی۔ رینالڈ کو باسکٹ بال کھیل پسند تھا اور خود لیون بھی کھیلتی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اسکٹ میکرونی بھی کھیل چھوڑ کر آگیا۔ عام طور پر اسکٹ، رینالڈ کی ٹیم میں کھیلتا تھا۔

''تم اپنے ڈیڈی سے ملنے گئے تھے؟'' اسے خاموش دیکھ کر اسکٹ نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

رینالڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں وہاں جا کر ڈر تو لگا ہوگا؟'' لیون نے وہ بات کہی جس کی رینالڈ کو توقع تھی۔

''نہیں...''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''نہیں لیون... مجھے وہاں بالکل بھی ڈر نہیں لگا۔ میں تو اپنے ڈیڈی کے ساتھ تھا پھر ڈر کس چیز کا؟''

''تمہارے ڈیڈی بہت خوفناک آدمی ہیں، ان سے سب کو ڈر لگتا تھا۔ لوگ اُن سے خوف زدہ رہتے تھے۔'' لیون نے اس طرح کہنا شروع کیا جیسے وہ چاہتی ہو کہ رینالڈ اپنے خوف کا اعتراف کرے۔ ''ایک مرتبہ تو ان سے اسکٹ بھی ڈر گیا تھا۔''

''مجھے پتا نہیں تم کب کی بات کررہی ہو۔'' لیون کی بات سنتے ہی اسکٹ نے جلدی سے تردید کی۔ ''اب اگر رینالڈ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں جا کر قطعی خوف زدہ نہیں ہوا، تو نہیں ہوا ہوگا۔'' اس نے اس طرح یہ بات کہی جیسے اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا ہو۔

''ویسے تم ہوتے کون ہو اس طرح کی بات کرنے والے۔'' رینالڈ نے اس کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر اسکٹ گڑبڑا گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد رینالڈ پر نظر ڈالی۔ ''میرے خیال میں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''میں جیل میں اپنے ڈیڈی سے ملنے گیا تھا اور اُن سے مل کر قطعی خوف زدہ نہیں ہوا۔'' اس نے دونوں کے چہروں پر طائرانہ نظریں ڈالتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''یہ دیکھو...'' اس نے انگلی سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہیٹ میرے ڈیڈی نے دیا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے سے تفاخر جھلک رہا تھا۔

''وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ انہوں نے تمہارے لیے کسی دوسرے کا یہ ہیٹ چرایا ہوگا۔'' لیون نے جھٹ سے ایک بار پھر اس کی بات کو جھٹلا دیا۔

''یہ بکواس ہے، تم جھوٹی ہو۔''

''تم جھوٹے ہو۔'' لیون نے غصے سے کہا۔ ''میں سفید فام ہوں اور تم نیگرو...'' اس کے لہجے سے نسل پرستی صاف ظاہر تھی۔ ''تم لوگ ایسے ہی ہوتے ہو... چور، اُچکے، بدمعاش، جھگڑالو۔''

اس کی بات سن کر رینالڈ کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ خاموش رہا۔ ویسے بھی لیون کی بات سن کر خود اسکٹ بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ اسی دوران سر پر کوا بولا۔ رینالڈ نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پھر اپنے باپ کی کہی بات کو ذہن میں دُہرانے لگا۔ ''تمہیں اپنی عزت اور احترام کا خیال کرنا ہوگا۔ ہم سیاہ فام ہیں مگر کسی سے کم نہیں۔'' رینالڈ نے سر اٹھا کر غور سے لیون اور اسکٹ کو دیکھا اور پھر بنا کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

اسے اپنے ڈیڈی کی کہی باتیں یاد آرہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک اسے اپنے عقب سے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اسکٹ، لیون اور ان کے دوسرے سفید فام ساتھی مل کر اسے پیٹ رہے تھے۔

☆☆☆

''اوہ میرے خدا تم بھی نا رینالڈ...'' وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا کہ اس کی ماں نے دروازہ کھلنے کی آہٹ سنتے ہی کہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ تڑپ کر صوفے سے اٹھی۔ ''یہ کیا ہوا؟'' وہ گھبرا گئی تھی۔

رینالڈ کی دائیں آنکھ سوج کر تقریباً بند ہوچکی تھی۔ ہونٹ کٹا ہوا تھا اور منہ سے بہنے والا خون خشک ہو کر اس کی ٹی شرٹ کے اگلے حصے پر جم چکا تھا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''تم تو ٹہلنے کے لیے گئے تھے، پھر یہ سب کچھ کیا

ہوا؟'' اس نے بیٹے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''ادھر آؤ۔'' اس نے ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ''چلو... صوفے پر بیٹھو۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ''میں دوا لاتی ہوں۔''

''رہنے دیں مما، یہ تو بس یونہی ذرا سی...''

''ذرا سی...'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔ ''اتنا خون بہا ہے۔ ہونٹ پر کٹ صاف نظر آرہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی۔ ''یہیں بیٹھے رہو۔''

رینالڈ خاموشی سے صوفے پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے پلٹی تو اس کے ہاتھ میں گرم پانی سے بھیگا تولیا اور دواؤں کا ڈبہ تھا۔ اس نے نم تولیا سے اس کی آنکھیں، ہونٹ اور چہرے پر لگا خون صاف کیا۔ ''کوئی بڑی چوٹ نہیں ہے۔ دوا لگاتی ہوں۔ صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹنکچر میں بھیگی روئی اس کے ہونٹوں کے کٹ پر لگائی۔

''اوہ مما...'' رینالڈ ہلکا سا کراہا۔ ''جلن مچ رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' اس نے بڑے پیار سے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دی۔ ''مجھے اس بارے میں تمہارے ڈیڈی سے بات کرنا ہوگی۔''

''نہیں مما...'' وہ منمنایا۔

''کل تم جب ڈیڈی سے ملے تھے تو انہوں نے یہ مار کٹائی کرنے کو کہا تھا۔'' ٹنکچر لگانے کے بعد وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے رینالڈ سے بولی۔

''نہیں مما...'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''بس! ذرا سی بات ہوگئی ہے، تم خوامخواہ پیچھے پڑے جا رہی ہو۔'' اس نے ماں کی سرد آنکھوں میں جھانکا اور اگلے ہی لمحے نظریں نیچی کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس بات کو بھول جائیں۔'' وہ صوفے سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ وہ پُرتشویش نگاہوں سے اپنے دس سالہ بیٹے کو کمرے سے باہر جاتا دیکھ رہی تھی۔

''میری بات سنو رینالڈ...'' اس نے پیچھے سے بیٹے کو پکارا۔ ''تم ٹھیک نہیں کر رہے، تمہارا باپ ایک اچھا آدمی نہیں ہے اور تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بھی ٹھیک نہیں۔'' رینالڈ کمرے سے نکلتے نکلتے رکا اور پلٹ کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اسی طرح کی غلط حرکتوں کے باعث وہ جیل تک پہنچا ہے مگر تم اپنے ڈیڈی سے کچھ سبق لینے کے بجائے اُلٹا اسی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے ہو۔'' وہ دم بخود دکھڑا اماں کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہا تھا۔ ''جانتے ہو ان حرکتوں کا انجام۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔

''تم غلط کہہ رہی ہو، ڈیڈی برے آدمی نہیں ہیں۔'' رینالڈ نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''وہ اچھا آدمی بھی ہرگز نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ ''بہت جلد تمہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ٹھیک آدمی نہیں تھا۔''

''تم جھوٹ بولتی ہو مما...'' وہ چلّایا۔ ''میرے ڈیڈی برے آدمی نہیں ہیں۔ وہ بہت جلد جیل سے رہا ہو کر آئیں گے اور ہمارے ساتھ رہیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا اور ماں کو معنی خیز نگاہوں سے گھورنے کے بعد کہنے لگا۔ ''وہ آجائیں گے تو کم از کم مارٹی کا آنا جانا تو بند ہوگا۔''

''بکواس بند کرو۔'' مارٹی کا نام سنتے ہی وہ چلّائی۔ ''تمہیں کوئی حق نہیں ہے اس کے بارے میں اس طرح بکواس کرنے کا۔'' وہ غصے سے کھڑی ہوئی۔

''میرے ڈیڈی برے آدمی نہیں، تم بھی انہیں اس طرح نہ کہا کرو۔'' یہ کہہ کر وہ دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہو کر کنڈی لگائی اور بستر پر گر پڑا۔ اس کا پورا جسم غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پلکیں نم تھیں اور دماغ مختلف سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا مگر پھر بھی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں مما اسے مارنے کے لیے کمرے میں نہ پہنچ جائیں مگر وہ جانتا تھا کہ مارٹی آنے والا ہوگا۔ مارٹی کی وجہ سے اسے نہ تو بیٹے کی پروا تھی اور نہ شوہر کی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنے باپ کو شدت سے یاد کر رہا تھا۔ یہ باپ اور بیٹے کا معاملہ تھا مگر ماں کو اس سے زیادہ اپنے بوائے فرینڈ کی فکر تھی۔ جب سے شوہر جیل گیا تھا، تب سے مارٹی ہر شام ان کے گھر آتا اور پھر رات گئے تک دونوں لیونگ روم میں اکیلے وقت گزار دیتے تھے۔ جب تک مارٹی گھر پر رہتا۔ رینالڈ کا لیونگ روم میں داخلہ ممنوع ہوتا۔ یہ دونوں باتیں اسے سخت ناپسند تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح اس کا باپ جلد سے جلد جیل سے رہا ہو کر آجائے تاکہ مارٹی اور اس پر ماں کی عائد بے جا پابندیاں ختم ہو سکیں۔ ماں کا یہی رویہ تھا، جس کے باعث وہ جیل میں قید باپ کے مزید قریب اور گھر میں بہت زیادہ تنہا ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اپنے ڈیڈی کے بارے میں ایک بھی نازیبا لفظ سننے کا روادار نہیں تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اسکٹ اور اس کے ساتھی اس کی پٹائی نہ کرتے۔ جب وہ میدان سے پلٹا، تب انہوں نے زور زور سے چلاتے ہوئے اس کے باپ کو بدمعاش، قیدی اور نہ جانے کیا کچھ کہا تھا۔ وہ برداشت نہ

کر سکا مگر پھر بھی آگے بڑھتا رہا۔ اس پر بھی ان کا دل نہ بھرا تو پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ یہ ایک تھا اور وہ کئی۔ ایک تو اس بے چارے کو بری طرح مار پڑی۔ اوپر سے ماں کی لعن طعن... وہ بے حد پریشان تھا۔ اچانک بے دھیانی میں اس نے آنسوؤں سے تر گالوں کو تکیے سے رگڑ کر صاف کیا۔ زخمی ہونٹ بھی تکیے سے رگڑ گیا۔ درد کی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ ''ڈیڈی...!'' رینالڈ نے زور سے کراہتے ہوئے باپ کو پکارا اور تکیے میں منہ دے کر ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگا اور اسی حالت میں بھوکا پیاسا سو گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن پیر تھا۔ اسکول کی آدھی چھٹی ہوئی تو وہ کھیلنے کے لیے میدان میں پہنچا۔ وہ اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا کہ کوئی اس کے ساتھ باسکٹ بال کھیلنے پر تیار ہو۔ لیون بھی میدان میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کی جماعت کے سارے ساتھی جانتے تھے کہ رینالڈ کھیلنا چاہتا ہے مگر کوئی اسے اپنے ساتھ کھلانے پر تیار نہ تھا۔ سب کو پتا تھا کہ وہ قیدی کا بیٹا ہے اور کل ہی اس کی کچھ ساتھیوں نے مل کر ٹھکائی بھی کی تھی۔

''اے رینالڈ، اِدھر آؤ۔'' وہ میدان کے کنارے کھڑا تھا کہ کلاس ٹیچر مسز ٹورٹیلا نے اسے دیکھ کر پکارا۔ ''لگتا ہے آج تمہارا موڈ کھیلنے کا نہیں ہے۔'' اس نے آوازِ بلند اپنی بات مکمل کی۔

''نہیں ٹیچر، ایسی بات نہیں۔'' رینالڈ نے جواب دیا۔

اسی دوران وہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''رینالڈ...'' وہ اسے حیران نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ ''پچھلے ویک اینڈ پر تم اپنے ڈیڈی سے ملنے جانے والے تھے، ملاقات کر آئے؟'' ٹیچر نے کچھ لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

''ہاں۔'' رینالڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم تو اپنے ڈیڈی سے مل کر بہت خوش ہوئے ہوگے؟''

''ہاں... اور بہت دکھی بھی ہوا تھا۔'' رینالڈ نے تیزی سے جواب دیا۔

مسز ٹورٹیلا نے اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لی

کہاوتیں

○ سات پانچ مل کیجیے کاج، ہارے جیتے نہ آوے لاج۔

☆ (صلاح مشورے سے کام کیا جائے تو ناکامی کے بعد بھی شرمندگی نہیں اٹھانی پڑتی۔)

○ سخی دے اور شرمائے، بادل برسے اور گرمائے۔

☆ (سخاوت کرنے والا دے کر احسان نہیں جتاتا۔ بادل برستا ہے تو گرجتا بھی جاتا ہے۔)

○ کھیت کھائے گدھا، مارا جائے جولاہا۔

☆ (قصور کوئی کرے اور سزا کسی کو ملے۔)

○ کھیل بتاشوں کا میل ہے۔

☆ (نہایت موزوں ہے، خوب جوڑی ملی ہے)۔

○ کہوں تو ماں ماری جائے، نہ کہوں تو باوا کتا کھائے۔

☆ (اس موقع پر کہتے ہیں جب کسی بات کے کہنے اور نہ کہنے، دونوں طرح خرابی پیدا ہونے کا ڈر ہو۔)

○ کیسے میں نہیں کھل کی ڈلی، بانکا پھرے گلی گلی۔

☆ (مفلسی میں اترانا۔)

○ گھبرائی ڈومنی پھر پھر سہیلے گائے۔

☆ (گھبراہٹ کے وقت عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔)

○ گھر میں نہیں تاگا، البیلا مانگے پاگا۔

☆ (باپ بے مقدور ہے مگر بیٹا شیخی باز ہے۔)

○ گھڑی پل کی آس نہیں، کہے کال کی بات۔

☆ (دم بھر کا بھروسا نہیں اور کل کا بندوبست کرتے ہیں۔)

○ مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہات (ہاتھ) تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات۔

☆ (دولت مند ہی کو اور دولت ملتی ہے۔ امیر لوگ امیر ہی کو ملتے ہیں، غریب کو کوئی نہیں پوچھتا۔)

مرسلہ: انعم رشید، لاہور

اور پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگیں۔ ''تم سال میں ایک مرتبہ ان سے ملنے جاتے ہونا...!''

رینالڈ نے منہ سے کچھ نہ کہا بلکہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں یہ دکھ ابھی پانچ مرتبہ اور سہنا پڑے گا۔'' مسز ٹورٹیلا نے اس کی طرف رحم بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

رینالڈ ان کی بات سن چکا تھا مگر کچھ بولا نہیں۔ وہ انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ مسز ٹورٹیلا اسے بہت پسند تھیں۔ وہ ایک اچھی ٹیچر تھیں۔ اسے ان کی مسکراہٹ بہت اچھی لگتی تھی۔ تصنع سے پاک اور بے لوث۔ وہ جانتی تھیں کہ رینالڈ کا باپ کئی برسوں کے لیے جیل میں قید ہے۔ اس لیے وہ دوسرے بچوں کی نسبت اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اسے لطیفے اور کہانیاں سناتیں۔ اسکول سے باہر آتے جاتے کہیں مل جاتیں تو رک کر اس سے پیار بھرے لہجے میں بات کرتیں۔ وہ اس کے ہم جماعتوں کی طرح اسے مذاق کا نشانہ نہیں بناتی تھیں۔ وہ سفید فام تھیں مگر اس کے باوجود وہ لیون کی طرح اس سے نفرت نہیں کرتی تھیں۔ اس وقت وہ زرد رنگ کا بہت خوب صورت سوئیٹر پہنے ہوئے تھیں۔ رینالڈ کو ان کا سوئیٹر بہت پسند تھا۔ کئی بار اس نے چاہا کہ اپنی ماں سے کہے کہ وہ اپنے لیے ایسا ہی سوئیٹر خریدیں مگر چاہنے کے باوجود وہ یہ بات کبھی نہیں کہہ سکا تھا۔

''اسکول کی بریک تفریح کے لیے ہوتی ہے۔ اسے یوں ضائع نہ کیا کرو۔'' ٹیچر نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ، اپنے ساتھیوں کے ساتھ جا کر کھیلو۔''

''اچھا...'' رینالڈ نے آہستگی سے کہا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ سب کچھ کہہ دے۔ انہیں بتا دے کہ ہم جماعت اس کے باپ کے جیل میں ہونے کے باعث اسے بھی مجرم سمجھتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کھیلنے سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ اسے دھتکارتے ہیں۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کل شام کی لڑائی کی بات بھی ٹیچر... کو بتا دے مگر وہ خاموش رہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جو کچھ ہو چکا، جو ہو رہا ہے اور جو کچھ آگے ہونے والا ہے، وہ صرف اس کے باپ کی وجہ سے ہے۔ وہ ڈیڈی اور اپنے بیچ کسی کو شراکت دار نہیں بنانا چاہتا تھا۔ دو روز پہلے اس کے ڈیڈی نے کہا تھا کہ اسے بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہ بہادر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے دکھ اپنے اندر دفن کرنا چاہتا تھا۔

اس نے جھکی ہوئی نظریں اوپر اٹھائیں۔ سامنے مسز ٹورٹیلا اینٹوں کے فرش پر اونچی ایڑی کے جوتے سے کھٹ کھٹ کرتی واپس جا رہی تھیں۔ وہ انہیں بہت پیار بھری نظروں سے جاتا دیکھتا رہا۔

سامنے کھیل کا میدان تھا، لیون اور اس کے دیگر ہم جماعت باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ کاش وہ بھی ان کے ساتھ کھیل رہا ہوتا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سر کو زور سے جھٹکا۔ اسے اندازہ تھا کہ بریک ختم ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔

دوپہر کو اسکول سے گھر لوٹتے ہوئے وہ ایک بار پھر جے کنٹری اسٹور میں داخل ہوا۔ سیدھا اس حصے کی طرف بڑھا جہاں سائیکلیں رکھی تھیں۔ اس نے پیٹھ پر لدا تھیلا اتار کر نیچے رکھا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس سائیکل کو غور سے دیکھنے لگا، جس کو حاصل کرنے کی خواہش اس کے دل میں شدت اختیار کر چکی تھی۔

اس لمحے رینالڈ کو اسٹور کے سامنے کھڑی اپنی سائیکل یاد آ گئی۔ سال خوردہ سائیکل کی گدی بے آرام تھی۔ اس کے فریم کا رنگ جگہ جگہ سے اتر چکا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چلنے کے باعث اس کے ٹائر گھس گئے تھے۔ فریم جگہ جگہ سے زنگ آلود تھا۔ کئی جگہ پر تو سائیکل فریم اتنا خراب تھا کہ اکثر چلاتے ہوئے اسے نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ سردیوں میں چلاتے ہوئے اگر ذرا سی بے احتیاطی ہوتی تو اس کی پتلون اس میں پھنس کر پھٹ جاتی تھی۔ گرمیوں میں وہ نیکر پہنتا تھا اور کئی بار فریم کی وجہ سے اس کی ٹانگوں پر تکلیف دہ گہری خراشیں پڑ چکی تھیں۔ نتیجے میں اسے اپنی بددماغ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

اگر اس کا باپ جیل کے بجائے گھر پر ہوتا اور روز صبح اپنی فیکٹری میں کام پر جاتا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس کا باپ جیل میں تھا اور ماں بے سہارا۔ وہ جیسے تیسے اپنا اور اس کا پیٹ بھر رہی تھی۔

رینالڈ نے سر جھٹک کر خود کو سوچوں کے سمندر سے باہر نکالا اور ایک بار پھر سائیکل کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ اس کی گدی پر ہاتھ پھیرا۔ ''کاش، اس وقت ڈیڈی میرے ساتھ ہوتے۔'' اس نے امید بھرے لیکن شکستہ لہجے میں خود کلامی کی۔ اس لمحے رینالڈ کو شدت سے احساس ہوا کہ باپ کے بنا یہ آزاد دنیا اس کے لیے جیل کی طرح ہے۔

''کیوں... خوبصورت ہے نا یہ سائیکل۔''

رینالڈ نے یہ سنتے ہی گردن موڑی۔ پیچھے قصاب جے کھڑا تھا۔ وہ اس اسٹور کا مالک بھی تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...؟'' رینالڈ نے یہ سنتے ہی منہ بنا کر پوچھا۔

جے فوراً مسکرا دیا۔ ''ارے مذاق کر رہا تھا بچے۔ لگتا ہے تمہیں میری بات کا بُرا لگا۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا۔ ''ویسے کیا بات ہے، تم اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے؟'' اس نے ایک بار پھر کہی ہوئی بات دہرا دی۔

''کچھ نہیں۔'' رینالڈ نے بددلی سے جواب دیا۔

''ویسے اس طرح چیزوں کو دیکھتے نہیں ہیں۔'' اس نے کندھے پر لٹکتے سفید تولیا کو اتار کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

رینالڈ کی نظریں بہ دستور سائیکل پر گڑی تھیں۔ اس نے جے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پھر کئی منٹ کے بعد خاموشی سے پلٹ کر اسٹور سے باہر نکل گیا۔

جب رینالڈ اسٹور سے نکل کر مرکزی سڑک پر پہنچا تو اس وقت سہ پہر کے سوا تین بج رہے تھے۔ وہ اپنے بھاری اسکول بیگ کو پیٹھ پر لادے آہستہ آہستہ پاؤں پیڈل پر مارتے ہوئے ریڈل روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی ایک آنکھ ہلکی ہلکی سوجی ہوئی تھی۔ آنکھ کے نیچے مار کے باعث پڑنے والا نیل بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگلی بار جب ڈیڈی سے ملے گا، تب انہیں اس بارے میں ضرور بتائے گا۔ وہ ڈیڈی سے کہے گا کہ اس دن اس کے ساتھیوں نے نہایت بے رحمی سے اس کی پٹائی کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ڈیڈی یہ بات جانتے ہوں گے کہ اس کی ہم جماعت لیون نسل پرست ہے۔ وہ بھول چکا تھا کہ پچھلی ملاقات میں وہ یہ بات خود انہیں بتا چکا تھا۔

اپنی سوچوں میں گم وہ آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ مرکزی سڑک سے اتر کر گھر جانے والے راستے پر مڑا۔ وہ لیون لینڈیز کے گھر کے ڈرائیووے کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں لیون کی آواز پڑی۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر دیکھا، وہ چار، چار ساتھیوں کی ٹیم بنا کر باسکٹ بال کھیل رہی تھی۔ باسکٹ بال رینالڈ کی کمزوری تھا۔ اس نے بریک پر دباؤ ڈالا اور سائیکل روک کر پاؤں زمین پر ٹکا کر کھیل دیکھنے لگا۔ باسکٹ اور بال دیکھ کر وہ بے خود ہو گیا۔ یہ بھی بھول گیا کہ اسکول ختم ہوئے تین گھنٹے گزر چکے ہیں اور وہ گھر جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ لیون اور اس کے ساتھی اُس سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں کل شام پڑنے والی مار بھی بھول چکا تھا۔ وہ سائیکل سے اترا اور ہینڈل تھام کر لینڈیز ہاؤس کے ڈرائیووے کی طرف بڑھنے لگا۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، لیون بال ہاتھ میں لیے باسکٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اسی دوران رینالڈ پر اس کی نظر پڑی اور فوراً ہی اس کے پاؤں تھم گئے۔ اس کے رکتے ہی کھیل بھی رک گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر ہر شے کو روک دیا ہے۔ اسی دوران رینالڈ باسکٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا تھا۔ لیون کینہ توز نگاہوں سے اسے گھورے جا رہی تھی۔ رینالڈ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے پاؤں بھی جیسے زمین میں گڑ چکے تھے۔ اس کا ذہن خالی تھا

اچھی خبر

ایک صاحب نے ایک شام گھر میں داخل ہوتے ہی یہ محسوس کر لیا کہ آج ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''آج تم مجھے کوئی بری خبر نہیں سنانا، کوئی اچھی خبر سناؤ۔''

بیوی نے کچھ سوچا، پھر بولی۔ ''آج ہمارے سات بچوں میں سے چھ بچوں نے اپنے ہاتھ کی ہڈی نہیں توڑی ہے۔''

****

آرٹ

ایک دفعہ ایک سرکاری، ملازم کے خلاف یہ جرم قائم ہوا کہ اس نے ایک گانے والی عورت کو کچھ زمین دلوائی ہے۔ عورت نے اپنی صفائی میں یہ کہا کہ وہ تو آرٹسٹ ہے۔ جس زمین کی خرید و فروخت پر تنازعہ پیدا ہوا تھا اسے بھلا کر بحث اس بات پر شروع ہو گئی کہ خریدنے والی آرٹسٹ ہے یا محض گانے والی۔ چونکہ سرکار کا پلہ بھاری تھا۔ وہ آرٹسٹ گانے والی ہی رہی مگر کیا کوئی گانے والی قیمت دے کر بھی زمین نہیں خرید سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بے چاری آسمان سے بھی محروم رہے اور زمین سے بھی۔

اقتباس: افکار پریشاں از جسٹس ایم آر کیانی

اور لیون اسے بہ دستور گھورے جارہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہاں آکر اس نے کوئی بڑی غلطی کردی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے... ان لوگوں نے کل جو کچھ کیا تھا، اسے بھلادے۔ کیا وہ ان ساتھیوں کو کل والی بات پر معاف کردے۔ کیا وہ خود آگے بڑھ کر ان سے کہے کہ چلو سب کچھ بھلا کر پہلے کی طرح اکھٹے کھیلتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہاں موجود سب خاموش تھے ایک لیون ہی نہیں، سب کی نظریں رینالڈ پر جمی ہوئی تھیں۔

کئی لمحے یوں ہی گزر گئے۔ لیون بہ دستور اسے گھورے جارہی تھی۔ اس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ رینالڈ نے سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ پیٹھ پر لدے بھاری تھیلے کے باعث اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔

''جس طرح تم مجھے پکارتے ہو، جو میرے بارے میں کہتے ہو، وہ سب کچھ میں نے اپنے ڈیڈی کو بتادیا ہے۔'' رینالڈ نے لیون کے سامنے پہنچ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ سب دم بخود تھے۔

''میرے ڈیڈی نے کہا ہے کہ ان سے کہنا کہ تم سفید فاموں کے لوگ جب ساٹھ سال سے زیادہ ہوجاتے ہیں تو کیوں پکے پھل کی طرح خاندان کی شاخ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تم کیوں انہیں اولڈ ایج ہاؤسز میں چھوڑ آتے ہو۔ ہم جنوب کے سیاہ فام ہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرتے۔ ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو جیتے جی خود سے الگ نہیں کرتے۔'' اس نے نہایت اعتماد سے مگر نرم لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

لیون سمیت اس کے سب ساتھی دم بخود سن رہے تھے۔ اسکٹ نے اسے گھورا مگر کچھ بولا نہیں۔

رینالڈ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا اور پھر ان پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر پلٹا، پاؤں سے سائیکل کا اسٹینڈ اتارا اور اس کا ہینڈل تھام کر فاتحانہ شان سے واپس چل پڑا۔ اب وہ اپنے گھر جارہا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو ماں اپنے کمرے میں سونے کے لیے جاچکی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور تھیلا ایک طرف پھینکا اور جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اونگھتے اونگھتے سوگیا۔

آنکھ کھلی تو شام کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ وہ سیدھا کچن میں گیا مگر وہاں کھانا نہیں تھا۔ اس نے فریج کھول کر دودھ کی بوتل نکال کر گلاس بھرا۔ اس میں تھوڑا سا مکھن ملایا اور اسٹرابری سیرپ ڈال کر مکسر میں انڈیل دیا۔ ایک منٹ میں اس کا پسندیدہ قوت بخش مشروب تیار تھا۔ وہ گلاس لے کر لیونگ روم میں گیا۔ لائٹ آن کی۔ میز پر سے ایکس باکس گیم اٹھایا اور صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ وہ کھیلتا جاتا اور گھونٹ گھونٹ بھر مشروب پیتا جاتا۔ ابھی اس نے گلاس خالی کر کے رکھا ہی تھا کہ ڈور بیل بجی۔ ''آرہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

''کیسے ہو دوست؟'' اس نے دروازہ کھولا تو سامنے مارٹی کھڑا تھا، اس کی مما کا دوست۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے ناگواری سے کہا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مارٹی ایسا شخص نہیں جو دروازے سے ہی مل کر واپس چلا جائے۔

مارٹی اندر بڑھا۔ ''کہاں ہو میری پیاری۔'' وہ اس کی مما کو آوازیں دیتا ہوا لیونگ روم کی طرف بڑھا۔

''آرہی ہوں ڈارلنگ...'' اس کی ماں نے اپنے کمرے سے جواب دیا۔

رینالڈ نے ناگواری سے دروازہ بند کیا اور مارٹی کے پیچھے پیچھے لیونگ روم میں داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی گاؤن سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ مارٹی صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس نے ٹی وی آن کرلیا تھا۔

''ہائے ڈارلنگ۔'' وہ سیدھی مارٹی کی طرف بڑھی۔ اسی دوران اس کی نظر رینالڈ پر پڑی۔ ''اے سنو، تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' وہ سخت لہجے میں اس سے بولی۔

رینالڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے ایکس باکس گیم اور ریموٹ اٹھانے لگا۔

''یہ اٹھاؤ اور سیدھے اپنے کمرے میں جاؤ۔'' اس نے بیٹے کو حکم دیا۔

''اوکے۔'' رینالڈ نے آہستہ سے جواب دیا اور لیونگ روم سے نکلنے لگا۔

''کمرا بند کر کے کھیلو، سوجاؤ یا ہوم ورک کرو مگر لیونگ روم میں نہ آنا۔'' اس نے چلا کر کہا۔

رینالڈ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اوپر جانے والی سیڑھی کی طرف بڑھا۔ اسی دوران لیونگ روم سے مما اور مارٹی کے زوردار قہقہوں کی آواز آئی جو اس کے ننھے سے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اب دو تین گھنٹوں کی چھٹی۔ جب تک مما اور مارٹی لیونگ روم میں

ہیں، وہ اپنے کمرے کا قیدی ہوگا۔ ڈیڈی کے جیل جانے کے بعد مارٹی اور اس کی مما کا یہ معمول بن گیا تھا۔ جہاں مارٹی آیا لیونگ روم اس کے لیے جائے ممنوع بن جاتی تھی اور شاید ان کے لیے جنت۔ ایسے میں لیونگ روم کے ٹی وی کی آواز تیز رہتی یا پھر کبھی کبھار ان دونوں کے قہقہے یا بے ہنگم آوازیں ہی اسے سنائی دیتیں جو رینالڈ کے ذہن پر تازیانے کی طرح برستی تھیں۔

وڈیو گیم کھیلتے کھیلتے وہ بور ہوچکا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوچکے تھے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ پانی پینے کے لیے اٹھا۔ سیڑھی سے اترتے ہوئے اس کی نظر لیونگ روم پر پڑی۔ لائٹ آف تھی مگر ٹی وی زوردار آواز میں چل رہا تھا۔ مارٹی اور مما ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے لیٹے تھے۔ یہ دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر مما نے دیکھ لیا تو اس پر عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ وہ پانی لینے کا خیال چھوڑ کر واپس پلٹا اور اپنے کمرے میں واپس داخل ہوکر آہستہ سے دروازہ بند کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ مارٹی کے جانے بعد مما ایک بار اس کے کمرے میں جھانکنے کو ضرور آئے گی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ اب آزادانہ طور پر اپنے گھر میں کہیں بھی آجاسکتا ہے۔

اسے سخت پیاس لگی تھی۔ وہ دل سے دعا مانگ رہا کہ مارٹی جلدی سے جائے۔ اسے ڈیڈی یاد آرہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے ڈیڈی جیل نہ گئے ہوتے تو آج یوں سخت پیاسا ہونے کے باوجود وہ اپنے ہی گھر میں اس طرح قیدی بنا، مارٹی کے جانے کا منتظر نہ ہوتا کہ وہ جائے تو یہ کچن میں جاکر پانی پی سکے۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن رینالڈ کی مما اب تک کمرے میں نہیں آئی تھی۔ اس بات کا مطلب واضح تھا کہ وہ اتنی رات گئے بھی اپنے کمرے سے باہر نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی کھولی۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ کھڑکی کھولتے ہی اسے خنکی کا احساس ہوا۔ اس نے گہری سانس لے کر تازہ آکسیجن .... اپنے پھیپھڑوں میں اتاری اور کچھ دیر تک آنکھیں موندے ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر باہر دیکھا اور کچھ سوچتا رہا۔ اس نے کمرے کے قید خانے سے فرار ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

رینالڈ نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر نیچے جھانکا اور پھر کھڑکی سے گھر کے پچھواڑے کود گیا۔ ریڈل روڈ اور اس کے کنارے واقع لیون کا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ مرکزی سڑک بھی سنسان تھی۔ گھر سے باہر نکل کر وہ سڑک کنارے کھڑا سوچ رہا تھا کہ صرف ایک ہی دن میں حالات کس طرح پلٹا کھاسکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں لیون اور اس کے دوست، باسکٹ بال گراؤنڈ، مارٹی اور مما کا تصور بار بار ابھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا آج دن بھر میں اس کے ڈیڈی نے کیا کچھ کیا ہوگا، اس وقت وہ کیا کررہے ہوں گے۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت ڈیڈی بھی اُس کے بارے میں ہی سوچ رہے ہوں گے، ویسے ہی جیسا کہ وہ خود دن اور رات میں اکثر اُن ہی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔

اس وقت رینالڈ سہا ہوا بھی تھا۔ اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو اس نے ابھی کیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران اسے جس طرح حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ ان کی وجہ سے ڈرا سہا تھا۔ اب وہ خود کو درپیش حالات کے تحت بدل دینے کے لیے پُرعزم تھا۔ یہ اس کے لیے بہت مشکل کام تھا مگر اسے حیرت تھی کہ وہی مشکل کام اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔

موسم خزاں کے پورے چاند کی چٹکی چاندنی میں اسے اپنے گھر کے سامنے تک کا پچیس فٹ کا فاصلہ میلوں لمبا لگ رہا تھا۔ گھر کے گیٹ کے ساتھ اس کی سائیکل کھڑی تھی اور وہ خود کو دیوار کے سائے میں چھپاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ مارٹی یا اس کی مما کی نظر اس پر پڑے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ لیونگ روم کی کھڑکی سے گھر کا گیٹ بالکل صاف نظر آتا تھا۔

وہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور دماغ میں جھماکے ہورہے تھے۔ اچانک وہ رکا۔ اس نے فیصلہ بدل دیا۔ وہ بنا سائیکل کے گھر سے باہر نکلا۔ ''وہ میری سائیکل ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ پیدل چلتا ہوا جے کنٹری اسٹور کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دور سے ہی اسے اسٹور کے سامنے کی سرخ ٹریفک لائٹ نظر آئی۔ اسٹور کے اوپر روشن بلب کے باعث اندر داخل ہونے کا شیشے والا دروازہ بھی صاف نظر آرہا تھا۔ اسٹور کے اندر مدھم روشنی بھی وہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ ٹریفک لائٹ عبور کرگیا۔ سامنے کنٹری اسٹور تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی وہ چھوٹی سلاخ تھی جس سے پہیا دوڑاتا تھا۔ دور دور تک سناٹا طاری تھا۔

اسٹور کے دروازے پر پہنچ کر رینالڈ نے اس سلاخ کو ہینڈل کے اس رخ پر کئی بار مارا، جہاں اس کے خیال میں

لاک ہوسکتا تھا۔ چند لمحوں میں ہی شیشہ تڑخ کر ٹوٹا اور اس نے ہاتھ ڈال کر اندر سے بہ آسانی لاک کھول لیا۔ دروازہ کھلتے ہی سیکیورٹی الارم بج اٹھا مگر رینالڈ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔

اسٹور کے اندر داخل ہوکر وہ سیدھا اس طرف بڑھا جہاں اس کی پسندیدہ سائیکل رکھی تھی۔ وہ آگے بڑھا، سائیکل کا ہینڈل تھاما اور باہر نکل آیا۔ الارم بار بار بج رہا تھا۔ سامنے ٹریفک کی سرخ لائٹ جل بجھ رہی تھی۔ سڑک پر بہ دستور سناٹا تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ سب کچھ منٹوں میں ہوگیا تھا۔ اس کی پسندیدہ سائیکل اب اس کے ہاتھ میں تھی۔

اسٹور کے گیٹ سے تھوڑا آگے جاکر سائیکل پر سوار ہوا اور بڑے پیار سے پیڈل پر پاؤں مارنے لگا۔ وہ گھر جانے کے بجائے اسٹور کے سامنے ہی گول دائرے میں سائیکل چلانے لگا۔ اس کے کان اب بھی اسٹور میں لگے الارم کی آواز سن رہے تھے۔ الارم رہ رہ کر بجے جارہا تھا اور وہ بہ دستور اسٹور کے سامنے دائرے میں اپنی پسندیدہ سائیکل چلانے کا لطف اٹھا رہا تھا۔

کئی منٹ ہوچکے تھے جب پولیس افسر جے کنٹری اسٹور پہنچا۔ اس نے داخلی دروازے کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا اور بجائے اندر جانے کے سیدھا رینالڈ کی طرف بڑھا۔ ویسے بھی رات کے اس پہر، جائے واردات پر ایک لڑکے کا اس طرح سائیکل چلانا کسی بھی شخص کے لیے غیر معمولی بات ہوسکتی تھی، وہ تو پھر بھی پولیس والا تھا۔ پولیس والے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے سائیکل چلانا بند کی۔

''بیٹا... یہ تم نے اسٹور سے نکالی ہے؟'' پولیس افسر نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

رینالڈ نے جواب دینے کے بجائے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پولیس والا دراز قامت سیاہ فام تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سائیکل پر گڑی تھیں اور پیشانی پر بل پڑے تھے۔ سائیکل پر اب بھی قیمت کا ٹیگ لگا تھا۔

''قیمت صرف دوسو، اُنیس ڈالر۔''

''ہاں... اسٹور سے نکالی ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پولیس والے کی بات کا جواب دیا۔ اب اسٹور کا الارم بھی بجنا بند ہوگیا تھا۔

''تو تم نے اسے اسٹور سے نکالا ہے؟'' پولیس والے نے تصدیق چاہی۔

''جی سر!'' اس نے فوراً اقرار کرلیا۔

''مگر کیوں؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟'' پولیس والے کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

رینالڈ نے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا کر نظریں زمین پر گڑا دیں۔

''بیٹا...'' پولیس والے نے گمبھیر مگر نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ اس سائیکل کے چکر میں کیا کرچکے ہو؟''

''جانتا ہوں سر!'' اس کی نظریں بہ دستور نیچے تھیں۔

''تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''دس سال۔''

''تم نے اسٹور سے یہ سائیکل اس لیے نکالی تھی کہ اسے اسٹور کے سامنے چلاسکو؟'' پولیس والے نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' رینالڈ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''بیٹا...''

''مجھے بیٹا مت کہو۔ میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔'' رینالڈ نے تیزی سے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''تم بڑی مشکل میں پھنس چکے ہو۔'' پولیس والے نے اس کی بات نظر انداز کرکے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

یہ سن کر رینالڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم نے یہ سائیکل کیوں چرائی؟''

رینالڈ نے سر اٹھا کر پولیس والے کو دیکھا۔ پھر گردن موڑ کر ریڈل روڈ کی طرف دیکھا جہاں اس کا گھر تھا۔ گھر، جس کے اندر اس کی مما اسے بھول کر اب بھی مارٹی کی آغوش میں ہوگی۔ ریڈل روڈ، جہاں کبھی وہ لیون اور دوسرے دوستوں کے ساتھ لینڈیز ہوم کے چھوٹے سے میدان میں باسکٹ بال کھیلتا تھا، مگر اب وہ کھیل کے دن گزر چکے تھے۔ اس نے ایک بار پھر گردن موڑی اور پولیس والے کو دیکھا۔

''تم نے یہ سائیکل کیوں چرائی؟'' پولیس والے نے اسے اپنے طرف متوجہ پاکر پرانا سوال دہرایا۔

''اس لیے کہ سال میں صرف ایک دن کی ملاقات کافی نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے رینالڈ کا لہجہ نہایت سرد تھا۔

''کیا مطلب...؟'' اس کی بات سن کر پولیس والا گڑبڑا گیا اور حیرت سے وضاحت طلب کی۔

''سال میں ایک دن کافی نہیں۔'' اس نے پھر وہی بات دہرادی۔ ''پلیز آفیسر... مجھے گیریسن جیل لے چلو۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام

رضوانہ ساجد

کرامتیں ہوں یا معجزے... حکایتیں ہوں یا روایتیں... عقلمندوں کے لیے ہمیشہ راہنمائی اور آگاہی کا ایک معتبر ذریعہ ہیں... یہ اور بات کہ مقدر والے ہی ان ذرائع سے فیضیاب ہو پائے... حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد اور بی بی مریم کو بے موسم کے پھل عطا کرکے اللہ تعالیٰ نے اندھیروں میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشنی عطا کی مگر... ہر تقدیر میں اجالا نہیں ہوتا... حضرت یحییٰ علیہ السلام خود کو صحرا میں منادی کرنے والا نبی کہتے تھے... کم عمری میں ہی بچوں کے ساتھ کھیلنے کے بجائے جنگل و بیابان کی طرف نکل جاتے اور خدا کے خوف میں آنسو بہاتے حتیٰ کہ گالوں پر آنسوئوں کی لکیریں بن گئیں... کیونکہ اللہ اپنے خوف سے رونے والوں اور بندگی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے... اور وہ کوئی عام انسان نہیں بلکہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے...

جنگل و بیابان کی آواز... حضرت یحییٰؑ کی مشکلات کا احوال

حضرت یحییٰ علیہ اسلام، حضرت زکریا علیہ السلام کے واحد بیٹے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کے حامل تھے۔ آپؑ کا ذکر قرآن مجید میں ان ہی سورتوں میں آیا ہے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے یعنی سورۂ آل عمران، سورۂ انعام، سورۂ مریم، سورۂ انبیا۔

''اے زکریا! ہم بے شک تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی۔ اس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اس سے قبل ہم نے کسی کے

لیے یہ نام نہیں ٹھہرایا۔''

آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے۔

زکریا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہیں یہ فکر ہمیشہ ستاتی رہتی تھی کہ ان کا دامن اولاد کی نعمت سے خالی ہے۔ وہ نبی تھے اس لیے ہونٹوں کے کنارے شکایت سے خالی ہی رہتے تھے کبھی کبھی خدا سے اس انداز میں ضرور مخاطب ہوتے کہ میرے بھائی بند ہرگز اس کے اہل نہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کی خدمت انجام دے سکیں پس اگر تو میرے کوئی نیک سرشت لڑکا پیدا کردیتا ہے تو مجھ کو یہ اطمینان ہوجاتا کہ بنی اسرائیل کی رہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود ہے۔

اتنی شکایت بھی صرف اس لیے تھی کہ آپ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جس دن سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیوی کی بہن حنہ جو ہمیشہ کی بانجھ تھیں، قدرت نے ان کی سن لی اور اب وہ حمل سے ہیں۔

''یا اللہ تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس طرح تو نے حنہ کو اولاد کی بشارت دی ہے اسی طرح اس کی بہن، میری بیوی الشیع کو بھی اولاد کی نوید سنادے۔''

اللہ اپنے نبی کی فریاد ٹال نہیں سکتا تھا لیکن شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

اور پھر ایک روز حنہ کے گھر سے خوش خبری آگئی۔ ان کے گھر بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو انہوں نے خاص طور پر بلوایا کہ وہ آکر بچی کو دیکھ جائیں۔

ان کے شوہر عمران کا انتقال اسی وقت ہوچکا تھا جب وہ حاملہ تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام ان کے گھر تشریف لے گئے تو وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھیں۔ آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ تو خوشی کا موقع ہے اس بڑھاپے میں خدا نے اولاد دی اور ان کے چہرے پر خوشی کی پرچھائیں بھی نہیں۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید یہ پریشانی ہوں گی کہ عمران اس دنیا میں نہیں رہے۔ آپ نے حقیقت جاننے کے لیے پریشانی کا سبب پوچھا۔

''حنہ، اس وقت یہ پریشانی کیسی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ عمران کو خدا نے لے لیا اس پر بھی تمہیں صبر کرنا چاہیے۔''

''بھائی صاحب، وہ بات نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ جب یہ بچی پیدا ہونے والی تھی تو میں نے نذر مانی تھی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجدِ اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کردوں گی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ تو نہایت مقدس رسم ہے اور بنی اسرائیل میں مدتوں سے چلی آرہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب اولاد کی محبت تمہیں اس رسم سے روک رہی ہو؟''

''اس رسم کی انجام دہی کے لیے ہی تو پریشان ہوں۔ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ خداوند بنی اسرائیل کے خدا کو میری یہ نذر پسند نہیں آئی۔ اس نے بیٹے کے بجائے مجھے بیٹی دے دی۔ سوچتی ہوں لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کرے گی۔ اسی مشورے کے لیے میں نے آپ کو بلایا تھا۔''

''تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ تمہاری نذر ضرور پوری ہوگی۔ خدا نے چاہا تو لڑکی ہونے کے باوجود یہ ہیکل کی خدمت کرے گی اور میں اس کی نگرانی کروں گا۔''

اس بچی کا نام مریم رکھا گیا۔ سریانی میں اس کے معنی خادم کے ہیں۔ یہ چونکہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کردی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔ حنہ اس بچی کی پرورش کرنے لگیں۔

''(وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے۔ پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بے شک! تو سننے والا، جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی پروردگار میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا لڑکی یکساں نہیں ہے (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کرسکتی لڑکا کرسکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔''

پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشوونما اچھے طریق پر کی اور حضرت زکریا

علیہ السلام کو اس کا نگران کار بنایا۔

حضرت مریمؑ کی پرورش ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ سنِ شعور کو پہنچیں لہٰذا اب یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت مریمؑ کی کفالت کس کے سپرد کی جائے یعنی ہیکل میں قیام کے دوران ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ حضرت زکریا علیہ السلام چونکہ خالو بھی تھے، معزز کاہن بھی اور خدائے برتر کے نبی بھی لہٰذا سب سے پہلے انہوں نے اپنا نام پیش کیا۔

''خدا نے اس کی ذمے داری کے لیے مجھے آگے کیا ہے لہٰذا یہ مقدس فریضہ مجھے انجام دینے دیجیے۔''

''آپ کا حق برحق لیکن اس ثواب سے ہم کیوں محروم رہیں۔'' کاہنوں نے بہ یک آواز کہا۔

''میرا حق مانتے بھی ہو اور حجت بھی کرتے ہو۔ میں مریم کا خالو ہوں جو تم میں سے کوئی نہیں۔''

''ہم تم سے زیادہ دولت مند ہیں۔ تم سے اچھی دیکھ بھال کرسکتے ہیں۔ صرف قرابت داری سے کیا ہوتا ہے۔ مریم ایک مقدس امانت ہے۔ اس پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا ہے۔ اگر تمہیں پھر بھی اعتراض ہے تو قرعہ اندازی کرلو۔ جس کے نام قرعہ نکل آئے وہی کفیل۔''

قرعہ اندازی کی گئی لیکن جب تینوں مرتبہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکلا تو سب سمجھ گئے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائید غیبی ہے تو انہوں نے بہ خوشی اس فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور اس طرح یہ سعید امانت حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کردی گئی۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہ السلام کے صنفی احترامات کا لحاظ کرتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کے لیے مخصوص کردیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادت الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر لے آتے۔

ایک روز دن کے وقت وہ حضرت مریم علیہ السلام کے حجرے میں تشریف لے گئے تو پھل رکھے دیکھے۔ ان میں کچھ پھل ایسے تھے جن کا موسم ہی نہیں تھا۔ آپ کو بڑا تعجب ہوا کہ موسمی پھل تو خیر آسکتے ہیں۔ کوئی دے گیا ہوگا لیکن بے موسم کے پھل یہاں کیسے پہنچ گئے۔ آپ نے اس وقت کچھ نہیں کہا۔ اسے محض اتفاق سمجھ کر نظر انداز کردیا لیکن آپ اس کی تحقیق میں لگ گئے۔ آپ جب حجرے میں آئے بے موسمی پھل رکھے ہوئے دیکھتے اور خود سے ایک ہی سوال کرتے کہ موسم کے پھل تو آسکتے ہیں، یہ بے موسم کے پھل کہاں سے آجاتے ہیں؟ بالآخر ایک دن انہوں نے حضرت مریم علیہ السلام سے پوچھ ہی لیا۔

''بیٹی! یہ بے موسم کے پھل تمہارے پاس کون رکھ جاتا ہے؟''

حضرت مریم علیہ السلام نے فرمایا۔ ''یہ پھل مجھے فرشتے لاکر دیتے ہیں۔ خالو جان آپ کو تعجب کیوں ہے۔ اللہ تعالیٰ رزق دینے والا ہے، بے حساب دیتا ہے اور ہر موسم میں دیتا ہے۔ وہ کیا نہیں کرسکتا اس کے اختیار میں سب ہی کچھ تو ہے۔''

حضرت مریم علیہ السلام کا جواب بھی غیر موسمی پھل کی طرح تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اس جواب پر تعجب تو نہیں ہوا لیکن بہت دنوں کی دبی ہوئی خواہش ایک مرتبہ پھر بیدار ہوگئی۔ بے موسم کے پھل دینے والا بے موسم اولاد بھی تو عطا کرسکتا ہے۔ میں اور میری بیوی بوڑھے ہوگئے ہیں تو کیا ہوا۔ خدا چاہے تو بے موسم پھل بھی دے سکتا ہے۔ آپ شدومد کے ساتھ ہر نماز کے بعد نیک اور صالح اولاد کے لیے دعا کرنے لگے۔

آپ ہیکل میں مشغول عبادت اور درگاہ الٰہی میں دعا کررہے تھے۔ ''خدایا! میں تنہا ہوں اور وارث کا محتاج اور یوں تو حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے۔ خدایا مجھ کو پاک اولاد عطا فرما۔ مجھے یقین ہے تو حاجت مند کی دعا ضرور سنتا ہے۔''

آپ یہ دعا ہمیشہ کرتے رہے تھے لیکن اب قبولیت کا وقت آگیا تھا۔ دعا فوراً مستجاب ہوئی۔ خدا کا فرشتہ ان پر ظاہر ہوا۔ اس نے بشارت دی کہ تمہارا بیٹا پیدا ہوگا اور تم اس کا نام یحییٰ رکھنا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر اس وقت ستتر سال، بعض کے نزدیک نوے سال اور بعض کے خیال میں ایک سو بیس سال ہوچکی تھی۔

بڑھاپے کی وجہ سے حضرت زکریا علیہ السلام کی ہڈیوں میں ایک قسم کی اکڑ پیدا ہوگئی تھی۔ آپ کی زوجہ بھی بوڑھی ہوچکی تھیں۔ انہیں جوانی ہی میں بانجھ قرار دیا جاچکا تھا۔ اب جو بے موسم کے پھل کی نوید سنی تو فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہوگئے۔ اپنے رب کا شکر ادا کیا اور فرشتے سے پوچھنے لگے۔

''یہ بشارت کس طرح پوری ہوگی۔ مجھ کو جوانی عطا ہوگی یا میری بیوی کا مرض دور کردیا جائے گا؟''

فرشتے نے جواب دیا۔ ''میں اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمہارے ہاں ضرور بیٹا پیدا ہوگا کیونکہ خدا کا فیصلہ اٹل ہے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ ''اے اللہ! مجھے کوئی ایسا نشانی عطا کر جس سے میں معلوم کرلوں کہ بشارت پوری ہونے کا وقت آگیا۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''علامت یہ ہے کہ جب تم تین روز تک بات نہ کرسکو اور اشاروں ہی سے اپنا مطلب ادا کرسکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کرلی ہے۔'' چنانچہ جب وقت قریب آیا تو حضرت زکریا علیہ السلام کی گویائی سلب ہوگئی۔ آپؑ یادِ الٰہی میں پوری طرح منہمک ہوگئے اور امت کو بھی حکم دیا کہ (اشاروں میں) وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد میں مشغول رہیں اس لیے کہ آنے والا بنی اسرائیل کے لیے بھی نیکی اور سعادت کا باعث تھا۔

پھر وہ وقت بھی آگیا جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ وارثِ نبوت پیدا ہوا تھا۔ یہ کوئی کم خوشی کی بات نہیں تھی۔ عام لوگ بھی سمجھ رہے تھے کہ بڑھاپے میں ولادت کا ہونا خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ بچہ واقعی بنی اسرائیل کی خوش بختی میں اضافہ کرے گا اور ان کے لیے خیر و برکت کا سبب بنے گا لہٰذا خاندان والوں نے ہی نہیں پورے قبیلے نے جشن منایا۔ ہیکل میں عبادتیں کی گئیں کہ خداوند نے خیر و برکت بھیجی۔

بنی اسرائیل میں قدیم دستور چلا آرہا تھا کہ نومولود کی ولادت کے آٹھویں دن رسم ختنہ ادا کی جاتی تھی اور بچے کا نام رکھا جاتا تھا لہٰذا آٹھواں دن آیا تو اس تقریب کا انتظام ہوا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا تعلق چونکہ ہیکل کے کاہن خاندان سے تھا لہٰذا اس تقریب میں کاہن بھی شریک تھے۔

جب نام رکھنے کا وقت آیا تو ان کاہنوں نے حضرت زکریا علیہ السلام سے پوچھا۔

''زکریا، کیا تم بھول گئے کہ آٹھویں دن بچے کا نام رکھا جاتا ہے۔ تم نے بچے کا نام سوچ لیا ہے؟''

''مجھے ایک تختی لادو تاکہ میں اس پر وہ نام لکھ دوں جو خداوند اسرائیل کے خدا نے مجھے پہلے سے بتادیا ہے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کو تختی دے دی گئی۔ آپؑ نے اس تختی پر جلی حروف میں لکھ دیا ''یحییٰ''

یہ تختی جب مہمانوں میں گھمائی پھرائی گئی تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلی، پسندیدگی کی نہیں ایک طنزیہ مسکراہٹ۔

کچھ دیر آپس میں سرگوشیاں ہوتی رہیں پھر ایک کاہن نے اس نام پر اعتراض کیا۔

''زکریا، یہ نام آج تک تو ہم نے سنا نہیں۔ تم نے یہ کیسا نام رکھ دیا اور یہ تمہارے ذہن میں آیا کیسے۔ وہ نام رکھو جسے لوگ آسانی سے قبول کرلیں۔''

تب حضرت زکریا علیہ السلام کو انہیں بتانا پڑا۔ ''صاحبو! تم دیکھ رہے ہو میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ تھی۔ کوئی ایسے ظاہری اسباب نہیں تھے کہ میں اولاد کی نعمت سے فیض یاب ہوتا۔ ایک خدا کا سہارا تھا جسے میں نے نہیں چھوڑا۔ اس سے مانگتا رہا کہ وہی دینے والا ہے پھر ایسا ہوا کہ ایک روز ہیکل میں تھا کہ ایک فرشتے نے میری توجہ اپنی جانب پھیری اور بشارت دی کہ تیرے گھر بیٹا پیدا ہوگا اور تو اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ میرے اللہ نے اولاد کی طرح نام بھی دیا۔ اسی لیے میں نے یہ عجیب وغریب نام رکھ دیا۔''

لوقا کی انجیل میں اس واقعے کا اس طرح ذکر ملتا ہے۔

''اور آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے مگر اس کی ماں نے کہا نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھنا۔''

اس نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں اور انہوں نے اس کے باپ کو اشارہ کیا کہ تو اس کا کیا نام رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے تختی منگوا کر یہ لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے اور سب نے تعجب کیا۔ اسی دم اس کا منہ اور زبان کھل گئی اور وہ بولنے اور خدا کی حمد کرنے لگا اور ان کے آس پاس کے سب رہنے والوں پر دہشت چھاگئی اور یہودیہ کے تمام پہاڑی ملک میں ان سب باتوں کا چرچا پھیل گیا اور سب سننے والوں نے ان کو دل میں سوچ کر کہا کہ یہ لڑکا کیسا ہونے والا ہے کیونکہ خداوند کا ہاتھ اس پر تھا۔''

حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی عاجزی سے سر جھکایا۔

خداوند اسرائیل کے خدا کی حمد ہو

کیونکہ اس نے اپنی امت پر توجہ کرکے اسے
چھٹکارا دیا
اور اپنے خادم داؤد کے گھرانے میں
ہمارے لیے نجات کا سینگ نکالا۔

☆☆☆

یہود تو اپنی سرشت کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام کے منکر ہیں مگر نصاریٰ انہیں یسوع مسیح کا منادی کرنے والا تسلیم کرتے ہیں اور ان کے والد حضرت زکریا علیہ السلام کو صرف کاہن مانتے ہیں۔

اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے عبرانی میں یوحنا کے وہی معنی ہوں جو یحییٰ کے ہیں اور ممکن ہے یوحنا نے عربی میں آکر یحییٰ کا تلفظ اختیار کرلیا ہو۔ قرآن نے انہیں یحییٰ کہا ہے۔

''خدا تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو خدا کے فیض (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کریں گے۔''

قرآن کی اس آیت کے مطابق منادی کرنے والا (یحییٰ علیہ السلام) آچکا تھا۔ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد قریب تھی۔

انجیل میں ہے۔

''یوحنا (یحییٰ) اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر میں باندھے رہتے تھے اور خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ہونے والا نبی ان کے گھر میں تولد ہوا ہے۔ اس کی پیدائش برکت بھی ہے اور ذمے داری بھی لہٰذا آپؑ اس بچے کی تربیت و نگرانی نہایت احتیاط سے کررہے تھے۔

☆☆☆

ابھی حضرت یحییٰ علیہ السلام صرف ایک ماہ کے تھے کہ حضرت زکریا علیہ السلام گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور اپنی زوجہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ الیشع نے ایسی گھبراہٹ اس سے پہلے ان پر طاری ہوتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''شہر کے بے ایمان تاجر اگر آپ کی بات سننے کو تیار نہیں تو آپؑ اتنے پریشان کیوں ہیں۔ آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے آپ نے پہنچا دیا۔ اپنی جان کیوں گھلاتے ہیں؟''

حضرت زکریا علیہ السلام تولنے والے تاجروں سے پریشان رہتے تھے۔ اس وقت بھی زوجہ محترمہ یہ سمجھیں کہ اسی فکر میں باہر سے پریشان آئے ہیں لیکن اس وقت بات کچھ اور تھی۔

''بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں مریم میں کچھ تبدیلی دیکھ کر آرہا ہوں۔ اس نے کئی روز سے حجرہ بند کررکھا تھا۔ کسی سے مل جل نہیں رہی تھی۔ آج میں زبردستی اندر گیا تو اس کا بڑھا ہوا پیٹ میری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا۔ اس کے جسم میں وہ تبدیلیاں نظر آرہی ہیں جو حاملہ عورتوں میں ہوتی ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ مقدس مریم کسی گناہ کی مرتکب نہیں ہوسکتی۔''

''میری نظریں دھوکا بھی تو نہیں کھاسکتیں۔''

''آپؑ نے اس سے کچھ پوچھا؟''

''میری ہمت نہیں ہوئی۔ سوچتا ہوں تمہارے سامنے بلاکر بات کروں۔''

اس سے پہلے کہ وہ حضرت مریم علیہ السلام کو بلاتے وہ خود ہی تشریف لے آئیں۔

''میں دیکھ رہی ہوں میری طرف سے آپ بدگمان ہوگئے ہیں۔''

''میں تمہاری پاکیزہ فطرت کی قسم کھاتا ہوں لیکن......''

''خالو جان، اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے کچھ پوچھیں میں آپ سے پوچھتی ہوں، بغیر بیج کے فصل ہوسکتی ہے؟''

''کیوں نہیں، اگر خدا چاہے۔''

''کیا خدا کسی مرد کے بغیر مجھے بچہ نہیں دے سکتا؟''
''ایسا کبھی ہوا نہیں ہے مریم۔''
''جو میں کہوں گی آپ اس پر یقین کریں گے؟''
''جلدی بتا، تجھ پر کیا بیت گئی ہے؟''
''میں پانی کا مشکیزہ اٹھائے گھاٹ کی طرف جارہی تھی کہ ایک آدمی میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میرے گھبرانے پر اس نے مجھے تسلی دی اور کہا، میں کوئی انسان نہیں ہوں۔ آپ کے رب کا فرشتہ ہوں اور پیغام لایا ہوں کہ خدا نے تم کو برگزیدہ کیا ہے۔ اس نے مجھے ایک فیض کی بشارت دی اور کہا اس کا نام عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ میری گود میں باتیں کرے گا اور نیکو کاروں میں ہوگا، پھر اس فرشتے نے میرے گریبان میں پھونک ماری اور نظروں سے غائب ہوگیا۔ اب مجھے چوتھا مہینا ہے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا کہ مریم پاک ہیں اور سچی ہیں لہٰذا آپؑ نے بھی انہیں تسلی دی لیکن اندیشوں کا اظہار بھی کردیا۔

''میں تجھے پاکیزہ خیال کرتا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہی قوم تجھے ایذا پہنچائے گی۔ تو ثابت قدم رہنا اور اللہ کے حکم کا انتظار کرنا۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پرورش ہوتی رہی اور وہ جس کی منادی کے لیے آپؑ آئے تھے حضرت مریم علیہ السلام کے پیٹ میں پلتا رہا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے اندیشے غلط نہیں تھے۔ لوگوں کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ حضرت مریم علیہ السلام شادی کے عمل سے گزرے بغیر حاملہ ہیں تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بہتان طرازیوں کی زبانیں دراز ہوگئیں۔ اس کی زد میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی آئے اور حضرت مریم علیہ السلام بھی لیکن خدا نے ان دشمنوں پر کچھ ایسا خوف غالب کردیا تھا کہ وہ لوگ حضرت مریم علیہ السلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ صرف زبانی کلامی لعن طعن کرتے رہے۔ حضرت مریم علیہ السلام ثابت قدمی سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔

''وہ (مریم) اپنی حالت چھپانے کے لیے لوگوں سے دور چلی گئی۔ پھر دردِ زہ کا اضطراب اسے کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا۔ اس نے کہا، میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ اب تک بھول چکے ہوتے۔ اس وقت ایک (فرشتے نے) نے اسے پکارا۔ غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے نیچے نہر جاری کردی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر اپنی طرف ہلا تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے۔ کھا پی اور (اپنے بچے کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارے سے......) کہہ دے میں نے خدائے رحمٰن کے حضور روزے کی منت مان رکھی ہے۔ میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کرسکتی۔''

ولادت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت مریم علیہ السلام نے فرشتوں کی حفاظت میں چالیس دن گزارے۔ درخت سے گرنے والی کھجوریں آپؑ کی غذا تھیں حالانکہ یہ کھجوروں کا موسم نہیں تھا۔

چالیس دن گزرنے کے بعد وہ اپنی قوم کے پاس آئیں۔ نومولود ان کی گود میں تھا۔

''وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی۔ لڑکا اس کی گود میں تھا۔ لوگ بول پڑے۔ مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا کام کر گزری۔ اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی۔ اس مریم نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتائے گا حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا، بھلا اس سے ہم کیا بات کریں گے جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار ہے مگر لڑکا بول اٹھا۔'' میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔ اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں۔ اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا۔ ایسا نہیں کیا کہ خودسر اور نافرمان ہوتا۔ مجھ پر اس طرف سے سلامتی کا پیغام ہے۔ جس دن پیدا ہوا جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔'' (سورۂ مریم)

اس واضح نشانی کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام لوگ حضرت مریم علیہ السلام کو بے گناہ سمجھتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ واضح طور پر دو گروہ بن گئے۔ کچھ لوگ خاموش ہوگئے، کچھ لوگ اب بھی طعنے دیتے اور لوگوں کو اکسانے پر کمربستہ رہے۔

اسم مبارک

☆ انبیائے علیہم السلام کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالوہاب ہے۔
☆ شیاطین کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالقہار ہے۔
☆ جنات کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالرحیم ہے۔
☆ پہاڑوں کی مخلوق کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالخالق ہے۔
☆ جنگلات کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالقادر ہے۔
☆ سمندروں کی مخلوق کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالقدوس ہے۔
☆ زمین کے کیڑے مکوڑوں کے نزدیک حضور ﷺ کا اسم مبارک عبدالغیاث ہے۔

(محمد زریان کی دلچسپ معلومات۔۔۔اردو بازار کراچی سے)

انہی حاسدوں سے بچنے کے لیے حضرت مریم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لے کر پہلے مصر گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچے کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا۔

☆☆☆

حضرت یحییٰ علیہ السلام ذرا بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے تو بچوں کو نیا ساتھی ملنے کی خوشی ہوئی۔ بچے کھیل کود میں مشغول ہوتے اور انہیں بھی دعوت دیتے لیکن آپؑ صاف انکار کردیتے کہ مجھے کھیل کود کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بات بچوں کی سمجھ میں تو کیا آنی تھی لیکن حضرت زکریا علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ کس لیے دنیا میں آئے ہیں۔ آپؑ کی باتوں سے حکمت و دانائی اس طرح ظاہر ہوتی تھی کہ اس عمر کے بچے سے اس کی توقع کی نہیں جاسکتی تھی۔ عجیب بات یہ بھی تھی کہ آپؑ آبادی سے زیادہ جنگل میں وقت گزارنا پسند کرتے تھے۔ ہم عمر بچے گلیوں میں دھما چوکڑی مچاتے تھے اور آپؑ کو جب ڈھونڈا جاتا تو کسی ویرانے میں ملتے۔

حضرت زکریا علیہ السلام اپنے فرائض انجام دے رہے تھے، جہاں ہجوم دیکھتے وہاں پہنچ جاتے اور معاشرتی برائیوں پر تقریریں کرتے۔ کبھی تاجروں کو مخاطب کرتے، کبھی علمائے وقت کو آخرت سے ڈراتے۔ ایک روز آپؑ گھر سے نکلے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام بھی ساتھ ہولیے۔ اونٹ کے بالوں کی پوشاک، چمڑے کا پٹا کمر سے کسا ہوا۔ غور و فکر میں ڈوبے ہوئے۔ باپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک جگہ کچھ بے فکرے نوجوان جمع تھے۔ قہقہے بلند ہورہے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی کا مقصد ہی یہ ہو کہ غم کو ہنسی میں اڑا دیا جائے۔ آپؑ انہیں دیکھ کر رک گئے۔ ان گستاخوں نے آپؑ کو دیکھ کر بھی اپنی ہنسی پر قابو نہیں پایا۔

آپؑ نے ان نوجوانوں کو مخاطب کیا۔ ''لوگو! کیوں ہنسی مذاق میں اپنی عاقبت کو بھولے جارہے ہو۔ تمہیں شاید نہ معلوم ہو لیکن مجھے بتایا گیا ہے جنت اور دوزخ کے درمیان ایک لق و دق میدان ہے جو خدا کے خوف سے آنسو بہائے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا اور جنت تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔''

یہ سننا تھا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر رقت طاری ہوگئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی تقریر میں اتنے محو تھے کہ انہیں یہ یاد ہی نہ رہا کہ یحییٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔

آپؑ کی تقریر نے اتنا اثر ضرور کیا کہ نوجوانوں کے قہقہے نہ صرف بند ہوگئے بلکہ وہ ایک ایک کرکے وہاں سے کھسکنے بھی لگے۔ کچھ اور دور جا کر آپؑ نے بازار میں کھڑے ہوکر تاجروں کو مخاطب کیا۔ ''میں اپنی قوم کے تاجروں سے کہتا ہوں تم اپنی عیب دار چیزیں پوری قیمت پر فروخت مت کرو۔ میں یہ کہتا ہوں منافع اتنا لو جتنا جائز ہے، گاہک کی جیب دیکھ کر نہیں بلکہ اپنی لاگت کے مطابق قیمت وصول کرو۔''

اسی طرح مختلف طبقوں سے خطاب کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ الیشع اپنے بیٹے کے انتظار میں دروازے پر کھڑی تھیں لیکن جب انہوں نے شوہر کو اکیلے آتے دیکھا تو پریشان ہوگئیں۔

''اکیلے آرہے ہو، یحییٰ کو کہاں چھوڑ آئے؟''

''یحییٰ میرے ساتھ کہاں تھا۔''

''آپ بھول رہے ہیں۔ میں نے اسے خود تیار کر کے آپ کے ساتھ بھیجا تھا۔''

اب حضرت زکریا علیہ السلام کو بھی یاد آیا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے ساتھ تھے۔ وہ اس مقام پر پہنچے جہاں آپ نوجوانوں سے وعظ میں مشغول تھے۔ لوگوں سے پوچھا لیکن کوئی بھی کچھ نہ بتاسکا۔ بازار میں آئے جہاں تاجروں کو مخاطب کیا تھا۔ یحییٰؑ یہاں بھی نہیں تھے۔

آپؑ یہ سوچ کر گھر لوٹ آئے کہ اب تک حضرت یحییٰ علیہ السلام گھر پہنچ چکے ہوں گے۔ رات ہوگئی تھی۔ گھر میں چراغ ٹمٹما رہا تھا لیکن ماں کی آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اب تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ معاً آپؑ پر سخت گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ یہ خیال آیا کہ میری قوم میری مخالفت پر اتری ہوئی ہے۔ کہیں کسی نے مجھے ستانے کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔ قدرت بھی شاید کچھ دکھانا چاہتی تھی ورنہ بذریعہ وحی انہیں بتادیا جاتا۔ آپؑ کی زوجہ الشیع کے سوالات آپؑ کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ وہ الفاظ سوجھ ہی نہیں رہے تھے جو الشیع کو مطمئن کرتے۔ جو اس گھر کے مکینوں پر گزر رہی ہوگی اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بڑھاپے میں، ہزار دعاؤں کے بعد بیٹا ملا تھا اور اب وہ غائب تھا۔

وہ رات سجدوں میں گزر گئی، ابھی سورج کی پہلی کرن نے انگڑائی بھی نہیں لی تھی کہ آپؑ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے شہر سے باہر آگئے۔ دور تک جنگل سر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ اس جنگل میں کیوں جانے لگا تھا اور پھر میں اسے کتنی دیر تک ڈھونڈوں گا۔ اب تو خدا ہی میری مدد کرے تو کرے۔ آپؑ عالم مایوسی میں شہر کی طرف لوٹنے ہی والے تھے کہ جنگل کی طرف سے ایک آدمی آتا نظر آیا۔ یہ فرشتہ تھا، انسان تھا یا کیا تھا۔

''آپ جنگل کی طرف سے آرہے ہیں، آپ نے وہاں میرے یحییٰ کو تو نہیں دیکھا؟''

''کون یحییٰؑ؟''

''میرا بیٹا ہے۔ کل سے گھر نہیں پہنچا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا وہ۔''

''کسی یحییٰؑ کو تو میں نہیں جانتا البتہ ایک لڑکے کو دیکھ کر ضرور آرہا ہوں جو کھڑا رو رہا تھا۔''

''وہی تو ہے میرا یحییٰؑ۔''

آپؑ جنگل کی طرف بے تحاشا دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ایک گڑھے میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور رخساروں پر آنسو جمے ہوئے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی روتے روتے چپ ہوئے ہیں۔ حضرت زکریاؑ ان کے قریب جا کر کھڑے ہوگئے۔

''بیٹا! ہم تو تیری یاد میں تجھ کو تلاش کر رہے ہیں اور تو یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہے۔''

''آپ ہی نے تو مجھے بتایا ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایسا لق و دق میدان ہے جو خدا کے خوف میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا۔ تو کیا میں جنت تک رسائی کے لیے آنسو نہ بہاؤں؟''

یہ سنتے ہی حضرت زکریا علیہ السلام پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ جنگل میں کھڑے دونوں آنسو بہا رہے تھے۔ دونوں جنت خرید رہے تھے۔

جب رونے سے جی بھر گیا تو دونوں جنگل سے نکلے اور گھر کی طرف چل دیے۔ جو آنسو رہ گئے تھے وہ ماں سے گلے لگ کر بہہ گئے۔

اس واقعے کے بعد ایک اداسی تھی جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ہر وقت گھیرے رہتی تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر خوف خدا اس درجہ غالب رہتا ہے کہ ہر وقت گریہ وزاری میں مشغول رہتے ہیں۔ رونے کو عبادت بنالیا ہے۔ اتنا روتے ہیں کہ رخساروں پر آنسوؤں کے نشان بن گئے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ وعظ میں شریک ہوتے اور باقی وقت جنگل میں گزارتے۔ ٹڈیاں اور درختوں کی

پتیاں آپؑ کی خوراک ہوتیں۔

اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کی پٹی کمر میں لگائے آپؑ جنگل کی طرف روانہ ہوتے تو اہلِ قبیلہ پر ایک خاص قسم کا خوف غالب آجاتا تھا۔ آپؑ سب سے بے نیاز جنگل میں داخل ہوتے اور عبادت الٰہی میں مصروف ہوجاتے۔

عمر عزیز میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب آپؑ لڑکپن کی حدود سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ رہے تھے۔ حکمت و دانائی لڑکپن ہی میں عطا ہوگئی تھی۔ البتہ جوانی تک پہنچتے پہنچتے یہ پریشانی بھی اس میں شامل ہوگئی کہ میری منزل کیا ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے کہاں جانا ہے۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ابھی تک انہوں نے کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ اہل قبیلہ ان پر رحم کھانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی تبلیغ کی وجہ سے مخالفتیں بڑھتی جارہی تھیں لیکن حضرت یحییٰ علیہ السلام سے کسی کو کوئی پرخاش نہیں تھی۔ انہیں ایک بے ضرر سا انسان سمجھا جارہا تھا جو جنگل میں جا کر روتا ہے اور بس۔ بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ دوسروں کی طرح وہ بھی حضرت زکریا علیہ السلام سے ناخوش ہیں۔

منصبِ نبوت جیسا اعلیٰ و اہم منصب کسی کو بھی صغیر سنی میں عطا نہیں ہوتا، چنانچہ جب آپؑ نے جوانی میں قدم رکھا تو آپؑ کو منزل نے آواز دے لی۔ آپؑ کو نوید نبوت ملی، کسی پکارنے والے نے آواز دے کر پکارا۔

''اے یحییٰؑ! خدا کی کتاب توریت کو سختی سے پکڑے رہو اور رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کردو۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی تھے رسول نہیں تھے لہٰذا آپؑ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب توریت کی پیروی کا حکم دیا جارہا تھا۔ آپؑ کو اسی شریعت پر عمل کرنا تھا۔ انہوں نے دریائے سیرون کے نواح میں دینِ الٰہی کی منادی شروع کردی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دینے لگے۔

پھر آپؑ کو حکم ہوا کہ یروشلم جا کر بیت المقدس میں وعظ کریں اور اللہ کی بیان کردہ پانچ باتوں کا حکم لوگوں تک پہنچائیں۔

آپؑ بیت المقدس میں تشریف لائے اور تمام بنی اسرائیل کو جمع کر کے وعظ بیان کیا۔ مسجد میں لوگ کثرت سے جمع تھے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی آواز گونجی۔

''اے لوگو! منادی کرنے والا منادی کرتا ہے۔ میری باتوں کو غور سے سنو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پانچ باتوں کا حکم دیا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں انہیں تم تک پہنچادوں۔ ان پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں۔ ان باتوں کی تفصیل سن لو۔ پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ کیونکہ مشرک کی مثال اس غلام کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے اپنی رقم سے خریدا اگر غلام نے وتیرہ اختیار کرلیا کہ جو کچھ کماتا ہے وہ مالک کے سوا ایک دوسرے شخص کو دے دیتا ہے تو اب تم بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ لہٰذا سمجھ لو کہ جب خدا ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

''دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرو کیونکہ جب تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہوگے، خدائے تعالیٰ برابر تمہاری جانب رضا اور رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا۔''

''تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو۔ روزہ دار کے منہ کی بو کا خیال نہ رکھو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے۔''

''چوتھا حکم یہ ہے کہ مال کا صدقہ نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو اس کے دشمنوں نے اچانک آ پکڑا ہو اور اس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر مقتل کی جانب لے چلے ہوں اور اس ناامیدی کی حالت میں وہ یہ کہے، کیا یہ ممکن ہے کہ میں مال دے کر اپنی جان چھڑالوں اور اثبات میں جواب پا کر اپنی جان کے بدلے سب دھن دولت قربان کردے۔''

''اور پانچواں حکم یہ ہے کہ دن رات میں کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہو کیونکہ ایسے شخص کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی سے اس کا تعاقب کر رہا ہو اور بھاگ کر وہ کسی مضبوط قلعہ میں پناہ گزیں ہوکر دشمن سے محفوظ ہوجائے۔ بلاشبہ انسان کے دشمن ''شیطان'' کے مقابلے میں ذکر اللہ کے اندر مشغول ہوجانا قلعہ میں محفوظ ہوجانا ہے۔''

اس وعظ نے عام لوگوں کو تو متاثر کیا لیکن علمائے یہود میں کھلبلی مچ گئی۔ انہیں اپنی دکانیں سرد ہوتی نظر آنے لگیں۔

باتیں ایسی تھیں کہ وہ ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ تو کر سکتے تھے کہ وہ باتیں بتانے والے کی مخالفت شروع کر دیں تاکہ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں اور علما کے دست نگر رہیں۔ ان علما نے لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا کہ یحییٰؑ صرف اپنی مقبولیت کے لیے یہ باتیں کرتے ہیں ورنہ یہ حق انہیں کس نے دیا اور ہم ان کی باتیں کیوں مان لیں؟ وہ خود کو نبی ثابت کریں ورنہ وعظ کرنا چھوڑ دیں۔ یہی علما ان سے پہلے حضرت ذکریا علیہ السلام کی مخالفت کرتے رہے تھے اور اب یحییٰؑ کی مخالفت کر رہے تھے۔

ان علما کا یہ عقیدہ چلا آرہا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جو یہودیوں کو راہ راست پر لائے گا۔

ان آنے والوں میں ایک تو حضرت الیاس علیہ السلام ہی تھے جو اچانک غائب ہو گئے تھے۔ قوم میں مشہور تھا کہ وہ واپس آئیں گے اور وہ سب ان کے منتظر تھے۔

لوگوں میں مشہور ہونے لگا تھا کہ یہ وہی الیاسؑ ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے بس تبلیغ کرتے پھر رہے تھے جسے علما اپنے حق میں بہتر نہیں سمجھ رہے تھے۔ بالآخر وہ سب مل کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس آئے۔

''اے یحییٰؑ! تو کون ہے۔ اپنی شناخت سے ہمیں آگاہ کر۔''

''میں یحییٰؑ بن زکریا ہوں۔ صحرا میں منادی کرنے والا ہوں۔''

''کیا تو مسیحؑ ہے؟''

''میں وہ بھی نہیں ہوں۔''

''پھر کون ہے، کیا تو ایلیا ہے؟''

''میں ایلیا بھی نہین ہوں۔''

''کیا تو وہ نبی ہے جس کا صدیوں سے انتظار ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تو کون ہے؟ جلدی بتا تاکہ ہم قوم کو بتا سکیں۔''

''تم میری فکر چھوڑ دو۔ اپنی راہ سیدھی کرو۔''

یہ علما واپس تو چلے گئے لیکن نفرت کا الاؤ دلوں میں لے کر گئے۔ مخالفت میں اور تیزی آگئی۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر زور دیا جانے لگا کہ وہ وعظ کرنا چھوڑ دیں۔

آپؑ نے فرمایا ''میں تو سیدھی راہ دکھانے آیا تھا۔ اب میں وہاں جاؤں گا جہاں میں نہیں، لوگ میرے پاس آئیں گے۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو یقین تھا کہ جو کچھ انہیں کہنا تھا، انہوں نے کہہ دیا۔ جب بیج بو دیا جائے تو کھیتی کی آرزو کی جاسکتی ہے۔ لوگوں میں احساس پیدا ہو گیا ہے، جب احساس گناہ ہو گا تو لوگ خود چل کر ان کے پاس آئیں گے۔

روایات کے مطابق آپؑ مشرقی اردن کے علاقے میں دعوت حق دیتے رہے۔ کچھ دنوں سے یہ آواز برابر گونج رہی تھی۔

''میں بیاباں میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم کو خداوند کی سیدھی راہ دکھاؤں۔''

پھر اس آواز میں ایک تبدیلی یہ آئی۔

''تم سب میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں بپتسمہ (گناہوں سے چھٹکارا) دوں۔ تم آؤ اور خود کو گناہوں سے پاک کر لو۔''

وہ علما سے بھی مخاطب تھے جنہیں وہ سانپ کی اولاد کہا کرتے تھے۔ یہ خطاب وہ انہیں اس لیے دیتے تھے کہ یہ علما خدائی احکام میں تحریف اور تاویل سے کام لیتے تھے اور اس طرح لوگوں کی ہلاکت کا باعث بنتے تھے۔ آپؑ کے مخاطب وہ تاجر بھی تھے جو کم تولتے تھے اور زیادہ قیمت وصول کرتے تھے۔ وہ چنگی وصول کرنے والوں سے بھی کہہ رہے تھے جو اصل سے زیادہ چنگی وصول کر کے کھا جاتے تھے۔ وہ ان سپاہیوں سے بھی مخاطب تھے جو تنخواہیں بھی لیتے تھے اور رشوت بھی۔

(جاری ہے)

ماخذات: قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بینک کی عمارت میں قدم رکھا اور سیدھا کیشیئر کی کھڑکی کی طرف چلا گیا...... جہاں مجھ سے پہلے ایک شخص موجود تھا۔ یہ کھڑکی کاؤنٹر کے آخری سرے پر واقع تھی اور اس کے برابر والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ میرے لیے یہ صورت حال خاصی اطمینان بخش تھی اور اس طرح میں بلاخوف وخطر کیشیئر سے نجی گفتگو کر سکتا تھا۔

میں نے گردن گھما کر ہال کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ بینک کا عملہ بھی تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ میں نے کھڑکی کے سامنے آکر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کیشیئر نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سب لوگ قطار میں کھڑے ہیں۔ آپ کو بھی قطار میں لگ کر اپنی باری کا

انسان پہلی ٹھوکر پر سنبھل جائے تو آئندہ زندگی کی آزمائشیں ذرا آسان ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدرد مل جائے تو اسے غیبی امداد کا اشارہ سمجھ لینا چاہیے۔ اسے بھی پہلی ٹھوکر لگی اور ہمدرد بھی ملا مگر وہ ایسی ہٹ دھرمی کا شکار تھا کہ غیبی مدد کو سمجھ ہی نہ پایا۔

حالات کی ستم ظریفی اور کم عقلی کا دلچسپ کھیل

انتظار کرنا ہوگا۔“

وہ عمر میں میری ماں سے بھی بڑی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ ضرور تھی لیکن میں جانتا تھا کہ ایسی عورتیں اندر سے بہت سخت ہوتی ہیں۔ میں نے کاؤنٹر پر رکھی اس کے نام کی تختی پڑھی جس پر بیو لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی ماں کی سہیلی یاد آگئی۔ اس کا نام بیور لے تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی لیکن اس عورت سے کسی رعایت کی امید رکھنا بے کار تھا۔ ویسے بھی اس نے ایک اصولی بات کہی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے الجھنے کے بجائے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں...... میں اسی طرف جا رہا تھا۔“

اس عورت پر میری نرم گوئی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پورا بازو پھیلا کر قطار کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ سب لوگ صبر سے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔“

میں جس مقصد کے تحت آیا تھا، اسے ذہن میں رکھتے ہوئے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی اور شرمندگی کے عالم میں سر جھکائے قطار کے آخری سرے پر جا کھڑا ہوا۔ کئی نظریں میری جانب اٹھیں۔ ان میں سے بہت سے چہروں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سب میرا مذاق اڑا رہے ہوں، مجھ سے آگے کھڑے ہوئے شخص نے ازراہ ہمدردی مجھے دیکھا اور بولا۔

”میں تمہیں اس حرکت کے لیے الزام نہیں دوں گا۔ جوانی میں سب ہی ایسا کرتے ہیں اور قطار میں نہ لگنا ایک ایڈونچر سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تمہاری عمر میں، میں نے کبھی قطار میں لگنے کی زحمت گوارا کی ہو۔ اب دیکھ لو، لگتا ہے کہ میری ساری عمر قطار میں کھڑے کھڑے انتظار کرتے گزر جائے گی۔ جانتے ہو کس لیے؟“

مجھے اس کے جوش خطابت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ جواب ملنے کی امید میں مسلسل مجھے دیکھے جا رہا تھا چنانچہ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔ ”جانتا ہوں، تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں بھی اس کی طرح بینک والوں کی سست روی سے نالاں ہوں اور ضرورت پڑنے پر اس کے ساتھ مل کر احتجاج کر سکتا ہوں۔

ہاں، کہنے کے بعد اس نے سانس لینے کے لیے وقفہ لیا اور اس کے بعد دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ اس کا یہ وعظ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ کیشیئر کی کھڑکی پر نہ پہنچ گیا۔ اسے وہاں پہنچ کر بھی چین نہ آیا اور میری طرف منہ کر کے اس نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ یہاں تک کہ کیشیئر نے اس کی پاس بک پر ضروری اندراج کر کے اسے فارغ نہ کر دیا۔ اس وقت تک میں مختلف موضوعات مثلاً ہتھیاروں پر کنٹرول، آبی وسائل کی تقسیم، مصروف شاہراہوں پر رفتار کی حد اور ومبلڈن ٹینس کے مقابلوں میں الیکٹرانک سسٹم کی تنصیب کے بارے میں اس کے زریں خیالات سے مستفید ہو چکا تھا۔

اس نے جاتے وقت مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ہونٹوں کی جنبش سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی تقریر جاری تھی لیکن فاصلے پر ہونے کی وجہ سے میں اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نہ سن سکا۔ ویسے بھی اس وقت تک میں کھڑکی پر پہنچ چکا تھا اور کیشیئر اپنے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجائے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو!“ اس نے کہا اور اپنے سامنے کاؤنٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”دوبارہ آمد پر خوش آمدید!“

یقیناً وہ مجھ پر طنز کر رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ مجھ سے پہلے بول پڑی۔ ”ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ذاتی مالی ضروریات کے لیے بیسلیم بینک کا انتخاب کیا۔ فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

مجھے اس عورت کا لہجہ کچھ اجنبی سا لگا۔ وجہ ظاہر تھی کیونکہ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی بینک میں قدم رکھا تھا۔ مجھے بینک کے ماحول اور کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ بینک وہ جگہ ہے جہاں لوگ اپنے پیسے جمع کرواتے اور ضرورت پڑنے پر نکالتے ہیں۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ بوڑھے لوگوں کو بینک سے ہی پنشن بھی ملتی ہے۔ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس لیے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی میں بوڑھا تھا جو بینک سے پنشن لینے آتا۔ پھر میں یہاں کیوں آیا تھا۔

دراصل میں نے فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں بینک ڈکیتی کے بہت سے واقعات دیکھ رکھے تھے۔ جن میں دو، چار یا چھ افراد ایک گروہ کی شکل میں بینک میں ڈاکا ڈالنے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک بینک کے صدر دروازے پر پہرا دیتا ہے، ایک باہر گاڑی میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کرتا ہے۔ دو آدمی بینک کے عملے اور وہاں موجود گاہکوں کو اسلحہ کے زور پر قابو کرتے ہیں جبکہ دو افراد کیشیئر سے رقم چھیننے پر مامور ہوتے ہیں۔ میں بینک ڈکیتی کی

ان وارداتوں کا بہ غور جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جس طرح بہت سے باورچی مل کر دیگ کا بیڑہ غرق کر دیتے ہیں اسی طرح زیادہ تعداد میں ڈاکوؤں کی موجودگی کسی بھی واردات کی ناکامی کا سبب بن سکتی ہے۔ سب سے پہلی رکاوٹ تو منصوبہ بنانے میں آتی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے ذہن اتنے پلان؟ ہر کوئی اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق مشورہ دیتا ہے اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو پھر اس کا جوش اور ولولہ بھی آدھا رہ جاتا ہے اور وہ بے دلی سے واردات میں حصہ لیتا ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی غیر معمولی ہنگامی صورت حال میں اگر گروہ کا ایک فرد بھی اپنے حواس کھو بیٹھے تو واردات کی ناکامی یقینی ہے پھر واردات ختم ہونے کے بعد بینک سے فرار ہونے کی ٹائمنگ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر کسی ایک فرد کو گاڑی تک پہنچنے میں تاخیر ہو جائے تو پولیس موبائل سے سامنا ہونے کا خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

مائیک میرا بچپن کا دوست اور پارٹنر تھا۔ ہم دونوں اکثر ان وارداتوں پر گفتگو کرتے۔ مائیک کا خیال تھا کہ چھوٹی موٹی وارداتوں سے ملنے والی رقم روزمرہ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ چوریاں کرنے، راہ گیروں کو سرعام لوٹنے یا لڑکیوں کے پرس چھیننے سے گزارہ نہیں ہو رہا تھا پھر پکڑے جانے کا خطرہ الگ تھا۔ اس لیے میں اور مائیک بڑی سنجیدگی سے بینک ڈکیتی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ مائیک کا خیال تھا کہ یہ کام دو آدمیوں کے بس کا نہیں۔ اس کے لیے ہمیں مزید لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا جبکہ میری سوچ اس کے بالکل برعکس تھی۔ اس نوعیت کی وارداتوں میں اصل کردار اس شخص کا ہوتا تھا جسے کیشیئر سے رقم کا تھیلا لے کر فرار ہونا ہوتا ہے۔ باقی سارے کردار ضمنی تھے اور ان کی حیثیت خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ کام میں تنہا بھی کر سکتا تھا۔ پھر مائیک کو ساتھ ملانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کرتا کہ بینک کے عملے اور گاہکوں پر بندوق تان کر کھڑا ہو جاتا اور اس چھوٹے سے کام کے عوض لوٹی ہوئی رقم میں نصف کا حصہ دار بن جاتا۔ وہ ویسے بھی بہت سست واقع ہوا تھا اور اس کا امکان بہت زیادہ تھا کہ وہ بینک سے نکلنے میں اس پھرتی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ نہ کر پاتا جس کی ضرورت ایسے موقعوں پر ہوتی ہے چنانچہ میں نے مائیک کو اس پروگرام میں شامل کرنا ضروری نہ سمجھا اور تنہا ہی بینک لوٹنے کے لیے چلا آیا۔

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ عورت اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے تو میں اپنا منہ کھڑکی کے پاس لے گیا اور بولا۔

”تمہاری دراز میں جتنی رقم ہے وہ میرے حوالے کر دو۔“

بیو نے اپنا ہاتھ کان پر رکھا اور بولی۔ ”لڑکے! تم نے کیا کہا کہ میں اپنی درازوں میں سے ساری رقم نکال کر تمہارے حوالے کر دوں۔“

”نہیں میم۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”میں نے دراز کہا ہے، درازیں نہیں۔“

”بہت اچھی بات ہے ورنہ تم مشکل میں پڑ جاتے۔ ویسے کیا تمہارا ارادہ بینک لوٹنے کا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم خوف زدہ کیوں ہو؟“ اس نے پوچھا پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”کیا کسی نے تمہیں اس کام کے لیے مجبور کیا ہے؟“

”نہیں میم! میں یہاں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔“

”مجھے حیرت ہے کہ تم اکیلے ہی یہ مہم سر کرنے چلے آئے۔ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔“

”یہ کیسے ممکن ہے جبکہ تم نے ابھی تک مجھے کوئی تحریر بھی نہیں دی۔“

”میرے پاس ایسی کوئی تحریر نہیں ہے۔ کیا زبان سے کہہ دینا کافی نہیں ہے؟“

”نہیں۔ میرے پاس تمہاری تحریر ہونی چاہیے تاکہ بعد میں اپنے افسروں اور پولیس کو دکھا سکوں اور انہیں یقین آجائے کہ مجھے واقعی لوٹا گیا ہے ورنہ وہ مجھے ایک ایسی نااہل کیشیئر سمجھیں گے جس نے کسی گاہک کو دس کے بجائے دس ہزار ڈالرز پکڑا دیے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا، انہیں تمہاری بات پر یقین کرنا پڑے گا۔“

”تم شاید بھول رہے ہو کہ ڈکیتی کی وارداتوں میں اس طرح کی تحریر دینے کا رواج ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ آئندہ یاد رکھوں گا۔“

”تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ وہ مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ پہلی بار ہے۔“

”پہلی بار؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔ لگتا ہے کہ تم پہلی بار بینک لوٹنے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“ میں

نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''بس تم مجھے جلدی سے رقم دے دو۔''
''تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے؟''
''یہ بینک ڈکیتی ہے اور یہ کام بہت تیزی سے ہونا چاہیے۔''
''اگر تم مجھے تحریر دے دیتے تو آسانی ہو جاتی۔''
''تم چاہتی ہو کہ میں ابھی نوٹ لکھ کر دوں؟'' میں نے اس کے سامنے رکھا ہوا قلم اٹھایا۔
''رہنے دو۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ بہرحال میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں کہ تم نے میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کی۔''
میں نے ایک گہری سانس لی اور قلم واپس قلم دان میں رکھ دیا تھا۔ اب امید ہو چلی تھی کہ وہ عورت میرا مطالبہ پورا کرنے میں دیر نہیں لگائے گی۔ ویسے بھی میرے پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ کیشیئر کی سست روی پر بہ آواز بلند تبصرے کر رہے تھے لیکن کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی عورت کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اب اس نے ایک نیا شوشا چھوڑ دیا۔
''ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس کوئی نوٹ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ساتھ کیا لے کر آئے ہو۔ کوئی گن وغیرہ ہے، تمہارے پاس؟''
''نہیں میم!'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
''کوئی چاقو، بم، تیر کمان یا فائر کریکر وغیرہ؟''
میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''تمہارے پاس مجھے ڈرانے دھمکانے کا کوئی سامان بھی نہیں ہے۔ پھر میں تمہیں رقم کس طرح دے سکتی ہوں؟''
''کیونکہ میں بہت خطرناک ہوں۔''
بیو نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''دیکھنے میں تو ایسے نہیں لگتے۔''
''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔'' میں نے جل کر کہا۔
اس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ ''میں تمہیں ایک بات بتا دوں اور وہ یہ کہ شاید تمہاری پیدائش سے پہلے سے ہی میں بینک میں کام کر رہی ہوں۔ جب میں ڈلاس میں تھی تو میں نے وہاں بینک ڈکیتی کی اتنی وارداتیں دیکھیں جو شاید کسی ایف بی آئی کے ایجنٹ نے بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ تم جانتے ہو کہ اس شہر میں جرائم پیشہ افراد کی بھرمار ہے۔ بینک ڈکیتی کے دوران وہ لوگ مجھ پر بندوق تان کر کھڑے ہو جاتے۔ میرا واسطہ ایسے بدمعاشوں سے بھی پڑا جو معززین کے بھیس میں آتے اور بتاتے کہ ان کے بریف کیس میں آتش گیر مادہ رکھا ہوا ہے۔ کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ ڈاکوؤں نے اسلحہ کے زور پر بینک کے عملے اور وہاں موجود گاہکوں کو فرش پر لیٹنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کے باوجود کوئی مجھ سے رقم نکلوانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس بل بوتے پر مجھے دھمکا رہے ہو!''
میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ عورت مجھے باتوں میں لگا کر وقت ضائع کر رہی تھی۔ میرے پیچھے لگی ہوئی قطار کچھ اور بڑی ہو گئی تھی اور لوگ بہ آواز بلند کیشیئر کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میرے لیے یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ میں نے غصے سے کہا۔ ''بہت ہو چکا، جلدی سے رقم میرے حوالے کر دو۔ دیکھ رہی ہو کہ لوگ شور مچا رہے ہیں ذرا سی دیر میں ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ ویسے میرے پاس گن ہے۔''
یہ کہہ کر میں نے اپنی قمیص اوپر اٹھائی اور فوراً ہی نیچے کر لی تاکہ وہ میری پیٹی سے بندھی کھلونا پستول کی جھلک دیکھ لے۔ پھر میں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''دراصل میں تمہیں خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔''
''تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ واقعی میں یہی سمجھتی کہ یہ اصلی گن ہے۔'' پھر وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم رقم لے جانے کے لیے تھیلا لے کر آئے ہو؟''
''نہیں۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔
اس نے غصے سے مجھے گھورا اور بولی۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ہر وقت اپنے پاس اس قسم کے تھیلے رکھیں تاکہ تم جیسا کوئی بھلکڑ ڈاکو ہمیں لوٹنے آئے اور ہم دراز میں سے رقم نکال کر ان تھیلوں میں ڈال دیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میرے پاس ایسا کوئی تھیلا نہیں ہے۔''
''واقعی میں نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا۔'' میں نے اعتراف کیا۔
''لگتا تو یہی ہے کہ تم نے یہاں آنے سے پہلے بہت سی باتوں کے بارے میں نہیں سوچا اور کسی تیاری کے بغیر چلے آئے شاید تم اس کام کے لیے مناسب نہیں ہو۔ ویسے بائی دی وے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''
میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''ریکس!''
ظاہر ہے کہ یہ میرا اصلی نام نہیں تھا۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ غالباً سمجھ گئی ہوگی کہ میں نے اسے غلط نام بتایا ہے۔ اس کے قہقہے کی گونج دور تک سنائی دی اور بینک میں موجود لوگ یہی سمجھے ہوں گے کہ ہم پرانے جاننے والے ہیں۔
''اوکے ریکس!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم نے مجھے کوئی تحریر نہیں دی۔ ایک کھلونا پستول لے کر

مجھے ڈرانے چلے آئے اور تمہارے پاس رقم لے جانے کے لیے تھیلا بھی نہیں ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہیں رقم کیوں چاہیے؟''
''مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔''
''یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ ہر انسان کو پیسوں کی ضرورت ہے لیکن جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں پیسے کیوں چاہئیں؟''
''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''
''ٹھیک ہے، پھر مجھے خود ہی اندازہ لگا لینے دو۔ شاید تمہاری ملازمت ختم ہو گئی ہے اور سیلائٹ ٹی وی کمپنی نے عدم ادائیگی کی صورت میں تمہارا کنکشن منقطع کرنے کی دھمکی دی ہے۔''
''واہ۔ تم نے تو پہلی ہی کوشش میں صحیح اندازہ لگا لیا۔'' میں نے اسے چکمہ دینے کی خاطر کہا۔
اس نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور بولی۔ ''اس طرح کی خوشامد تمہیں زیب نہیں دیتی۔ تمہیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو اور کیا تم واقعی ہمیشہ یہ کام کرتے رہو گے؟''
مجھے اس کی باتوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور کسی وقت بھی کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔ ''تم اپنی دراز میں موجود ساری رقم مجھے دے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔''
اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے وہ میرا جھوٹ پکڑنا چاہ رہی ہو۔ میری ماں بھی ایسے ہی کیا کرتی تھی پھر بولی۔ ''کیا تمہاری ماں کو کچھ اندازہ ہے کہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟''
''وہ میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھتی ہے۔''
اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ جس پر کئی لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے، وہ کہنے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت بھی گھر پر بیٹھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی ہوگی۔ شاید اسے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ تم جرم کی دنیا میں قدم رکھ چکے ہو۔''
''نہیں میم۔''
''کیا ہی اچھا ہو کہ اسے کبھی یہ بات معلوم نہ ہو سکے۔'' وہ دردمندی سے بولی۔
''آخر کب تک۔ ایک نہ ایک دن تو اسے معلوم ہو جائے گا۔''
''میرا خیال ہے کہ تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ تم نے مجھے کوئی دھمکی یا گالی نہیں دی۔ اس لیے مجھے اب بھی امید کی کرن نظر آتی ہے۔''
''تم ایسا سوچ سکتی ہو۔''
اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور ایک پلاسٹک کے تھیلے میں رقم ڈالنا شروع کر دی پھر بولی۔ ''فی الحال میں تمہارے لیے اتنا ہی کر سکتی ہوں۔ اب تم خاموشی سے چلے جاؤ۔''
''شکریہ۔''
''شاید تمہیں کھلے پیسوں کی بھی ضرورت پڑے۔ تم چاہو تو میں تمہیں اس کے علاوہ دس پندرہ ڈالرز دے سکتی ہوں۔''
''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔''
''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے مرکزی دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی۔
''کیا تم نہیں سمجھتیں کہ باہر پولیس میرا انتظار کر رہی ہوگی؟''
''اس کی توقع تو ہر وقت کی جا سکتی ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ بینک کا اپنا بھی ایک حفاظتی انتظام ہوتا ہے۔''
''تمہیں بولنے کا مرض ہے اور تم نے مجھے کافی دیر سے باتوں میں الجھایا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں اتنا ہی احمق نظر آتا ہوں کہ اتنی آسانی سے تمہارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاؤں گا۔ شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے اسی وقت الارم کا بٹن دبا دیا تھا جب میں نے تم سے پہلی بار رقم کا مطالبہ کیا تھا اور اتنی دیر سے مجھے باتوں میں لگا کر پولیس کے آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔''
اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولی۔ ''میں ان سے کہہ دوں گی کہ تمہارے ساتھ نرمی برتیں۔ کیونکہ تم سے پہلی بار کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔''
''شکریہ!'' میں نے تلخی سے کہا اور رقم کا تھیلا کاؤنٹر پر چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گیا۔
میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے بینک کے صدر دروازے سے باہر آیا تو وہاں کوئی پولیس والا میرا منتظر نہیں تھا اور نہ ہی میرا کوئی تعاقب کر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس علاقے سے باہر آ گیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے تو میں وہیں فٹ پاتھ پر لگی بنچ پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں اس مہربان اور شفیق عورت کا شکریہ ادا کرنے لگا جس نے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا کر مجھے جرم کی راہ پر چلنے سے بچا لیا تھا، اب میں واقعی سنجیدگی سے کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اسما قادری

جنونِ عشق

حسن اور نزاکت کا امتزاج بے شک آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے مگر جب کبھی اسی صنفِ نازک کی گہرائی کو پانے کی کوشش کی جاتی ہے تو احساس ہوتا ہے "مجموعۂ اضداد ہے عورت... کہیں ریشم کہیں فولاد ہے عورت" وہ جو محض اپنے ایک گمان پر یقین کیے خارزار راہوں پر چل نکلی تھی... اسے ہر رستہ سراب کی صورت خوابوں کی جھلک دکھلاتا... ہر دن ابھرتا سورج اس کے لہو کی گردش تیز کردیتا اور ہر ڈھلتی شام اس کے کانوں میں مدھم سی سرگوشی کر جاتی "اندھیروں میں اجالوں میں... سراب آثار رستوں میں... سفر اپنا رہے جاری... اگرچہ شام سر پہ ہے... مگر یہ بھی حقیقت ہے... ابھی امید ہے باقی" اور عشق جنوں کی اس کیفیت میں اس نے جس کے کارن بدلی ذات، کیا سورج کو بھی رات... وہ تو کسی اور ہی منزل کا راہی نکلا۔ اس کی جستجو، اس کی طلب میں تو کچھ اور ہی تھا۔ اسے پھولوں کی مہک اور خوابوں کی چمک سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن... جب خوشبو اور خواب اپنے محور کو محصور کرلیں تو کسی کی مجال کیا کہ ان کی دسترس سے نکل جائے... جنوں خیزی کے موسم میں چلتے چلتے اچانک ایک موڑ ان کی زندگی کا وہ سنگِ میل ٹھہرا جہاں خوشگوار دھڑکنیں جذبوں کی روش بچھائے ان کے ملن کی منتظر تھیں۔

دل فگار موسم، حنائی جذبوں اور دلبروں کی عنایتوں کی سحر انگیز داستان

اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے حسب عادت میل بکس میں جھانکا اور ایک جانا پہچانا سا لفافہ دیکھ کر کھل اٹھی۔ دیارِ غیر میں وطن سے باقاعدگی سے آنے والے خطوط کا یہ سلسلہ، اس کے لیے کسی ملٹی وٹامن ٹانک کی حیثیت رکھتا تھا۔

''ہیلو عائشہ!'' اس نے میل باکس میں سے لفافہ نکال کر ان انگلیوں کے لمس کو محسوس کرنا چاہا جنہوں نے بہت محبت سے اس لفافے پر ایڈریس لکھ کر اسے پوری نفاست کے ساتھ بند کیا تھا کہ اپنے عقب سے سنائی دیتی آواز پر پلٹنا پڑا۔ سامنے حمزہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا تھا۔

''ہیلو۔'' عائشہ نے بھی ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا لیکن شاید آج تم کچھ لیٹ ہوگئی ہو۔''

''ہاں، آج ماریہ نے ایک گھنٹا لیٹ اسٹور پر آنا تھا، اس لیے مجھے وہاں رکنا پڑا لیکن تم بتاؤ، تم کیوں میرا انتظار کر رہے تھے؟'' حمزہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے عائشہ نے اس سے پوچھا۔

''آج میں نے اپنے علاقے کی ایک اسپیشل ڈش بنائی ہے اور چاہ رہا تھا کہ کسی اچھے ساتھی کے ساتھ بیٹھ کر اسے انجوائے کروں۔'' حمزہ نے وجہ بتائی اور تھوڑا پیچھے ہٹ کر، سر کو قدرے جھکاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے عائشہ کو اپنے اپارٹمنٹ میں آنے کی دعوت دی۔

''تم بیٹھو، میں ابھی دو منٹ میں اسے مائیکرو ویو میں گرم کرلیتا ہوں۔'' حمزہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ یقیناً عائشہ کا دعوت قبول کرلینا اسے سرشار کر گیا تھا۔ وہ واپس آیا تو عائشہ نے دیکھا، ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے ٹن، کوارٹر پلیٹس اور ٹماٹو ساس کے ساتھ ایک ڈش بھی موجود تھی۔

"یہ کیا ہے؟" عائشہ نے ڈش میں موجود سموسے نما چیز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ فنکالیاں ہیں، ہمارے علاقے کی خاص ڈش۔ تم کھا کر دیکھو، تمہیں بہت پسند آئیں گی۔" حمزہ نے فخر سے کہتے ہوئے دعویٰ کیا تو عائشہ نے مسکراتے ہوئے پلیٹ میں اپنے لیے ایک فنکالی نکالی اور ٹماٹو ساس کے ساتھ ایک بائٹ لیا۔

"زبردست حمزہ! تم تو بہت اچھے کک ہو، میری مانو تو پارٹ ٹائم میں یہ بزنس بھی شروع کردو، سارے نیو یارک میں تمہارے داغستان کے کھانوں کی دھوم مچ جائے گی۔"

"تعریف کے لیے شکریہ لیکن مشورہ قابل قبول نہیں۔ میں شیف حمزہ کہلانے کے مقابلے میں سرجن حمزہ کہلانے میں زیادہ خوش ہوں۔" حمزہ کے جواب پر عائشہ کھلکھلا کر ہنسی اور کولڈ ڈرنک کا ٹن کھول کر ہونٹوں سے لگایا۔ حمزہ نے بہت محویت سے عائشہ کے اس انداز کو دیکھا۔ بلیو جینز پر لائٹ گرین لانگ کرتا اور سیاہ اسکارف پہنے یہ لڑکی ہمیشہ ہی اسے بہت اٹریکٹ کرتی تھی۔

"تمہاری اسٹڈیز کیسی چل رہی ہے؟" اس نے خود اپنا ہی دھیان بٹانے کے لیے عائشہ سے پوچھا۔

"بہت شاندار۔" ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے عائشہ نے جواب دیا اور کھانے کے دوران ایک سائڈ پر رکھ دیے جانے والے لفافے کو اٹھا کر اپنے بیگ کے اندر احتیاط سے رکھا۔

"پاکستان سے خط آیا ہے؟" حمزہ نے پوچھا۔

"ہاں، میرے بابا کا خط ہے۔" عائشہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ بتایا۔

"امیزنگ۔ انٹرنیٹ کے اس دور میں تمہارے فادر تمہیں خط لکھتے ہیں، میرے لیے یہ بات بہت تعجب خیز ہے۔" حمزہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہمارا کاغذ قلم کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے حمزہ! ہم اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ میرے والد سول سروسز میں ہیں۔ ان کی جاب اس نوعیت کی ہے کہ وہ عموماً کسی نہ کسی ایمرجنسی میں گھرے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا قلم بہتے جھرنوں، سبزہ زاروں، ساون کی دلکشی اور نازک جذبات کا عکاس بنا کاغذ پر خوبصورت نظمیں بکھیرتا رہتا ہے۔ کاغذ کے اس ٹکڑے پر میں ان کی انگلیوں کا لمس اور خوشبو محسوس کرسکتی ہوں۔" بہت جذب سے یہ سب کہتے ہوئے وہ حمزہ کو کچھ اور بھی دلکش لگ رہی تھی۔

©©©

دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز پر چارپائی پر کروٹیں بدلتے نور محمد نے لپک کر دروازے کا رخ کیا۔ آج کل حالات اتنے غیر یقینی تھے کہ سکھ کی نیند آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ ہر گھڑی، ہر لمحہ یہی خوف رہتا تھا کہ کہیں سے بپھرے ہوئے انسانوں کا ایک ریلا آئے گا اور انہیں کاٹ پیٹ کر رکھ دے گا۔

"نورے! ہوشیار ہوجا۔ اطلاع ہے کہ مکتی باہنی والے ہماری بستی کا رخ کرنے والے ہیں۔" نور محمد کے بدترین خدشات کی تصدیق کرنے کے لیے اس کا پڑوسی ارشاد اس کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ تحفظ کے لیے متفکر گھر کے مرد لاٹھی، بانس، ہاکی یا اسی قسم کی دوسری اشیا ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔ ارشاد اطلاع دینے کے بعد وہاں رکا نہیں تھا۔ نور محمد بھی پلٹ کر گھر کے اندر واپس آگیا اور چارپائی کے نیچے جھک کر چار فٹ لمبا وہ بانس نکالا جس کے سرے پر ایک تیز دھار چھرا باندھ کر اس نے اپنے ہتھیار کو کارآمد اور مہلک بنانے کی کوشش کی تھی۔ چارپائی پر اس کی بیوی کلثوم اور اس کا بیٹا رحمت الٰہی محو خواب تھے۔ رحمت الٰہی کی عمر کل آٹھ دن تھی۔ ابھی کل ہی محلے کے چند گھروں کی میٹھی چاولوں سے دعوت کر کے رحمت الٰہی کی "مسلمانی" کی تقریب انجام دی گئی تھی۔ اسی تقریب میں ہی کلثوم اور نور محمد نے بہت چاہت سے اپنے پہلوٹی کے بیٹے کے لیے رحمت الٰہی نام تجویز کیا تھا۔ نور محمد اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کلثوم کی زچگی کے موقعے پر تنہائی کا احساس اور بھی شدت سے ہوا تھا۔ اسے وہ آرام اور ناز برداری میسر نہیں تھی جو بھرے پُرے خاندان میں رہنے والی عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔

نور محمد نے کلثوم کو جگانے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا لیکن پھر کچھ سوچ کر ارادہ ملتوی کردیا۔ چار دن پہلے بھی انہیں حملے کی اطلاع ملی تھی لیکن رات بھر جاگنے کے بعد پتا چلا تھا کہ اطلاع درست نہیں۔ اب بھی ایسی ہی امید دل میں لیے نور محمد نے کلثوم کے آرام میں خلل نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ لیکن آج کے دن اس کی کوئی اچھی امید پوری نہ ہونے والی تھی۔ بستی پر حملہ ہوا اور ان کے اندازے سے بڑھ کر کئی گنا شدت کے ساتھ ہوا۔ حملہ آوروں کے ساتھ برسرِ پیکار نور محمد کے لیے گھر واپس لوٹنے اور کلثوم کو ہوشیار کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا لیکن یہ چیخ و پکار اور آہ و بکا میں ڈوبا ہوا ماحول ایسا نہیں تھا کہ کلثوم کی نیند نہ ٹوٹتی۔ وہ شور کی آواز پر گہری نیند سے جاگ گئی تھی اور پہلے

سے اندیشوں میں ڈوبے ہوئے ذہن نے بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کرلیا تھا۔ چارپائی کے اوپر سے نور محمد اور نیچے سے اس کے ہتھیار کی غیر موجودگی نے کلثوم کو احساس دلا دیا تھا کہ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ رحمت الٰہی کو دنیا میں آئے بے شک صرف آٹھ دن ہوئے تھے لیکن کلثوم تو گزشتہ نو ماہ سے اسے اپنے خون سے سینچ رہی تھی۔ رحمت الٰہی اسے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی جان اور نور محمد کی بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کلثوم نے بہت تیزی سے فیصلہ کیا اور بستر پر موجود چادر میں ہی رحمت الٰہی کو لپیٹ کر گھر کے پچھلے دروازے سے نکل کر باہر کی طرف دوڑی۔ حملہ آور مزاحمت کے باعث ابھی پوری بستی میں نہیں پھیلے تھے۔ کلثوم کو اپنے اردگرد اور بھی کئی لوگ جان بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے نظر آئے لیکن کلثوم ان میں سے کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ وہ صرف اور صرف اپنے بچے کو کسی محفوظ مقام تک پہنچانے کی خواہش رکھتی تھی، وہ بہت تیزی سے گھر کی پچھلی جانب موجود درختوں کے جھنڈ میں دوڑ رہی تھی۔ اس کے پیر خونم خون ہوگئے تھے اور زچگی کی شدید تکلیف سے چند روز قبل ہی گزرنے والا بدن پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا لیکن وہ رکی نہیں تھی۔ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ہموار سڑک پر آنے کے باوجود بے سمت دوڑتی ہوئی بالآخر وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئی جہاں موجود مکانات اپنی بناوٹ سے، مکینوں کی خوشحالی کی عکاسی کررہے تھے۔ خوب صورت بیلوں سے گھرے ایک بڑے سے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کلثوم کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ گیٹ کے سامنے ڈھے گئی۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے کہیں دور سے آتی اذان کی آواز کو سنا تھا اور اپنی بانہوں میں موجود رحمت الٰہی کے گرد اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

©©©

پروفیسر آر پی نے لیکچر کے دوران کلاس میں موجود طلبہ پر نظر دوڑائی اور پھر آخری قطار میں موجود چہرے کو دیکھ کر الجھ گیا۔ سیاہ اسکارف کے ہالے میں گھرا رہنا والا یہ چہرہ ہر بار اسے اسی طرح الجھن میں مبتلا کردیتا تھا۔ اس چہرے پر پڑنے والی اپنی نظر کو پلٹانے میں اسے ہمیشہ بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دوسری طرف اس لڑکی کا ردعمل بھی بہت عجیب تھا۔ پروفیسر آر پی نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ اس لڑکی کی طرف نگاہ کرتا تو لڑکی بہت محویت سے اس کی طرف متوجہ ہوتی تھی لیکن پروفیسر آر پی کی نگاہ سے نگاہ ملتے ہی وہ بہت سرعت سے اپنی پلکیں جھکا لیتی تھی۔ امریکا جیسی ریاست میں مقیم ہونے کے باوجود، جہاں جگہ جگہ حسن بے حجاب کے جلوے بکھرے ہوئے تھے، نہ وہ کبھی کسی کی نیلی آنکھوں کے سمندر میں ڈوبا تھا، نہ اسے کسی کی سنہری زلفوں کے پیچ وخم گرفتار کرنے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ اپنی عمر کے تین عشرے اپنے طے کردہ ضوابط کے مطابق وہ نہایت کامیابی سے گزار چکا تھا۔ لیکن اب چوتھے عشرے سے گزرتے ہوئے یکدم ہی وہ لڑکی اس کے لیے ایک امتحان بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس سے کئی سال چھوٹی یہ لڑکی جس کا نام عائشہ سجاد، قومیت پاکستانی اور مذہب اسلام تھا۔ بظاہر ایک طالبہ کی حیثیت سے اس کلاس روم میں بیٹھتی تھی لیکن یہ تو صرف پروفیسر آر پی ہی جانتا تھا کہ وہ لڑکی کلاس روم میں صرف ایک طالبہ نہیں بلکہ چیلنج کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھتی تھی۔ جتنا پروفیسر آر پی کا دل عائشہ سجاد کی طرف لپک رہا تھا، وہ اتنا ہی اس سے چڑتا جا رہا تھا۔ یہ چڑ ایک واضح ناپسندیدگی کی صورت میں اس کے رویے سے ظاہر ہوتی تھی جس سے کلاس کا تقریباً ہر اسٹوڈنٹ ہی واقف ہوچکا تھا۔

©©©

"جلدی کرو کملا! ہم لیٹ ہورہے ہیں۔" جوتے کا تسمہ باندھتے ہوئے راج پرشاد نے اپنی بیوی کملا دیوی کو آواز دی۔

"آرہی ہوں بھئی، تم تو ہر صبح ایسے بے قرار ہوتے ہو جیسے واک کے لیے نہیں محبوبہ سے ملنے جانا ہو۔" کملا بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

"ڈاکٹر کی بیوی ہو ڈارلنگ! ایسی چھوٹی چھوٹی پابندیاں تو برداشت کرنی ہی پڑیں گی۔" راج پرشاد نے کملا کی جھنجلاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ گلاب کی پتیوں جیسی آمیزش رکھنے والی اس کی سفید رنگت نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر اب تو راج پرشاد کو اکثر یہ گمان ہونے لگتا تھا جیسے کسی نے دودھ میں ڈھیروں ہلدی گھول دی ہو۔ دو ماہ قبل اس کا مس کیرج ہوا تھا، اپنے بچے کو کھونے کے ساتھ ساتھ اس خبر نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ وہ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ شدید ترین ذہنی کرب سے بھی گزری تھی۔ راج کی اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود یہ کوشش ہوتی تھی کہ کملا کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکے۔ اسی مقصد کے تحت اس نے مارننگ واک پر جاتے

ہوئے کملا کو اپنے ساتھ لے جانے کا معمول بنالیا تھا۔
''راج! تم نے اس مسئلے کے حل کے لیے کوئی کوشش کی؟'' کملا کا ذہن آج کل صرف ایک ہی بات میں اٹکا رہتا تھا اس لیے راج کے خوشگوار موڈ کے جواب میں بھی اس کے پاس روزانہ والا سوال ہی تھا۔
''تم فکر مت کرو کملا! میں کوشش کررہا ہوں۔'' راج اس کی ذہنی حالت کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے اس بے وقت کی راگنی پر چڑنے کے بجائے بہت نرمی سے اسے تسلی دی۔
''سمے بہت تیزی سے بیت رہا ہے راج! میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے کہ ماتا جی یہاں آئیں ہم انہیں کوئی خوشخبری بھیج دیں۔ ہمارے پاس ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے بچہ موجود ہونا چاہیے۔'' کملا نے فکرمندی سے اسے احساس دلایا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ ماتا جی کے شدید ردعمل سے ڈر کر انہیں کملا کے ساتھ بیتنے والے حادثے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ کملا کی تسلی کے لیے راج پرشاد نے منصوبہ بنایا کہ وہ لوگ کملا کو ڈاکٹر کی دی گئی ڈیٹ سے پہلے کسی نومولود بچے کو ایڈاپٹ کرلیں گے اور ماتا جی پر یہی ظاہر کریں گے کہ وہ ان کی اپنی اولاد ہے۔ کملا جیسی ناپسندیدہ بہو کو ماتا جی کے عتاب سے بچانے کا یہی ایک طریقہ راج پرشاد کو سوجھا تھا لیکن اس طرح سے بچے کا حصول کہ کسی کو اس کی بھنک نہ پڑے، بہت مشکل تھا۔
''بھگوان سب ٹھیک کردے گا تم چنتا مت کرو۔'' کملا کے شانے پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے راج پرشاد نے اسے تسلی دی اور باہر کی طرف رخ کیا۔ گیٹ کا بغلی دروازہ کھول کر وہ دونوں باہر نکلے اور باہر موجود عورت کو دیکھتے ہی کملا کے ہونٹوں سے حیرت اور خوف سے ملی جلی چیخ نکل گئی۔
راج پرشاد نے فوراً ہی آگے بڑھ کر عورت کی نبض چیک کی اور اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ عورت کا جسم اگرچہ ابھی مکمل طور پر ٹھنڈا نہیں پڑا تھا لیکن اس کی زندگی کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔ صبح کی ملگجی روشنی میں بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ساڑھی میں ملبوس عورت کی لاش بہت سی کہانیاں سنا رہی تھی۔ روز بہ روز بگڑتے حالات سے واقف راج پرشاد کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں تھا کہ یہ عورت کسی ایسی بستی سے، جہاں رات کو موت کا کھیل کھیلا گیا ہوگا زندگی کی تلاش میں فرار ہوئی تھی لیکن موت کے بے رحم پنجوں نے اسے یہاں بھی جکڑ لیا تھا۔ لاش کا حال دیکھ کر کوئی بھی شخص موت کی وجہ کا تعین کرسکتا تھا پھر راج پرشاد تو ایک ڈاکٹر تھا جس نے فوراً ہی جان لیا تھا کہ عورت کی موت خون کے بہت زیادہ اخراج کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔
''راج! اسے دیکھو، یہ بچہ سانس لے رہا ہے۔'' کملا اس دوران قریب آکر عورت کی گود میں موجود بچے کو اپنی گود میں لے چکی تھی، راج کو عورت کی طرف سے مایوس ہوتے دیکھ کر دبے دبے جوش سے بولی۔ راج پرشاد فوراً ہی بچے کی طرف متوجہ ہوا۔ بچہ واقعی سانس لے رہا تھا لیکن اس کی حالت کچھ خاص اچھی نہیں تھی۔
''اندر چلو، اسے بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''
راج کے اندر کا ڈاکٹر پرجوش امید کے ساتھ جاگا اور وہ بچے کے ساتھ تیزی سے گھر کے اندر کی طرف بھاگا۔ کملا بھی اس کے پیچھے موجود تھی۔ اس کی تمام توجہ کا مرکز وہ بچہ تھا جسے راج پرشاد ٹریٹمنٹ دینے کی کوشش کررہا تھا۔ کملا سانس روکے راج کے مصروف ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی، اسے اپنے گیٹ پر لاش کی شکل میں پڑی عورت کا خیال بھی نہیں آرہا تھا۔
''کملا! پولیس کو فون کرو اور انہیں اس واقعے کی اطلاع دو۔'' راج پرشاد نے کملا کو ہدایت دی تو وہ خاموشی سے اس ملحقہ کمرے میں چلی گئی جہاں ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ فون کرکے وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر گہری سوچ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔
''کیا ہوا؟ تم نے پولیس کو عورت کی لاش اور بچے کے بارے میں اطلاع دے دی؟'' راج پرشاد، جواب بچے کی طرف سے قدرے مطمئن نظر آرہا تھا، کملا کو واپس آتے دیکھ کر اس سے پوچھنے لگا۔
''ہاں! میں نے انہیں بتادیا ہے کہ ہمارے گیٹ کے سامنے ایک عورت کی لاش پڑی ہے۔''
''اور بچہ؟'' کملا کے غیر معمولی انداز پر راج پرشاد نے چونک کر پوچھا۔
''یہ بچہ ہمارا ہے راج! ہم اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔'' کملا نے راج کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔
''پاگل مت بنو کملا! ہم اس طرح سے کوئی بچہ کیسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں؟'' راج پرشاد نے اسے ٹوکا۔
''بات سمجھنے کی کوشش کرو راج! یہ بچہ ہمارے مسئلے کا حل ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ مرنے والی کی گود میں کوئی بچہ بھی موجود تھا۔ ہم بہت آسانی سے اسے اپنا بیٹا ظاہر کرسکتے ہیں۔'' کملا نے اپنی بات پر زور دیا۔
''تم نے شاید غور سے اس بچے کو نہیں دیکھا کملا! اسے

کوئی بھی ہماری اولاد نہیں مانے گا۔ یہ اپنے جسم پر اپنے مسلمان ہونے کی نشانی سجائے ہوئے ہے۔'' راج پرشاد نے کملا کی توجہ بچے کی طرف مبذول کروائی تو ایک پل کے لیے وہ بھی ساکت رہ گئی۔
''ہم لوگوں سے اس بات کو چھپا سکتے ہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں راج! میں بہت احتیاط کروں گی۔ میں کسی کی نظر اس مقام تک نہیں جانے دوں گی کہ وہ سچ جان سکے۔'' کملا نے لجاجت سے کہا تو راج پرشاد نے دیوانی ہوتی اپنی بیوی کے اس انداز پر گہرا سانس لیا اور رسان سے بولا۔
''تم جذباتی ہورہی ہو کملا! چلو مان لیا کہ ہم ساری دنیا سے اس سچ کو چھپالیں گے لیکن جب بڑا ہوکر یہ بچہ ہم سے اپنے متعلق سوال کرے گا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ کیا یہ اپنی شناخت چھینے جانے پر ہمیں موردالزام نہیں ٹھہرائے گا؟''
''یہ بہت بعد کی بات ہے راج! تب تک ہم اس مسئلے کا کوئی حل سوچ لیں گے۔ یوں بھی میں نے سنا ہے کہ بعض بچے قدرتی طور پر اس حال میں پیدا ہوتے ہیں۔'' کملا کسی صورت اپنے مطالبے سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھی۔
''تمہاری احمقانہ تاویلات کو یہ کبھی قبول نہیں کرے گا اس لیے بہتر ہے کہ تم اس بچے کا خیال اپنے من سے نکال دو۔'' راج پرشاد نے لہجے کو سخت بنا کر کملا کو اس کی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔
''تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اپنی ماتا جی کے سامنے مجھے بانجھ ثابت کرنا چاہتے ہو تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق تمہارا دوسرا بیاہ کرواسکیں۔ تم اوپر اوپر سے مجھ سے پیار جتاتے رہتے ہو لیکن سچ یہ ہے کہ تمہارے اپنے من میں بھی دوسری شادی کی تمنا ہے۔'' کملا کے الزام نے راج پرشاد کو ششدر کردیا تھا۔ اسی پل گھر کے باہر سے پولیس کی گاڑی کا مخصوص سائرن سنائی دینے لگا۔ راج پرشاد کملا کو کوئی جواب دینے کے بجائے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔
''یاد رکھنا راج! اگر تم نے پولیس والوں کو اس بچے کے بارے میں بتایا تو میں تیل چھڑک کر خود کو آگ لگالوں گی۔'' اپنے پیچھے سنائی دینے والی کملا کی دھمکی نے راج پرشاد کو سن کردیا تھا۔ قدموں کو بہ مشکل گھسیٹتا ہوا وہ گھر کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا۔ اب اس کے پاس کملا کا مطالبہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

⊛⊛⊛

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' تانیہ عرف ٹینا نے حسب معمول رات ایک بجے فلیٹ میں قدم رکھا اور عائشہ کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر اس طرف چلی آئی۔
''مجھے اپنا اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا، اس لیے کچھ ٹائم لگ گیا۔'' عائشہ نے جواب دیا۔
''کون سا اسائنمنٹ؟ وہ وہی جو پروفیسر آرپی نے دیا تھا؟'' ٹینا نے استفسار کیا۔
''ہاں، وہی۔'' اس بار عائشہ کا جواب مختصر تھا۔
''بے کار وقت ضائع کررہی ہو۔ تم کتنی بھی محنت سے اسائنمنٹ بنالو، پروفیسر اس میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور نکال لے گا۔'' ٹینا کے انداز میں تمسخر تھا لیکن اس کی بات غلط بھی نہیں تھی اس لیے عائشہ غصہ آنے کے باوجود خاموشی اختیار کرگئی، البتہ ضبط کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔
''تم نے شاید مائنڈ کیا؟ لیکن میں غلط نہیں کہہ رہی۔ پروفیسر جان بوجھ کر تمہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ سب تمہارے حلیے اور نام کی وجہ سے ہے۔ اس تعصب بھرے ماحول میں تم خود پر مسلم ہونے کا ٹیگ لگا کر پھروگی تو لوگ تمہارے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔'' ٹینا نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''میرے لیے لوگوں کا متعصبانہ انداز برداشت کرنا آسان ہے بہ نسبت اس بات کے کہ میں اپنی شناخت کھو دوں۔'' عائشہ کا جواب بھی ہمیشہ والا ہی تھا۔
''گوٹو ہیل۔'' ٹینا آہستہ سے بڑبڑائی اور واپس پلٹ گئی۔ عائشہ تاسف سے جاتی ہوئی ٹینا کو دیکھنے لگی۔ اس نے نیویارک میں قدم رکھتے ہی اپنے نام سمیت ہر شے بدل ڈالی تھی۔ عائشہ اسے پاکستان سے جانتی تھی۔ ٹینا نے کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور کی پرمشقت جاب کے مقابلے میں نائٹ کلب کی چار گھنٹے کی نوکری کو ترجیح دی تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ رات کو واپس نہیں آتی تھی۔ اس کے پاس موجود ڈالرز کی کثرت سے عائشہ اندازہ لگاسکتی تھی کہ وہ اپنی یہ راتیں کہاں گزارتی ہے۔
اس نے پروفیسر کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پروفیسر آرپی کے نقوش اور رنگت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی مشرقی ملک سے ہے۔ اس کے ماں باپ میں سے کم از کم ایک کا تعلق ضرور مشرق سے تھا، کس ملک اور کس مذہب سے؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ پروفیسر کی شخصیت بھید بھری تھی وہ اپنی ذات کو ڈسکس کیے جانا پسند نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ اصل نام کی جگہ بھی وہ ہر جگہ آرپی پکارا جاتا تھا۔ مگر وہ پروفیسر کے بارے میں جاننا چاہتی تھی

......کیوں؟ اس بات کا جواب بہت سیدھا سا تھا۔ اول روز سے ہی وہ اپنے دل میں پروفیسر آر پی کے لیے خاص جذبات محسوس کر رہی تھی۔ اسے اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں تھا کہ وہ پروفیسر کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے لیکن پروفیسر کا رویہ عجیب وغریب تھا۔ عائشہ نے کئی بار اس بات کو محسوس کیا تھا کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں کی چمک یکدم ہی بہت بڑھ جاتی ہے لیکن پھر نہ جانے کیوں یہ چمک بہت تیزی سے غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شدید جھنجلاہٹ اور چڑچڑا پن لے لیتا ہے۔ عائشہ پروفیسر کے اس عجیب وغریب رویے کا تجزیہ کرنے سے قاصر تھی لیکن اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ پروفیسر کی کیفیات میں رونما ہونے والی اس تبدیلی اور خود سے برتے جانے والے امتیازی سلوک کے اسباب ڈھونڈ نکالے گی۔

٭٭٭

بچہ پا کر کملا بہت خوش تھی۔ اس کے دن رات بچے کی سیوا میں گزر رہے تھے۔ بچہ بہت کمزور تھا۔ راج پرشاد کی دی ہوئی ٹریٹمنٹ نے اسے اس رات ہونے والے سردی کے حملے سے تو بچا لیا تھا لیکن کملا کو اس کی بہت زیادہ دیکھ بھال کرنی پڑ رہی تھی۔ راج بھی باقاعدگی سے بچے کا چیک اپ کرتا رہتا تھا۔ بچے کی ماں کے بارے میں ان لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ وہ مسلمانوں کی ایک بستی پر ہونے والے حملے میں اپنی جان بچا کر بھاگی تھی۔ اس عورت کا شوہر اس حملے میں مر چکا تھا اور کوئی دوسرا قریبی عزیز بھی نہیں تھا۔ وہ لاپتا بچہ کملا کے لیے خوشی کے در کھول گیا تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ اب اسے اپنی ساس کا سامنا کرنے پر اس کے طعنے نہیں سننے پڑیں گے۔ شادی کے کئی سال بعد تک کملا کا ماں نہ بننا اس کی ساس کی برداشت سے باہر تھا اور وہ کملا کو دن رات بانجھ پن کے طعنے دیتی رہتی تھی۔ ساس کی نفرت کا خیال آتے ہی اسے راج کا دھیان آیا۔ راج نے اس کا مطالبہ مان تو لیا تھا لیکن اس دن کے بعد سے وہ بہت چپ تھا۔ اس نے کملا سے گفتگو تقریباً ترک کر رکھی تھی۔ کملا اس کی وجہ جانتی تھی۔ کملا کے اس دن دیے جانے والے طعنوں اور مجنونانہ انداز نے راج پرشاد کو ہرٹ کیا تھا۔ کملا اپنے اس رویے کے لیے راج سے شرمسار تھی، وہ جانتی تھی کہ راج اس سے کتنا پیار کرتا ہے۔

کملا جو اسپتال کے ایک معمولی باورچی کی بیٹی تھی۔ ڈاکٹر راج پرشاد کے دل کو ایسی بھائی تھی کہ وہ اپنے اور اس کے درمیان طبقاتی فرق کو بھول کر اس سے شادی کے لیے اڑ گیا تھا۔

راج پرشاد کا گھرانا ایک بڑا کاروباری گھرانا تھا: بنگال کے پاکستان میں شامل ہونے پر ان لوگوں نے دیگر لوگوں کی طرح بھارت کی طرف نقل مکانی نہیں کی تھی اور یہیں جمے رہے تھے۔ راج کے باپ نرائن پرشاد کے بڑے بڑے وزیروں اور سفیروں سے تعلقات تھے ایسے میں راج کا کملا جیسی معمولی لڑکی سے بیاہ کی خواہش کرنا اس کے ماں باپ کے لیے ایک صدمہ ہی تھا لیکن انہیں بیٹے کی ضد کے آگے ہار ماننا پڑی اور یوں کملا اپنے باپ کے چھوٹے سے کوارٹر سے راج کے بڑے سے گھر میں پہنچ گئی۔ پر اس بڑے گھر کے لوگوں کا ظرف بڑا نہیں تھا۔ راج کی ماں سریتا اور دونوں بہنیں شلپا اور مادھوری طعنے دے دے کر کملا کی زندگی اجیرن بنائے رکھتیں۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ شادی کے کئی سال گزر جانے کے بعد بھی کملا کی گود ہری ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ساس اور نندوں کو ایسے میں طعنے دینے کا اور بھی موقع مل جاتا تھا۔ البتہ دونوں چھوٹے دیور اور سسر نرائن پرشاد اس معاملے میں غیر جانبدار تھے۔ خصوصاً نرائن پرشاد کا دل بہو کی خاموش خدمت کی وجہ سے کافی نرم پڑ چکا تھا اسی لیے جب راج پرشاد نے کملا سے ہونے والی زیادتیوں کو دیکھ کر گھر سے دور ڈھاکا میں رہائش کی خواہش کا اظہار کیا تو نرائن پرشاد نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس نے راج کو معقول بہانہ بھی فراہم کر دیا۔ ان دنوں پان کی تجارت بڑی نفع بخش تھی اور ٹوکرے بھر بھر کر پان ہر روز ڈھاکا سے جہاز کے ذریعے مغربی پاکستان جاتے تھے۔ نرائن پرشاد نے اپنے تعلقات استعمال کر کے ایک وزیر کے ذریعے راج کے لیے پان کی تجارت کا پرمٹ حاصل کر لیا، یوں کملا اور راج ڈھاکا آن بسے اور راج پرشاد اپنی اسپتال کی نوکری چھوڑ کر پان کی تجارت کا کام کرنے لگا۔ اب دونوں کا کبھی کبھار ہی گھر والوں سے ملنے جانا ہوتا تھا۔ ملاقات کے ان چند دنوں میں بھی کملا کی ساس اور نندیں طعنے بازی سے باز نہیں آتی تھیں بلکہ اب تو کملا پر بانجھ پن کے الزام کے علاوہ راج کو گھر سے الگ کر دینے کا الزام بھی موجود تھا۔ آئے روز کملا کی ساس راج کو دوسری شادی کے لیے اکساتی رہتی تھی ایسے میں کملا کو اپنا آپ بڑا غیر محفوظ محسوس ہوتا تھا لیکن پھر آٹھ سال بعد امید کی کرن جاگ ہی اٹھی۔ کملا کے امید سے ہونے کی خبر نے ہر طرف خوشی کی لہر دوڑا دی۔ کملا خود بھی بہت خوش تھی لیکن اسے یہ خوشی راس نہیں آئی۔ چھٹے مہینے میں سیڑھیوں سے پھسلنا اس کی خوشی کو چھیننے کا بہانہ بن گیا اور ساتھ ہی ہر امید بھی ختم

ہو گئی۔ اس وقت اگر راج پرشاد کملا کو نہیں سنبھالتا تو اس کا دوبارہ زندگی کی طرف آنا مشکل تھا۔ کملا کی خواہش پر ہی اس نے کملا اور اپنے گھر میں حادثے کی اطلاع نہیں ہونے دی تھی اور اب جبکہ وہ پریشان تھا کہ کملا سے کیا گیا وعدہ کیسے نبھائے گا تو اس بچے نے آ کر کملا کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

بچے کے وجود کو چھپانے کے لیے انہوں نے گھر کے تمام ملازمین کو فارغ کر دیا تھا، ماسوائے چوکیدار کے جو گیٹ پر ہی رہتا تھا اور اس کی گھر کے اندر تک رسائی نہیں تھی۔ بچے کی اطلاع وہ لوگ کملا کا وقت پورا ہونے پر ہی گھر پہنچاتے۔ بچہ جتنا کمزور اور نحیف تھا اس کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی اس کی پیدائش کے وقت پر شک نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس عرصے میں بچے کا زخم بھی بھر جاتا اور کملا کے لیے اسے کسی چادر میں لپیٹ کر، اس کی شناخت کو چھپائے رکھنے میں آسانی ہو جاتی۔

٭٭٭

''گڈ مارننگ!'' اس نے لفٹ کے لیے بٹن دبایا ہی تھا کہ پیچھے سے حمزہ بھی چلا آیا۔

''مارننگ۔'' عائشہ نے حسب عادت مسکرا کر جواب دیا اور پھر دونوں آگے پیچھے لفٹ میں داخل ہو گئے۔

''آج اس ٹائم پر کیسے دکھائی دے رہے ہو؟'' یہ حمزہ کے اسپتال جانے کی ٹائمنگ نہیں تھی اس لیے عائشہ نے پوچھا۔

''ہاں بس، ایک ضروری کام سے جانا تھا۔'' حمزہ نے جواب دیا تو عائشہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

''آج میں تمہیں یونیورسٹی ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' وہ دونوں لفٹ سے باہر نکلے تو حمزہ نے عائشہ کو پیشکش کی۔

''نو تھینکس، تم جاؤ اپنے کام سے میں خود چلی جاؤں گی۔'' اسے زحمت نہ دینے کے خیال سے عائشہ نے انکار کیا۔

''تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں، تمہاری یونیورسٹی میرے راستے میں پڑے گی۔'' حمزہ فوراً ہی عائشہ کے انکار کا سبب سمجھ گیا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو اچھی بات ہے۔ میں یقیناً تمہاری آفر سے فائدہ اٹھانا چاہوں گی۔'' عائشہ نے خوشگوار انداز میں جواب دیا۔

''یہاں زندگی اتنی مصروف ہے کہ کوئی کسی کے لیے زحمت اٹھانا گوارا نہیں کرتا اس لیے ایسی کوئی آفر ملا کرے تو فوراً قبول کر لیا کرو۔'' کار کا دروازہ اَن لاک کرتے ہوئے حمزہ نے عائشہ کو نصیحت کی۔

''تم یہاں کب سے ہو حمزہ؟'' گاڑی روڈ پر آئی تو عائشہ نے حمزہ سے پوچھا۔

''بہت سالوں سے۔ میں نے ہائی اسکول کے بعد اپنی ساری ایجوکیشن یہیں سے حاصل کی ہے اور اس کے بعد جاب کر کے یہیں سیٹل ہو گیا ہوں۔''

''اپنے ملک، اپنے لوگوں سے ملنے جاتے ہو؟''

''نہیں۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' عائشہ حیران ہوئی۔

''وہاں گیا تو پھر یہاں واپس نہیں آسکوں گا۔''

''وہ کیوں بھئی!'' عائشہ مزید حیران ہوئی۔

''میرے گاؤں کے جھرنے، سبزہ اور وہاں کی ہوائیں میرے پیروں میں زنجیر ڈال دیں گی۔ میرا گاؤں بہت خوب صورت ہے عائشہ! کبھی تمہارا داغستان جانا ہو تو وہاں کے پہاڑوں کے قلب میں واقع سدا نامی آوار گاؤں دیکھنے ضرور جانا۔ وہاں کا حسن تمہیں مبہوت کر دے گا۔'' حمزہ کی آنکھیں جیسے کسی منظر پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''اور پتا ہے میرے گاؤں کی سرزمین شعر وسخن کے لیے بڑی زرخیز ہے۔ تمہارے بابا تو وہاں جا کر بہت خوش ہوں گے۔ میرے والدین نے میرا نام ایک مشہور آوار شاعر حمزہ توف کے نام پر ہی رکھا ہے۔ حمزہ ایک خوب صورت شاعر تھے۔ ان کے بیٹے رسول حمزہ توف کو بے تحاشا شہرت ملی تھی، ان کا کلام دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔'' وہ بہت جوش سے عائشہ کو بتا رہا تھا۔ عائشہ کو خیال آیا کہ اس نے بابا کے کلیکشن میں رسول حمزہ توف کی کوئی کتاب دیکھی تو تھی لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ وہ شاعری کی کوئی کتاب تھی یا نثر کی۔

''تم اپنے پیرنٹس سے ملنے بھی نہیں جاتے حمزہ؟'' حمزہ کی زبان سے والدین کا ذکر سننے پر عائشہ نے اس سے پوچھا۔

''وہ دونوں اس دنیا میں نہیں رہے۔ جب میں یہاں تعلیم اور روزگار کے ذرائع حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف تھا، وہ دونوں ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آج کے سرجن حمزہ کے پاس اس وقت اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے والدین کو ان کے آخری سفر پر رخصت کرنے کے لیے ہی جا سکتا۔ بس پھر میں نے بعد میں کوشش ہی نہیں کی۔'' حمزہ کے لہجے میں موجود دکھ نے گاڑی کی فضا کو بوجھل کر دیا تھا۔

''لو بھئی، تمہاری منزل آگئی۔'' چھا جانے والی خاموشی کو حمزہ کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

''تھینک یو حمزہ!'' عائشہ نے گاڑی سے اتر کر حمزہ کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرا کر ہاتھ سے ''بائے'' کا اشارہ کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

حمزہ کے دکھ نے اور ان لمحات کا تصور، جب حمزہ مالی مشکلات کے باعث اپنے والدین کی وفات پر واپس اپنے ملک نہیں جا سکا تھا، عائشہ کو غمگین کر گیا تھا۔ غم کے اس احساس کے تحت سر جھکائے اپنی سوچوں میں غرق چلتے ہوئے وہ کیسے سامنے سے آتے ہوئے بندے سے جا ٹکرائی، اسے خود خبر نہیں ہو سکی۔

''آنکھیں کھول کر چلنے کی زحمت کیوں نہیں کرتیں؟'' جھنجلائے ہوئے سخت لہجے میں کہتے ہوئے کسی نے اسے تھام کر گرنے سے بچایا۔ عائشہ کا تو گویا وجود ہی ساکت ہو گیا۔ پروفیسر آر پی جس کے دائرہ کشش سے دور رہنے کے لیے وہ کلاس روم میں بھی سب سے آخری قطار میں بیٹھا کرتی تھی، اسے یوں تھامے کھڑا تھا۔ عائشہ سجاد کو سکتہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

''احمق قوم کی احمق لڑکی۔'' پروفیسر آر پی اسے خطابات سے نوازتا وہاں سے چلا بھی گیا لیکن وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔ یوں جیسے اگر ذرا بھی حرکت کی تو کوئی حسین خواب ٹوٹ جائے گا۔

☾☾☾

''کیا بات ہے راج! دو تین دن سے تم گھر دیر سے واپس آ رہے ہو......'' رات کو جب وہ دونوں سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو کملا نے راج پرشاد سے پوچھا۔

''کسی دوسری جگہ مکان تلاش کر رہا ہوں تاکہ ہم وہاں شفٹ ہو سکیں۔'' راج پرشاد نے سنجیدگی سے کملا کو جواب دیا۔

''پر وہ کس لیے؟'' کملا حیران ہوئی تو راج نے اس پر ایک شکایتی نظر ڈالتے ہوئے اس کے پہلو میں لیٹے بچے کی طرف دیکھا۔

''تمہارے مس کیرج کی خبر ملازمین کے ذریعے آس پڑوس کے لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ کئی پڑوسی تمہاری عیادت کے لیے بھی آئے تھے۔ ملازمین کو تو ہم نے فارغ کر دیا لیکن پڑوسی تو اپنی جگہ موجود رہیں گے۔ ایسے میں جب تم اس بچے کو اپنا بچہ ظاہر کرو گی تو سچ کیسے چھپے گا؟ اس لیے میں چاہتا ہوں ماتا جی کو کوئی خبر بھیجنے سے پہلے ہم نئے مکان میں شفٹ ہو جائیں۔'' راج پرشاد کی بات سن کر کملا کو اس پر ڈھیروں پیار آیا۔ وہ کملا سے روٹھا ہوا تھا پھر بھی اس کی خوشی کو برقرار رکھنے کے لیے بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''تھینک یو راج!'' کملا نے یکدم ہی اپنا سر راج پرشاد کے سینے پر رکھتے ہوئے محبت اور ممنونیت کا اظہار کیا۔

''کس لیے؟'' راج پرشاد کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم نے میری ضد مان لی اور اب بھی تم میرے کہے بنا ہر چیز کا خود سے خیال رکھ رہے ہو حالانکہ میں جانتی ہوں تم میرے رویے سے ہرٹ ہوئے ہو۔ میرا اس دن کا رویہ تمہارے لیے اجنبی تھا لیکن میں مجبور تھی راج! یہ بچہ میری ممتا کی تسکین ہی نہیں، میرے سہاگ کی ضمانت بھی ہے۔ ماتا جی کو اگر یہ خبر مل جاتی کہ ہم اپنا بچہ کھو بیٹھے ہیں اور میں آئندہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تو وہ زبردستی تمہارا دوسرا بیاہ کروا دیتیں۔ میں تمہیں کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی راج! آئی لو یو سو مچ!'' کملا اپنی غلطی اور مجبوری کا اعتراف کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو راج پرشاد کا گریبان بھگو رہے تھے۔ وہ جو روٹھا ہوا تھا، اپنے سینے پر گرتے آنسوؤں کی گرمی سے پگھلنے لگا۔

''اٹس او کے کملا! جو کچھ ہو چکا اب ہم دونوں کو ہی مل کر اسے نبھانا ہے لیکن تم ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو۔ کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہو سکے گا کہ تم سب لوگوں سے اس بچے کی اصلیت چھپا سکو؟'' کملا کے بالوں کو سہلاتے ہوئے راج پرشاد نے ایک بار پھر اسے معاملے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

''میں سب سنبھال لوں گی۔ میں اس بچے کا سایا بن کر اس کے ساتھ رہوں گی اور کسی کو اتنا موقع ہی نہیں دوں گی کہ وہ اس کی اصل تک پہنچ سکے۔'' کملا نے سر اٹھا کر راج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''بس تو پھر میں آنے والے دو چار دن میں ماتا جی کو بچے کی اطلاع بھجوا دوں گا۔ گیٹ پر عورت کی لاش ملنے کے واقعے کا ذکر میں نے پتا جی کو چٹھی میں لکھ بھیجا ہے اور ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس واقعے کے بعد میں اس علاقے کے محفوظ ہونے کے بارے میں مطمئن نہیں ہوں اس لیے جلد مکان تبدیل کرنے والا ہوں۔ ایک مناسب مکان میں نے دیکھ بھی لیا ہے۔ بچے کی اطلاع کی چٹھی بھیجوں گا تو اس مکان کا ایڈریس بھی بھیج دوں گا۔ تم سامان کی پیکنگ شروع کر دو۔ ملازمین تو ہیں نہیں اس لیے تمہیں سارا کام خود کرنا ہوگا، مجھے ٹائم ملا تو میں بھی تمہاری مدد کر دوں گا۔'' راج پرشاد نے کملا سے کہا۔

''وہ سب میں کر لوں گی۔ تم چنتا مت کرو۔'' کملا نے اسے تسلی دی۔ درحقیقت وہ اتنی خوش تھی کہ اسے کوئی بھی کام بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

☾☾☾

راج پرشاد کے نئے گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ کملا کی ساس، نند اور سسر، بچے کی خبر پا کر اسے دیکھنے ڈھاکا پہنچ گئے تھے۔ دونوں دیور اور چھوٹی نند مادھوری البتہ ان کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ سلہٹ سے کملا کی اپنی ماں اور پتا بھی آ گئے تھے۔ سب رشتے داروں کے بیچ کملا مہارانی بنی، کھلے کھلے چہرے کے ساتھ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ باری باری ہر ایک بچے کو اپنی گود میں لے کر اس پر پیار نچھاور کر رہا تھا۔ کملا کی ساس کی تیوری پر ہمیشہ پڑے رہنے والے بلوں کی تعداد میں بھی آج خاطر خواہ کمی آ گئی تھی۔

''میرا ارادہ تھا کہ دو چار دن میں تیرے پاس آ جاؤں گی لیکن داماد جی نے وقت سے پہلے ہی بچے کی اطلاع دی تو میرا دل ہول کر رہ گیا۔ میری بچی کو تن تنہا اتنے کڑے وقت سے گزرنا پڑا۔'' کملا کی ماں وہ واحد ہستی تھی جسے بچے کے ساتھ ساتھ کملا کی بھی فکر تھی۔

''میں نے تو کہا تھا راج سے کہ کملا کو ہمارے پاس ہی چھوڑ دو لیکن یہ دونوں مانے ہی نہیں۔ اپنی مرضی سے جینے والوں کو مشکل وقت میں اسی طرح تنہا رہنا پڑتا ہے۔'' کملا کی ساس سریتا نے کملا کی ماں کی بات کو خود پر طنز سمجھا اس لیے فوراً ہی تڑخ کر جواب دیا۔ کملا کی ماں کو اس کا یہ انداز برا لگا لیکن بیٹی کی ماں تھی، وہ بھی حیثیت میں کم تر، سو برداشت کر کے چپ ہو بیٹھی۔ کملا کو ماں کی اس بے بسی پر رحم آیا اور اس کی دلجوئی کے لیے بولی۔

''ماں! تم بیکار میں پریشان ہو رہی ہو۔ بھگوان کی کرپا سے میرا سارا کام اچھی طرح ہو گیا اور پھر میں تنہا کب تھی، راج تھا نا میری دیکھ ریکھ کرنے کو۔ سچ...... اس نے مجھے بالکل ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ جب ہی تو میں اتنی ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہوں۔'' راج کے خیال رکھنے والی بات کملا نے ساس کو سنانے کے لیے کہی تھی۔ اتنے سال سریتا اس کا دل جلاتی رہی تھی، آج اسے موقع ملا تھا تو کیوں فائدہ نہ اٹھاتی۔ حسب توقع سریتا جل بھن گئی اور اپنا غصہ نکالنے کے لیے بہو پر تنقید کرتے ہوئے بولی۔

''یہ تم نے بچے کو اتنی بری طرح لپیٹ کیوں رکھا ہے، اس طرح تو یہ بالکل گھٹ کر رہ جائے گا۔'' ساتھ ہی اس نے بچے کے گرد لپٹی چادر کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں ماتا جی! ڈاکٹر نے کہا ہے بچہ بہت نازک ہے۔ اسے بہت احتیاط سے رکھنا ہوگا، ذرا بھی ٹھنڈ لگ گئی تو یہ اس کے لیے خطرناک ہوگا۔'' کملا نے جھپٹ کر بچہ اپنی گود میں لے لیا۔ بچہ اپنی سیاہ آنکھیں کھول کر ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

''توبہ کتنا چلتر ہے۔ ابھی صرف تین دن کا ہے اور یوں پٹر پٹر دیکھ رہا ہے ورنہ اتنے چھوٹے بچے تو آنکھیں ہی نہیں کھولتے۔'' شلپا نے بھی ماں کا ساتھ دینے کو تنقید کا پہلو ڈھونڈ نکالا۔

''یہ تم ماں بیٹی کن باتوں میں الجھ گئی ہو۔ مجھے تو اپنا یہ پوتا بہت ٹیلنٹڈ محسوس ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک کامیاب بزنس مین بنے گا۔ کامیاب بزنس مین کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ وقت سے پہلے حالات کو بھانپ کر فیصلے کر لے۔ میرا پوتا تو ابتدا سے ہی یہ کام کر رہا ہے، اس نے ڈاکٹر کے اندازے سے پہلے دنیا میں آنے کا فیصلہ کیا اور اب عام بچوں کی طرح آنکھیں بند کر کے رہنے کے بجائے تم لوگوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے یوں حیران ہوا دیکھ رہا ہے۔ جب یہ وقت سے پہلے کاروباری فیصلے کرے گا تو اس کے حریف تو ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔'' نرائن پرشاد دور کی کوڑی لایا تھا۔ سب اس کی بات سن کر ہنسنے لگے۔

''پتا جی! اگر اجے اور وجے بھی ساتھ آ جاتے تو اور بھی اچھا لگتا۔ اس خوشی کے موقعے پر یہاں ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔'' راج پرشاد نے باپ کو مخاطب کر کے دونوں بھائیوں کی کمی کا ذکر کیا۔

''مجبوری تھی بیٹا! پیچھے کاروبار سنبھالنے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ مادھوری بھی بھائیوں کی وجہ سے مجبوری میں رک گئی۔ لاکھ ملازم موجود ہیں لیکن وہ ماں بہن جیسا خیال تو نہیں رکھ سکتے۔ پھر آج کل کے حالات میں گھر کے تمام افراد کا ایک ساتھ نکلنا بھی مناسب نہیں ہے۔'' نرائن پرشاد نے گویا بیٹے کی دلجوئی کی کوشش کی۔

''پتا جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں راج!'' کملا نے بھی سسر کی تائید کی اور پھر سسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''پتا جی! اپنے پوتے کا کوئی اچھا سا نام تو رکھ دیں۔''

''کیوں نہیں بھئی۔ میں تو گھر سے ہی نام سوچ کر نکلا تھا۔ اس کا نام روی ہوگا۔ کیوں گپتا جی! آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔'' نرائن پرشاد نے خاموشی سے وہاں بیٹھے کملا کے باپ کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''بہت اچھا نام ہے جناب!'' گپتا کے پاس تائید

کرنے کے علاوہ کوئی انتخاب تھا بھی نہیں۔

''تو بس طے ہوگیا، آج سے اس کا نام روی ہے۔ روی راج پرشاد۔'' راج نے بھی باپ کے رکھے ہوئے نام کی تائید کی۔

''میرا خیال ہے اب ہم سب کو یہاں سے اٹھنا چاہیے، کافی رات ہو چلی ہے اور بہو کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔'' نام کا تعین ہونے کے بعد نرائن پرشاد نے احساس دلایا تو سب ایک ایک کر کے کملا کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔

☾☾☾

سجاد رہبر نے اپنے لیے آئی ہوئی ڈاک کا جائزہ لیا اور اس میں عائشہ کا خط پا کر کھل اٹھا۔ عائشہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ عائشہ جب پندرہ سال کی تھی تو اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ شریک حیات کی وفات کے بعد سجاد رہبر کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف عائشہ تھی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے وہ اسے پہلے بھی کم عزیز نہیں تھی لیکن بیٹی کا دوست وہ صحیح معنوں میں اس کی ماں کے جدا ہونے کے بعد ہی بنا تھا۔ تب ہی جب بیٹی نے باہر جا کر پڑھنے کی خواہش کی تو وہ اسے انکار نہیں کر سکا۔ وہ بیٹی کے خوابوں، عزائم اور مقاصد سے اچھی طرح واقف تھا، ایسے میں وہ اس کی راہ کی رکاوٹ کیونکر بنتا۔ اس نے عائشہ کے باہر جانے، ایڈمشن اور رہائش سے متعلق تمام معاملات نمٹا دیے۔ وہ اچھی پوسٹ پر تھا لیکن چونکہ ایماندار تھا اس لیے اس کے پاس بہت کثیر سرمایا موجود نہیں تھا چنانچہ اس کا تمام جمع جتھا اس کام پر خرچ ہو گیا۔ عائشہ کو اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جز وقتی جاب کرنی پڑتی تھی۔ سجاد رہبر نے اپنی ذاتی ضروریات کو بہت محدود کر لیا تھا اور تنخواہ میں سے ایک بڑا حصہ عائشہ کو بھجوا دیتا تھا لیکن یہ رقم امریکی ڈالرز میں تبدیل ہونے کے بعد بہت کم ہو جاتی تھی۔

''دوست محمد! میرے لیے ایک کپ چائے تو بنا دو یار۔'' اس نے گھریلو کاموں پر مامور ملازم کو آواز لگائی اور خطوط کے ڈھیر میں سے عائشہ کا خط علیحدہ کر کے باقی لفافے میز پر ایک جانب رکھ دیے۔ عائشہ کا خط پڑھنے سے پہلے وہ ان میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ پوری احتیاط اور نفاست سے لفافہ کھولنے کے بعد اس نے اس میں سے خط نکالا اور بے حد توجہ سے پڑھنے لگا۔ عائشہ نے یونیورسٹی، اپنی تعلیم اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کی ایک ایک تفصیل لکھی تھی۔ سجاد اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہی بیٹی کے پاس نیویارک پہنچ گیا، اس نے پورا خط مسکراتے لبوں سے پڑھا تھا لیکن آخری سطور پر پہنچ کر وہ چونک گیا، ان سطور میں عائشہ نے لکھا تھا۔

''بابا! کیا آپ کو میرے خط میں سے کوئی خوشبو آتی محسوس ہو رہی ہے؟ آج کل مجھے اپنا پورا وجود کسی سحر انگیز خوشبو کے حصار میں گھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ خوشبو میری انگلی کی پوروں سے کاغذ پر منتقل ہو کر ضرور آپ تک پہنچے گی۔''

سجاد رہبر بیٹی کے ان الفاظ پر گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ عائشہ نے اسے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی یا بے ساختہ ہی یہ جملے لکھ گئی تھی، وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن سجاد رہبر تو عائشہ کے ان احساسات کے محرک میں الجھ گیا تھا۔ وہ خود ایک حساس دل رکھنے والا آدمی تھا جس نے ساری زندگی نازک جذبات کی آبیاری کی تھی۔ وہ خود اپنی زندگی میں محبت کے بھرپور دور سے گزرا تھا۔ عائشہ کی ماں اس کے دل کے ہر گوشے میں بستی تھی اور سجاد رہبر کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کے مرنے کے اتنے سالوں بعد بھی اس کی خوشبو کو اپنے اردگرد محسوس کر سکتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی بیٹی کے جذبات کو نہ پہچان پاتا، یہ کیسے ممکن تھا۔

☾☾☾

کملا نے فیڈر بچے کی منہ سے نکالا اور رومال سے اس کا منہ صاف کر کے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ بچہ چند دنوں میں ہی اسے بے حد عزیز ہو گیا تھا۔ بچے کی شناخت چھپانے کی مجبوری اپنی جگہ لیکن کملا خود بھی اس کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دے کر خوشی محسوس کرتی تھی۔ اس کا بچے کو اس طرح اپنے پروں میں چھپائے رکھنے والا رویہ راج پرشاد کے گھر والوں کو اتنا بھایا نہیں تھا۔ وہ ڈھاکا میں چار دن کے قیام کے بعد واپس جا چکے تھے اور یہ واپسی قدرے ناراضی کے ساتھ ہوئی تھی۔ انہوں نے راج پرشاد سے کملا کے رویے کی شکایت بھی کی تھی۔ وہ لوگ کملا سے ناراض تھے کہ وہ بچے کو ان لوگوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ راج کی ماں کو بہو سے ایک شکایت اور بھی تھی کہ وہ بچے کو خود فیڈ کروانے کے بجائے ڈبے کے دودھ پر پال رہی تھی۔ راج پرشاد کملا کے رویے کا پس منظر جانتا تھا اس لیے اپنے گھر والوں کی شکایت دور کرنے کے لیے کچھ کہہ نہ سکا البتہ دودھ پلانے کے معاملے میں اس نے یہ بتا کر کہ ڈاکٹر نے خود بچے کے لیے ڈبے کا دودھ تجویز کیا ہے، ماں کی تسلی کروانے کی کوشش کی تھی جس پر ماں بہت دیر تک بڑبڑاتی رہی تھی۔ بہرحال اب وہ لوگ یہاں سے جا چکے

تھے اور کملا قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔ اب اسے چوبیس گھنٹے بچے کی نگرانی نہیں کرنی پڑتی تھی لیکن کملا کی اپنی ماں جو بیٹی کی خاطر داری کے لیے یہاں رک گئی تھی، کملا کے لیے الجھن کا سبب تھی۔ ماں اس کی خاطر یہاں رکی تھی اور وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ واپس اپنے گھر چلی جائے۔ ماں کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے اس کے ذمے ملازمین کی نگرانی کا کام لگا دیا تھا۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد راج پرشاد نے کملا کی بچے والی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے فوراً ہی گھریلو کاموں کے لیے دو نئے کل وقتی ملازمین رکھ لیے تھے۔ اب کملا کی ماں دن بھر ان ملازمین کے سر پر سوار رہ کر ان سے مختلف کام کرواتی رہتی تھی۔ وہ خود جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس کے لیے ملازمین والی عیاشی ممکن نہیں تھی۔ برسوں سے گھریلو کام کاج کرتے ہوئے اس کی ہڈیاں گھس چکی تھیں اور یہ ایک ایسی خدمت تھی جس کے لیے کوئی اس کا شکرگزار بھی نہیں تھا۔ اب کملا کے گھر میں اسے تختہ مشق بنانے کو دو دو ملازمین ملے تو وہ حکمرانی کے مزے لوٹنے لگی۔ اپنی اس مصروفیت میں اسے بیٹی سے یہ شکوہ کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ نواسے کو زیادہ دیر کے لیے اس کی گود میں نہیں دیتی تھی۔ اس طرح سے کملا بھی مطمئن تھی اور ماں بھی خوش۔ اس وقت بھی کملا کی ماں باورچی خانے میں کھڑی نوکر سے کملا کے لیے کوئی مقوی کھانا بنوا رہی تھی، بچہ بھی دودھ پی کر سو چکا تھا۔ کملا نے سوچا موقع اچھا ہے کہ وہ نہا لے۔ وہ اپنے کپڑے نکال کر غسل خانے میں گھس گئی۔ ابھی مشکل سے دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ کملا بے چین ہو گئی لیکن مجبور تھی، فوراً باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ جلدی جلدی پانی ڈال کر اپنے لمبے بالوں میں لگا صابن بہانے لگی لیکن اس کی سماعتیں برابر باہر کی طرف ہی متوجہ تھیں۔ اپنی ماں کی آواز سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ بچے کے رونے کی آواز سن کر اس کے پاس پہنچ چکی ہے اور اسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ذرا دیر میں بچے کے رونے کی آواز بند ہو گئی۔ کملا نے مطمئن ہوتے ہوئے سکون سے غسل کیا اور گیلے بالوں میں تولیا لپیٹ کر واپس اپنے کمرے میں آئی۔ اس کی ماں بچے کے قریب ہی بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں اسے سلا کر نہانے گئی تھی لیکن بدمعاش میرے جاتے ہی رونے لگا۔'' کملا کو ڈر تھا کہ ماں اسے چلے سے پہلے نہانے پر ٹوکے گی لیکن ماں نے تو جیسے اس بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی وہ عجیب سی نظروں سے کملا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کملا کچھ سٹپٹا سی گئی۔ ماں نے اس پر سے نظریں ہٹائیں اور بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اس نے پیشاب کر لیا تھا۔ کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے بے چین ہو کر رو رہا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے بدلے تو دوبارہ آرام سے سو گیا۔''

ماں کی بات نے کملا کے ہوش اڑا دیے۔ ماں جو کہہ رہی تھی اس کے بعد یہ امید رکھنا کہ وہ بچے کی اصلیت سے واقف نہیں ہوئی ہو گی، ناممکن تھا۔

''ماں......'' کملا کے لبوں سے تھرتھراتا ہوا یہی ایک لفظ نکل سکا۔

''یہ سب کیا ہے کملا! تو نہیں بتائے گی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ تجھے دن رات بچے کو اپنے سے چمٹائے دیکھتی تو سمجھتی تھی اتنے برسوں بعد ماں بنی ہے اس لیے بچے کے پیچھے یوں دیوانی ہوئی جا رہی ہے لیکن اب اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد یہی سمجھ آ رہا ہے کہ پاگل تو نہیں ہوئی تھی بلکہ تو ہم سب کو پاگل بنا رہی تھی۔'' کملا کی ماں کے انداز میں خفگی تھی۔

کملا بلکتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔ ''میں مجبور تھی ماں۔ میں یہ سب نہیں کرتی تو میرا گھر اجڑ جاتا۔ میں راج کی محبت کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی اس لیے یہ سب کر گزری۔'' کملا دھیرے دھیرے ماں کو سارے واقعات سے آگاہ کرتی چلی گئی۔

''لیکن تو سوچ، تو کن خطروں سے کھیل رہی ہے۔ جیسے آج مجھے پتا چلا ہے کل کسی اور کو بھی چل جائے گا۔ تو کتنی بھی احتیاط کر لے لیکن اس بات کو ظاہر ہونے سے روک نہیں پائے گی اور جب تیرے سسرال والوں کو پتا چلے گا کہ تو نے انہیں کتنا بڑا دھوکا دیا ہے تو وہ تجھے بالکل بھی معاف نہیں کریں گے۔'' کملا کی ماں بیٹی کو اس کی غلطی کا احساس دلانے لگی۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں اور راج اس بچے کو لے کر یہاں سے کہیں بہت دور چلے جائیں گے۔ بس تو اپنی زبان بند رکھنا۔'' کملا یکدم ہی اس فیصلے پر پہنچ کر ماں سے زبان بندی کی درخواست کرنے لگی۔

''میں تیری ماں ہوں کملا! تیری خوشی کے لیے ساری زندگی کے لیے لب سی لوں گی لیکن تو آگے کی بھی سوچ۔ کل کو جب یہ بچہ بڑا ہو گا اور تجھ سے اپنے بارے میں سچ پوچھے گا، تو تو کیا کرے گی۔'' وہ بات جو راج پرشاد نے بھی کملا سے کہی تھی، کملا کی ماں نے بھی کہی۔

”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ماں! میں اس پر اتنا پیار نچھاور کروں گی کہ اسے میرے اپنی سگی ماں ہونے پر کوئی شک ہی نہیں رہے گا۔ پھر میں اسے جو بتاؤں گی یہ اس پر یقین کرلے گا۔“ کملا کی بات پر اس کی ماں نے خاموشی اختیار کرلی۔ وہ جان گئی تھی کہ بیٹی پر جو دیوانگی طاری ہے وہ اس کو عقل و سمجھ کی کوئی بھی بات سوجھنے نہیں دے گی۔

❂❂❂

ایک بلند درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھی عائشہ کا قلم بہت مدھم رفتار میں رائٹنگ پیڈ پر چل رہا تھا لیکن اس کی یکسوئی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ جو کچھ لکھ رہی ہے اس کی، اس کے اپنے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے وہ اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ آج پھر پروفیسر آر بی نے اس کی بلاوجہ بہت انسلٹ کی تھی۔ کل طبیعت کی خرابی کے باعث عائشہ یونیورسٹی نہیں آسکی تھی۔ اس کی طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی کہ وہ ٹینا سے بھی اپنے مس ہوجانے والے لیکچرز لے کر پڑھنے کی ہمت نہیں کرسکی تھی۔ آج بھی اسے ہلکا ہلکا بخار تھا لیکن وہ اپنی پڑھائی کا حرج ہونے کے خیال سے یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ پروفیسر آر بی نے اپنے لیکچر کے دوران اچانک ہی اسے کھڑا کر کے گزشتہ یوم کے لیکچر کے بارے میں سوالات شروع کردیے تھے اور عائشہ کی طرف سے جواب نہ ملنے پر اسے خوب سنائی تھیں اس نے عائشہ کو اتنا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی غیر حاضری اور طبیعت کی خرابی کی وجوہات بتا کر کوئی ایکسکیوز ہی کرسکے۔ عائشہ پروفیسر کے اس رویے سے بے حد ہرٹ ہوئی تھی اور پیریڈ کے اختتام پر کلاس چھوڑ کر یونیورسٹی کے اس حصے میں آگئی تھی جو اونچے اونچے درختوں، اور تنہائی کی وجہ سے اسے بہت زیادہ پسند تھا۔ اس حصے سے وہ سڑک گزرتی تھی جو یونیورسٹی کو اس کے اسٹاف کے رہائشی حصے سے ملاتی تھی۔ عموماً طلبہ اس طرف کا رخ نہیں کرتے تھے۔ کلاس سے نکل کر اس طرف آنے کے بعد پہلے وہ آنسوؤں کی شکل میں اپنے دل کا درد بہاتی رہی اور جب آنسو رکے تو اس نے قلم تھام لیا۔ لکھنے کی صلاحیت اسے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ اب بھی وہ اسی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اشعار کی شکل میں اپنی دلی کیفیت کو ڈھال رہی تھی۔ محبت اور درد نے مل کر اس کی تحریر کو بہت پر اثر بنا دیا تھا۔ اس نے بہت محبت کے ساتھ نظم مکمل کی اور قلم بند کر کے اسے توجہ سے پڑھنے لگی۔ وہ اپنے اس کام میں اتنی محو تھی کہ اسے اپنی طرف بڑھتے ان دو سیاہ فام لڑکوں کے بارے میں بھی علم نہیں ہوا جو اچانک ہی وہاں آگئے تھے اور عائشہ کو تنہا پا کر ان کی شیطانی جبلت جاگ اٹھی تھی۔

”ہیلو مس پاکی!“ ان میں سے ایک نے عائشہ کے ہاتھ سے رائٹنگ پیڈ اچکا اور اس کے چونکنے پر چہرے پر خبیثانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ عائشہ ان دونوں کو اس طرح اپنے سر پر سوار دیکھ کر گھبرا گئی لیکن خود کو پراعتماد ظاہر کرنے کے لیے غصے سے بولتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ویسے وہ ان دونوں کو پہچان چکی تھی وہ اس کے کلاس فیلوز تو نہیں تھے لیکن ان کا اس کی کلاس کے چند اسٹوڈنٹس کے ساتھ میل ملاپ تھا اور شاید ان ہی اسٹوڈنٹس کے ذریعے انہیں اس کے پاکستانی ہونے کا علم ہوا تھا۔

”بیوٹی فل ایسٹرن گرل اینڈ بیوٹی فل ایسٹرن اسٹائل۔“ اس کے غصے سے حظ اٹھاتا ہوا وہی شخص جس نے اس سے اس کا رائٹنگ پیڈ چھینا تھا، اپنے ساتھی سے آنکھیں میچ کر مخاطب ہوا اور پھر دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ان کا انداز دیکھ کر عائشہ نے یہی بہتر سمجھا کہ ان کے منہ لگنے کے بجائے وہ خود اس جگہ سے ہٹ جائے۔ چنانچہ اس نے نیچے گھاس پر رکھا اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور وہاں سے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

”کہاں جارہی ہو سوئٹ ہارٹ۔“ دوسرا شخص جواب تک خاموش رہا تھا، عائشہ کے قریب آیا اور اس کی کلائی تھام کر اسے وہاں سے جانے سے روکا۔

”ڈونٹ ٹچ می۔“ عائشہ بری طرح غرائی اور اپنی کلائی پر موجود اس کے ہاتھ کو بری طرح جھٹکا۔ حقیقتاً اس شخص کی یہ حرکت اس کے پورے وجود میں غصے کی شدید لہر دوڑا گئی تھی۔

”یو بچ، تمہاری یہ ہمت۔“ عائشہ کے انداز پر وہ شخص بھی بری طرح تلملایا اور اس کی طرف جھپٹا۔ عائشہ بھی اس دوران اس کے تیور بھانپ چکی تھی اس لیے پلٹ کر پوری قوت سے سڑک کی طرف دوڑ پڑی۔ اسے پکڑنے کی کوشش کرنے والے کے ہاتھ میں فقط عائشہ کا سیاہ اسکارف ہی آسکا تھا۔ عام حالات میں یہ اسکارف کبھی عائشہ کے وجود سے جدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت معاملہ الگ تھا۔ اپنے تعاقب میں آتی دو عفریتوں سے بچنے کے لیے وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے وہ سڑک کے بالکل درمیان میں آگئی۔ عین اسی وقت ایک تیز رفتار کار سڑک پر نمودار

ہوئی۔ کار کی اسپیڈ سے لگتا تھا کہ وہ عائشہ کو کچلتی ہوئی گزر جائے گی۔ ایک طرف عزت کے دشمن تھے تو دوسری طرف موت سر پر چڑھی چلی آرہی تھی۔ عائشہ کے حواس یکدم ہی جواب دے گئے اور وہ بے ہوش ہوکر سڑک پر آرہی۔

❂❂❂

راج پرشاد نے ہمیشہ کی طرح کملا کی فرمائش مان لی تھی اور گھر والوں کی بے حد مخالفت کے باوجود امریکا شفٹ ہوگیا تھا۔ کملا کی ضد کے علاوہ خود اس کے اپنے مفاد میں بھی یہی بہتر تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے دور ہٹ جائے ورنہ ایک نہ ایک دن بچے والا راز فاش ہوجاتا اور پھر راج پرشاد کی خیر نہیں تھی۔ کملا کا شریک جرم ہونے کے ناتے وہ خود بھی ماں باپ کے عتاب کا شکار ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی مسلم دشمنی سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ایک مسلمان بچے کا اس کے گھر میں پلنا اس کے باپ کے نزدیک دھرم بھرشٹ کر دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ وہ اور کملا بچے کو لے کر امریکا چلے آئے۔ راج نے یہاں آکر ایک بار پھر اپنی پریکٹس شروع کردی تھی ان کے امریکا آنے کے کچھ عرصے بعد ہی مشرقی پاکستان الگ ہوکر بنگلا دیش بن گیا تھا۔ کملا اور راج پرشاد کو اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ روی کے ساتھ اپنی زندگی میں مگن تھے۔ روی کی خاطر انہوں نے یہاں زیادہ میل ملاپ بھی نہیں بڑھایا تھا اور اسے بھی خود تک محدود رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خصوصاً ان کی خواہش تھی کہ روی کا مسلمان گھرانے کے بچوں سے دوستانہ نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف آہستہ آہستہ ایسا زہر بھر دیا تھا کہ وہ خود بھی اپنے کسی مسلم کلاس فیلو کے ساتھ بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کملا اور راج پرشاد اس صورت حال سے کافی مطمئن تھے۔ ان کی حکمت عملی کامیاب رہی تھی اور روی تیرہ سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک ان کے سامنے وہ سوال لے کر نہیں آیا تھا جس کے سامنے آنے سے وہ تیرہ سال سے مسلسل خوفزدہ تھے۔ روی کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک لاعلم رکھنے کے لیے وہ دونوں ہی بڑی قربانیاں دیتے رہے تھے۔ تیرہ سال کے اس عرصے میں راج پرشاد صرف دو بار بنگلا دیش گیا تھا۔ ایک بار اپنی مرتی ہوئی ماں کو اپنا چہرہ دکھانے اور دوسری بار اپنے باپ کی چتا کو آگ لگانے۔ کملا البتہ ایک بار بھی وہاں نہیں گئی تھی۔ اپنے باپ کی بیماری اور مرنے کی اطلاع سن کر بھی نہیں۔ وہ روی کو اپنے ساتھ بنگلا دیش نہیں لے جانا چاہتی تھی اور اس کو یہاں پر اکیلا چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا سو خود پر بند باندھ کر رہ گئی۔ بعد میں اس نے کوشش کی کہ اپنی ماں کو امریکا بلا لے لیکن ماں اس کے باپ کے آخری وقت پر بھی نہ آنے کی وجہ سے اس سے خفا تھی، اس لیے اس نے آنے سے انکار کردیا۔ کملا نے روی کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھی خوشی سے بھرلیا۔ وہ بچہ جو پہلے اس کے سہاگ کی ضمانت تھا، اب اس کے لیے رگ جان بن گیا تھا۔ اسے اپنا بنائے رکھنے کے لیے کملا نے احتیاط پسندی کی حد کردی تھی۔ نہ اس کی خود کسی سے دوستی تھی اور نہ ہی وہ راج کو اس کے دوستوں کو گھر تک لانے کی اجازت دیتی تھی۔ روی کے ذہن میں بھی وہ وقتاً فوقتاً ایسی باتیں فیڈ کرتی رہتی تھی کہ وہ کسی سے دوستی کرنے سے خائف رہتا تھا۔ کملا کی تربیت نے اسے الگ تھلگ رہنے والا ایک نہایت خاموش طبع بچہ بنا دیا تھا جس کی زندگی اپنے ماں باپ، گھر اور کتابوں کے بیچ ہی گھومتی رہتی تھی۔ وہ ٹی وی پر بھی صرف کملا کے منتخب کردہ پروگرامز اس کی موجودگی میں دیکھا کرتا تھا۔ البتہ گھمانے پھرانے اور شاپنگ کروانے کے معاملے میں راج اور کملا اس پر بہت مہربان تھے۔ شاید اس طرح وہ اس زیادتی کی تلافی کی کوشش کرتے تھے جو انہوں نے روی کو ایک نارمل زندگی سے دور رکھ کر اس کے ساتھ کی تھی۔ یہ سب کرنے کے باوجود وہ دونوں خوفزدہ ہی رہتے تھے، وہ جانتے تھے ایک دن روی ان کے سامنے اپنی شناخت کا سوال لے کر ضرور آئے گا۔ کب؟ یہ انہیں خود بھی نہیں معلوم تھا لیکن وہ اتنا اندازہ ضرور کرسکتے تھے کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔

❂❂❂

عائشہ کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ صوفہ کم بیڈ پر لیٹے ہوئے پایا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے اردگرد کے اجنبی ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ ماحول اجنبی ہونے کے باوجود بہت پرسکون تھا۔ اسے اپنے دل میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا اور وہ اطمینان سے گردن گھما کر کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ کمرے کے فرش پر سبز اور کریم رنگ کے امتزاج کا قالین بچھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے ہلکے سبز رنگ کے تھے اور بہت پرسکون سا تاثر پیش کررہے تھے۔ دائیں طرف کی پوری دیوار پر بک شیلف بنا ہوا تھا جس میں بے تحاشا کتابیں بہت قرینے اور ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔ بک شیلف کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ رائٹنگ ٹیبل پر ایک سبز شیڈ کا نفیس سا لیمپ رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک نازک سا قلمدان تھا جس میں دو سیاہ اور سنہری رنگ کے قلم رکھے ہوئے تھے۔ میز پر

ایک رائٹنگ پیڈ بھی موجود تھا اور دو تین کتابیں بھی۔ پورے کمرے میں اس رائٹنگ ٹیبل، اس کے ساتھ رکھی کرسی اور صوفہ کم بیڈ کے علاوہ کوئی اور فرنیچر نہیں تھا۔ ہاں قالین پر ایک طرف فلور کشنز کا ڈھیر لگا کر کسی دوسرے فرد کے بیٹھنے کی جگہ ضرور بنائی گئی تھی۔ دیواروں پر بھی سلور رنگ کے ایک خوب صورت وال کلاک کے سوا کوئی دوسری شے آویزاں نہیں کی گئی تھی۔ پورے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد عائشہ کی آنکھوں میں تحسین اتر آئی۔ کمرے کی سجاوٹ کرنے والا کوئی اس کا ہم ذوق شخص تھا جس کی پسند سادگی اور نفاست کا امتزاج تھی۔ عائشہ دل میں اس شخص کو سراہ رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ آنے والے کو دیکھ کر عائشہ کا دل بری طرح دھڑکا اور ساتھ ہی اسے پہلی بار اپنے اسکارف کی غیر موجودگی کا بھی احساس ہوا۔ اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی اور پلکیں جو آنے والے پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد ہی جھک گئی تھیں، رخساروں پر لرزنے لگیں۔

''اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم؟'' خلاف معمول اس کا لہجہ نرم تھا۔ عائشہ کو اپنی سماعت پر شک ہوا۔ اگر وہ شخص پروفیسر آر۔ پی ہی تھا تو عائشہ کے لیے اس کے لہجے میں اتنی نرمی کیسے تھی؟ عائشہ نے بے ساختہ نظر اٹھا کر تصدیق کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا، عائشہ نے فوراً ہی نظریں جھکالیں۔

''کیا مجھ پر قتل کا کیس بنوانا چاہتی تھیں جو میری گاڑی کے نیچے آنے کی کوشش کی تم نے؟'' پروفیسر نے عائشہ کی طرف سے جواب نہ آنے پر دوسرا سوال پوچھا۔

''دو لڑکے مجھے پریشان کر رہے تھے۔ میں ان سے بچ کر بھاگی تو پتا ہی نہیں چلا کہ کیسے آپ کی گاڑی کے سامنے آگئی۔'' اب عائشہ کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ خود پر لگائے جانے والے پروفیسر کے الزام کی تردید کے لیے اس نے مدھم آواز میں پیش آنے والے واقعے کی وضاحت کردی۔

''ان لڑکوں کو یہ موقع تم نے خود فراہم کیا ہے۔ تم اپنی غلطی کی وجہ سے اس مشکل میں پھنسی تھیں اور امکان ہے کہ آئندہ بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے۔'' پروفیسر کا نرم لہجہ اب سپاٹ ہو چکا تھا۔

''کیسی غلطی؟'' عائشہ حیران ہوئی۔

''یہ جاننے کے باوجود کہ یہاں تمہاری قوم کے لیے لوگوں کے دلوں میں کیسی نفرت اور حقارت پائی جاتی ہے، تم اپنے مسلم ہونے کا اشتہار بن کر پھرتی ہو۔ تمہیں چاہیے تھا کہ یہاں ویسے ہی رہو جیسے یہاں کے لوگ رہتے ہیں۔ کسی نئے ماحول میں رہنے کے لیے اس ماحول کو اپنانا پڑتا ہے، خود کو اس ماحول کا حصہ ثابت کرنا پڑتا ہے۔'' پروفیسر آر۔ پی اسے جو نصیحتیں کر رہا تھا وہ پہلے بھی بار ہا ٹینا کی زبانی سن چکی تھی۔

''آئی ایم سوری سر! لیکن مجھے آپ کے پوائنٹ آف ویو سے اختلاف ہے۔ ماحول میں ایڈجسٹ ہونا اور ماحول میں رنگ جانا دو مختلف باتیں ہیں۔ ایڈجسٹ منٹ اپنی ضرورت اور مقاصد کے مطابق کی جاتی ہے۔ میرا یہاں آنے کا مقصد صرف اور صرف ایجوکیشن حاصل کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے زبان و بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ میرے پاس موجود ہے۔ میں یہاں سے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ ہوتے ہی واپس اپنے وطن چلی جاؤں گی۔ مجھے اس ماحول کا حصہ بن کر ہمیشہ یہاں نہیں رہنا اس لیے مجھے اپنے آپ کو اس ماحول میں رنگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اپنی ذات پر دوسروں کا رنگ وہ لوگ چڑھاتے ہیں جنہیں اپنے اصل پر شرمندگی ہوتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں، مجھے اپنے اصل، اپنی شناخت پر فخر ہے۔ خرابی میری شناخت میں نہیں خرابی یہاں کے لوگوں کے ذہن میں ہے جو شخصی آزادی کا نعرہ لگاتے تو ہیں لیکن صرف اپنی ذات کے لیے، یہ لوگ دوسروں کو ان کی شخصی آزادی دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ایک اور بات جس کا مجھے خیال آرہا ہے وہ یہ ہے کہ جو حادثہ آج میرے ساتھ پیش آتے آتے رہ گیا وہ کئی امریکی لڑکیوں کے ساتھ آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔ اس لیے میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتی کہ ایسا صرف میرے مسلم ہونے کی وجہ سے پیش آیا ہے اس واقعے کے پیچھے اس معاشرے کی مادر پدر آزادانہ روش بھی ہے جو انسان کو جانور کے روپ میں لے آئی ہے۔ انسان کی کھال میں خود کو چھپا کر بیٹھے وحشی جانور کے روپ میں۔'' عائشہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنا کچھ بول گئی ہے۔ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد جذبات کا زور ٹوٹا تو وہ پروفیسر کے ردعمل کا سوچ کر کانپ گئی لیکن اس کی توقع کے خلاف وہ بالکل خاموش رہا یوں جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔

''آپ کی مدد کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اب میں چلتی ہوں۔'' پروفیسر کو خاموش دیکھ کر عائشہ کو خیال آیا کہ وہ بلاوجہ ہی اب تک یہاں رکی ہوئی ہے سو جانے کے لیے اٹھ

کھڑی ہوئی۔ پروفیسر نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا یہاں تک کہ وہ اس کے قریب سے گزر کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اب وہ گھر کے جس حصے میں تھی وہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ عائشہ جس کمرے سے نکلی تھی اس کے دروازے کے علاوہ بھی دو دروازے اس لاؤنج میں کھل رہے تھے۔ عائشہ اندازے سے ایک دروازے کی طرف بڑھی اور ہینڈل دبا کر اسے کھولا۔ بیرونی منظر نے اس کے اندازے کی تصدیق کی، وہ مکان سے نکاسی کا ہی راستہ تھا۔ عائشہ دروازے سے گزر کر باہر نکل گئی۔ سامنے وہی چمکتی ہوئی سڑک تھی جس پر وہ پروفیسر کی گاڑی کی زد میں آنے سے بال بال بچی تھی۔ دن میں پیش آنے والا واقعہ اور اپنا ابتر سا حلیہ اس راستے سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں خوف جگا رہا تھا لیکن وہ مجبور تھی سو چلتی رہی۔

''عائشہ!'' اپنے پیچھے سنائی دینے والی پکار پر اس نے اپنے قدم روک لیے لیکن مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس شخص کی طرف دیکھنے سے ہمیشہ ہی گریز کرتی تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی روز وہ پتھر کی نہ ہوجائے۔

''میں تمہیں یونیورسٹی گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔'' قدموں کی چاپ اس کے قریب رکی اور پروفیسر آر۔ پی نے اس سے کہتے ہوئے کوئی شے اس کے شانوں پر رکھی۔ عائشہ نے پروفیسر کا مقصد سمجھتے ہوئے پھرتی سے وہ مفلر اپنے سر اور گردن کے گرد لپیٹا۔ اب وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر اس سڑک پر چل رہے تھے۔ پروفیسر نے جانے کیوں اپنی گاڑی استعمال کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ خاموش سڑک پر صرف ان دونوں کے جوتوں سے پیدا ہونے والی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی بالکل چپ تھے اور چلتے چلے جارہے تھے۔

☾☾☾

''مام! کل میں اسکول سے دیر سے گھر واپس آؤں گا۔ مجھے ایک فنکشن میں جانا ہے۔'' کملا، راج پرشاد اور روی رات کے کھانے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے تب روی نے کملا کو مخاطب کرکے اطلاع دی۔

''کیسا فنکشن؟'' کملا روی کی بات پر حیران ہوئی۔

''یہ تو نہیں معلوم لیکن ایڈی نے کہا ہے کہ مجھے ضرور فنکشن میں آنا ہوگا۔'' روی نے شانے اچکاتے ہوئے بتایا تو کملا کی تشویش کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

''یہ ایڈی کون ہے؟'' اس نے پریشان سے انداز میں پوچھا۔

''میرا فرینڈ ہے۔ میرے ساتھ میری کلاس میں پڑھتا ہے۔'' روی کھانا کھاتے ہوئے بہت بے نیازی سے بتا رہا تھا۔

''تم نے کوئی فرینڈ بنالیا روی اور مجھے بتایا بھی نہیں؟'' کملا کے لہجے میں صدمہ تھا۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ روی اس سے پوچھے بغیر بھی کوئی کام کرسکتا ہے۔ راج پرشاد نے کملا کی اس حالت کو دیکھا اور اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ دیا۔

''ایکچولی مام! میں نے اسے فرینڈ نہیں بنایا، اس نے مجھے اپنا فرینڈ بنایا ہے۔ لاسٹ منتھ جب اس کا ایڈمیشن ہوا تھا تو ٹیچر نے اسے میرے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا۔ تب سے ہی وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ شروع میں تو میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی لیکن پھر مجھے لگا کہ وہ اچھا لڑکا ہے۔ سچ مام! وہ بہت ہی اچھا لڑکا ہے فرینڈلی، جولی اینڈ جینئس۔ ٹیچرز کہتے ہیں اس کے آنے سے میں بھی تھوڑا سا ہنس مکھ ہوگیا ہوں۔ کیا میں بہت سڑیل مزاج ہوں مام؟''

ایڈی کے بارے میں بتاتے بتاتے راج نے یکدم ہی کملا سے استفسار کیا تو وہ سٹپٹا سی گئی۔ وہ اسے کیا جواب دیتی...... کیونکہ وہ جو کچھ بھی تھا اور جیسا بھی تھا اس کی تربیت کے نتیجے میں تھا۔

''نو مائی سن! تم سڑیل مزاج نہیں ہو۔ بس تم دوسرے بچوں سے تھوڑے سے مختلف اور زیادہ سنجیدہ مزاج ہو اور یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں۔ ہر شخص کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔'' روی کو جواب دینے کی ذمے داری راج پرشاد نے نبھائی۔

''آئی تھنک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ڈیڈ! بہرحال کل میں ایڈی کے ساتھ اس کے گھر جارہا ہوں۔ آپ لنچ پر میرا انتظار مت کرنا مام!'' روی نے فوراً ہی راج پرشاد سے اتفاق کرتے ہوئے ایک بار پھر کملا کو بتایا۔

''لیکن روی! ہم تو تمہارے دوست کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں۔ معلوم نہیں وہ کیسا لڑکا ہے اور اس کے گھر والے کیسے لوگ ہیں؟'' کملا نے روی کو روکنے کی ایک کوشش کی۔

''ڈونٹ وری مام! اب میں بڑا ہوگیا ہوں۔ چار ماہ بعد میں چودہ سال کا ہوجاؤں گا۔ میری عمر کے لڑکے پتا نہیں کیا کیا کام کرتے ہیں اور آپ مجھے ایک دوست کے گھر جانے سے بھی روک رہی ہیں۔'' روی کے انداز نے کملا کو

احساس دلایا کہ اب وہ بڑا ہوگیا ہے اور وہ زیادہ عرصے اسے پابند نہیں رکھ سکے گی۔

''راج! تم سن رہے ہو اپنے بیٹے کی باتیں! یہ بتا رہا ہے کہ اب یہ بڑا ہوگیا ہے اور اسے ہمارے مشوروں کی ضرورت نہیں رہی۔'' کملا نے روہانسی ہوکر راج سے شکوہ کیا۔

''ایزی کملا! روی کا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔'' راج پرشاد نے اسے تسلی دینی چاہی۔

''ڈیڈ صحیح کہہ رہے ہیں مام! اگر آپ نہیں چاہتیں کہ میں ایڈی کے گھر جاؤں تو ٹھیک ہے میں نہیں جاؤں گا۔ کل میں اس سے ایکسکیوز کرلوں گا۔'' روی بھی کملا کے ردعمل پر بوکھلا گیا تھا اس لیے فوراً ہی اپنی خواہش سے دستبردار ہوگیا۔

''تمہاری مام کا یہ مطلب نہیں تھا بیٹا! تم کل ضرور اپنے فرینڈ کے گھر جاؤ لیکن آئندہ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی فرینڈ سے کمٹمنٹ کرنے سے پہلے اپنی مام سے اجازت لے لو۔''

''تھینکس ڈیڈ! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔'' راج پرشاد نے دیکھا کہ روی جس نے پہلے بے دلی سے اپنا ارادہ ملتوی کیا تھا، اجازت ملتے ہی کھل اٹھا تھا۔ راج پرشاد نے روی کا ردعمل اور کملا کی خود پر جمی شکوہ بھری نظریں دونوں ہی چیزیں دیکھی تھیں لیکن کچھ کہے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

''تم نے روی کو جانے کی اجازت کیوں دی راج! جبکہ وہ اچھا بھلا رکنے کے لیے راضی ہوگیا تھا۔'' کھانے کے بعد وہ دونوں اپنے بیڈروم میں آئے تو کملا اپنے دل کا شکوہ ہونٹوں پر لے آئی۔

''آنے والے حالات کا سامنا کرنے کی تیاری کرو کملا! اب زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، تمہاری احتیاط اور پابندی نے اس معاشرے میں رہنے کے باوجود اب تک اگر روی کو حقیقت سے لاعلم رکھا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ ہی لاعلم رہے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ جب اس کے علم میں اپنی اصلیت آئے تو اس وقت تک وہ ہماری بے جا پابندیوں کی وجہ سے ہم سے اتنا متنفر ہوچکا ہو کہ ہماری طرف سے دی جانے والی کوئی وضاحت بھی سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ اسے خیال گزرے کہ ہم نے صرف سچ چھپائے رکھنے کے لیے اسے زندگی کی خوشیوں سے محروم کردیا ہے۔ مجھے روی کی زبان سے ایسا کوئی الزام سننے سے خوف آتا ہے کملا!'' راج پرشاد خود بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

''اگر روی نے ہم سے ایسا کوئی سوال کیا تو ہم کیا کریں گے راج!'' کملا جو ہمیشہ اس بات کو آنے والے وقت پر ٹالتی رہی تھی اب خود پریشان ہوکر پوچھ رہی تھی۔

''ہم اسے سچ بتائیں گے۔ سچ کے علاوہ اسے کسی شے سے نہیں بہلایا جاسکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سچ جان کر تھوڑا سا ڈسٹرب تو ہوگا لیکن جس طرح ہم نے اتنے سال اس کی تربیت کی ہے وہ اسے ہم سے الگ نہیں ہونے دے گی۔ ہندو دھرم اس کے ذہن و دل کے ہر گوشے میں بس چکا ہے وہ اس دھرم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکے گا۔'' راج پرشاد نے پورے یقین سے کہا تو کملا کو بھی کچھ اطمینان ہوا۔

⊛⊛⊛

سیاہ اور سفید بُنائی والا مفلر دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے، عائشہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں صرف مفلر کی نرماہٹ کو ہی نہیں کسی اور چیز کو بھی محسوس کررہی تھیں۔ مفلر پر کسی کے وجود کا لمس تھا۔ وہ جس نے ایک بار اسے گرنے سے بچانے کے لیے بلا ارادہ چھوا تھا تو عائشہ کا پور پور اس کی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔ جس سے اس کا نہ سمجھ میں آنے والا لیکن سب سے انوکھا تعلق تھا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی تو ڈھنگ سے نہیں جانتی تھی۔ اس کا تو اصل نام بھی عائشہ کو معلوم نہیں تھا۔ نام...... جو بہت کچھ ظاہر کردیتا ہے۔ پروفیسر نے اس نام کو آر۔ پی کے دو حروف میں چھپا دیا تھا۔ وہ خود کو چھپا کر رکھنے والا عائشہ کی دھڑکنوں میں آبسا تھا۔ یونیورسٹی کے پہلے ہی دن سے اس کی محبت نے عائشہ کے لاشعور میں جگہ بنالی تھی اور اب لاشعور میں چپکے چپکے پلنے والی یہ محبت پوری قوت سے شعور پر بھی چھا گئی تھی۔ اس کے گھر سے آنے کے بعد سے مسلسل وہ سارے لمحات اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے جو اس نے پروفیسر کے سنگ گزارے تھے... خصوصاً پروفیسر کا اپنے قدم سے قدم ملا کر چلنا عائشہ کے دل کو بہت بھایا تھا۔ اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود بھید بھری خاموشی نے بہت کچھ بتایا تھا۔ وہ جو پروفیسر اب تک اپنے غصے، چڑچڑاہٹ اور سخت لہجے کی مدد سے چھپانے کی کوشش کرتا رہا تھا، عائشہ پر آشکار ہوچکا تھا۔ بس پروفیسر کا خیال تھا، اس کا مفلر تھا اور عائشہ تھی جو بستر پر لیٹی اسے ہی سوچے جارہی تھی۔ لیٹے لیٹے اس نے کروٹ لی اور مفلر رخسار کے نیچے رکھ کر ایک بار پھر گزرے واقعات کو سوچنے لگی۔ یکدم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ جب وہ پروفیسر کی گاڑی کی زد میں آنے سے خوفزدہ ہوئی تھی تو بے ہوش ہوکر وہیں سڑک پر گر پڑی تھی

اور پھر بعد میں اس کی آنکھ پروفیسر کے گھر میں ہی کھلی تھی یعنی جب وہ بے ہوش تھی تو پروفیسر نے اسے سڑک سے اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا تھا اور گاڑی سے اپنے گھر کے اندر بھی وہ خود ہی اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس منظر کا تصور کرکے عائشہ پوری کانپ گئی اور اس کا چہرہ دہک اٹھا۔

''عائشہ! تم جاگ رہی ہو نا؟'' ٹینا کی آواز پر اس نے اپنے کپکپاتے وجود پر قابو پایا اور بہ مشکل آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''شام میں حمزہ آیا تھا اپنی برتھ ڈے کا انویٹیشن دینے۔ تم گھر پر نہیں تھیں اس لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں میسیج دے دوں۔'' ٹینا خود ڈیوٹی بھگتا کر آئی تھی اور کافی تھکی ہوئی تھی لیکن پھر بھی اس نے عائشہ کے وجود کی کپکپاہٹ کو محسوس کرلیا تھا۔

''آر یو او کے عائشہ؟'' اس نے قریب آکر اس سے پوچھا لیکن عائشہ میں جواب دینے کا بھی حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ٹینا کو کچھ سمجھ نہیں آیا تو حمزہ کے فلیٹ کی طرف بھاگی۔ امریکی معاشرے میں اس قسم کی بے تکلفی کا رواج نہ ہونے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ حمزہ، عائشہ کی مدد ضرور کرے گا۔ اس کا یہ اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ ٹینا کی بات سن کر حمزہ فوراً ہی اپنی میڈیکل کِٹ کے ساتھ ان کے فلیٹ میں آگیا تھا۔

''اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ یونیورسٹی اور اسٹور کی تھکن نے مل کر دوبارہ بخار کو اس پر حملہ آور کردیا ہے۔'' حمزہ نے چیک اپ کرنے کے بعد عائشہ کو ایک انجیکشن لگایا اور ٹینا کو بتانے لگا۔

''کیا اس کی طبیعت بہت خراب ہے اور اسے رات بھر دیکھ بھال کی ضرورت پڑے گی؟'' ٹینا نے جماہی لیتے ہوئے حمزہ سے پوچھا۔ شدید تھکن کے باعث وہ باقی کی رات جاگ کر گزارنے کے خیال سے بیزار لگ رہی تھی۔

''نہیں۔ اتنی سیریس بات نہیں ہے۔ تم جاکر سو جاؤ میں ہوں عائشہ کے پاس۔'' حمزہ نے کہا تو ٹینا کوئی تکلف کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ حمزہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر غنودگی میں ڈوبی ہوئی عائشہ کو دیکھنے لگا۔ نیند میں ہونے کے باوجود اس کی پلکیں آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں اور گلاب پنکھڑیوں سے ہونٹ یوں نیم وا تھے جیسے کچھ کہنے کو بے چین ہوں۔ ان نیم وا ہونٹوں کی گلابی سے نظر چرا کر حمزہ نے آنکھیں موند لیں۔ عائشہ کی لاعلمی میں اسے یوں دیکھنا بھی اسے بے ایمانی محسوس ہوئی تھی۔ البتہ وہ خیال جو بہت دنوں سے اس کے ذہن میں پل رہا تھا وہ ضرور فیصلہ کن شکل اختیار کرچکا تھا اور وہ عائشہ کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے میں اب زیادہ دیر بھی نہیں کرنے والا تھا۔

⊛⊛⊛

''تمہارے گھر پر آج کس سلسلے میں فنکشن ہے ایڈی! تم نے ابھی تک مجھے بتایا نہیں۔'' وہ اسکول سے ایڈی کے گھر پہنچ چکا تھا۔ ایڈی کے گھر پر اس کے کئی رشتے دار موجود تھے۔ روی کو ان رشتے داروں کے بیچ بٹھانے کے بجائے ایڈی اسے اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ روی تنہائی پسند ہے اور اتنے سارے لوگوں کے درمیان خود کو ایزی محسوس نہیں کرسکتا۔ ان دونوں نے لنچ بھی ایڈی کے کمرے میں ہی کیا تھا جو کہ آلو بھرے پراٹھوں، املی کی چٹنی اور سلاد پر مشتمل تھا۔ آلو بھرے پراٹھے روی کی پسندیدہ ڈشز میں سے ایک ڈش تھی جو کملا اس کی فرمائش پر بہت اہتمام سے بناتی تھی۔ ایڈی کی ممی کے ہاتھ کے بنے پراٹھے بھی روی کو بہت پسند آئے تھے۔ اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور کھانے کے بعد ہی اسے ایڈی سے یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا تھا تاکہ گھر میں ہونے والے فنکشن کی نوعیت کے بارے میں علم ہوسکے۔ تقریب کی نوعیت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی نہیں لاسکا تھا البتہ کملا نے ایک لفافے میں رکھ کر کچھ رقم بہ طور تحفہ دینے کے لیے ضرور اس کے ساتھ کردی تھی۔

''میں نے تم سے اپنے بوبی انکل کا ذکر کیا تھا نا۔ وہی جو آرٹسٹ ہیں اور جن کے بنائے ہوئے مجسموں کی تصویریں بھی میں تمہیں ایک بار اسکول لاکر دکھا چکا ہوں۔'' ایڈی نے جواب دینے سے پہلے تمہید باندھ کر روی کو پہلے دی جانے والی معلومات کا بھی اعادہ کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے، تم نے بتایا تھا کہ تمہارے بوبی انکل کے کہنے پر ہی تمہارے فادر کینیڈا کی کنسٹرکشن کمپنی سے معاہدے کی مدت پوری ہونے کے بعد یہاں شفٹ ہوئے ہیں اور تم لوگ یہاں ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہ رہے ہو۔''

''بالکل صحیح۔'' ایڈی، روی کا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ ''بوبی انکل کے گھر فرسٹ بے بی ہوا ہے۔ آج وہ اپنے بے بی کا نام رکھیں گے اس لیے انہوں نے یہاں رہنے والے چند رشتے داروں کو گھر پر انوائٹ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں اپنے کسی فرینڈ کو بلانا چاہوں تو بلا سکتا ہوں سو میں

نے تمہیں بلا لیا۔"

"بے بی کا نام رکھنے کے لیے بھی فنکشن کیا جاتا ہے، مجھے نہیں معلوم تھا۔" روی نے ایڈی کی بات سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

"اوہ روی! تم آخر کس Planet پر رہتے رہے ہو جو تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔" ایڈی نے اس کی حیرت پر تعجب کا اظہار کیا۔

"ایکچولی ہم لوگ یہاں تنہا ہیں۔ ہمارا کوئی رشتے دار یہاں نہیں رہتا اس لیے مجھے اس قسم کی رسوم کے بارے میں بالکل بھی معلومات نہیں ہیں۔" روی نے شرمندگی سے بتایا۔

"پھر بھی یار! رشتے دار نہ سہی قریبی دوست وغیرہ تو ہوتے ہی ہیں جن کے گھر آنے جانے سے بہت سی ایسی رسموں کے بارے میں جن کا امریکا میں رواج نہیں ہے معلوم ہو ہی جاتا ہے۔" ایڈی کو اس کی معلومات کی یہ کمی بہت حیرت میں مبتلا کر رہی تھی اور روی دل ہی دل میں اس کی اس بات سے اتفاق کر رہا تھا کہ رشتے دار نہ سہی لیکن دوستوں سے تو میل ملاپ ہونا ہی چاہیے لیکن اس کے ماں باپ کی زندگی میں دوستوں والا خانہ بھی تقریباً خالی ہی تھا۔

"اب تو مجھے تمہیں بلا کر اور بھی زیادہ خوشی ہو رہی ہے، کم از کم یہاں آ کر تم مشرق کی چند رسوم کے بارے میں ہی جان جاؤ گے۔ خصوصاً میں تمہیں ایک ایسی رسم دکھاؤں گا جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ تمہیں بالکل بھی علم نہیں ہوگا۔" ایڈی بہت ایکسائٹڈ ہو گیا تھا۔

"ایڈی بیٹا! نیچے آجاؤ۔ تمہارے انکل تمہیں یاد کر رہے ہیں۔" اسی وقت ایڈی کی ممی نے دروازے پر دستک دے کر اسے پکارا تو ایڈی اسے ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گھر کی نچلی منزل پر ایک بڑے سے کمرے میں چودہ پندرہ کے قریب افراد موجود تھے۔ مرد حضرات نے زیادہ تر پینٹ شرٹ پہن رکھا تھا جبکہ خواتین ساڑھی یا شلوار قمیص پہنے ہوئے تھیں۔ ایک دو نوجوان لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس نظر آئیں۔

"وہ میری دادی جان ہیں۔ انکل کے بیٹے کا نام وہ ہی رکھیں گی۔" ایڈی نے روی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کاٹ میں موجود بچے کے قریب سفید براق چھچماتے غرارے میں ملبوس، لباس کے ہم رنگ بالوں والی خاتون کے بارے میں بتایا۔

"اب بتا بھی دیں گرینڈ ما، کہ ہمارے اس نئے بھائی کا نام کیا ہے؟" روی کی ہم عمر ایک لڑکی نے بوڑھی خاتون سے فرمائش کی۔

"اس کا نام میں نے نور محمد سوچا ہے۔ یہ تمہارے دادا کا نام تھا اور میری خواہش ہے کہ بابر کے بیٹے کے ذریعے یہ نام دوبارہ زندہ ہو جائے۔" بوڑھی خاتون یعنی ایڈی کی دادی کی زبان سے نکلنے والے الفاظ پر سب نے زوردار تالیاں بجائیں لیکن روی سن سا ہو گیا۔ بچے کا نام نور محمد رکھے جانے کا مطلب تھا کہ ایڈی کی فیملی مسلمان تھی اور وہ اتنے عرصے میں یہ بات نہیں جان سکا تھا۔ ایڈی کے نام کے سبب اسے کبھی ایسا کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا کہ جیسے ایڈی اپنے بابر انکل کو بوبی کہہ کر پکارتا تھا ایسے ہی ایڈی بھی کسی نام کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ اتفاق سے ان کی دوستی کے اس مختصر عرصے میں کبھی مذہب سے متعلق گفتگو بھی زیر بحث نہیں آئی تھی اس لیے روی کو ایڈی کی اصلیت جاننے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ روی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے پہلی بار مام کی اجازت کے بغیر کوئی کام کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک مسلمان سے دوستی کر بیٹھا۔ اس قوم کے فرد سے جس سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا رہا تھا۔

"ابھی دیکھنا روی! میرے سیکنڈ نمبر کے انکل جو کہ ڈاکٹر ہیں ہماری ایک اہم رسم انجام دیں گے۔ رسم بھی کیا، ہمارا مذہبی فریضہ سمجھو۔ مسلمان لڑکوں کے لیے ایک طرح سے یہ ان کے مسلمان ہونے کی شناخت ہے۔" روی چاہتا تھا کہ پلٹ کر ایڈی کے گھر سے باہر نکل جائے کہ ایڈی نے اس کے بازو پر دباؤ ڈالتے ہوئے جوش سے کہا۔ مجبوراً روی کو اپنی جگہ پر رکنا پڑا لیکن اس کے بعد اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر وہ سناٹے میں آ گیا۔ ایڈی نے جس چیز کو مسلمان لڑکوں کی Identification ٹھہرایا تھا وہ شناختی علامت تو روی کے اپنے جسم پر بھی موجود تھی۔ روی راج پرشاد، جو کہ کملا دیوی اور راج پرشاد کا بیٹا تھا اپنے ساتھ مسلمان ہونے کی علامت کیوں لیے ہوئے تھا؟ یہ سوال روی کے ذہن میں بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ بچے کے رونے کی آواز، بڑوں کے بولنے اور قہقہہ لگانے کی آوازیں سب کچھ غائب ہو چکا تھا اور فقط ایک سوال رہ گیا تھا۔ روی نے اپنے بازو پر موجود ایڈی کے ہاتھ کو ایک طرف ہٹایا اور ایڈی کی پکار کو نظرانداز کرتا ہوا تیزی سے اس کے گھر سے باہر نکل گیا۔

❁❁❁

"تشریف لائیے مادام! اور بتائیے کہ اب آپ کی

طبیعت کیسی ہے؟'' حمزہ نے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر عائشہ کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے اس کی خیریت بھی پوچھی۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسی میڈیسن دی تھی کہ میں دوپہر تک سوتی ہی رہی اور میری یونیورسٹی سے چھٹی ہوگئی۔'' عائشہ نے اندر داخل ہوکر اس سے شکوہ کیا۔

''سوری عائشہ! لیکن میں ڈاکٹر ہوں اور بہتر جانتا ہوں کہ کس پیشنٹ کو کس وقت، کس میڈیسن کی ضرورت ہے۔ تمہارے اعصاب بہت ٹینس لگ رہے تھے اور انہیں ریلیکس کرنے کے لیے آرام کی شدید ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے صبح تمہیں نیند کے انجیکشن کی ایک ہلکی سی ڈوز دے دی تھی۔'' حمزہ نے اس سے معذرت کرتے ہوئے وضاحت دی اور پھر پوچھنے لگا۔

''تمہارے ساتھ ٹینا نہیں آئی!''

''وہ آرہی ہے، میں اس لیے پہلے آگئی تھی کہ اگر تمہیں ضرورت ہوتو تمہاری مدد کرسکوں۔'' عائشہ نے بتایا۔

''اس مہربانی کے لیے شکریہ۔ لیکن فی الحال یہاں کوئی کام نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو میں ایک پیشنٹ سے ہر گز بھی مشقت نہ لیتا۔'' حمزہ نے شریر سے انداز میں کہا تو عائشہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی۔

''کام کوئی نہیں ہے لیکن میں پھر بھی خوش ہوں کہ تم باقی لوگوں سے پہلے یہاں آگئی ہو۔ مجھے تم سے آج ایک بہت اہم بات کرنی تھی۔''

''وہ کیا؟'' حمزہ کی بات پر عائشہ نے تجسس سے اس سے پوچھا۔

''میں بہت زیادہ گھما پھرا کر بات کرنے والا شخص نہیں ہوں عائشہ! اس لیے بہت سیدھے سادے لفظوں میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ول یو میری می عائشہ؟'' حمزہ کے سوال نے عائشہ کو کچھ دیر کے لیے خاموش کردیا تھا۔

خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد وہ حمزہ سے بولی۔ ''تم بہت اچھے شخص ہو حمزہ! کوئی بھی لڑکی تمہیں اپنا لائف پارٹنر بنا کر خوشی محسوس کرے گی، بٹ آئی ایم سوری۔ میری زندگی میں پہلے ہی کوئی اور موجود ہے۔''

''کون؟ کیا پاکستان میں کوئی؟'' حمزہ نے دھواں دھواں ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو عائشہ نے نفی میں سر ہلا دیا اور بہت آہستگی سے بولی۔

''اس کا تعلق یہیں سے ہے۔''

''کیا کوئی نان مسلم......؟'' حمزہ نے کسی اندیشے کے تحت پوچھا۔

''آئی ڈونٹ نو۔ میں اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمارا پروفیسر ہے اور پوری یونیورسٹی میں آر۔پی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس آر۔پی کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے، کسی کو نہیں معلوم۔'' عائشہ نے بے بس سے انداز میں جواب دیا پھر اسی وقت مہمانوں کی آمد شروع ہوجانے کے باعث ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مہمانوں میں عائشہ کے علاوہ ٹینا اور حمزہ کے دو کولیگ ڈاکٹرز بھی شامل تھے۔ مہمانوں کی گرم جوش تالیوں کے درمیان حمزہ نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کیک کاٹا اور پھر کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بیشتر چیزیں باہر سے منگوائی گئی تھیں البتہ حمزہ نے عائشہ کی پسندیدہ فنگلیاں خود گھر پر تیار کی تھیں۔

''حمزہ یار! اس موقع پر کوئی اچھا سا گیت ہوجائے۔'' حمزہ کے دوستوں میں سے ایک نے فرمائش کی تو عائشہ اور ٹینا چونک گئیں۔

''تو کیا حمزہ گانا بھی جانتا ہے؟'' ٹینا نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''بہت اچھا۔ ہم دوست اگر ایک جگہ جمع ہوں تو حمزہ سے اس کی آواز میں گانا ضرور سنتے ہیں۔'' حمزہ کے جس دوست نے گانے کی فرمائش کی تھی اسی نے ٹینا کو بتایا۔

''یہ تو بہت انٹرسٹنگ نیوز ہے۔ چلو حمزہ! اب اور دیر مت کرو اور جلدی سے کوئی خوب صورت سا سانگ سنادو۔ کچھ دیر میں مجھے اپنی ڈیوٹی کے لیے بھی روانہ ہونا ہے۔'' ٹینا نے زور دے کر کہا تو حمزہ اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد وہ واپس آیا تو خالی ہاتھ نہیں تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' ٹینا نے اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''یہ پاندور ہے، قفقار کے علاقوں میں مقبول قدیم ساز۔ میں کئی سال پہلے جب یہاں آیا تھا تو اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ مجھے بے حد عزیز ہے۔'' حمزہ نے جواب دیا اور نیچے قالین پر بیٹھ کر سر بکھیرنے لگا پھر اس کی اپنی آواز بھی ان سروں کا ساتھ دینے لگی۔ حمزہ کے ہونٹوں پر موجود نغمہ اجنبی زبان میں تھا جو سمجھ نہ آنے کے باوجود درد کا دلنشین سا احساس جگا رہا تھا۔ حمزہ کی آواز اور ساز کا یہ درد بھرا تاثر

عائشہ کو دکھی کرگیا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ حمزہ کو اس کے انکار نے دکھ پہنچایا ہے لیکن وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھی۔ دلوں کے سودے مروت میں طے نہیں پاتے اور عائشہ کا دل تو پہلے ہی بن مول کسی کا ہوچکا تھا۔

''ونڈرفل، ویری امیزنگ اینڈ فنٹاسٹک۔'' حمزہ گیت ختم کرکے خاموش ہوا تو کمرے میں موجود تمام افراد نے اسے داد دی۔

''اس سانگ کا ردھم اور تمہارا میوزک بہت خوب صورت تھا حمزہ! لیکن افسوس کہ ہم تمہارے گائے ہوئے گیت کا ایک بھی لفظ نہ سمجھ سکے۔ یہ کس زبان کے الفاظ تھے؟'' ٹینا نے تعریف کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آوار زبان ہے جو میرے گاؤں میں بولی جاتی ہے۔'' حمزہ نے ٹینا کو جواب دیا۔

''مائی گاڈ، تم نے اب تک یہاں قیام کے اتنے سالوں میں بھی اپنی زبان کو نہیں بھلایا حالانکہ مجھے تو اس مختصر سے عرصے میں ہی یہ لگنے لگا ہے کہ میں انگلش کے علاوہ کوئی اور زبان بول اور سمجھ ہی نہیں سکتی۔'' ٹینا نے نزاکت سے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں نے ہرگز بھی اپنی زبان کو نہیں بھلایا۔ پتا ہے ہمارے علاقے میں جب عورتوں کی آپس میں لڑائی ہوجائے تو وہ ایک دوسرے کو یہ کوسنا دیتی ہیں کہ خدا کرے تیرے بچے اس زبان سے محروم ہوجائیں جو ان کی ماں بولتی ہے۔ تم اندازہ کرو کہ کسی انسان کا اپنی زبان کو نہ جاننا کتنی بڑی محرومی ہے کہ اس نے باقاعدہ ایک بددعا کی شکل اختیار کرلی ہے۔ میں اپنے بنانے والے کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری یادداشت کو تازہ رکھ کر مجھے اتنی بڑی محرومی کا شکار ہونے سے بچالیا۔'' حمزہ کے بہت سنجیدگی سے دیے جانے والے اس جواب نے تانیہ مراد عرف ٹینا کو اس کا تکبر زدہ سر جھکانے پر مجبور کردیا تھا۔

⊛⊛⊛

''ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ تم ہماری سگی اولاد نہیں ہو۔ ڈھاکا میں ہونے والے فسادات نے ایک دن اتفاقاً تمہیں ہم سے لاملایا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ہم میں سے نہیں ہو ہم نے تمہیں اپنا لیا تھا۔'' راج پرشاد کے اعتراف پر روی کا چہرہ لٹھے کے مانند سفید پڑگیا۔ وہ بہت ٹینشن میں ہونے کے باوجود بھی ایڈی کے گھر سے اس انکشاف کی امید لے کر نہیں آیا تھا۔

''اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے روی کہ تمہیں کس نے جنم دیا تھا۔ تم میری طرف دیکھو، میں ہوں تمہاری ماں۔ میں...... جس نے زندگی کے اتنے برس صرف اور صرف تمہارے لیے دان کردیے۔ رات رات بھر تمہارے لیے میں جاگی ہوں۔ تمہارے لیے میں نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ گھر، وطن، ماں، باپ سب کچھ۔'' کملا نے روتے ہوئے روی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس پر بے تحاشا بوسے دیے۔

''میں مانتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کچھ کیا ہوگا لیکن آپ کی ساری محبت اس سچ کو نہیں چھپا سکتی کہ میں کسی مسلمان کی اولاد ہوں۔'' روی کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

''بھول جاؤ اس بات کو روی! بھول جاؤ کہ تمہیں کسی مسلمان عورت نے جنم دیا ہے۔ بس یہ یاد رکھو کہ بھگوان نے تمہارے لیے ہندو دھرم کو پسند کیا تھا اسی لیے اس رات وہ تمہاری ماں کو ہمارے دروازے تک لے آیا تھا۔ اگر بھگوان کی مرضی نہ ہوتی تو تم ہمارے پاس کیسے آسکتے تھے۔'' کملا نے اسے خود سے لپٹا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں کس طرح آپ لوگوں تک پہنچا تھا۔ مجھے ایک ایک لفظ بتائیے۔'' روی نے کملا سے الگ ہوتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ روی کے اس انداز پر کملا کے ہونٹوں سے ایک زوردار سسکاری نکلی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ زندگی میں ایک دن ایسا آئے گا جب روی اپنی شناخت کا سوال لے کر ان کے سامنے کھڑا ہوگا، وہ روی کا یہ انداز برداشت نہیں کرپا رہی تھی۔ راج پرشاد نے صدمے سے نڈھال ہوتی کملا کو دیکھا اور پھر فوراً ہی اس سے نظریں پھیر کر روی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اب تک آنکھوں میں سوال لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راج پرشاد نے ایک گہرا سانس لیا اور روی کے خود تک پہنچنے سے لے کر اپنے امریکا شفٹ ہونے تک ایک ایک بات اسے بتانے لگا۔ روی جو کل تک ان کے لیے ایک معصوم بچہ تھا، چہرے پر بوڑھوں جیسی سنجیدگی لیے راج پرشاد کی باتوں کو غور سے سنتا رہا۔ راج پرشاد سب کچھ بتا کر خاموش ہوا تو روی بنا ایک لفظ کہے اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے سے باہر کا رخ کیا۔

''روی!'' کملا نے تڑپ کر اسے پکارا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"راج! میں روی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ روی صرف میرا ہے۔ اگر وہ مجھ سے جدا ہوا تو میں مرجاؤں گی راج!" روی کی بے رخی پر پہلے سے آنسو بہاتی کملا کے رونے میں اور بھی شدت آ گئی۔

"وہ کہیں نہیں جائے گا کملا! وہ تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔" کملا کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے راج پرشاد نے اسے دلاسا دیا۔

"ہمیں اسے کچھ وقت دینا پڑے گا۔ ابھی وہ خود پر ہونے والے انکشاف کے زیر اثر ہے۔ ہمیں اس کے سنبھلنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تم اپنے جذبات کو قابو میں رکھو۔ اس وقت ہمیں اپنے نہیں، روی کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے بہت مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ ہمیں اس کے ہر ردعمل کو بہت حوصلے سے برداشت کرنا ہوگا۔ تم دیکھنا وہ بہت جلد ہماری طرف پلٹ آئے گا۔ اس کی رگوں میں خون چاہے جس کا بھی رہا ہو اسے پالا تو ہم نے ہے۔ وہ تھوڑے عرصے کشمکش میں رہنے کے بعد پھر سے ہمارا ہو جائے گا۔ وہ ساری زندگی اس دھرم پر رہے گا جو ہم نے اسے دیا ہے۔ ہماری تربیت اس کے خون کے اثر پر بھاری رہے گی کملا!" راج پرشاد صرف کملا کو ہی نہیں بہلا رہا تھا بلکہ خود کو بھی تسلی دے رہا تھا۔

❂❂❂

روی کے اندر ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔ اس کا اپنا ہی وجود اس کے لیے ایک سوال بن گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ دراصل وہ کیا ہے۔ وہ، جو اسے پیدا کیا گیا تھا یا وہ، جو اسے تربیت کے ذریعے بنا دیا گیا تھا۔ راج اور کملا نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ وہ ہندو دھرم سے قریب رہے۔ وہ ان کے سکھائے ہوئے طریقوں کے مطابق پوجا پاٹ بھی کرتا رہا تھا اور مسلمانوں سے نفرت بھی۔ لیکن اب یہ سارا سکھایا پڑھایا کچھ بے معنی سا ہو کر رہ گیا تھا۔ لاکھ اس کی شخصیت راج اور کملا کی پابندیوں کے سبب دب گئی تھی لیکن وہ قدرتی طور پر ایک ذہین بچہ تھا جو سچ سامنے آنے کے بعد بہت سی باتوں کا تجزیہ کر سکتا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کیوں پیدا کی گئی؟ اسے لوگوں سے کاٹ کر رکھنے کی کوشش کیوں کی جاتی رہی؟ وہ کیوں کبھی ایسے اسکول میں نہیں پڑھا جہاں ایشین کمیونٹی کے بچوں کی اکثریت ہوتی تھی؟ کیوں اسے ٹک کر کبھی ایک اسکول میں نہیں پڑھنے دیا گیا اور کیوں اسے دوست بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اسے یہ بھی سمجھ آ رہا تھا کہ راج اور کملا کیوں کبھی اسے اپنے رشتے داروں سے ملانے کے لیے آبائی وطن لے کر نہیں گئے؟ وہ تربیت اور ماحول کے ذریعے خود کو ملنے والے دھرم کو قبول کر لیتا اگر اس کے ساتھ اتنی بے ایمانیاں نہیں کی گئی ہوتیں۔ اگر اس پر آگہی کے سارے در بند نہیں کیے گئے ہوتے۔ اتنی پابندی اور اتنی احتیاط کا تو ایک ہی مطلب تھا کہ اسے پالنے والے اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ اپنے اصل کی طرف نہ لوٹ جائے؟ لیکن پلٹنا بھی تو آسان نہیں تھا۔ پلٹا تو اس راستے پر جاتا ہے جس کا کوئی نشان، کوئی نقش ذہن پر موجود ہو۔ روی کا ذہن تو اس معاملے میں مکمل تاریکی میں تھا۔ اس کی زندگی ایک دوراہے پر آ کر رک گئی تھی اور کشمکش کی اس کیفیت نے اس کی کم گوئی کو مکمل خاموشی میں بدل دیا تھا۔

"تم اپنے ذہن پر زور مت ڈالو روی! تم کچھ بھی مت سوچو۔ تم صرف اس پر یقین کرو جو میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو روی! تمہیں میں نے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر چاہا ہے۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں روی! کیا تمہیں اپنی ماں کی محبت پر شک ہے جو تم اس پر یقین نہیں کرتے، اس کی بات ماننے کے بجائے بیکار کی سوچوں اور وسوسوں میں الجھے رہتے ہو۔" روی کی خاموشی پر ہول کر کملا بار بار اسے اپنی محبت کا یقین دلانے لگتی۔ وہ کملا کی ہر بات خاموشی سے سنتا لیکن کبھی جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ جیسے کسی مشین میں تبدیل ہو گیا تھا جو وقت پر سوتی جاگتی، کھاتی پیتی اور پڑھتی لکھتی بھی لیکن جس کے پاس جذبات نہیں تھے۔ اس کی یہ حالت کملا کو پاگل کیے دے رہی تھی۔ وہ بچہ جو اس کی زندگی کا محور تھا اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اس سے بچھڑ کر رہ گیا تھا۔

"تم اپنے ذہن کو کسی اور طرف مصروف کرو کملا! اگر تم چوبیس گھنٹے اسی طرح روی کے بارے میں سوچتی رہیں تو تمہارا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔" راج جو شروع میں اسے تسلیاں اور دلاسے دیا کرتا تھا کہ آہستہ آہستہ روی پھر پہلے جیسا ہو جائے گا' ایک دن خود بھی اس کی طرف سے مایوس ہو کر کملا کو سمجھانے لگا۔

"میں کیا کروں راج! مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔" کملا نے روتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

"تم لوگوں سے میل ملاپ بڑھاؤ۔ روی کی خاطر تم نے اپنی سوشل لائف بالکل ختم کر لی تھی لیکن اب جو ہونا تھا، ہو چکا تمہیں خود کو یوں تنہائی کی مار، مارنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم لوگوں میں آؤ جاؤ، ان سے گھلو ملو۔ تمہارا ڈپریشن

خود ہی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ زندگی محدود ہو تو جینے کے راستے نہیں ملتے، اسے وسعت دو تو دل کو بہلانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔" راج نے اسے مشورہ دیا تھا۔ ابتدا میں کملا اس مشورے پر عمل کرنے کی ہمت نہیں کر سکی لیکن آخر کب تک؟ بالآخر اس نے راج کے مشورے پر عمل کرنا شروع کر ہی دیا۔ اب اس کی اکثر شامیں ایشین کمیونٹی میں ہونے والے کسی مشاعرے، سیمینار، غزل شام، فوڈ فیسٹیول یا ایسی ہی کسی سرگرمی میں گزرنے لگی تھیں۔ روی جو پہلے ہی سب سے کٹ کر رہ گیا تھا اب اس کی ساکت وجامد زندگی میں کنکر مار کر لہر پیدا کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا تھا۔ راج، روی اور کملا جو پہلے ایک اکائی کی صورت میں رہتے تھے، اب اپنی الگ الگ مصروفیات کے دائرے میں گھوم رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو کسی کی سرگرمیوں کا علم تھا نہ ذہنی انقلاب کی خبر۔

❂❂❂

دوسرے دن عائشہ یونیورسٹی گئی تو پروفیسر آر۔ بی غیر حاضر تھا۔ اسے اپنے کلاس فیلوز سے معلوم ہوا کہ وہ گزشتہ روز بھی نہیں آیا تھا۔ عائشہ کو تشویش نے گھیر لیا۔ کئی بار خیال آیا کہ اس کی رہائش گاہ پر جا کر اس کی خیریت معلوم کر لے لیکن پھر ہمت نہیں پڑی۔ تیسرے دن ایک نئے پروفیسر ان کی کلاس میں موجود تھے، اس اطلاع کے ساتھ کہ پروفیسر آر۔ بی لانگ لیو پر چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ وہ انہیں پڑھائیں گے۔ عائشہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ نئے پروفیسر کا پیریڈ مکمل ہونے کا انتظار کرنے میں اسے خود پر بہت جبر کرنا پڑا۔ وہ پروفیسر کے دیے گئے لیکچر کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکی۔ چنانچہ جیسے ہی پروفیسر صاحب لیکچر ختم کر کے کلاس سے باہر نکلے' اس نے ٹینا کا ہاتھ پکڑا اور کلاس سے باہر نکل آئی۔

"کیا ہے بھئی، کیا مسئلہ ہے؟" ٹینا خود کو اس طرح باہر لائے جانے پر ناراضی سے پوچھنے لگی۔

"میرے ساتھ پروفیسر آر۔ بی کی Residence تک چلو، میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیوں لانگ لیو پر چلے گئے ہیں۔" عائشہ نے ٹینا کو بتایا۔

"یہ پروفیسر کا ذاتی معاملہ ہے ہم اس معاملے میں پوچھ تاچھ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ اور پھر تمہیں تو ان کے جانے سے خوش ہونا چاہیے۔ تمہاری کتنی انسلٹ کیا کرتے تھے، اچھا ہے تمہاری جان چھوٹی۔" ٹینا نے بے پروائی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"پلیز ٹینا! ان سب باتوں کو جانے دو اور میرے ساتھ چلو۔ میرے لیے پروفیسر کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔" عائشہ نے لجاجت سے ٹینا سے درخواست کی۔ اس روز پیش آنے والے واقعے کی وجہ سے وہ تنہا پروفیسر کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"او کے بابا! چلو، تمہارا ابھی کچھ معلوم نہیں ہے کہ کس کو کس وجہ سے اہمیت دیتی ہو۔ وہ بیچارہ حمزہ تمہارے پیچھے اتنا خوار ہوتا ہے اور تم اسے دوستی سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ یہاں پروفیسر کا یہ حال ہے کہ تم سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی اور تم ہو کہ ان کی فکر میں دبلی ہوئی جا رہی ہو۔" ٹینا جتنی بے پروا اور لیے دیے رہنے والی نظر آتی تھی اتنی تھی نہیں اس بات کا عائشہ کو ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا لیکن فی الحال اس کے لیے یہ بات اہم تھی کہ ٹینا اس کے ساتھ پروفیسر کی رہائش گاہ تک جانے پر راضی ہو گئی تھی۔

پروفیسر کی رہائش گاہ پر پہنچ کر عائشہ نے ڈور بیل بجائی۔ گھر کے اندر بیل بجنے کی آواز سنائی دی لیکن جواب میں کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ عائشہ نے دوبارہ اور پھر تیسری بار بھی بیل بجائی لیکن نتیجہ حسب سابق ہی رہا۔

"میرے خیال میں ابھی پروفیسر گھر پر نہیں ہیں۔ ہم بعد میں دوبارہ یہاں آ جائیں گے۔" عائشہ کے چہرے پر پھیلنے والی مایوسی کو دیکھ کر ٹینا نے تسلی دینے والے انداز میں اس سے کہا تو وہ دروازے سے ہٹ کر واپسی کے لیے مڑ گئی۔

"پروفیسر صاحب یہ گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ میں نے آج صبح ہی انہیں سامان کے ساتھ یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" برابر والے گھر کے لان میں کام کرتے مالی نے ان لوگوں کو بیل بجاتے اور پھر ناکام ہو کر پلٹتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے قریب آ کر اطلاع دی۔ اس کی دی ہوئی اطلاع نے عائشہ کو ادھ موا کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتی ہوئی ٹینا کے ساتھ واپس ہوئی۔ اس کے بعد اگلے ایک ہفتے تک وہ اس کوشش میں لگی رہی کہ کہیں سے پروفیسر کے بارے میں کوئی اطلاع مل جائے لیکن اسے اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔

❂❂❂

فیروزی بارڈر والی سیاہ ساڑھی کا پلو بہت اہتمام سے سیٹ کرنے کے بعد کملا نے آئینے میں اپنے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر گردن کی پشت پر موجود بالوں کے بڑے سے جوڑے کو ہولے سے تھپتھپا کر اس کی درست پوزیشن کا

اندازہ لگایا۔ آج اسے ایک اسکول کے رزلٹ فنکشن میں جانا تھا۔ اسکول کی پرنسپل مسز ایلکا کپور کا شمار اس کی اچھی دوستوں میں ہوتا تھا اور ایلکا نے بہت اصرار سے کملا کو اس فنکشن میں انوائٹ کیا تھا۔ پچھلے پانچ سالوں میں کملا بہت سوشل ہوچکی تھی اور آئے دن اس کا کسی نہ کسی فنکشن میں آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن اسکول فنکشن کی بات ہی الگ تھی۔ یہ فنکشنز اسے روی کے بچپن کی یاد دلاتے تھے۔ روی کے اسکول میں ہونے والے کسی بھی فنکشن میں کملا لازماً شرکت کرتی تھی لیکن پچھلے پانچ سال سے یہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ روی نے اس واقعے کے بعد کبھی کملا کو ایسے کسی فنکشن کے بارے میں انفارم نہیں کیا تھا۔ بس وہ اپنے رزلٹس خاموشی سے کملا کے سامنے لاکر رکھ دیتا تھا۔ کملا نے محسوس کیا تھا کہ روی کے رزلٹس ماضی کے مقابلے میں اور بھی اچھے ہوگئے تھے اور اس کی وجہ لازماً یہ تھی کہ اس نے ہر طرف سے دھیان ہٹا کر خود کو پڑھائی میں مصروف کرلیا تھا۔ کملا کے لیے جو بات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ یہ کہ روی کی زندگی میں مذہب کا خانہ خالی ہوگیا تھا۔ وہ اپنے Documents میں خود کو لامذہب ظاہر کرنے لگا تھا۔ روی جو کبھی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوا کرتا تھا، اپنی روش کی وجہ سے کملا کے لیے دکھ کا سبب بنتا جارہا تھا۔ اس دکھ سے خود کو بچانے کے لیے وہ اپنے آپ کو گھر سے باہر زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ اب اس کے پاس راج کے لیے بھی زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ کملا کی طرح راج نے بھی خود کو گھر سے باہر مصروف کرلیا تھا اور اب ان دونوں کو ایک دوسرے کے شیڈول کے بارے میں زیادہ خبر نہیں ہوتی تھی۔ آج صبح بھی جب کملا جاگی تو راج حسب معمول گھر سے جاچکا تھا۔ کملا کو ساڑھے دس بجے فنکشن میں پہنچنا تھا سو اس نے ہلکا پھلکا ناشتا لے کر فنکشن میں جانے کی تیاری شروع کردی۔ ٹھیک دس بجے وہ بالکل تیار تھی۔ اپنی تیاری کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ گھر سے نکلی اور ایک کیب کے ذریعے مسز ایلکا کپور کے اسکول کی طرف روانہ ہوگئی۔ دس بج کر بیس منٹ پر وہ اسکول پہنچ چکی تھی۔ ایلکا نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور وی آئی پیز کے لیے مخصوص اگلی نشستوں میں سے ایک پر لے جاکر اسے بٹھا دیا۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے تک سب مہمان اسکول ہال میں پہنچ چکے تھے اور فنکشن کا آغاز ہوگیا تھا۔ فنکشن بہت اچھا تھا اور کملا اسے بہت انجوائے کررہی تھی۔ کامیاب ہونے والے بچوں کے چمکتے چہرے اسے انوکھی خوشی دے رہے تھے۔ وہ خوب تالیاں بجا کر ان بچوں کو داد دے رہی تھی۔ رزلٹ اناؤنسمنٹس کے درمیان بچوں کی پرفارمنسز بھی تھیں جو فنکشن کا لطف دوبالا کررہی تھیں۔ اصل میں ایلکا کے اسکول میں زیادہ تر انڈین کمیونٹی کے بچے زیرتعلیم تھے اس لیے پیش کیے جانے والے خاکوں اور دوسری چیزوں میں انڈین کلچر کا رنگ غالب تھا۔ دیار غیر میں اپنوں سے دور رہنے والوں کو یہ چیز بہت فیسی نیٹ کررہی تھی۔ کملا کی ہتھیلیاں تالیاں بجا بجا کر سرخ ہوچکی تھیں لیکن اسکول انتظامیہ کے پاس پیش کرنے کو ابھی بہت کچھ تھا۔ چھوٹے بچوں کا وہ گروپ بھی ایک خوب صورت آئٹم لے کر اسٹیج پر آیا تھا۔ بچے ایک انڈین ملی نغمے پر فارمنس دے رہے تھے۔ بچوں کے گروپ کو لیڈ کرنے والا چار سالہ بچہ بہت کیوٹ اور کانفیڈینٹ تھا۔ کملا کی نظریں گروپ میں موجود باقی چار بچوں کو چھوڑ کر مسلسل اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ ان بچوں کا آئٹم ختم ہوگیا اور وہ اسٹیج سے واپس جانے لگے لیکن وہ بچہ دیگر چار بچوں کی طرح بیک اسٹیج نہیں گیا تھا وہ اسٹیج کے سامنے والے حصے میں بنے چار اسٹیپس کی سیڑھیاں اتر کر بھاگتا ہوا مہمانوں کی نشستوں کی طرف بڑھا تھا۔ بہت سے لوگوں کی طرح کملا نے بھی گردن موڑ کر اس بچے کو طرف دیکھا۔ بچے کو اس طرف آتے دیکھ کر ایک جوڑا اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ یقیناً بچے کے ماں باپ تھے۔ بچے کے قریب پہنچنے پر مرد نے اسے اپنی گود میں اٹھایا اور اس کے گال پر بوسہ دیا۔ بچے نے بھی اس کو جوابی بوسہ دیا اور باپ کی گود میں موجود رہتے ہوئے جھک کر اپنی ماں کو پیار کرنے لگا۔ لوگ اس خوب صورت منظر پر مسکرائے اور پھر گردن سیدھی کرکے اسٹیج کی طرف متوجہ ہوگئے لیکن کملا ایسا نہیں کرسکی تھی۔ اس کی گردن اسی پوزیشن میں ساکت ہوگئی تھی۔ وہ جوڑا اپنی نشستوں پر واپس بیٹھ چکا تھا لیکن کملا ٹک ان کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید بےیقینی اور حیرت تھی۔

☾☾☾

''آج کا دن کیسا گزرا راج؟'' چہرے پر نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے کملا نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے راج کے عکس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ یہ بات آج پہلی بار نوٹ کررہی تھی کہ راج ماضی کے مقابلے میں زیادہ خوش اور تازہ دم نظر آنے لگا تھا۔

''آج کا دن......'' راج کی آنکھوں میں چمک سی جاگی اور ہونٹ مسکرانے لگے لیکن پھر وہ جیسے خود ہی کسی خوب

صورت خیال کی گرفت سے باہر آیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''بس روزانہ جیسا ہی تھا آج کا دن بھی۔ مصروف اور تھکا دینے والا۔''

''تمہاری مصروفیت اور تھکن کا آج مجھے بہت شدت سے احساس ہوا ہے راج! تم تو بہت زیادہ بوجھ تلے دبے ہوئے ہو۔'' کملا کے لہجے میں طنز تھا۔

''ارے نہیں بھئی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اپنے پیاروں کے لیے کچھ کرنے سے آدمی بوجھ نہیں خوشی محسوس کرتا ہے۔'' راج کملا کے لہجے کے طنز کو نہیں پاسکا تھا اس لیے نارمل سے انداز میں جواب دیا۔

''پھر بھی، دو دو گھروں کے ذمے داریاں سنبھالنا کوئی اتنا آسان تو نہیں ہوتا، وہ بھی امریکا جیسی جگہ پر۔'' کملا نے جیسے دھماکا کیا تھا جس نے کئی لمحوں کے لیے راج کو گنگ کرکے رکھ دیا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو کملا؟'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے حیرت کا اظہار کرنا چاہا۔

''وہی جو میں آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔ کتنے خوش لگ رہے تھے تم اپنی دوسری بیوی اور بیٹے کے ساتھ۔'' کملا نے اسٹول گھما کر راج کی طرف رخ کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پھنکاری۔

''تو تمہیں معلوم ہوگیا۔'' راج نے بیڈ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''تو تمہارا کیا خیال تھا کہ تم ساری زندگی مجھے یونہی دھوکا دیتے رہو گے اور مجھے کبھی معلوم ہی نہیں ہوگا؟'' کملا نے غصے سے کہا۔

''میں نے تمہیں دھوکا نہیں دیا کملا! میں نے تم سے یہ بات صرف اس لیے چھپا کر رکھی کہ تمہیں دکھ نہ ہو۔'' راج بہت پرسکون تھا۔

''لیکن کیوں راج! تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا کمی تھی تمہیں اس گھر میں جو تم نے ایک اور گھر بسالیا؟'' کملا اپنی جگہ سے اٹھ کر راج کے قریب آئی اور اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے اسی سے پوچھنے لگی۔

''تم کمی کا پوچھتی ہو کملا! میں پوچھتا ہوں اس گھر میں ہے ہی کیا؟ تم...... جو ساری زندگی بس اپنی ہی محرومیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتی رہیں، یا پھر روی...... جسے سب کچھ دے کر بھی ہم اپنا نہیں بنا سکے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل اور اپنے مسائل کے حل کے لیے تم نے میری پوری زندگی برباد کردی۔ تمہاری وجہ سے میں نے اپنے والدین، بہن بھائی، جائداد اور دیش کو چھوڑا۔ تمہاری خاطر میں نے اپنے دھرم کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک مسلمان بچے کو اپنا نام دیا لیکن مجھے کیا حاصل ہوا؟ تمہیں معلوم ہے روی نے ہمارا دیا ہوا نام ترک کرکے خود کو آر۔ پی کہلانا شروع کردیا ہے۔ وہ، جو اپنی شناخت چھپانا چاہتا ہے دنیا میں میرے نام کو کیسے آگے بڑھائے گا اور تم...... تمہیں بھی تو فرصت نہیں تھی کہ تم مجھ سے میرا دکھ بانٹو۔ تمہیں تو صرف اپنی پروا تھی۔ تم ہمیشہ اپنے ہی غموں کا حل ڈھونڈتی رہیں، تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ مجھے بھی ایک غمگسار اور ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں بھی انسان ہوں جو ہمیشہ صرف دکھ چننا نہیں چاہتا، کبھی کسی سے اپنا دکھ بانٹنا بھی چاہتا ہے لیکن تمہیں تو ان ساری باتوں کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ایسے میں اگر میں نے اپنی ایک چھوٹی سی دنیا الگ بسالی تو کیا غلط کیا؟ میرا بھی حق ہے خوشیوں پر۔ آخر میں کب تک تم سے محبت کرنے کا تاوان دیتا رہوں۔'' برسوں سے راج کے اندر پلتے شکوے آج لاوے کی طرح بہہ نکلے تھے۔ کملا پھٹی پھٹی آنکھوں سے راج کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی راج ہے جو اس کی خاطر اپنا سب کچھ نچھاور کردیتا تھا۔ راج کے بازو پر رکھا اس کا ہاتھ خودکار طریقے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جان لیا تھا کہ وقت کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہیں۔ راج اب اس کا نہیں رہا تھا۔

☾☾☾

ایزی چیئر پر جھولتے پروفیسر آر۔ پی کی آنکھیں بند تھیں لیکن ان بند آنکھوں کے پیچھے بہت سے منظر جاگ رہے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے کئی واقعات تھے جو رہ رہ کر اسے یاد آتے تھے۔ وہ بچپن جو عام بچوں کے بچپن سے بے حد مختلف تھا، جو اس نے بے تحاشا پابندیوں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس پر عائد پابندیاں ایک سچ کے سامنے آنے سے ختم ہوگئی تھیں لیکن وہ سچ خود اپنی جگہ اتنا کربناک تھا کہ وہ ساری زندگی خود کو اس کی اذیت سے نہیں نکال سکا۔ اسے پنجرے سے اس وقت رہائی نصیب ہوئی تھی جب اس کے اندر اڑان کی تمنا ہی ختم ہوگئی تھی۔ پہلے کملا اور راج اسے نارمل زندگی نہیں جینے دیتے تھے بعد میں وہ خود نارمل زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہا۔ اس نے ایڈی جس کا اصل نام عدنان تھا، سے بھی قطع تعلق کرلیا تھا۔ ایڈی بہت دنوں تک اس کے اس رویے کا سبب جاننے کے لیے اس کے آگے پیچھے گھومتا رہا تھا لیکن اس نے اپنے ہونٹوں پر پڑے قفل نہ کھولے تھے۔ بالآخر ایڈی نے ہار مان لی۔

اگلے سال اس نے اسکول بدل لیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ کملا اور راج کے بجائے اس نے خود اپنا اسکول تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پرانے اسکول میں وہ صرف اپنے ساتھی اور ٹیچرز ہی نہیں، اپنا نام بھی چھوڑ آیا تھا۔ اس نے خود کو روی پرشاد کی جگہ آر۔ پی کہلانا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کا نہ کوئی باقاعدہ نام تھا اور نہ ہی مذہب۔ گھر پر کملا نے بھی کچھ عرصہ اس کے ساتھ مغز ماری کرنے کے بعد ہار مان لی تھی اور یوں وہ یکسو ہو کر تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کے شب و روز لگی بندھی روٹین کے ساتھ گزرنے لگے تھے۔ اس جمود میں اس وقت ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا تھا جب کملا کے علم میں راج کی دوسری شادی کا معاملہ آیا تھا۔ کملا نے راج سے لڑنے جھگڑنے کے بجائے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔ روی اور راج اس کی زندگی کے یہی دو محور تھے جب دونوں ہی نے اپنے معاملات اس سے جدا کر لیے تو کملا کے پاس امریکا میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔ وہ بنگلا دیش واپس لوٹ گئی جہاں اس کی ماں بڑھاپے اور تنہائی کے عذاب سے گزر رہی تھی۔ کملا چاہتی تھی کہ آخری عمر میں ماں کی سیوا کر کے ہی من کی تھوڑی سی شانتی سمیٹ لے۔ یوں عمر کے انیسویں برس میں آر۔ پی کا وہ گھر بھی ختم ہو گیا جہاں اس کو زندگی کی بہت سی سہولیات میسر تھیں۔ کملا کے جانے بعد راج پرشاد مکمل طور پر اپنی دوسری بیوی اور بچے میں مگن ہو گیا تھا۔ اسے آر۔ پی سے دلچسپی تو بہت پہلے ہی ختم ہو گئی تھی، کملا کے جانے کے بعد وہ اس کی ذمے داریوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ خود آر۔ پی کو بھی اب اس کی مدد کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اس لائق ہو چکا تھا کہ اپنے اخراجات اٹھانے کے لیے کوئی کام کر سکے۔ زندگی کا یہ دور اس کے لیے بہت مصروف اور پرمشقت ثابت ہوا تھا لیکن وہ کامیابی سے اس دور سے گزر گیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم اور اچھی جاب جو ایک کامیاب انسان کی زندگی کے دو اہم جز ہوتے ہیں اس کی دسترس میں تھے لیکن اس کے بعد پھر اس کی زندگی جامد تھی۔ وہ خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا تھا کہ کسی لڑکی سے شادی کر کے نارمل لائف کا آغاز کر سکے۔ وہ اپنے مسلمان اور ہندو ہونے کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ اس کے لیے ایک ایسی الجھی ڈور کے مانند تھا جسے سلجھانے کی اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ بس وہ ساری دنیا اور خصوصاً عورتوں سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس معاشرے میں ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی جو مذہب کا سوال سامنے لائے بغیر بھی اسے اپنانے کے لیے تیار ہو جاتیں۔ وہ خود ہی تردد کا شکار تھا۔ ایسے میں جب عائشہ سجاد سے اس کا سامنا ہوا اور اس نے خود کو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہوا محسوس کیا تو وہ بلاوجہ ہی اس سے چڑنے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کیں کہ عائشہ سجاد اس سے بدگمان ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے خراب رویے پر عائشہ کے چہرے پر دکھ اور حیرت تو ضرور آ جاتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آر۔ پی کے لیے موجود محبت کے رنگ پھیکے نہ پڑتے تھے۔ وہ اس بات سے اور بھی چڑ جاتا تھا۔ عائشہ سجاد ایک مسلمان لڑکی تھی اور وہ کسی مسلمان لڑکی کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن اس کے فرار کی ہر کوشش اس روز مسدود ہو گئی تھی جب عائشہ اس کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے سیاہ فام لڑکے پروفیسر آر۔ پی کو دیکھ کر واپس پلٹ گئے تھے اور سڑک پر بے ہوش عائشہ کے ساتھ صرف وہ تھا۔ اس وقت وہ عائشہ کو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اٹھا کر اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ صرف خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہے اور جلد ہوش میں آ جائے گی۔ اس نے عائشہ کو اپنی اسٹڈی میں پڑے صوفہ کم بیڈ پر لٹا دیا تھا اور چاہتا تھا کہ پلٹ جائے لیکن پلٹ نہیں سکا تھا۔ وہ پہلی بار اس کے حسن بے حجاب کو اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کے سیاہ گھنے بال جو ہمیشہ بلیک اسکارف میں چھپتے رہتے تھے چاند کے گرد بننے والے ہالے کی طرح اس کے چہرے کو اور بھی پرکشش بنا رہے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ سنگ مرمر سے تراشا کوئی حسین مجسمہ تھی جسے سانس لینے کی صلاحیت عنایت کر دی گئی تھی۔ سانسوں کا زیر و بم اس مجسمے کی خوبصورتی کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ آر۔ پی کا جی چاہا وہ اسے چھو کر دیکھے لیکن عائشہ کے چہرے پر موجود تقدس نے اسے اس خواہش سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ دوبارہ جب وہ کمرے میں آیا تو عائشہ ہوش میں آ چکی تھی۔ اس وقت اس کی عائشہ سے تھوڑی سی بات چیت ہوئی تھی۔ اس گفتگو میں پروفیسر آر۔ پی نے عائشہ کو اس کی شناخت چھپانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس مشورے کے جواب میں عائشہ نے ایک طویل تقریر جھاڑی تھی لیکن پروفیسر آر۔ پی کو اس کا صرف ایک جملہ یاد رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ”اپنی ذات پر دوسروں کا رنگ وہ لوگ چڑھاتے ہیں جنہیں اپنے اصل پر شرمندگی ہوتی ہے، میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے اصل، اپنی شناخت پر فخر ہے۔“ یہ جملہ بولتے وقت عائشہ کے لہجے میں جو اعتماد تھا وہ پروفیسر آر۔ پی کے پاس کبھی نہیں رہا تھا۔ اس

روز عائشہ کو رخصت کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یوں گمنام اور بے سمت زندگی گزارنے کے بجائے اپنے اصل کو تلاش کرے گا۔ وہ اپنے لیے وہ شناخت تلاش کرے گا جس کے بعد وہ عائشہ سجاد ہی کی طرح خود کو فخر سے لوگوں کے سامنے متعارف کروا سکے۔ اس فیصلے کے بعد اس نے کئی فوری نوعیت کے فیصلے کیے تھے اور نتیجتاً اب کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں بیٹھ کر آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہا تھا اس کی کھو جانے والی شناخت ایک گوہر نایاب تھی جس کے حصول کے لیے جانے اسے کس کس دریا کی تہ کھنگالنی تھی۔

⊕⊕⊕

عائشہ کو پروفیسر آر۔ پی کے بارے میں کوئی علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کسی سے اتنا قریب تھا ہی نہیں کہ کوئی اس کے پروگرامز یا ارادوں سے باخبر ہوتا۔ عائشہ پروفیسر کے اس طرح غائب ہو جانے سے بے حد پریشان تھی۔ اسے لگتا تھا کہ پروفیسر کے نہ ہونے سے زندگی رک سی گئی ہے۔ حالانکہ زندگی کے سارے ہی کام جاری و ساری تھے۔ وہ اپنے سارے کام سابقہ معمول کے مطابق ہی کر رہی تھی لیکن کچھ تھا جو اندر ہی اندر اسے کھائے جا رہا تھا۔ اپنی اس حالت پر وہ اکثر سوچتی کہ جس شخص کے غائب ہو جانے سے یہ حال ہوا ہے اس کا نام، اس کی محبت اگر کبھی زندگی سے خارج کر دینے کی نوبت آئی تو کیا ہوگا؟ اسے پروفیسر سے محبت ہو گئی ہے، یہ بات تو اس نے بہت دن ہوئے جان لی تھی لیکن اس محبت کی گہرائی کا ادراک اسے اب ہو رہا تھا۔ شب و روز جیسے گہری اداسی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ کم گو تو وہ پہلے ہی تھی لیکن اب تو لگتا تھا قوتِ گویائی ہی کھو بیٹھی ہو۔ ایسے میں اسٹور کی نوکری کرنا اچھا خاصا مشکل ہو گیا تھا لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی اس کے حصول کو کسی صورت میں بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی اور اس کے لیے اسے معاشی سہارے کی ضرورت تھی سو بہ حالت مجبوری ہی سہی، اسٹور کی جاب کو گھسیٹ رہی تھی۔

یہ بھی مجبوری کے سہارے گزرنے والی ہی ایک شام تھی۔ عائشہ کاؤنٹر پر کھڑی لوگوں کو ان کے بلز بنا کر دینے کا کام انجام دے رہی تھی کہ ایک شناسا چہرے نے کی بورڈ پر چلتی اس کی انگلیوں کی حرکت کو روک دیا۔ وہ، جسے وہ کئی دنوں سے ڈھونڈ رہی تھی یوں اچانک سامنے آ کھڑا ہوگا عائشہ نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس کے ہاتھ اس ٹرالی کے ہینڈل پر رکھے ہوئے تھے جس میں اس کی خریدی ہوئی اشیا موجود تھیں۔ وہ خود بھی اس اچانک ہو جانے والی ملاقات کے باعث حیران نظر آ رہا تھا۔

”آپ...... آپ کہاں چلے گئے تھے سر!“ بالآخر عائشہ نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

”کیا تم نے مجھے مس کیا تھا؟“ پروفیسر کے ہونٹوں سے ایک ایسا سوال پھسلا جو اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا۔ جواباً عائشہ کی آنکھوں میں دھند اتر آئی جسے چھپانے کو اس نے نظریں جھکا لیں۔ یہ جواب اتنا واضح تھا کہ پروفیسر نے بنا کچھ کہے بھی سب کچھ جان لیا۔

”تمہاری ڈیوٹی ختم ہونے میں کتنا وقت ہے؟“ اس نے بہت سنجیدگی سے عائشہ سے دریافت کیا۔

”ایک گھنٹا، ایک گھنٹے بعد میرا آف ہو جائے گا۔“ سوال کا مقصد نہ سمجھنے کے باوجود عائشہ نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”میں اس سامنے والے ریسٹورنٹ میں ہوں۔ آف کرنے کے بعد تم وہاں آ کر مجھ سے مل لینا۔“ پروفیسر نے آہستگی سے کہا اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعے اس بل کی ادائیگی کرنے لگا جو عائشہ کی ساتھی لڑکی نے اس دوران تیار کر کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ بل کی ادائیگی کے بعد وہ سیدھا باہر نکل گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر عائشہ کے چہرے کے تاثرات جاننے تک کی کوشش نہیں کی تھی۔ عائشہ اسے اسٹور سے نکلنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہی اور پھر اسے سامنے کھڑے گاہک کے ”ایکسکیوز می“ کہنے پر اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ اسٹور سے نکل کر سامنے والے ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اسٹور سے ریسٹورنٹ تک کا بیس پچیس قدم کا مختصر سا راستہ اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ طے کیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ایک گھنٹے کے اس وقفے میں پروفیسر نے اپنا ارادہ بدل نہ دیا ہو اور جب وہ ریسٹورنٹ میں پہنچے تو پروفیسر غائب ہو۔ وہ خدشات میں گھری ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی اور وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر اسے چکر سا آ گیا کہ ان لوگوں میں پروفیسر موجود نہیں تھا۔ یعنی اس کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر غائب ہو چکا تھا۔

عائشہ اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی واپسی کے راستے کی طرف پلٹی اور گنگ رہ گئی۔ ریسٹورنٹ کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہونے والا شخص پروفیسر ہی تھا یا وہ کسی الوژن کا شکار ہوئی تھی وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”بے وقوف لڑکی!“ پروفیسر اس کے قریب آ کر

دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر اس کے بائیں ہاتھ کو اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے کر آگے کی طرف بڑھا۔ عائشہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل پڑی۔ ایک ریزروڈ ٹیبل کے قریب پہنچ کر پروفیسر رک گیا اور اسے کرسی پیش کی۔ عائشہ سحر زدہ سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ وہ شخص تھا جو کبھی اسے بے عزت کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا لیکن اس وقت اس کے انداز میں عائشہ کے لیے بے حد احترام تھا۔

''حیران ہو رہی ہو میری اس تبدیلی پر؟'' پروفیسر نے عائشہ کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے پوچھا اور پھر اس کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگا۔

''جب انسان سچ کو تسلیم نہیں کرتا تو الجھا رہتا ہے۔ اس کے اندر کی الجھن اس کے رویوں کو بدصورت بنا دیتی ہے۔ میں بھی اپنے اندر کے ایک سچ کو ماننے سے انکاری تھا اس لیے تمہارے ساتھ وہ سلوک کرتا رہا جس کی تم حقدار نہیں تھیں لیکن سچ کہوں ابھی ابھی جو تمہارا رویہ تھا اس نے مجھے اتنی بری طرح ہرٹ کیا ہے کہ مجھے لگتا ہے میرے ہر سابقہ رویے کا حساب برابر ہو گیا ہوگا۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' عائشہ نے الجھ کر پوچھا۔

''تم بے اعتبار ہو گئی تھیں۔ تمہیں میں نظر نہیں آیا تو تم نے سوچا کہ میں یونہی تم سے ملے بنا ہی چلا گیا ہوں۔ حالانکہ میں تو بس کچھ ضروری چیزوں کی شاپنگ کرنے کے لیے گیا تھا۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ میں ایک گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جاؤں۔ میں پہنچ بھی گیا تھا بس سامان کو گاڑی میں رکھنے میں چند منٹ کی دیر ہو گئی اور تم ان چند منٹوں میں ہی بدگمان ہو گئیں۔ یہ تو تمہارے اور میرے تعلق کا اصول نہیں۔ اس تعلق میں تو پہلی شرط ہی اعتبار ہے۔'' وہ بہت یقین سے ہر بات کہہ رہا تھا۔ عائشہ نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے لیکن پروفیسر نے اسے موقع نہیں دیا۔

''کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر عائشہ کی پلکوں پر اٹکا ایک آنسو اپنی انگلی کی پور پر چنتے ہوئے اس کے سامنے کیا۔

''اگر اعتبار ہوتا تو تمہاری آنکھوں میں ان کی گنجائش نہیں نکلتی۔''

''آپ نے کبھی مجھے ایسا کوئی یقین دلایا ہی نہیں کہ میرا دل وسوسوں سے آزاد ہو پاتا۔'' عائشہ کے ہونٹوں پر شکوہ مچلا۔

''شاید تم ٹھیک کہتی، ہو ایک شخص جو اپنی ہی ذات کے بارے میں ابہام کا شکار ہو، دوسرے شخص کو کسی بات کا یقین کیسے دلا سکتا ہے؟'' وہ یک دم ہی پژمردہ اور اداس نظر آنے لگا تھا۔

''جب خود سے اپنی ذات کے معمے حل نہ ہو رہے ہوں تو کسی دوسرے کو یہ موقع دینا چاہیے۔ شاید کہ دوسرا شخص کوئی حل پیش کر سکے۔'' عائشہ نے مشورہ دیا۔

''حل تو میں نے سوچ لیا ہے اور اسی لیے یونیورسٹی کو بھی فی الحال خیرباد کہہ چکا ہوں لیکن ابھی اسٹور پر تمہیں دیکھ کر یہ خیال ضرور آیا کہ تمہیں وہ سب کچھ ضرور بتا دوں جسے جان کر تم کشمکش سے نکل آؤ اور اپنے مستقبل کے لیے کوئی بہتر راہ متعین کر سکو۔ میری حقیقت جاننے کے بعد شاید تمہاری زندگی میں میری کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی کیونکہ تم ایک مسلمان لڑکی ہو اور میں......'' پروفیسر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''اور آپ؟'' عائشہ نے بے چین ہو کر اس ادھوری بات تو جاننا چاہا۔

''میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ ہندو، نہ مسلم، نہ کرسچن اور نہ ہی کچھ اور۔ میں پچھلے بیس سال سے ایک ایسی زندگی گزار رہا ہوں جو بے شناخت ہے۔ اس سے پہلے کے تقریباً چودہ برس میں نے اس شناخت کے ساتھ گزارے تھے جو مجھے اپنی ضرورت کے تحت اپنانے والوں نے مجھ سے میری اصل شناخت چھپا کر مجھے دی تھی۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سر؟ میں سمجھ نہیں پا رہی۔'' پروفیسر کی بات پر الجھ کر عائشہ نے پوچھا۔

''میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ میرے جنم دینے والے اور پالنے والے ماں باپ دونوں ہی کا تعلق بنگلا دیش سے تھا۔ میں جس وقت کا ذکر کر رہا ہوں اس وقت بنگلا دیش، پاکستان سے الگ ہو کر علیحدہ ملک نہیں بنا تھا۔ میری پیدائش کے وقت وہاں کے حالات بہت خراب تھے۔ فسادات کا ایک سلسلہ تھا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مجھے جنم دینے والے بھی ان فسادات کی لپیٹ میں آ گئے اور میری ماں میری زندگی بچانے کے لیے بھاگتی بھاگتی ایک ایسے گھر کی دہلیز پر آ کر ہمت ہار گئی جو ہندو دھرم کے ماننے والوں کا ٹھکانا تھا۔ اتفاق سے اس گھر میں رہنے والے راج پرشاد اور کملا دیوی بے اولاد تھے۔ انہیں ان دنوں ایک ایسے نومولود بچے کی ضرورت تھی جسے وہ اپنا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس لیے انہوں نے یہ جان لینے کے باوجود کہ میں مسلمان ہوں مجھے اپنا لیا لیکن

پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنے لوگوں میں رہ کر ان سے میری اصلیت نہیں چھپا سکیں گے سو وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر یہاں چلے آئے۔ یہاں انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ میں اپنی حقیقت نہ جان سکوں لیکن ایسا کب تک ممکن تھا۔ بالآخر مجھے سچ کا پتا چل ہی گیا اور بس پھر اس دن کے بعد سے میں بے سمت ہو گیا۔ نہ میرا کوئی نام رہا نہ مذہب۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ زندگی یونہی گزار دوں گا۔ لیکن پھر تم چلی آئیں۔ تم نے میری زندگی میں ہلچل مچا دی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمہیں نظر انداز کر سکوں لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا خصوصاً اس روز جب تم میرے گھر پر تھیں تو مجھے تمہارے لیے اپنے جذبے کی شدت کا اندازہ ہوا، پھر تم نے میری نصیحت کے جواب میں اپنی شناخت چھپانے سے انکار کرتے ہوئے جس طرح اپنے مسلم ہونے پر فخر کا اظہار کیا اس نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ میں نے جانا کہ اپنی شناخت سے واقف انسان خود کو کتنا معتبر محسوس کرتا ہے۔ بس پھر میں نے طے کر لیا کہ میں بھی اپنے لیے ایک شناخت تلاش کروں گا۔ یہ کام میں کتنے عرصے میں اور کب تک کر سکوں گا مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایسا جلد از جلد ممکن ہو سکے۔ اسی لیے میں نے اپنا پورا وقت اس کام کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' پروفیسر آر۔ پی نے مختصراً عائشہ کو تمام واقعات کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس دوران ویٹر ان کی ٹیبل پر آرڈر کے مطابق چائے اور دیگر لوازمات سرو کر کے جا چکا تھا۔

''چائے لیں۔'' پروفیسر نے عائشہ کو اشارہ کیا۔ عائشہ کے چائے بنانے تک ان کے درمیان خاموشی طاری رہی۔

''اگر آپ کہیں تو میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کروں۔'' چائے کا ایک سپ لینے کے بعد عائشہ نے پروفیسر کو آفر کی۔

''نہیں۔'' پروفیسر کے انکار میں بہت قطعیت تھی۔

''میں ہر قسم کے جذباتی دباؤ اور جانبداری سے بچ کر اپنے لیے راہ کا تعین کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم سے مدد لوں گا تو مجھے پالنے والے ماں باپ کی طرح تم بھی قدرتی طور پر یہی چاہو گی کہ میں تمہارے مذہب پر چلوں اور اب میں اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے پر کسی اور کا اثر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔'' ساتھ ہی پروفیسر نے اپنے انکار کی توجیہہ بھی بیان کر دی۔

''آپ نے اپنے پالنے والے ماں باپ کے بارے میں نہیں بتایا۔ اب وہ دونوں کہاں ہیں؟'' عائشہ نے راج پرشاد اور کملا دیوی کے بارے میں پوچھا۔

''غرض کے رشتوں میں چاہے محبت کا ٹانکا بھی لگا دو تو بھی ان رشتوں کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ جب میں اس لائق نہیں رہا کہ ان کی محبت کے جواب میں انہیں محبت دے سکوں تو ان دونوں نے اپنی اپنی زندگی کے لیے راہیں متعین کر لیں۔ ڈیڈی نے دوسری شادی کر کے الگ گھر بسا لیا اور مام کو برسوں بعد اپنی بوڑھی ماں اور وطن کی یاد ستانے لگی سو وہ واپس لوٹ گئیں۔ چودہ سال کی عمر میں میرا ان سے ذہنی و روحانی رشتہ ٹوٹا تھا۔ تب سے اب تک میں کسی بھی رشتے کے بغیر زندگی گزار رہا ہوں۔'' پروفیسر کے جواب نے عائشہ کو بے حد اداس کر دیا۔ اس نے خود بھی کم عمری میں اپنی ماں کو کھویا تھا لیکن اس کے پاس بابا کی محبت اور باقی بہت کچھ تو موجود تھا۔ پروفیسر کی خالی زندگی کتنی اذیتناک ہو گی، وہ تصور کر سکتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے کہ......'' اس نے پروفیسر کی تسلی کے لیے کچھ کہنا چاہا لیکن پروفیسر نے عائشہ کو روک دیا۔

''ان ساری باتوں کو جانے دو۔ میرا اس وقت تم سے ملنے اور یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ تم خود کو اس تعلق سے آزاد کر لو جو نجانے کیسے خود بخود ہی ہمارے درمیان قائم ہو گیا ہے۔ میں جس منزل کی تلاش میں جا رہا ہوں وہ جانے مجھے کس صورت میں ملے۔ میری تلاش کا سفر کسی ایسی منزل پر بھی تو ختم ہو سکتا ہے جو تمہارے لیے قابل قبول نہ ہو اور کون جانے کہ مجھے منزل ملتی بھی ہے یا نہیں یا پھر ملے بھی تو اتنی دیر میں کہ عمر کا سنہری دور گزر چکا ہو۔ یوں بھی اس وقت میری عمر 34 سال ہو چکی ہے۔ میں تم سے عمر میں کئی سال بڑا ہوں اور نہیں چاہتا کہ تم وقت سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کرنے کے بجائے ایک مبہم سی امید کے سہارے اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال میرے انتظار میں گزارو۔'' پروفیسر نے عائشہ پر صورتِ حال واضح کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''میں اپنی زندگی کسی مبہم امید کے سہارے نہیں بلکہ اس کامل یقین کے ساتھ آپ کے انتظار میں گزارنے کا عہد کرتی ہوں کہ چاہے وقت کا کتنا ہی بڑا حصہ کیوں نہ گزر جائے۔ مجھے اگر کوئی خوشی ملنی ہوئی تو آپ کے وجود سے ہی ملے گی۔ کب؟ اور کہاں؟ یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ مگر اتنا یقین ضرور ہے کہ ایسا ہو گا ضرور۔ آپ تلاش حق میں جا رہے ہیں تو وہ جو ہادی برحق ہے آپ کی صحیح راہ کی طرف رہنمائی ضرور

کرے گا۔'' عائشہ کی آنکھوں میں عزم اور امید تھی۔

''تمہارا یقین اپنی جگہ لیکن یہ جان لو کہ آج کے بعد میں تم سے کوئی رابطہ نہیں کروں گا۔ اپنی منزل کا تعین کرنے سے پہلے تو ہرگز بھی نہیں۔'' پروفیسر نے قطعی انداز میں عائشہ کو بتایا۔

''اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی منزل پالیں گے۔ اسی یقین کی بنا پر میں آپ کو اپنے نیویارک اور پاکستان دونوں جگہ کے ایڈریسز دے کر جارہی ہوں۔ اگر تین سال کے اندر آپ نے اپنی منزل ڈھونڈلی تو یہاں مجھ سے رابطہ کیجیے گا ورنہ تین سال بعد پاکستان میں، میں آپ کو اپنی منتظر ملوں گی۔'' عائشہ کا لہجہ پروفیسر سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس پر ایڈریس لکھ کر، نوٹ بک میں سے صفحہ پھاڑ کر پروفیسر کے سامنے رکھ دیا۔ اس کام کو کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سیدھی ریسٹورنٹ کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر یہ منظر تک نہیں دیکھا تھا کہ پروفیسر نے کیسے اس کے دیے ہوئے کاغذ کے چند انچ کے ٹکڑے کو متاع عزیز کی طرح سنبھال کر اپنی شرٹ پر بائیں جانب عین دل کے مقام پر موجود جیب میں رکھ لیا تھا۔

⊛⊛⊛

پروفیسر آر۔ پی نے بیزاری کے عالم میں اپنے ہاتھ میں موجود کتاب کو بند کیا اور بے دلی سے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ کئی ماہ گزر گئے تھے اسے مذاہب عالم کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ اس نے بڑے بڑے اسکالرز کی مذاہب کے تقابلی جائزے پر لکھی ہوئی کتابیں کھنگال ڈالی تھیں لیکن وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پارہا تھا۔ اسے ہر جگہ کچھ نہ کچھ جانبداری کا عنصر دکھائی ضرور دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس سے بہتر تو وہ زندگی تھی جو وہ نیویارک میں ایک باعزت پروفیسر کے طور پر گزار رہا تھا۔ نیویارک سے ٹیکساس شفٹ ہونے کا فیصلہ اس نے خود کو یکسو رکھنے کے لیے کیا تھا تاکہ راہ میں آنے والے شناسا چہرے توجہ بانٹنے کا سبب نہ بنیں لیکن اب وہ تھکنے لگا تھا۔ وہ جو سوچ کر نکلا تھا کہ تلاش کے اس سفر میں برسوں بھی لگ سکتے ہیں چند ماہ میں ہی بیزار ہوگیا تھا۔ اسے یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ اپنی جمع پونجی ختم ہونے کے بعد وہ معاشی مسائل سے کس طرح نبرد آزما ہوگا۔ اس کی قلبی کیفیت بہت رنجیدہ ہورہی تھی۔ رنجیدگی کے اس عالم میں ہی اس پر ایک مختلف کیفیت طاری ہونے لگی اور وہ بند آنکھوں کے ساتھ اپنے دل سے پکارا۔

''اے کائنات کو بنانے والے! اگر تیرا کوئی وجود ہے تو مجھے اس راہ کی طرف موڑ دے جو تیری طرف آتی ہے۔ میں بہت بھٹک چکا، تو میرے لیے درست سمت کا تعین کردے۔'' اس مختصر سی دعا میں اس کے اندر کی پوری بے چینی اور تڑپ سمٹ آئی تھی۔ وہ تکیے میں منہ چھپا کر کسی چھوٹے بچے کی طرح ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ بالآخر دبی دبی سسکیاں بھی دم توڑ گئیں اور اسے خود پر سکون سا طاری ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وجود کی اس ہلکی پھلکی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے وہ کب نیند کی پرسکون وادی میں جا اترا اسے خود بھی خبر نہ ہوسکی۔

⊛⊛⊛

عائشہ کی آنکھ اچانک ہی کھلی تھی۔ وہ بہت گہری نیند سویا کرتی تھی اور صبح الارم کی آواز پر ہی جاگتی تھی لیکن اس وقت الارم نہیں بجا تھا، اس کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی تھی جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ عائشہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹائم پیس اٹھایا تاکہ وقت کا اندازہ ہوسکے۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے آخری پہر کا اعلان کر رہی تھیں۔ عائشہ نے حساب لگایا اسے سوئے ہوئے ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں گزرا تھا لیکن آنکھوں سے نیند ایسے غائب تھی جیسے وہ کئی گھنٹے کی پرسکون نیند لینے کے بعد جاگی ہو۔ سونے کے دوران بنا کسی وجہ کے آنکھ کھل جانے پر لوگ عموماً کوشش کرتے ہیں کہ کروٹ بدل کر دوبارہ سو جائیں، عائشہ نے بھی ایسی ہی کوشش کی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بالآخر اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ بستر سے اتر آئی اور اپنے کمرے سے باہر نکل کر تانیہ کے کمرے میں جھانکا۔

تانیہ کا بستر بے شکن تھا اور وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اب اس کا راتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا۔ عائشہ نے ایک آدھ بار اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن تانیہ کے رویے نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کچھ بھی سمجھنے سمجھانے کی حدود سے بہت دور جاچکی ہے۔

تانیہ کے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ کچن میں آئی اور ایک گلاس پانی پینے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں آکر دوبارہ بستر پر لیٹنے کے بجائے وہ وہاں موجود واحد کرسی پر ٹک گئی۔ کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر ایک کونے میں رکھے مصلے پر پڑی۔ مصلیٰ دیکھ کر اس کے دل میں خود بخود ہی نماز پڑھنے کی خواہش جاگی۔ وہ فوری طور پر اٹھ کر باتھ روم کی طرف گئی اور وضو کر کے واپس اپنے کمرے میں آکر مصلیٰ بچھالیا۔ پانچ وقت کی نماز وہ بچپن سے ہی پابندی سے پڑھتی آرہی تھی۔ رمضان کے مہینے میں اکثر سحری سے پہلے تہجد بھی پڑھ لیا کرتی تھی لیکن نماز پڑھنے کی ایسی خواہش اور طلب اس کے دل میں کبھی نہ جاگی تھی جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ اس نے دل کی پوری لگن کے ساتھ تہجد کے نوافل ادا کیے۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو آنسو خود بخود ہی گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔ آنسوؤں کی اس دھند میں نظر آنے والا پہلا چہرہ پروفیسر آر۔ پی کا تھا۔ عائشہ کو یکدم ہی احساس ہوا کہ رات کے اس پہر آنکھ کھلنے اور دل میں نماز پڑھنے کی خواہش جاگنے کے پیچھے کیا سبب کارفرما تھا۔ ایک شخص جو تلاش حق میں نکلا تھا اسے کسی چاہنے والے کی دعائیں زادِ راہ کے طور پر درکار تھیں۔ وہ بے حد رقت سے پروفیسر کے لیے دعا کرنے لگی۔ ایسی دعا، جو طالب کے لیے رحمت الٰہی کی برسات کردے۔

⊛⊛⊛

دوسری صبح پروفیسر کی آنکھ کھلی تو اس کا وجود بے حد ہلکا پھلکا تھا۔ بے کیفی اور بیزاری کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ اس نے ناشتا تیار کر کے بہت رغبت سے کیا۔ وہ اپنی کیفیت پر غور کرتا رہا۔ اسے یاد تھا کہ رات وہ روتے روتے سو گیا تھا اور صبح جب اٹھا تو بالکل فریش تھا لیکن اس سونے اور جاگنے کے درمیان بھی کچھ ہوا تھا۔ کچھ ایسا جو اسے یاد نہ آنے کے باوجود ذہن میں اٹکا ہوا تھا۔ پھر ترتیب وار رکھی کتابوں میں سے یونہی ایک کتاب نکال کر اسے درمیان سے کھول کر دیکھا۔ کتاب کے کھلے ہوئے صفحے کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک زوردار جھماکا ہوا اور اسے وہ بات یاد آگئی جو وہ باوجود کوشش کے بھی یاد نہیں کر پارہا تھا۔ مذاہب کے تقابلی جائزے پر لکھی گئی اس کتاب کا... جو صفحہ کھلا تھا اس پر خانہ کعبہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس رنگین تصویر میں سیاہ رنگ کا غلافِ کعبہ اور اس پر سنہری تاروں سے لکھی قرآنی آیات بہت واضح تھیں۔ یہ وہ منظر تھا جو پروفیسر نے پرسکون نیند کے دوران دیکھے جانے والے خواب میں بھی دیکھا تھا۔ وہ بات جو وہ جاگنے کے بعد سے مسلسل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا دراصل یہی خواب تھا جو اب اسے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد آچکا تھا۔ خواب میں اس نے خود کو دو سفید چادروں میں خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ابتدا میں وہ کعبے کی عمارت سے بہت دور تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں اس عمارت کے گرد گھوم رہا ہے، گھومنے کے دوران اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح اس عمارت کے نزدیک پہنچ جائے لیکن لوگوں کا ہجوم اسے اس کے قریب نہیں جانے دے رہا تھا۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا اتنا ہی پیچھے ہٹتا جاتا تھا۔ یکدم ہی اس کی نظر درِ کعبہ کی طرف اٹھی۔ عائشہ وہاں کھڑی اسے پکار رہی تھی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ یوں پروفیسر کی سمت اٹھایا ہوا تھا جیسے اس کے ہاتھ کو تھام لینا چاہتی ہو۔ پروفیسر نے بے ساختہ ہی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی طرف بڑھایا اور پھر جیسے ہجوم درمیان سے ہٹتا ہی چلا گیا۔ اب وہ درِ کعبہ کے بالکل سامنے عائشہ کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ عائشہ نے اپنے ہاتھ میں موجود کنجی سے دروازے پر پڑا قفل کھولا اور پروفیسر کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر کھلے ہوئے دروازے سے کعبے کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ داخل ہونے کے بعد اس نے پلٹ کر عائشہ کی طرف دیکھا۔ عائشہ اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر نے چاہا کہ اسے پکارے لیکن اسی وقت دروازہ بند ہوگیا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے پروفیسر نے عائشہ کی شکل دیکھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ اور ماتھے پر نور کی چمک تھی۔ وہ اپنے اس طرح پیچھے رہ جانے پر دکھی یا آزردہ ہونے کے بجائے بہت مطمئن اور پرسکون نظر آرہی تھی۔ عائشہ کا پرسکون چہرہ نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد پروفیسر کا خواب ٹوٹ گیا تھا۔ خواب کے اس حصے کے بعد اسے کوئی اور بات یاد نہیں آئی تھی۔ کچھ یاد آنے اور نہ آنے کی کیفیت کے باعث وہ جس الجھن کا شکار تھا وہ مکمل طور پر ختم ہوچکی تھی۔ پروفیسر نے اپنے ہاتھ میں موجود کتاب کو واپس اس کی جگہ پر رکھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اس وقت وہ معمول کے مطابق کسی لائبریری یا بک سینٹر کی طرف جانے کے بجائے اس پارک کی طرف جارہا تھا جس کے قریب ہی اس نے ایک چھوٹی سی مسجد دیکھی تھی۔ وہ کبھی کبھار شام کے اوقات میں پارک میں آکر بیٹھتا تھا تو اسے مسجد میں آنے جانے والے نمازی دکھائی دے جاتے تھے۔ وہ مسجد کے پھاٹک میں موجود مختصر سے ذیلی دروازے سے گزر کر اندر چلا گیا۔ ایک آدمی ویکیوم کلینر کی مدد سے اس کی صفائی کر رہا تھا۔ پروفیسر کو آتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنا کام روک دیا اور اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''السلام علیکم۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' پروفیسر جب اس کے قریب پہنچ کر بھی کچھ نہ بولا تو

اس نے خود ہی سلام کرتے ہوئے اس سے اس کی آمد کا مقصد پوچھا۔ اس دوران پروفیسر یہ بات نوٹ کر چکا تھا کہ اس کے سامنے کھڑے شخص کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پروفیسر کو اس نوجوان کے چہرے پر معصومیت کے علاوہ بھی کچھ دکھائی دیا۔ کوئی ایسی چیز جس نے اس کے چہرے کو بہت چمکدار اور نورانی بنا دیا تھا۔

''آپ شاید یہاں کسی سے ملنے آئے ہیں۔'' پروفیسر کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر نوجوان نے خود ہی اس کی آمد کے مقصد کے بارے میں اندازہ لگایا۔

''ہاں، میں کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو مجھے میرے سوالوں کے جواب دے سکے۔'' بالآخر پروفیسر نے اپنی وہاں آمد کا مقصد بیان کر ہی دیا۔

''میں آپ کو یاسر بھائی سے ملوا دیتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔'' نوجوان ویکیوم کلینر وہیں چھوڑ کر پروفیسر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسجد کے احاطے میں موجود سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''یاسر بھائی! یہ صاحب ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں۔'' نوجوان نے ایک شخص کو پروفیسر کی طرف متوجہ کیا۔

''تشریف لائیے۔'' یاسر نامی شخص نے خوش اخلاقی سے پروفیسر کو مخاطب کیا۔ اس شخص کے نزدیک بیٹھنے سے پہلے پروفیسر بک شیلفس میں موجود کتابوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال چکا تھا۔ وہ تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور سائنسی علوم سے متعلق کتابیں تھیں۔ پروفیسر کو حیرت سی ہوئی۔ اس کی معلومات کے مطابق مذہبی حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اسی موضوع پر کتب پڑھنا پسند کرتے ہیں لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔

''مجھے یاسر محمود کہتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں۔ روزانہ صبح فجر کے بعد سے ظہر تک کا وقت یہاں گزارتا ہوں اور پھر حصول معاش کے لیے نکل پڑتا ہوں۔'' یاسر نے بہت بے تکلفی سے پروفیسر سے اپنا تعارف کروایا اور پھر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''مجھے پروفیسر آر۔ پی کہتے ہیں۔'' جواباً پروفیسر نے صرف اتنا ہی تعارف کروایا۔

''آر۔ پی یعنی......؟''

''اس یعنی سے آگے کے جواب ہی کی تلاش میں تو سرگرداں ہوں۔'' پروفیسر نے یاسر کے سوال کے جواب میں کہا۔

''اللہ نے چاہا تو آپ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ اگر آپ کو اس سلسلے میں میری کوئی مدد درکار ہے تو میں حاضر ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔'' یاسر کے انداز میں خلوص تھا۔ شاید خلوص کی یہ دولت ہی تھی جس کی وجہ سے اپنی اور یاسر کی عمروں میں چند برس کا ہی فرق ہونے کے باوجود پروفیسر نے اپنے دل میں اس کے لیے احترام محسوس کیا۔ وہ بنا کسی جھجک کے یاسر محمود کو اپنی زندگی کے واقعات سناتا گیا۔ عائشہ سجاد کے بعد یاسر محمود وہ دوسرا شخص تھا جس پر پروفیسر اپنی شخصیت کا راز افشاں کر رہا تھا۔ یاسر محمود بنا کوئی سوال کیے خاموشی اور توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا۔ پروفیسر نے محسوس کیا کہ جب وہ واقعات سناتے ہوئے کل رات دیکھے گئے خواب کی تفصیلات سنانے لگا تو یاسر کی دلچسپی پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی۔

''سبحان اللہ! آپ کا خواب تو بہت مبارک معلوم ہوتا ہے۔ میری نظریں آپ کو کسی بہت بلند مقام پر فائز ہوتا دیکھ رہی ہیں۔'' یاسر محمود نے خواب سن کر بے ساختہ ہی یہ جملہ کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس خواب کا کیا مطلب ہے، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ رات میں نے کائنات کے مالک کو پکارا تھا اور پھر میں نے یہ خواب دیکھا تو مجھے لگا اس مالک نے میری رہنمائی کی ہے۔ اسی لیے میں سیدھا اس طرف آ گیا لیکن میرے ذہن میں موجود کنفیوژنز اپنی جگہ قائم ہیں۔ میں صرف ایک خواب کی بنیاد پر اپنے لیے مذہب کا انتخاب نہیں کر سکتا۔'' پروفیسر نے اپنی الجھن بیان کی۔

''میں آپ کو اس بات کا مشورہ دے بھی نہیں سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں یہ ایک بہت حساس معاملہ ہے خصوصاً آپ جیسے پڑھے لکھے اور باشعور فرد کے لیے۔''

''اچھا مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے کبھی کسی الہامی کتاب کا بھی مطالعہ کیا ہے؟'' درمیان میں ہی روک کر یاسر محمود نے پروفیسر سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہر مذہب کی کتاب اپنے ہی مذہب کا پرچار کرے گی اور میں خوامخواہ الجھ کر رہ جاؤں گا۔''

''ایک بار میرے کہنے پر عمل کر کے دیکھیں۔ مذہب کا اس کے ماننے والوں کی نظر سے نہیں، اس کے خالق کے کلام کی روشنی میں مطالعہ کریں۔ پڑھے لکھے شخص ہیں بہت جلد حق و باطل کو الگ الگ پہچان لیں گے۔ میں اس سے بڑھ کر مشورہ اس لیے نہیں دوں گا کہ پھر آپ کو مجھ پر بھی جانبدار ہونے کا شک گزرے گا۔ آگے آپ کی قسمت اور اللہ کی مرضی

پر منحصر ہے۔ آپ کے اور میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔'' پروفیسر کی امید کے برخلاف یاسر محمود نے اسے اسلام کی طرف راغب کرنے یا اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے لمبے چوڑے دلائل نہیں دیے تھے۔

''آپ کے وقت کا شکریہ یاسر صاحب! ہو سکتا ہے پھر کبھی دوبارہ بھی آپ سے ملاقات کی صورت بنے۔'' پروفیسر نے کھڑے ہوتے ہوئے یاسر محمود سے کہا۔

''میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دوبارہ ضرور ملیں گے۔'' یاسر محمود خود بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے بڑھا، اس کا ہاتھ تھام کر بہت یقین سے کہا۔ اس کے اس یقین پر پروفیسر مسکرایا اور پھر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے پہنچا تو روشن چہرے والا وہی لڑکا جو اسے یاسر محمود کے کمرے تک چھوڑ کر گیا تھا، گملوں میں موجود پودوں کی چھٹائی کرتا ہوا دکھائی دیا۔ پروفیسر کو اپنے نزدیک پا کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ مسکرانے سے اس کے بائیں رخسار پر ایک گہرا گڑھا پڑ گیا جس نے اس کے روشن چہرے کی دلکشی کو کچھ اور بھی بڑھا دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' پروفیسر نے اس سے دریافت کیا۔

''رحمت پرویز۔'' نوجوان نے جواب دیا تو پروفیسر مزید کوئی سوال کیے بنا بیرونی راستے کی طرف بڑھ گیا۔

©©©

یاسر محمود نے اسے کسی الہامی کتاب کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور پروفیسر کے سامنے پہلا مرحلہ اس کتاب کا انتخاب تھا۔ قرآن، انجیل، گیتا۔ یکدم ہی اسے یاسر محمود کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا، مذہب کا اس کے ماننے والوں کی نظر سے نہیں، اس کے خالق کے اقوال کی روشنی میں مطالعہ کریں، یہاں ہر الہامی کتاب پر رائٹر کا نام تھا۔ کتابوں کے اس ڈھیر میں واحد قرآن مجید ایک ایسی کتاب تھی جس پر کسی رائٹر کا نام نہیں تھا۔ قرآن کے مطالعے کے دوران وہ نوٹس بھی لیتا جا رہا تھا۔ اخلاقیات، معاشیات، قوانینِ انصاف، سائنسی اصول، موضوعات کا ایک ڈھیر تھا جو اس کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ سائنس کے ثابت شدہ قوانین سے لے کر، اخلاقی اصولوں تک وہ جو کچھ قرآن سے میچ کرتا گیا اسے برحق نظر آیا۔ چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والی یہ کتاب بے شمار سائنسی حقائق کو بیان کرتی تھی۔ یاسر محمود نے ٹھیک کہا تھا، پروفیسر کو اللہ اور بندے کے بنائے گئے اصول و قوانین میں خود بخود ہی فرق نظر آنے لگا تھا۔ پروفیسر کی رگوں میں موجود مسلمان ماں باپ کا خون جوش کھانے لگا۔ اس کے دل میں ایمان کی لہریں اٹھنے لگیں۔ قرآن کے صرف چار ماہ کے مطالعے میں اس نے جان لیا کہ اب اسے کسی دوسری کتاب کے مطالعے کی ضرورت نہیں۔ اس کے قدم پھر اسی مسجد کی جانب اٹھ گئے جہاں اس کی ملاقات یاسر محمود سے ہوئی تھی۔ چار ماہ پہلے کی طرح اس بار بھی اسے مسجد کا ذیلی دروازہ کھلا ملا اور وہ بنا کسی جھجک کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے دل نے بے ساختہ چار ماہ قبل کی طرح رحمت پرویز کو دیکھنے کی خواہش کی لیکن اندر کا منظر اس کی خواہش کے برخلاف تھا۔ نماز کا وقت نہ ہونے کے باوجود مسجد میں کئی لوگ نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر اتنے لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس پلٹ جاتا۔ یاسر محمود نے اسے دیکھ لیا اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''خوش آمدید پروفیسر! بڑے خاص وقت پر تشریف لائے۔'' یاسر محمود نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ پروفیسر نے نوٹ کیا کہ یہ جملہ کہتے ہوئے یاسر محمود کے لبوں پر مسکراہٹ ہے لیکن آنکھیں ضبط کی کوشش میں سرخ ہوئی جا رہی ہیں۔ یاسر محمود جیسی کیفیت اسے وہاں موجود دوسرے چہروں پر بھی نظر آئی بلکہ کچھ افراد تو ایسے بھی تھے جن کی آنکھوں میں اشک چمک رہے تھے۔ پروفیسر کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

''سب خیریت تو ہے یاسر صاحب؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

قیمت

''بہن! تمہارا یہ ہار بہت خوبصورت ہے کتنے میں بنوایا؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ صرف دو گھنٹے تک روتی رہی اور ایک وقت کھانا نہیں کھایا۔''

٭٭٭٭

فن

مشہور اطالوی ڈراما نویس ریمیگو سے پوچھا گیا کہ تھیٹر ایک فن ہے یا صنعت؟ تو انہوں نے جواب دیا ''اگر کامیاب ہو جائے تو صنعت ہے، نہیں تو فن ہے۔''

''الحمدللہ۔ آج صبح اطلاع آئی ہے کہ ہمارا ساتھی رحمت پرویز کشمیر کے محاذ پر لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرگیا۔'' یاسر محمود نے بتایا تو پروفیسر کی نظروں کے آگے نورانی چہرے والے رحمت پرویز کی تصویر گھوم گئی۔ وہ اب اس دنیا میں ہی نہیں رہا تھا یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔

''لیکن وہ تو یہاں تھا۔ وہ کشمیر کیسے جا پہنچا؟'' پروفیسر نے حیرت کا اظہار کیا۔

''شوق شہادت کھینچ کر لے گیا تھا اسے۔ یہاں تھا تب بھی وہاں کے حالات سن کر کڑھتا رہتا تھا۔ بس جیسے ہی موقع ملا وہاں روانہ ہوگیا۔ وہ تو اس کی وصیت کے مطابق اس کی شہادت کی خبر یہاں بھیجی گئی تو ہمیں علم ہوا۔'' یاسر محمود کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک در آئی۔

''اسے تو اونچا مرتبہ ملنا ہی تھا۔ اس کی پیشانی پر لکھا تھا کہ اس میں کچھ خاص ہے۔'' پروفیسر دھیرے سے بڑبڑایا ،اس کی یہ بڑبڑاہٹ یاسر محمود نے بھی سنی۔

''ٹھیک فرما رہے ہیں۔ آپ فرمائیں آپ کی تلاش حق کا سفر کہاں تک پہنچا؟ پروفیسر!''

یاسر محمود نے اس سے دریافت کیا۔

''آج میں اپنے قبول اسلام کا اعلان کرنے کے ارادے سے ہی اس طرف آیا تھا۔'' پروفیسر نے دھیمی آواز میں بتایا۔ یہ بات سن کر یاسر محمود کا چہرہ کھل اٹھا۔

''دوستو! رحمت پرویز کی شہادت کے علاوہ بھی آج کا دن آپ کے لیے ایک بڑی خوشخبری لے کر آیا ہے۔ میرے یہ عزیز دوست اسلام قبول کرکے ہم میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔''

اس اعلان کو سن کر ہر ایک چہرہ ہی کھل اٹھا۔ بالآخر پروفیسر نے یاسر محمود کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہونے کی سعاوت حاصل کی۔ اسلام قبول کرتے ہی اس کے لیے اسلامی نام تجویز کرنے کا مسئلہ اٹھا۔

''رحمت پرویز۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ کو یہ نام دے دیا جائے؟'' یاسر محمود نے پروفیسر سے پوچھا۔

''آر۔پی سے رحمت پرویز یہ تو بہت اچھا ہے۔'' پروفیسر نے خوشی کا اظہار کیا۔ بیس برس پہلے روی پرشاد سے آر۔پی بن کر اپنی شناخت کھو دینے والا، آج آر۔پی سے رحمت پرویز بن کر اپنی اصل شناخت حاصل کرچکا تھا۔

***

''آج سے دس برس پہلے میں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر اس مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہونے کے باوجود کوئی مسجد نہیں تھی۔ اس مقصد کی کامیابی کے لیے ڈونیشن سے زیادہ اجازت کا مسئلہ تھا جو بڑی مشکلوں سے حل ہوا پھر یہاں کا ماحول بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی کو شکایت ہوسکے۔ ہم نے نہ تو مسجد کے منبر کو کسی خاص قوم کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے استعمال کیا نہ لاؤڈ اسپیکر سے اذانیں بلند کرکے اردگرد رہنے والوں کو شکایت کا موقع دیا۔ ہمارا مقصد تو بس ایک ایسی جگہ بنانا تھی جہاں ہم اپنی اجتماعی عبادات کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاقات رکھ سکیں۔ مسلمان والدین جو دنیا کے مختلف حصوں سے آکر یہاں بس گئے ہیں، یہاں کی تیز رفتار زندگی کا ساتھ دیتے ہوئے اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کا بندوبست نہیں کرپاتے اور انہیں طرح طرح کے سوالوں کا سامنا ہے۔ جب لوگ ان بچوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند اور قدامت پسند جیسے القابات سے پکارتے ہیں تو لازمی بات ہے وہ الجھن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ میں اور میرے دوست اس قسم کی الجھنوں میں گرفتار نوجوانوں کے کنفیوژنز دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم انہیں بتاتے ہیں کہ اسلام نہ تو غیر مہذب لوگوں کا مذہب ہے اور نہ ہی اس کا قدامت پرستی سے کوئی تعلق ہے۔'' پروفیسر کے قبول اسلام کے بعد یہ اس کی یاسر محمود کے ساتھ پہلی تفصیلی ملاقات تھی جس میں وہ پروفیسر کو اپنے عزائم اور مقاصد سے آگاہ کررہا تھا۔

پروفیسر نے یاسر محمود کو سراہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ اللہ نے آپ کے لیے اس دین کو منتخب کرلیا تھا ورنہ قرآن کو تو کتنوں ہی نے پڑھ رکھا ہے۔ اسے پڑھنے والے سب ہی لوگ اس پر ایمان نہیں لے آتے۔ یہ سعادت تو صرف ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے ساتھ اللہ کی رضا شامل ہوجائے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ آپ کو ملنے والی اس نعمت کے پیچھے کسی کی بہت دل سے مانگی گئی دعاؤں کا بھی ہاتھ ہے۔ شاید وہ لڑکی جس کا آپ نے اپنے خواب میں ذکر کیا تھا، وہ سبب بنی ہو آپ پر اتری اس نعمت کا۔'' یاسر محمود نے پروفیسر سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں یاسر صاحب! اس بات کا تو مجھے خود بھی یقین ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ عائشہ کی خصوصی دعائیں رہی ہیں۔ وہ اگر میری زندگی میں نہ آتی تو شاید میں کبھی اپنی تلاش کے لیے اتنی شدت سے سرگرداں نہ ہوتا۔'' پروفیسر نے اعتراف کیا۔

''آپ رحمت پرویز کو بہت چاہتے تھے ناں یاسر صاحب!'' پروفیسر نے یاسر محمود سے پوچھا۔

''وہ تھا ہی بہت پیارا۔ خصوصاً میرے لیے تو بالکل بچوں جیسا تھا۔ اس کا باپ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ وہ کشمیر سے آیا تھا اور یہاں ایک مسلمان لڑکی سے شادی کرکے خوش باش زندگی گزار رہا تھا۔ رحمت اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رحمت جب بارہ سال کا تھا تو ٹریفک کے ایک حادثے میں میرے دوست اور اس کی بیوی کی ڈیتھ ہوگئی۔ میں رحمت کو اپنے ساتھ لے آیا۔ میں تو بس اب یہی سوچ کر صبر کرتا ہوں کہ اللہ نے اسے شہادت کے بلند مرتبے پر فائز کرکے ہمیشہ کی زندگی عطا کردی جس درجے سے وہ گیا ہے وہ ہر ایک کا نصیب نہیں ہوتی۔''

یاسر محمود کے لب بہت محبت سے رحمت پرویز کا ذکر کررہے تھے اور آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک در آئی تھی۔

''چلیں چھوڑیے اس قصے کو۔ اگر رحمت کا ذکر کرتا رہا تو ہماری ملاقات اسی ذکر میں تمام ہوجائے گی۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ نے عائشہ بی بی کو اپنے قبول اسلام کے بارے میں خبر دی یا نہیں؟'' آنسوؤں کی نمی کو اپنے اندر اتارتے ہوئے یکدم ہی یاسر محمود نے موضوع گفتگو تبدیل کرتے ہوئے پروفیسر سے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خود اس کے سامنے جاکر اسے یہ خوش خبری سناؤں تاکہ اس کے چہرے پر چھانے والی خوشی کے رنگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔'' پروفیسر نے جواب دیا جسے سن کر یاسر محمود کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

***

عائشہ کی آنکھ کسی معمول کی طرح کھلی تھی۔ اس رات کے بعد سے یہ معمول سا بن گیا تھا کہ رات کے آخری پہر خود بخود ہی اس کی آنکھ کھل جاتی۔ پہلے دن کے بعد سے اس نے دوبارہ کبھی اس طرح آنکھ کھلنے پر کوئی پریشانی محسوس نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے یہ سوچنا پڑا تھا کہ اب کیا کرے؟ اب آنکھ کھلتے ہی وہ بستر چھوڑ دیتی تھی اور وضو کرکے نماز کے لیے کھڑی ہوجاتی تھی۔ اس کے اندر خود بخود ہی یہ احساس پیدا ہوگیا تھا کہ وقت کے ان بہترین لمحات کو اللہ نے اس لیے مخصوص کردیا ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے حضور پروفیسر کی رہنمائی، سلامتی اور بھلائی کے لیے دعائیں کرے۔ محبت اسے اللہ سے رابطے کا ہنر سکھا رہی تھی۔ وہ ہر روز اس یقین کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ بلند کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ضرور پروفیسر کو ایمان کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ آج بھی اس نے آنکھ کھلنے پر معمول کی طرح نماز ادا کرکے دعا کی پھر اسے ٹینا کا خیال آگیا۔ ٹینا کل رات گھر نہیں آئی تھی اور نہ ہی دن میں اس کا یونیورسٹی یا گھر پر ٹینا سے سامنا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ٹینا چاہے اپنی رات کہیں بھی بسر کرتی لیکن صبح یونیورسٹی ضرور پہنچتی تھی۔ وہ اس کی طرف سے تشویش کا شکار تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ وہ دو راتوں سے گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔

''اگر آج بھی وہ واپس نہیں آئی تو میں حمزہ سے کہوں گی کہ اس کے بارے میں معلوم کرلے۔ کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پھنس گئی ہو۔'' پریشانی سے سوچتے ہوئے وہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔

فجر کا وقت ہوچکا تھا اور اسے نماز ادا کرنی تھی۔ نماز کے بعد وہ اپنے روٹین کے کاموں میں مصروف ہوگئی اور مقررہ وقت پر یونیورسٹی کے لیے تیار ہوکر کمرے سے نکلی۔

یونیورسٹی پہنچ کر امید کے برخلاف اس کی ٹینا سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی اور اس کی تشویش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ یونیورسٹی سے وہ اپنی ڈیوٹی پر اسٹور پہنچی تو بھی اس کا ذہن ٹینا میں ہی الجھا رہا۔ ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے کے بعد وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوئی تو اسے پوری امید تھی کہ ٹینا سے ملاقات ہوجائے گی لیکن اس کی امید کے برخلاف وہاں ایک پولیس مین اس کا منتظر تھا۔

''ہمیں ایک ایشین لڑکی کی لاش ملی ہے۔ انوسٹی گیشن کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک نائٹ کلب میں جاب کرتی تھی۔ نائٹ کلب سے اس کا ایڈریس لے کر میں یہاں آیا ہوں۔ اس کی ساتھی اور ہم وطن ہونے کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں کہ تم لاش کو شناخت کرلو تاکہ ہم آگے کی کارروائی کرسکیں۔''

پولیس مین جو کچھ کہہ رہا تھا اسے سن کر عائشہ کو چکر آنے لگا۔ یہ تصور کرنا کہ ٹینا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بہت تکلیف دہ تھا، بہرحال اسے پولیس مین کے ساتھ جانا پڑا۔ مردہ خانے میں شناخت کے لیے رکھی وہ لاش یقیناً تانیہ مراد عرف ٹینا ہی کی تھی۔ لاش کی حالت دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے بدترین تشدد کا شکار ہوئی تھی۔ حمزہ عائشہ کی کال پر فوری طور پر وہاں پہنچ گیا تھا اور پھر اس کے بعد کے سارے مراحل سے وہ خود ہی نمٹتا رہا تھا۔ اس صورتحال میں عائشہ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ فی الحال تو اسے یہ بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے

''بابا!'' قریب آنے پر اس نے بے قراری سے پکارا۔

''بابا کی جان۔'' سجاد رہبر نے جواباً اپنی بانہیں وا کر دیں۔ وہ تیزی سے باپ کی کھلی بانہوں میں سما گئی۔ اس کی آنکھوں سے روانی سے بہنے والے اشک سجاد رہبر کا شانہ بھگونے لگے۔

''بس میری جان! ورنہ یہاں سیلاب آجائے گا اور تمہاری وجہ سے بیچارے دوسرے لوگ مشکل میں پڑ جائیں گے۔'' بیٹی کے آنسو سجاد رہبر کے اپنے دل کو پگھلا رہے تھے لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس کے اس حوصلے نے کام کر دکھایا اور عائشہ مسکراتی ہوئی باپ سے الگ ہوئی۔

''میں نے ہمیشہ آپ کو بہت مس کیا بابا!'' اب وہ سجاد رہبر کے ساتھ چلتے ہوئے بیرونی راستے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے سامان سے لدی ٹرالی سجاد رہبر نے سنبھال لی تھی اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔

''اگر آپ کے خطوں کا سہارا نہیں ہوتا تو میں پہلے ہی سیمسٹر میں گھبرا کر واپس آپ کے پاس لوٹ آتی۔ پتا نہیں لوگ کیسے ساری زندگی دوسرے ملکوں میں گزار دیتے ہیں۔'' وہ مسلسل بول رہی تھی اور سجاد رہبر خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا، یہ وہ باتیں ہیں جو اس کی بیٹی نے اتنے عرصے میں کبھی نہیں کہیں۔ نہ فون پر نہ خط میں۔ وہ اپنے باپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے ہمیشہ ضبط سے کام لیا۔

''میں تو حمزہ کو بھی بہت سمجھاتی تھی کہ اپنی صلاحیتیں اور طاقتیں ایک غیر ملک پر برباد کرنے کے بجائے اپنے ملک لوٹ جائے۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے کہ ماں باپ نہیں رہے تو کیا ہوا اور تو بہت لوگ ہوں گے جنہیں اس کی ضرورت ہوگی۔ ابھی مجھے ایرپورٹ پر سی آف کرنے آیا تھا تو کہہ رہا تھا۔'' عائشہ! تمہاری باتوں پر تمہارے جانے کے بعد غور کروں گا ہوسکتا ہے۔'' حمزہ کا نام سجاد رہبر کے لیے اجنبی نہیں تھا، عائشہ اپنے اکثر خطوط میں اپنے اس پڑوسی کا ذکر کرتی رہی تھی۔ اس ذکر کے پیچھے کوئی خاص وجہ تھی یا پھر وہ یوں ہی روانی میں حمزہ کا ذکر کر جاتی تھی، سجاد رہبر بھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ البتہ ہر بار اس کے ذہن میں عائشہ کے اس خط کی تحریر گھومنے لگتی تھی جس میں اس نے کوئی حوالہ دیے بغیر اپنی کیفیات کا ذکر کیا تھا اور جسے پڑھ کر سجاد رہبر کو گمان ہوا تھا کہ اس کی بیٹی کسی کی محبت میں مبتلا ہوگئی ہے۔ وہ شخص حمزہ بھی ہوسکتا ہے، یہ بات سجاد رہبر نے بارہا سوچی تھی لیکن اب جبکہ عائشہ اس کے سامنے تھی اور اس کے ہونٹوں پر حمزہ کا نام تھا۔ سجاد رہبر نے بہت غور سے عائشہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں اسے ایسی کوئی کیفیت نظر نہیں آئی جو محبوب کا نام ہونٹوں پر آنے پر کسی لڑکی کے چہرے پر در آتی ہے۔ سجاد رہبر گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔ بیٹی کے دل کا راز جاننے کے لیے ابھی اسے اور انتظار کرنا تھا۔

❀❀❀

عائشہ کو واپس لوٹے چار ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا۔ یونیورسٹی سے آفر ملنے پر اس نے وہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ یونیورسٹی، کچن کی ذمے داریاں، لیکچر کی تیاری اور رات میں سجاد رہبر کے ساتھ نشست، دن اچھی خاصی مصروفیت میں گزرنے لگے تھے۔ وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن تھی لیکن سجاد رہبر ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کی زندگی میں کچھ اور خوشیاں بھی دیکھنے کا متمنی تھا۔ عائشہ کے لیے اس کے جاننے والوں اور دوست احباب کے ہاں سے کئی اچھے رشتے بھی آئے تھے لیکن عائشہ کے ہونٹوں پر ہر ایک کے لیے نہ تھی۔ بالآخر سجاد رہبر نے بیٹی سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سے پوچھا کہ اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے تو بتا دے۔ جواباً عائشہ نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ کسی کی منتظر ہے۔ اس کے بعد باپ بیٹی میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سجاد رہبر ایک روشن خیال اور سمجھدار آدمی تھا جو بیٹی کو اس کی مرضی کی زندگی جینے دینے کا حقدار سمجھتا تھا.... ایک رات جب دونوں سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکے تھے کہ ڈور بیل کی آواز نے دروازے پر کسی کی موجودگی کی اطلاع دی۔ عائشہ کی واپسی کے بعد سے سجاد رہبر کا ملازم رات کو رکنا چھوڑ چکا تھا۔ وہ صبح سات بجے ڈیوٹی آتا تھا اور رات نو بجے تک واپس چلا جاتا تھا۔ اس وقت بارہ سے اوپر کا ٹائم ہو رہا تھا۔ چنانچہ سجاد رہبر کو خود ہی دروازے تک جانا پڑا۔ عائشہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر آچکی تھی۔

''کون ہے؟'' دروازہ کھولنے سے قبل سجاد رہبر نے احتیاطاً پوچھا۔

''میر رحمٰن۔ عائشہ بی بی کے لیے پیغام لایا ہوں۔'' آنے والے نے اپنا نام بتانے کے ساتھ آمد کا مقصد بھی بیان کیا۔ اس کی آواز بہت مدھم تھی، سجاد رہبر بہ مشکل ہی اس کی بات سن سکا تھا اور سن کر اس کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی تھی لیکن بہرحال اس نے بات ایسی کہی تھی کہ سجاد رہبر نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے تیئس چوبیس سال کا سرخ و سفید رنگت والا ایک جوان کھڑا تھا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' اس نے مہذب لہجے

میں سجاد رہبر سے پوچھا تو اس نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ نوجوان اپنے اطوار سے شریف النفس انسان معلوم ہوتا تھا۔ سجاد رہبر اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ عائشہ بھی ان کے ساتھ تھی کیونکہ آنے والے کے مطابق وہ عائشہ کے لیے ہی کوئی پیغام لے کر آیا تھا۔

''رات کے اس پہر آپ لوگوں کو زحمت دینے پر معذرت خواہ ہوں لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھے آپ کے گھر آتے ہوئے دیکھے اور آپ کسی مشکل میں گرفتار ہوں۔'' اس نے شائستہ انداز میں اپنی بے وقت آمد پر معذرت کرتے ہوئے وجہ بھی بیان کی جس پر عائشہ اور سجاد رہبر نہ سمجھنے والے انداز میں، سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''بہتر ہے کہ میں آپ لوگوں سے اپنا مختصر تعارف کروادوں تاکہ آپ کی الجھن رفع ہوسکے۔'' میر رحمٰن نے اُن دونوں کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا اور بتانے لگا۔

''میرا تعلق مجاہدین سے ہے اور مجھے ایک اہم خط آپ تک پہنچانے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یہ خط عائشہ بی بی کے نام پروفیسر آر پی کی جانب سے ہے۔'' میر رحمٰن کے الفاظ سن کر عائشہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ آخر آر پی کی طرف سے کوئی پیغام آ ہی گیا تھا۔

''لائیں وہ خط مجھے دے دیں۔'' ذہن میں یہ الجھن ہونے کے باوجود کہ آخر پروفیسر نے کشمیر کاز کے کسی مجاہد کو ہی پیغام رسانی کے لیے کیوں منتخب کیا، اس نے بے تابی سے مطالبہ کیا۔ میر رحمٰن نے اس کی بے تابی کو دیکھ کر ایک افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ خط اُسے تھمادیا۔

''اب مجھے اجازت دیں۔'' خط تھماتے ہی وہ فوراً کھڑا ہوگیا۔

''ارے بھئی ایسے کیسے؟ کم از کم چائے تو پیتے جاؤ۔'' سجاد رہبر نے اصرار کیا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں نے بے وقت آکر آپ لوگوں کو جو زحمت دی اسی کے لیے شرمندہ ہوں۔ مزید زحمت ہرگز نہیں دوں گا۔'' اصرار کے باوجود وہ کسی صورت نہیں رکا۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ وہیں بیٹھ کر خط پڑھنے لگی۔ خط میں لکھا تھا۔

''عائشہ!

یہ میرا تم سے پہلا اور آخری رابطہ ہے۔ اس خط کے ذریعے میں تمہیں دو اہم اطلاعات دینا چاہتا ہوں۔ پہلی خبر سن کر تم یقیناً خوش ہوگی کہ الحمدللہ تمہاری دعائیں رنگ لائیں اور میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا لیکن قبولیت اسلام کے فوراً بعد ہی میں ایک کڑے امتحان سے گزرا۔ جس ہستی کے ہاتھ پر میں نے اسلام قبول کیا تھا انہیں صرف اس وجہ سے گرفتار کرلیا گیا کہ ان کی زیر نگرانی پرورش پانے والا ان کا شاگرد کشمیر کاز میں شامل ہوکر اپنی جان دے بیٹھا۔ میرے محسن یاسر محمود صرف درس و تدریس کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے لیکن طاقتور دنیا کی قوم کے سورماؤں نے انہیں انتہا پسند قرار دے کر ان کی زبان کھلوانے کے لیے اتنا تشدد کیا کہ وہ بے چارے اپنی جان سے ہی چلے گئے۔ ان کی شہادت کے بعد میں بھی اسی سفر میں شامل ہوگیا ہوں اور اب اپنی زندگی ان ہی کے لیے وقف کرچکا ہوں۔ تم سمیت مجھے دنیا کا کوئی بھی شخص یاد نہیں رہا ہے لیکن میں یہ خط تمہیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تمہارے جذبے کی شدت سے واقف ہوں اور جانتا ہوں کہ تم عمر بھر میرا انتظار کروگی اور یہاں یہ حال ہے کہ کسی بھی لمحے جان جاسکتی ہے۔ میں یہ خط امانتاً اپنے کمانڈر کے پاس رکھوا رہا ہوں اس ہدایت کے ساتھ کہ جیسے ہی میری شہادت ہو، یہ خط تم تک پہنچادیا جائے تاکہ تمہیں بھی ایک لاحاصل انتظار سے نجات ملے اور تم اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بہتر فیصلہ کرسکو۔ تم سمجھ رہی ہونا میری بات۔ دوسری اطلاع جو میں تمہیں دے رہا ہوں وہ اپنے اس دنیا سے جانے کی ہے۔ تم یہ خبر سن کر اداس نہ ہونا اور جذبات کو چھوڑ کر اپنے لیے زندگی کی نئی راہیں متعین کرلینا۔

تمہارا ہمدرد و خیر خواہ

پروفیسر آر پی''

خط ختم ہوگیا تھا لیکن پھر بھی وہ بے یقینی کے عالم میں کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ جس کے انتظار میں دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھی تھی وہ اس جہاں میں ہی نہیں رہا تھا۔

ساکت بیٹھے بیٹھے آنسو ایک تسلسل سے اس کی آنکھوں سے رواں ہوگئے اور کاغذ کو بھگونے لگے۔ سجاد رہبر نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو اٹھ کر اس کے قریب آئے اور خط اس کے ہاتھ سے لے کر خود پڑھنے لگے۔ جوں جوں وہ پڑھتے گئے ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت طاری ہوتی گئی۔ اس مختصر سے خط میں وہ سب کچھ تھا جس نے ان پر ان کی بیٹی پر گزرنے والا سانحہ عیاں کرڈالا۔ انہوں نے بے ساختہ ہی اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

''صبر کرو میری بیٹی! صدمہ بڑا ہے لیکن صبر کے سوا

کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔'' وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے لیکن اپنی لاڈلی بیٹی کے دکھ پر ان سے ان کے سارے لفظ روٹھ گئے تھے اور وہ نہایت بے بسی سے اس کے آنسو اپنی قمیص میں جذب ہوتے دیکھنے پر مجبور تھے۔

☾☾☾

جو حادثہ گزرنا تھا وہ گزر چکا تھا۔ عائشہ نے بھی ظاہری طور پر خود کو سنبھال لیا تھا اور زندگی کے معمولات میں شامل ہوگئی تھی البتہ اب اس کی مصروفیات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔ یونیورسٹی کی جاب کے علاوہ وہ فلاحی کاموں میں بھی حصہ لینے لگی تھی اور آج کل شہر کے مضافات میں ایک ایسا اسکول کھولنے کے لیے کوشاں تھی جس میں غریب بچوں کو مفت تعلیم کی سہولیات حاصل ہوں۔ سجاد رہبر اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے لیکن ایک باپ کی حیثیت سے وہ اپنی جوان بیٹی کے لیے فکرمند بھی تھے۔ لیکن عائشہ کے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ وہ اب تک اسے اس موضوع پر سمجھا نہیں سکے تھے اور ایک بے بس باپ کی طرح اس کے کاموں میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ ناامیدی کے اس اندھیرے میں حمزہ کی فون کال ان کے لیے امید کی کرن بن کر چمکی۔ وہ پاکستان آنے والا تھا اور یہ تو سجاد رہبر کو بھی معلوم تھا کہ کیوں؟ عائشہ کے امریکا سے واپس آنے کے بعد وہ لڑکا تسلسل سے اسے فون کالز یا ای میل وغیرہ کرتا رہا تھا اور خود ان کی بھی اس سے کئی بار بات ہوئی تھی۔ ایک زمانہ شناس آدمی ہونے کی وجہ سے انہوں نے حمزہ کے جذبات کو بھانپ لیا تھا اس لیے اس کی پاکستان آمد کی اطلاع ان کے لیے خوشی کی امید بن گئی۔ جس روز حمزہ کو آنا تھا وہ عائشہ کو کچھ بھی بتائے، بغیر اسے لے کر ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔

''کچھ بتائیں تو سہی بابا کہ کون آرہا ہے جسے لینے ایئرپورٹ جارہے ہیں؟'' اُن کے بچوں کی طرح پُراسرار بننے پر وہ کچھ جھنجلاہٹ محسوس کررہی تھی اس لیے بے زاری سے پوچھا۔

''بتایا تو ہے کہ میرا ایک مہمان آرہا ہے اور تمہیں میں اس لیے ساتھ لایا ہوں کہ میرا گاڑی ڈرائیو کرنے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''اٹس نوٹ فیئر بابا! کچھ تو ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔'' وہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔

''چھپا نہیں رہا بلکہ کچھ بتانے کے لیے ہی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ تم نے مجھے اسکول کے لیے زمین خریدنے کے لیے جہاں بھیجا تھا وہاں سے میں ناکام آیا ہوں کیونکہ وہ زمین پہلے ہی ایک صاحب خرید چکے ہیں۔ اچھے معقول آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ایک ٹانگ سے محروم ہیں۔ لیکن پھر بھی بہت باہمت ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ خاصے عرصے سے پسماندہ علاقوں میں فلاحی کام کررہے ہیں۔ خصوصاً اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے پیشکش کی ہے کہ اگر تم چاہو تو وہ اُس زمین کو تمہیں مفت بھی دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد تو اسکول تعمیر کرنا ہے اب چاہے جو بھی وہ اسکول تعمیر کروادے۔'' ان کا چونکہ حمزہ سے وعدہ تھا کہ پہلے سے عائشہ کو اس کی آمد سے آگاہ نہیں کریں گے اس لیے بات کا رخ ہی بدل گئے۔

''رہنے دیں بابا! آج کل الٹی سیدھی این جی اوز بھی میدان میں اتری ہوئی ہیں۔ وہ صاحب بھی جانے کون ہیں؟ میں ایسے کسی چکر میں پڑے بغیر اپنی مرضی کا اسکول کھولنا چاہتی ہوں۔'' عائشہ نے فوراً ہی انکار کردیا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔ ویسے اس شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس زمین کے علاوہ کہیں اور بھی زمین خریدنا چاہیں تو وہ ہماری مدد کرسکتا ہے۔ میں نے اس کا فون نمبر لے لیا ہے کسی دن ملاقات کے لیے جاؤں گا۔'' انہوں نے مزید بتایا۔

''ٹھیک ہے چلے جایئے گا۔ ویسے بھی آپ کون سا مجھے کچھ بتانا پسند کرتے ہیں۔ ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کون آرہا ہے۔'' اس نے منہ پھلایا۔

''ارے بھئی برا ماننے کی کون سی بات ہے جب یہاں تک پہنچ ہی گئے ہیں تو تم خود دیکھ لینا۔'' ان کا اطمینان قابل دید تھا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے، عائشہ نے بھی مزید سوال کرکے اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا لیکن جب انتظار کی زحمت سے گزر کر اسے بالکل غیر متوقع طور پر ایک شناسا چہرہ نظر آیا تو وہ دم بخود رہ گئی۔

''حمزہ......!'' اس نے بے یقینی سے آنے والے کا نام پکارا۔

''یقین کرلو کہ یہ میں ہی ہوں۔'' وہ اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوا۔ ان ہی تاثرات کو دیکھنے کے لیے تو اس نے اس خبر کو راز رکھا تھا۔

''بہت کمزور ہوگئی ہو۔ کیا اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتیں؟'' اسے دور سے دیکھتے ہوئے حمزہ نے پوچھا۔ وہ اس کے ساتھ گزرنے والے سانحے سے اچھی طرح واقف تھا بلکہ اتنی دور ہونے کے باوجود بھی مسلسل اس کا غم بانٹنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''ہاں، کام بھی تو بہت کرنے لگی ہوں۔'' عائشہ نے

سرسری انداز میں جواب دیا اور پھر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"دو تین دن پہلے ہی تو میری تم سے بات ہوئی تھی، اس وقت تو تم نے مجھے اپنی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"سرپرائز اسی کو تو کہتے ہیں ڈیئر!" وہ ہنسا۔

"اور بابا آپ بھی اس احمق کے ساتھ شامل ہو گئے۔" اس نے باپ سے خفگی بھرا شکوہ کیا۔

"سوری بیٹا لیکن کیا اب سارے شکوے یہیں کھڑے کھڑے کرلوگی؟ گھر چلو، وہاں تم میری اور حمزہ کی زیادہ اچھی طرح خبر لے سکتی ہو۔" سجاد رہبر نے معصومیت سے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا تو حمزہ کا بلند قہقہہ فضا میں گونج اٹھا جبکہ وہ خود کو یوں بچوں کی طرح ٹریٹ کیے جانے پر جھینپ سی گئی۔

©©©

حمزہ کی آمد سے زندگی میں یکدم ہی بہت گہما گہمی سی ہوگئی تھی۔ وہ صرف دس دن کے لیے پاکستان آیا تھا اور ان دس دنوں کے لیے عائشہ نے چھٹی لے لی تھی۔ وہ اس کے ساتھ شہر بھر کے تفریحی اور قابلِ دید مقامات کے خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ وہ لوگ اسے دو دن کے لیے لاہور کی سیر کے لیے بھی لے گئے تھے۔ وہاں موجود قدیم عمارات نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کی تاریخی مقامات میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے سجاد رہبر نے اسے ٹھٹھہ اور مکلی کا بھی ایک وزٹ کروایا تھا۔ اس موقع پر عائشہ اپنی ایک کولیگ کی منگنی کے فنکشن کی وجہ سے ان کے ساتھ شامل نہیں ہوسکی تھی۔ البتہ اس نے یہ بات ضرور محسوس کی تھی کہ وہاں سے واپسی پر سجاد رہبر کافی خوش نظر آرہا ہے۔ اسے لگا کہ یہ حمزہ کی دلچسپ کمپنی کا کمال ہے۔ وہ واقعی ایسا تھا کہ اس کے ساتھ وقت پر لگا کر اڑتا محسوس ہوتا تھا۔ دس دن کیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے احساس ہی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی پاکستان میں قیام کی آخری رات آگئی۔ اس رات وہ لوگ بہت دیر تک جاگتے رہے پھر سجاد رہبر کو ہی خیال آیا کہ اگلی صبح حمزہ کو سفر کے لیے نکلنا ہے۔ انہوں نے اصرار کر کے اسے آرام کے لیے بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ بھی اپنے کمرے میں جانے لیے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن سجاد رہبر نے اسے روک لیا۔

"کچھ دیر بیٹھو بیٹا! مجھے تم سے ایک اہم بات کرنی ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سجاد رہبر کچھ دیر تک یوں سوچ میں ڈوبا رہا جیسے خود کو مجتمع کررہا ہو۔ وہ منتظر نظروں سے باپ کی شکل دیکھتی رہی۔

"کیا بات ہے بابا! کوئی پریشانی ہے کیا؟" بالآخر اس نے خود ہی پوچھ لیا۔

"پریشانی تو نہیں بیٹا بس ایک خواہش ہے۔" انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

"وہ کیا؟" اس نے غور سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھٹھہ کی سیر کے دوران حمزہ نے مجھ سے تمہارا ہاتھ مانگا تھا۔ مجھے تمہاری رائے کا خیال نہ ہوتا تو فوراً ہاں کردیتا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور مجھے امید ہے کہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" انہوں نے حمزہ کا پروپوزل مع اپنی خواہش اس کے سامنے رکھا تو دس دن سے اس کے ذہن میں ابھرتے سوالوں کا جواب اسے مل گیا۔ حمزہ کی اچانک آمد نے اسے شک میں تو مبتلا کیا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آیا ہے لیکن جب وہ خاموش رہا اور اس سے کچھ نہ کہا تو وہ سمجھی کہ وہ بس ایک دوست کی حیثیت سے اس سے ملنے اس کا دکھ بانٹنے آیا ہے لیکن اب سمجھی کہ اس بار اس نے براہ راست اس سے بات کرنے کے بجائے اسے اس کے باپ کے ذریعے پانے کی کوشش کی ہے۔

"آپ جانتے ہیں بابا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔" اس نے لمحہ بھی نہ لگایا انکار کرنے میں۔

"تھوڑی سی کوشش کرو تو ممکن ہو بھی سکتا ہے۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔

"یہ آپ کہہ رہے ہیں بابا؟ آپ جو شادی کو ہمیشہ محبت سے وابستہ سمجھتے رہے ہیں۔ جنہوں نے خود امی کے وفات کے بعد باوجود بہت مشکلات کے کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی۔ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی شادی کی بنیاد سمجھوتے پر رکھ لوں؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا پھر انہیں خاموش پا کر مزید بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ آپ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں جو نہ کہوں گی آپ وہ بھی سمجھ لیں گے پھر ایسا کیوں ہوا بابا کہ آپ میرے دل کی حالت نہ جان سکے۔" اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

سجاد رہبر جان بوجھ کر اس سے نظریں چرا گئے اور قدرے سپاٹ لہجے میں بولے۔

"اس وقت میں صرف ایک بیٹی کا باپ بن کر سوچ رہا ہوں جو اس وقت میرے پیش نظر جذبات کے بجائے

بے رحم حقائق ہیں۔ میں ساری زندگی تو تمہارے سر پر سلامت نہیں رہوں گا اور میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ یہ سوچ کہ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ تم کتنی بھی لائق ہو اور مالی طور پر مستحکم ہو جاؤ، رہوگی ایک عورت ہی جس کے ساتھ اگر کسی مرد کا سہارا نہ ہو تو ہمارا معاشرہ اسے جینے نہیں دیتا۔ میں اس وقت سے اتنا خوف زدہ ہوں کہ راتوں کو ڈھنگ سے سو نہیں سکتا اور اگر تمہاری شادی کیے بغیر مر گیا تو شاید قبر میں بھی سکون سے نہ رہ سکوں۔"

بولتے بولتے وہ اتنے آزردہ ہوگئے تھے کہ عائشہ کا دل تڑپ گیا۔

"ایسی خوفناک باتیں مت کریں بابا! اللہ نے چاہا تو آپ کا سایا ہمیشہ میرے سر پر قائم رہے گا۔"

"میں خوفناک باتیں نہیں کررہا۔ درحقیقت حقائق ہوتے ہی خوفناک اور بھیانک ہیں جیسا کہ یہ حقیقت کہ میرا سایا ہمیشہ تمہارے سر پر قائم نہیں رہ سکتا اور تم نے اگر میری بات نہیں مانی تو ایک دن بالکل تنہا اور بے سائبان رہ جاؤ گی اور میں یہ برداشت نہیں کرسکتا...... اگر تم چاہتی ہو کہ میں مرنے کے بعد بھی قبر میں بے چین رہوں تو اور بات ہے ورنہ تمہیں شادی کے لیے ہامی بھرنی ہوگی۔" آج وہ ہمیشہ سے بالکل مختلف موڈ میں تھے اور دوستانہ رویے کو بھول کر ایک روایتی باپ کے روپ میں نظر آرہے تھے۔

"ایسی باتیں مت کریں بابا۔" ان کا یہ روپ دیکھ عائشہ روہانسی ہوگئی۔

"میں صرف باتیں نہیں کررہا بلکہ تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تمہیں اب شادی کرنی ہوگی۔" ان کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔ عائشہ کو سخت بے بسی کا احساس ہوا۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"اگر میں زندگی میں پہلی بار حکم عدولی کی مرتکب ہو جاؤں تو......؟"

"تو میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گا تاکہ تمہیں میری زندگی میں ہی اس بات کا احساس ہو جائے کہ بے سائبانی کیا چیز ہوتی ہے۔ تم چاہو تو سوچنے کے لیے آج کی رات لے سکتی ہو کل صبح حمزہ کی روانگی سے پہلے اپنا فیصلہ سنا دینا۔" اپنی بات کہنے کے بعد سجاد رہبر نے رکنے کی زحمت نہیں کی اور وہاں سے چلے گئے۔ عائشہ بھی کمرے میں چلی گئی اور ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ محبت کرنے والے شفیق باپ کا یہ روپ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا اور اس کے لیے وہ کسی حد تک حمزہ کو بھی ذمے دار سمجھ رہی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے جہاندیدہ باپ نے اس وقت کسی ماہر سرجن .....کی طرح اس کے وجود میں نشتر اتار کر آئندہ کے لیے بہتری کی کوشش کی ہے۔

"میں شادی کے لیے راضی ہوں لیکن حمزہ سے نہیں۔ آپ میرے لیے کسی ایسے شخص کا انتخاب کریں جو پاکستانی ہو اور میں پاکستان میں رہ کر اپنے مشن کو جاری رکھ سکوں۔ آپ کی خاطر میں سمجھوتے کی شادی پر تو تیار ہوں لیکن اس بات پر سمجھوتا نہیں کرسکتی کہ جن کاموں کو میں نے اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے انہیں ادھورا چھوڑ کر کہیں دور چلی جاؤں۔" صبح اس نے نہایت ٹھوس لہجے میں سجاد رہبر کو اپنا فیصلہ سنایا۔

"اور اگر حمزہ پاکستان میں رہنے کے لیے تیار ہو جائے تو......؟" انہیں حمزہ بہت اچھا لگا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ ان کی بیٹی سے محبت کرتا تھا اس لیے اسے ہی اس کی زندگی کا ساتھی دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

"حمزہ کو چاہیے کہ اپنے وطن جا کر اپنے لوگوں کی خدمت بھی کرے۔ جو شخص اپنے وطن کے لیے کچھ نہیں کرسکتا وہ میرے ہم وطنوں کے مسائل حل کرنے کے لیے میرا ساتھ کیا خاک دے گا۔" اس کا لہجہ ایسی قطعیت لیے ہوئے تھے جس کے بعد بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سجاد رہبر کو اس کے آگے سپر ڈالنی پڑی اور حمزہ کو ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑا۔

©©©

"آج پھر آپ کہیں جارہے ہیں؟" ناشتے کی میز پر نک سک سے تیار سجاد رہبر کو دیکھ کر اس نے ذرا خفگی سے یہ سوال کیا۔ اس کی یہ خفگی بے جا نہیں تھی۔ حمزہ کے واپس جانے کے بعد سے سجاد رہبر نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ آئے دن گھر سے غائب رہنے لگے تھے۔ پوچھنے پر ہر بار یہی جواب ملتا تھا کہ رحمت سے ملنے جارہا ہوں۔ رحمت اسی شخص کا نام تھا جس نے وہ زمین خریدی تھی جس پر عائشہ اسکول تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ سجاد رہبر بہت تواتر سے اس سے ملنے لگے تھے اور اس مصروفیت میں ان کے پاس اتنی فرصت بھی نہیں رہی تھی کہ عائشہ کے اسکول والے پروجیکٹ پر دھیان دے سکیں۔ ان کی عدم توجہی کی وجہ سے وہ کام التوا میں پڑا ہوا تھا۔ عائشہ اپنے طور پر ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کررہی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو پارہی تھی کہ اس کے دل میں خوف سا رہتا تھا کہ کہیں وہ دھوکا نہ کھالے اور اسکول کے لیے جمع کی گئی پونجی ڈوب جائے۔ اسے لگتا تھا کہ شاید حمزہ کے رشتے سے انکار پر ردعمل کے طور پر سجاد رہبر نے یہ رویہ

اختیار کر رکھا ہے لیکن ان سے باز پرس کی ہمت نہیں تھی۔ بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ ان کے معمولات پر احتجاج کر سکے چنانچہ اب یہی کرنے جا رہی تھی۔

''رحمت سے ملنے جا رہا ہوں۔ رات اس سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے اپنے ہاں انوائٹ کیا تھا۔'' عائشہ کے لہجے کی فکر کیے بغیر انہوں نے اطمینان سے جواب دیا اور ایک سلائس پر مکھن کی تہ جمانے لگے۔

''رحمت صاحب سے آپ کی ضرورت سے زیادہ دوستی نہیں ہو گئی ہے؟ میں نے آپ کو خبردار کیا تھا کہ حضرت این جی او کی آڑ لے کر کسی اور کام میں بھی مصروف ہو سکتے ہیں۔'' ان کا جواب حسب توقع تھا پھر بھی وہ اندر ہی اندر بلبلائی لیکن پھر خود کو سنبھال کر ہموار لہجے میں اپنا اعتراض ظاہر کیا۔

''پہلی بات یہ ہے کہ رحمت کی کوئی این جی او نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے یہ بال کوئی دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ مجھے رحمت اچھا بندہ لگتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اچھا ہے، اس لیے تم میرے لیے فکرمند نہ ہوا کرو۔'' وہ اسی اطمینان سے جواب دیتے ہوئے ناشتا جاری رکھے ہوئے تھے۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے بابا؟'' ان کے انداز پر عائشہ روہانسی ہو گئی۔

''کیا مطلب؟ میں تمہارے ساتھ کیا کر رہا ہوں؟''

''آپ مجھے اگنور کر رہے ہیں۔''

''بالکل بھی نہیں۔ مجھے ایسا کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' انہوں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''آپ مجھے پریشرائز کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے بابا! میں نے صرف حمزہ سے شادی سے انکار کیا ہے' اس کے علاوہ آپ جس بھی پاکستانی مرد سے میری شادی کریں گے۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' ذہن میں پلتا شک آخر اس نے باپ کے سامنے اگل ہی دیا۔

''میں صرف اتنا کہوں گا کہ تم غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔'' اس کا ایک ایک لفظ غور سے سننے کے بعد انہوں نے جواب دیا اور کرسی کو بے آواز کھسکا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلتا ہوں۔ رحمت کو میرا انتظار ہوگا کہیں دیر نہ ہو جائے۔'' وہ باوقار انداز میں چلتے باہر نکل گئے جبکہ پیچھے عائشہ کڑھتی ہی رہ گئی۔

⊙⊙⊙

''آخر ہم اتنی صبح صبح جا کہاں رہے ہیں؟'' سجاد رہبر سے بات ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ انہوں نے ایک صبح اسے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دے ڈالا۔ ان کے حکم کی تعمیل میں وہ گاڑی میں بیٹھ تو گئی لیکن ذہن میں موجود الجھن کو سلجھانے کے لیے یہ سوال ضروری تھا۔

''تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے بس یہی دکھانے لے جا رہا ہوں۔'' وہ آج معمول سے زیادہ خوش اور پرجوش نظر آ رہے تھے۔

''کہیں حمزہ ایک بار پھر تو نہیں آ دھمکا ہے؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔ اگر اسے آنا ہوتا تو گاڑی اس وقت ائرپورٹ کی طرف جا رہی ہوتی۔'' سجاد رہبر نے مدلل جواب دیا تو اسے بھی قائل ہونا پڑا۔

آخر کار طویل سفر کے بعد ان کا سفر ختم ہوا اور وہ ایک پسماندہ سے علاقے میں پہنچ گئے۔ سجاد رہبر نے گاڑی ایک مکان کے سامنے روکی اور عائشہ کو اشارہ کرتے ہوئے گاڑی سے اتر گئے۔ عائشہ نے ان کی تقلید کی۔ سجاد رہبر نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ ذرا سے توقف کے بعد ایک ملازم صورت شخص نے دروازہ کھولا۔

''سلام صاحب۔'' انہیں دیکھ کر اس نے فوراً سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو نبی بخش؟'' انہوں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے صاحب۔ آئیں آپ اندر آ جائیں۔'' وہ ان دونوں کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم کے طرز کے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

''آپ لوگ بیٹھیں، میں چائے وغیرہ لاتا ہوں۔''

''رحمت کہاں ہے؟'' اسے جاتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''سر جی کو اچانک کوئی ضروری کام آ پڑا تھا۔ انہوں نے جاتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ آپ لوگ آنے والے ہیں، میں آپ کی اچھی طرح خاطر مدارات کروں۔ شاید انہوں نے آپ کو فون بھی کیا تھا لیکن نمبر نہیں مل سکا۔''

''اوہو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ بہرحال ہم چلتے ہیں۔'' کچھ مایوسی سے کہتے ہوئے سجاد رہبر کھڑے ہونے لگے۔ عائشہ اس دوران بالکل خاموش تھی اور صرف ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

''ایسے نہیں صاحب! آپ پہلی بار بیٹی کو لے کر یہاں آئے ہیں۔ تھوڑی بہت خاطر تو ضروری ہے۔''

نبی بخش نے ان کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی اور لوازمات سے بھرپور چائے پلا کر ہی وہاں سے رخصت کیا۔ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو سجاد رہبر نے گاڑی کو واپسی کے راستے پر ڈالنے کے بجائے کچھ اور آگے بڑھا دیا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' عائشہ نے پوچھا لیکن پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب سامنے پا کر چپ ہو گئی۔ وہ ایک اسکول کی عمارت تھی جس کا احاطہ تو خاصا وسیع تھا لیکن ابھی صرف تقریباً دو سو گز پر تعمیر کا کام ہوا تھا۔ عمارت صاف ستھری اور بالکل نئی تھی اور اس پر 'رہبر پرائمری اسکول' کا بورڈ آویزاں تھا۔ عائشہ دم بخود رہ گئی۔ وہ جو اسکول بنانے کا ارادہ رکھتی تھی' اس کا یہی نام تو سوچ رکھا تھا۔

''بابا......'' فرطِ جذبات سے اس کے ہونٹ بس تھرتھرا کر رہ گئے۔

''بابا کی جان...... بابا کو تمہاری خوشی سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی پیارا نہیں ہے اس لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں جو بھی قدم اٹھاؤں سب سے پہلے تمہاری خوشی کو پیش نظر رکھتا ہوں۔'' انہوں نے بھی اسی جذباتی کیفیت میں اس سے کہا تو عائشہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر وہ کچھ دیر بعد اپنے جذبات پر قابو پا کر بولی۔

''میں جانتی ہوں بابا اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی اس بات کی نوبت نہیں آنے دوں گی کہ آپ کو یہ گمان ہو کہ میں آپ کو اپنا خیرخواہ نہیں سمجھتی۔'' اس نے اپنی مرضی سے اپنے پیروں میں وعدے کی زنجیر پہنتے ہوئے اپنے اسکول کی زمین پر پہلا قدم رکھا۔

⊙⊙⊙

جاب کے ساتھ اسکول کی شروعات نے اسے بہت زیادہ مصروف کر دیا تھا۔ نصاب وغیرہ کے سلسلے میں تو وہ پہلے ہی اچھا خاصا کام کر چکی تھی لیکن اصل مرحلہ تھا افلاس زدہ اس علاقے کے لوگوں کو اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر آمادہ کرنا۔ وہ لوگ راضی نہیں ہوتے تھے۔ انہیں راضی کرنے کے لیے عائشہ کو بہت سے دلائل کے ساتھ ترغیبات کا بھی سہارا لینا پڑا۔ اسکول کا پروجیکٹ ایسا نہیں تھا جسے وہ محض اپنی ذاتی آمدنی سے چلا سکتی۔ اس سلسلے میں وہ اپنے کولیگز وغیرہ سے بھی مدد لے رہی تھی۔ اس کے علاوہ سجاد رہبر کا وسیع حلقہ احباب بھی بہت کام آ رہا تھا۔ رحمت کی طرف سے بھی خاصی مدد فراہم کی گئی تھی۔ مالی امداد کے علاوہ اس نے اسکول کی بہتری کے لیے بہت سی تجاویز اور مشورے بھی بھجوائے تھے لیکن خواہش کے باوجود عائشہ کی اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ اپنی نئی کتاب کے لیے مواد حاصل کرنے وہ آج کل شہر سے باہر ہے اور تحقیق کے ساتھ ساتھ وہاں بھی کسی فلاحی مقصد پر کام کر رہا ہے۔ وہ سجاد رہبر کی زبانی اس کے بارے میں سنتی رہتی تھی اور ان باتوں کو سن کر اس کے ذہن میں اس شخص کے متعلق جو خاکہ بنا تھا وہ ایک محنتی، ایمان دار، دین دار اور قابل شخص کا خاکہ تھا جس نے اپنی معذوری کو اپنے لیے روگ نہیں بننے دیا تھا اور پوری طرح فعال اور متحرک تھا۔ وہ غائبانہ ہی اس سے خاصی متاثر تھی۔ متاثر تو سجاد رہبر بھی تھے اسی لیے عائشہ کے ساتھ اس کے مشن میں مصروف ہونے کے باوجود کئی بار دوسرے شہر جا کر رحمت سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے بعد وہ واپس گھر آئے تو عائشہ کو معمول سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش محسوس ہوئے۔ اس نے باتوں باتوں میں ان سے ... وجہ جاننے کی کوشش کی لیکن وہ کھل کر نہ دیے۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر چپ ہو گئی۔ اس روز انہوں نے معمول کے مطابق رات کا کھانا ساتھ کھایا اور پھر جب رات گئے وہ انہیں ان کی اسٹڈی میں کافی دے کر واپس جانے لگی تو انہوں نے اسے روک لیا۔

''عائشہ! رکو بیٹا، مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

عائشہ کو بے ساختہ ہی وہ رات یاد آ گئی جب انہوں نے اس سے حمزہ کے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی۔ آج پھر وہ اسے بیٹی کے باپ کے روپ میں نظر آ رہے تھے لیکن اس روز کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ اور سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے ایک فلور کشن پر ٹک گئی۔

''کئی دن پہلے تم نے اپنی زندگی کے فیصلے کا اختیار میرے ہاتھ میں دیا تھا اور واحد شرط یہ رکھی تھی کہ میں تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے کروں جو پاکستانی ہو اور تمہارے مشن میں تمہارا ساتھ دے سکے۔ اتفاق سے ایک ایسا شخص مجھے مل گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر اسے بہت پسند بھی کرتا ہوں۔ اس کے کردار داخلاق سے لے کر قابلیت و محنت سمیت ہر شے نے متاثر کیا ہے۔ لیکن جب میں اس رشتے کو تمہارے حوالے سے دیکھتا ہوں تو دو عیب نظر آتے ہیں۔ اول وہ شخص عمر میں تم سے خاصا بڑا ہے دوئم یہ کہ اس کا ایک پیر کسی حادثے میں متاثر ہونے کی وجہ سے وہ اسٹک سے سہارا لے کر چلنے پر مجبور ہے۔ تمہارے اختیار دے دینے کے باوجود میں تمہاری زندگی کا یہ فیصلہ خود نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہوں کہ تم سوچ سمجھ کر خود فیصلہ کرو۔ ایک طرف اگر اس شخص

خدشہ تھا کہ سمجھوتے کی شادی کر کے تم کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔

وہ تمہارے والد تھے اور تمہیں دنیا کے ہر شخص سے بڑھ کر اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے ان کی زبانی سب کچھ سنا تو الجھن میں پڑ گیا اور پھر ایک دن ساری حقیقت ان کے گوش گزار کردی۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے کہ میں ہی وہی شخص ہوں جسے ان کی بیٹی بے تحاشا چاہتی ہے۔ انہوں نے خود ہی یہ فیصلہ سنادیا کہ دونوں کی شادی ہوجانی چاہیے۔ میں نے اس شرط پر ہامی بھرلی کہ اگر عائشہ میری اصلیت جانے بغیر محض میری خوبیوں کی بنیاد پر جسمانی عیب کے باوجود مجھ سے شادی کے لیے راضی ہوجاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں اس کی محبت کو آزمائش میں نہیں ڈالوں گا۔ تم نے ہامی بھرلی اور یوں ہم بچھڑ جانے کے باوجود ایک بار پھر مل گئے کہ ہمارا ملنا تو اللہ نے طے کر رکھا تھا۔'' اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرا دیا۔ عائشہ نے اس طویل وضاحت کے دوران بالکل بھی دخل نہیں دیا تھا اور اس کے زانو پر سر رکھے خاموشی سے سب سنتی رہی۔ وہ خاموش ہوا تو خود ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اپنے جسمانی عیب کی وجہ سے مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دینے کا آپ کا فیصلہ میری محبت کی توہین تھا۔ آپ کیا سمجھتے تھے کہ اگر آپ ایک پیر کے لنگ کے ساتھ میرے سامنے آئیں گے تو میرے جذبات میں فرق آجائے گا؟ میں سوچ میں پڑ جاؤں گی.... کہ مجھے آپ سے شادی کرنی بھی چاہیے یا نہیں؟'' غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا اور عروسی لباس کی سرخی سے مل کر اسے کچھ اور بھی حسین بنارہا تھا۔

''بالکل نہیں۔ میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا لیکن اس موقعے پر میرے دل میں موجود تمہاری محبت آڑے آگئی تھی۔ یہ میری بے تحاشا محبت ہی تھی کہ میں چاہتا تھا کہ تمہیں مجھ سے بڑھ کر اچھا اور شاندار ساتھی ملے اسی لیے میں نے اپنے قدم پیچھے ہٹالیے تھے لیکن جب میں نے جانا کہ تم اب بھی میرا خیال دل میں بسائے سمجھوتے کی راہ پر چلنے سے گریزاں ہو تو میں نے ہمت کر ڈالی خصوصاً سجاد صاحب کی گفتگو کے اس نکتے نے کہ تم ان کے حکم سے مجبور ہو کر کہیں نہ کہیں شادی تو ضرور کرلوگی لیکن کبھی خوش نہیں رہ سکوگی، میرے لیے فیصلے کو آسان کردیا اور اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ اپنے مجرم کو جو چاہے سزا دو میں بنا اُف کیے قبول کرلوں گا۔'' اس نے روٹھی ہوئی عائشہ کا ہاتھ ایک بار پھر نرمی سے تھام لیا۔

''میں آپ کے ساتھ بالکل خوش نہیں رہوں گی۔ آپ کو بہت تنگ کروں گی۔ آپ نے مجھے اتنا رلایا ہے اب میں بھی آپ کو کبھی ہنس کر نہیں دکھاؤں گی۔'' وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح اس سے ناراضی کا اظہار کررہی تھی۔

''تم مجھے تنگ کرو، برا بھلا کہو، میرا خیال نہ رکھو۔ مجھے یہ سب کچھ منظور ہے لیکن اب تم اپنی ہنسی پر پہرے نہیں بٹھا سکتیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ ان گزرے ماہ و سال میں تم تنہا ہی روئی تھیں؟ ایسا نہیں ہے عائشہ ......! تمہارا ہر آنسو میرے دل پر گرا ہے۔ میں مرد ہوں اس لیے دھاڑیں مار کر رو نہیں سکا لیکن آنسوؤں کا ایک سمندر ہے جو میرے اندر جمع ہو چکا ہے۔ اگر تم اب بھی مجھے اپنی ہنسی سے محروم رکھنے کی سزا دوگی تو کیا یہ میرے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ اب تو اس نمکین پانی کے بجائے تمہاری ہنسی کے کھلتے گلاب میرا مقدر ہونے چاہئیں'' اس نے انگلی کی پور پر عائشہ کی پلکوں پر اٹکا آنسو کا قطرہ چنتے ہوئے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ وہ پگھل گئی اور ناز سے بولی۔

''اگر آئندہ کبھی مجھے تنہا چھوڑنے کا سوچا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''نہیں، آئندہ کبھی میں یہ غلطی دُہرانے کی جرأت کر بھی نہیں سکتا۔ تم میرے لیے اللہ کی نعمت ہو اور کفران نعمت کافر کرتے ہیں مجھے تمہاری طرح اپنا ایمان بھی بہت پیارا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا اور میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرنے لگا جس کے باعث عائشہ کے ہونٹوں پر ہنسی کے گلاب کھل اٹھے۔ اس نے رحمت کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں اور سُہانے خواب دیکھنے لگی۔ ایسے خواب جو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں تھے بلکہ جس میں دوسروں کا بھی حصہ تھا، اسے یقین تھا کہ رحمت پرویز کی معیت میں وہ زیادہ تندہی و قوت سے اپنے مشن کے لیے کام کرسکے گی۔ کیونکہ قدرت نے ان دونوں کی کیمسٹری ایک جیسی بنائی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہی کام کررہے تھے تو اب ایک ہونے کے بعد تو زیادہ جانفشانی سے یہ سب کچھ کرسکتے تھے لیکن یہ سب آنے والی صبح سے شروع ہونا تھا، آج کی رات تو دو پیاسی روحیں ایک دوسرے کو سیراب کرنے پر مامور تھیں سو اس پھولوں بھرے کمرے میں محبت کی برکھا ٹوٹ کر برس رہی تھی اور اس برکھا میں بھیگتے وہ دونوں بہت شاد تھے۔

ساتھ پاکستان سے یہاں آنے والی ہنستی کھیلتی، زندگی سے بھرپور ٹینا، اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے۔

۞۞۞

"مسٹر رحمت پرویز۔" پروفیسر اپنی رہائش گاہ سے نکل کر چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک آواز نے اسے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے پلٹ کر خود کو پکارنے والے کو دیکھا۔ پکارنے والے کی صورت اس کے لیے اجنبی تھی۔

"آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کا خیر خواہ ہوں اور ایک بہت اہم اطلاع کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں۔" اس شخص کی بات نے پروفیسر کو تجسس میں مبتلا کر دیا؟

"بہتر ہے کہ ہم اندر چل کر بات کریں۔" یہ تجویز بھی اسی شخص کی طرف سے آئی تھی جسے پروفیسر نے قبول کر لیا۔ اجنبی ہونے کے باوجود وہ شخص اسے مشکوک یا ناقابلِ اعتبار نہیں لگا تھا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔" لاک کھول کر اس شخص کو اپنے ساتھ اندر لے جاتے ہوئے پروفیسر نے اس شخص سے کہا۔

"میرا نام علی انس ہے۔ میرا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اس شخص کو جس کے نام پر آپ کا نام رکھا گیا ہے، اس کی خواہش پر یہاں سے کشمیر تک لے گئے تھے۔" اس شخص نے اپنا تعارف کروایا تو پروفیسر کو حیرت ہونے لگی کہ وہ شخص کیوں اس سے ملنے یہاں آیا ہے۔

"میں وجہ بتانے ہی آپ کے پاس آیا ہوں لیکن پہلے آپ بتائیں کہ آپ کہاں جانے کے ارادے سے باہر نکلے تھے؟" علی انس نے پروفیسر سے پوچھا۔

"میں آپ کو اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔" پروفیسر نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ مت بتائیں لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت یاسر محمود سے ملنے جا رہے تھے اور اسی لیے میں نے آپ کو روکا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"رات کو یاسر محمود کا گھر یا مسجد جو بھی آپ کہہ لیں. وہاں پر ریڈ کر کے انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" علی انس کی اطلاع پر پروفیسر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ان پر الزام ہے کہ وہ نوجوانوں کو بھڑکاتے ہیں۔" علی انس نے دھیرے سے بتایا۔

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں نے اس شخص کے منہ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں سنی جس کی بنا پر اس پر یہ الزام لگایا جاسکے۔" پروفیسر چیخ اٹھا تھا۔

"یاسر محمود پر یہ سارا عتاب رحمت پرویز کی وجہ سے آیا ہے اور یاسر محمود اس کے سرپرست ہونے کی وجہ سے مشکوک قرار پائے ہیں. اب وہ لوگ کوشش کریں گے کہ یاسر محمود کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے انہیں گرفتار کر لیں۔ آپ کے لیے بھی احتیاط اس لیے بہت ضروری ہے۔" علی انس نے بتایا۔

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟" پروفیسر نے شک بھری نظروں سے علی انس کو دیکھا۔

"ظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو بھی مضبوط کرنا پڑتا ہے۔ ہم مجاہدین کا بھی اپنا نیٹ ورک ہے جس کے ذریعے ہم حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں فی الحال آپ اپنی رہائش گاہ تبدیل کر کے خاموشی سے ایک طرف ہو جائیں اور حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔ ہوسکتا ہے تمام معاملات سیٹل ہو جائیں۔ میں آپ کو ایک کانٹیکٹ نمبر دے کر جا رہا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر آپ اس نمبر پر ہم لوگوں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔" علی انس نے پروفیسر کو ایک ٹیلی فون نمبر دیا۔

"اس نمبر پر آپ اپنا نام بتا کر صرف ہیلپ کہہ دیجیے گا۔ کال ریسیو کرنے والا آپ سے آپ کا ایڈریس وغیرہ لے کر خود ہی آپ کو ہم تک پہنچانے کا انتظام کر دے گا۔" نمبر دینے کے بعد علی انس نے پروفیسر کو ہدایت دی اور پھر خود وہاں سے رخصت ہو گیا۔

۞۞۞

ڈور بیل کی آواز پر پر عائشہ نے دروازہ کھولا۔ سامنے حمزہ کھڑا تھا۔ عائشہ دروازہ کھلا چھوڑ کر واپس اندر آگئی، حمزہ اس کے پیچھے تھا۔

"کیسی ہو؟" لاؤنج میں پہنچ کر حمزہ نے عائشہ کے آزردہ چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔" عائشہ کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"تم نے ٹینا کی موت کا بہت اثر لیا ہے۔" حمزہ نے بہ غور اسے دیکھا۔

"لازمی بات ہے ہمارا برسوں کا ساتھ تھا۔" عائشہ نے اُداسی سے جواب دیا۔

"ٹینا جس راہ پر چل رہی تھی اس میں ایسے حادثات ہونا کچھ غیر معمول نہیں۔" حمزہ نے کہا تو عائشہ سرد سی آہ بھر کر رہ گئی۔

"جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اس وقت میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے تمہارے ساتھ اس اپارٹمنٹ کو شیئر کرنے کے لیے ایک مسلم لڑکی کا انتظام کر لیا ہے۔ اچھی، صاف ستھرے کردار کی لڑکی ہے، میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے اور ایرانی ہے۔" عائشہ کی کیفیت کی وجہ سے حمزہ فوراً ہی موضوعِ گفتگو تبدیل کر کے اسے درپیش اہم ترین مسئلے کے حوالے سے خوشخبری سنانے لگا۔ ٹینا کے بعد عائشہ اس سلسلے میں فکر مند تھی کہ کوئی اچھی لڑکی مل جائے اس کے لیے اکیلے اس اپارٹمنٹ کو افورڈ کرنا بہت مشکل تھا۔

"تھینک یو ویری مچ حمزہ! تم میرا بہت ساتھ دیتے ہو۔"

"تم اگر مان جاؤ تو میں ساری زندگی تمہارا ساتھ دینے کے لیے راضی ہوں۔" عائشہ کے ممنونیت بھرے انداز پھر حمزہ نے بے ساختہ ہی کہا۔

"سوری حمزہ! تم میری مجبوری جانتے ہو ورنہ تم میں کوئی برائی نہیں ہے۔" عائشہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اٹس او کے ڈیئر۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ تو بس خود بخود ہی زبان پھسل گئی ورنہ میں اس معاملے میں اپنی خواہش سے زیادہ تمہاری خوشی کو اہمیت دیتا ہوں۔" جواباً حمزہ بھی بہت سنجیدگی سے بولا۔ پھر مزید پوچھا۔ "پروفیسر کی طرف سے کوئی اطلاع آئی؟" حمزہ خود بھی اٹھ کر کچن میں اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ کافی بیٹ کرتا عائشہ کا ہاتھ اس کے سوال پر پل بھر کے لیے رک گیا۔

"انشاءاللہ۔ اطلاع بھی ایک دن آ ہی جائے گی۔ میرا کام تو بس دعا اور انتظار کرنا ہے۔" عائشہ کا لہجہ بہت مطمئن اور پریقین تھا۔

۞۞۞

اس تنگ و تاریک کمرے میں رہتے ہوئے پروفیسر کو کئی دن گزر چکے تھے۔ اتنے دنوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا نام مشکوک افراد کی فہرست میں نہیں ہے۔ وہ یاسر محمود کے جاننے والوں سے وقتاً فوقتاً رابطہ کرتا رہتا تھا اور اسے بہت سی اطلاعات مل جاتی تھیں۔ یاسر محمود کے رفقا اور چاہنے والے اپنی بساط بھر کوشش کر کے دیکھ چکے تھے لیکن ان کی رہائی ممکن نہیں ہو سکی تھی۔ پھر ایک دن وہ اطلاع ملی جسے سن کر پروفیسر کے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ تفتیش کے دوران کیے جانے والے سخت ٹارچر نے یاسر محمود سے ان کی زندگی چھین لی تھی۔ پروفیسر نے یہ اطلاع سنی تو کتنی ہی دیر سن سا بیٹھا رہ گیا۔ کون تھا جو ظالموں سے حساب کرتا۔ طاقت کے نشے میں چور یہ لوگ تو شک کی بنا پر اقوام کی تقدیر کے فیصلے کر رہے تھے۔ جنہیں نسلوں کو مٹا ڈالنے پر جوابدہی کا خوف نہیں تھا وہ ایک فرد کی جان لیتے ہوئے کیونکر جھجکتے۔

کتنے ہی دنوں تک پروفیسر کی نظروں میں یاسر محمود کا چہرہ گھومتا رہا۔ اس نے ہمیشہ ہر ایک آنکھ میں یاسر محمود کے لیے احترام دیکھا تھا۔ لوگوں کے رویوں کو یاد کرتے ہوئے اسے روشن چہرے والا یاد آیا۔ اس لڑکے کے انداز میں یاسر محمود کے لیے کیسی عقیدت مندی تھی۔ وہ یاسر محمود کے زیرِ سایہ ہی تو پروان چڑھا تھا۔ اس کی شخصیت میں یاسر محمود کے کتنے ہی رنگ جمع ہوئے ہوں گے لیکن اس نے منزل کے حصول کے لیے الگ راہ کا تعین کر لیا تھا۔ پروفیسر نے محسوس کیا کہ رحمت پرویز کی راہ ٹھیک تھی۔ وہ ظلم کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے لڑا تھا اور کئی ظالموں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا تھا۔ وہ جوں جوں سوچتا گیا رحمت پرویز کے حق میں دلائل جمع ہوتے گئے۔ بالآخر اس نے ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچتے ہوئے علی انس کا دیا ہوا نمبر نکال کر اس کی ہدایت کا مطابق اس پر کال کر ڈالی۔ جواباً اسے قریبی پارک تک پہنچنے کی ہدایت دی گئی۔ وہ پارک پہنچا تو اعلی انس اس کا منتظر تھا۔

"فرمایئے پروفیسر صاحب! آپ کو ہماری کس قسم کی مدد درکار ہے؟ ہماری اطلاعات کے مطابق تو آپ بالکل محفوظ ہیں۔" سلام دعا کے مرحلے کے بعد علی انس نے براہ راست موضوع پر آتے ہوئے پروفیسر سے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں جس کا نام اپنایا ہے اس کی شخصیت بھی اپنا لوں۔" پروفیسر نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیا مطلب؟" علی انس کچھ حیران ہوا۔

"میں رحمت پرویز کی طرح آپ کے کاز کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔" اس بار پروفیسر نے بہت واضح الفاظ میں اپنا مقصد بیان کیا تھا۔

"خوش آمدید، رحمت پرویز۔" علی انس نے فرطِ مسرت سے پروفیسر کو گلے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

سجاد رہبر کی نظریں مسافروں کے ہجوم میں ایک خاص چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بالآخر اسے وہ چہرہ نظر آ گیا۔ درمیان میں کتنے ہی ماہ و سال آئے تھے لیکن اسے اس چہرے کو شناخت کرنے میں ایک پل بھی نہیں لگا تھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ اس دوران وہ بھی سجاد رہبر کو دیکھ چکی تھی۔